ریضہ ادا کرنے والے علمائے کرام سے آج تک برسر پیکار چلے آرہے ہیں۔ دہلوی صاحب نے
شد واالرحال سے اشاروں کنایوں میں روضۂ اطہر کی زیارت کو ناجائز قرار دیا تھا لیکن
حضرات نے کھل کر مسلمانوں کو اس ایمانی و روحانی سعادت سے محروم رکھنے کی مہم چلائی ہوئی ہے
لاجیداللہ غیر مقلد نے لکھا ہے:

طلب علم اور دیگر ضروریات کے لیے سفر کا کوئی حرج نہیں، صرف کسی جگہ کی طرف
ن میں قبر نبوی بھی داخل ہے ثواب کی نیت سے سفر کرنا جائز نہیں۔" [1]

دیق حسن خاں قنوجی بھوپالی کا اس سلسلے میں فوابی فیصلہ یہ ہے:

السفر لمجرد الزیارة فیه	صرف زیارت کے واسطے سفر کرنے (کے
اع ومن سافر لمجرد قبر	حکم) میں اختلاف ہے اور جس نے محض
لم یرد زیارة شرعیة بل	کسی قبر کی جانب سفر کیا تو یہ شرعی زیارت
عة۔ [2]	نہیں بلکہ بدعت ہے۔

ل اسمٰعیل حینی نے روضۂ انور کے بارے میں یہ ایمان سوز فیصلہ صادر کیا تھا:

فان قلت) هذا قبر رسول الله	اگر تو کہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی الله علیه وسلم قد عمرت	کی قبر ہے، اس پر بہت سا مال خرچ
علیه قبة عظیمة انفقت فیها	کیا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ در حقیقت
لاموال (قلت) هذا جهل	یہ بہت بڑی جہالت ہے۔
عظیم بحقیقة الحال۔ [3]	

معیل غزنوی نے اس سلسلے میں خارجیت کے نشے سے بدمست ہو کر یوں لکھا ہے:
آجکل صالحین کی قبور پر جو گنبد اور قبے بنائے گئے ہیں وہ بھی بطور ایک بت
کے ہیں۔ [4]

---

[1] جیداللہ، مولوی: مسئلہ سماع موتیٰ، ص ۱۱۔
[2] صدیق حسن خاں، مولوی: دلیل الطالب(؟)، ص ۹۔
[3] اسمٰعیل حینی، مولوی: تطہیر الاعتقاد، ص ۲۶۔
[4] اسمٰعیل غزنوی، مولوی: تحفۂ وہابیہ، ص ۵۹۔

اِسی مولوی اسمٰعیل غزنوی نے اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے:[1]

آستانوں کی زیارت کے لیے شدِّ رحال
اس میں کیا شانِ پرستاریٔ اصنام نہیں

یہ ہے غیر مقلد وہابیہ کی نظر میں روضۂ اطہر اور رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ کی قدر و قیمت۔ یہ ہے اِن کی حبیبِ پروردگار اور شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عقیدت اور وابستگی۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ایسے خلافِ رُوحِ ایمان نظریات سے محفوظ و مامون رکھے اور وہابیت کی بلا سے بچائے۔ آمین

انکارِ تقلید مسئلہ تقلید ہی فرقہ سازی کے راستے میں سدِ سکندری کا کام دیتا تھا، لیکن جب سے وہابیہ نے انکارِ تقلید کا فتنہ اٹھایا ہے، اسی وقت سے فرقہ سازی و تفرقہ بازی کا سیلاب اُمنڈتا آرہا ہے، جس نے ملتِ اسلامیہ کو مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر رکھ دیا۔ اسی فتنہ کے باعث ایک خدا کو ماننے والے، ایک ہی آخری رسول کے اُمتی کہلانے والے، ایک قرآن کو اپنا ضابطۂ حیات و اساسِ دین گرداننے والے، ایک ہی قبلے کی جانب منہ کر کے نماز پڑھنے والے باہم دست و گریبان ہیں۔ جن کی سعیٔ بلیغ غیر مسلموں کو مسلمان بنانے اور اسلام کا دفاع کرنے میں وقت ہونی چاہیے تھی، اُنھیں آپس میں برسرِ پیکار رہنا پڑ رہا ہے۔ اب ابجد خوان بھی اُٹھ کر فخرِ غزالی و رازی بن جاتا ہے اور تحقیق کے نام پر مقدس شجرِ اسلام کی اپنی عقل و دانش کے معلے سے کاٹ چھانٹ شروع کر دیتا ہے۔ ٹھوٹ کاریگر ہونے کے باعث اصلاح کے نام پر فتنہ بازی ملتِ اسلامیہ سے خیر خواہی کے پردے میں اسے اتنا نقصان پہنچا جاتا ہے جتنا غیر مسلم نہیں پہنچا سکتے۔ رہا یہ غور ہے کہ غزالی و رازی (رحمۃ اللہ علیہما) جیسے آسمانِ علم و عرفان کے ماہ اور جنید و بایزید نیز غوثِ اعظم و مجدد سرہندی جیسے بحرِ معرفت کے شناور و میدانِ طریقت کے شہسوار تو تقلید سے مستغنی نہ ہوئے، اُنھوں نے قطعاً انکار نہ کیا لیکن چودھویں صدی کے بخاری، ترمذی اور مشکوٰۃ پڑھے ہوئے صاحبان کو تقلید سے آزاد ہونے اور ائمہ مجتہدین

---

[1] اسمٰعیل غزنوی، مولوی: تحفۂ وہابیہ، ص ۱۵، ۱۶

ن کرنے کا خدائی پرمٹ مل گیا ہے؟ کیا یہ حضرات اُمتِ محمدیہ کے اُن لاکھوں اکابر سے علم و عرفان
ار ہیں جو ہر دور میں اسلام کی حقانیت کے زندہ ثبوت اور راہِ ہدایت کے بلند و بالا اور روشن
ے۔ کاش! یہ محقق ہونے کا دعویٰ کرنے والے کبھی اُن اکابر کے علم و عرفان کو سامنے رکھ کر
ریبانوں میں جھانکتے اور اُن بزرگوں کے حضور اپنی علمیت و قابلیت کا حدود اربعہ ناپنے کی
ہ گوارا فرمالیں، تو تحقیق کا سارا وزن چشمِ زدن میں کُھل جائے۔ بلند بانگ دعاوی کا پُورا بھرم
ہ جائے۔ واللہ یہدی من یشاء الی صراطٍ مستقیم۔

ہدین عظام پر طعن

چونکہ ائمہ مجتہدین نے عرق ریزی کر کے قرآن و حدیث سے مسائل کا
استنباط کیا اور اپنی عزیز عمریں فرقہ بازی و فرقہ سازی کے سدِّباب
ہا کر دیں تا کہ آئندہ نسلیں نااہلوں کے پیچھے لگ کر اپنی عاقبت برباد کرنے سے بچ جائیں۔
ت ہے کہ ائمہ دین کی تقلید پر قائم رہنے سے کوئی فرقہ بن ہی نہیں سکتا۔ ملتِ اسلامیہ کے
ے کیے ہی نہیں جا سکتے۔ وہابی حضرات نے فرقہ بازی کا دروازہ کھولنے کی خاطر اور تفرقہ بازی کا
ہونے کی غرض سے تقلید ہی کا انکار کر دیا اور جن بزرگوں کی تقلید پر اُمتِ محمدیہ متفق چلی آ رہی تھی
حضرات پر ہی زبانِ طعن دراز کرنی شروع کر دی۔ چونکہ مجتہدین حضرات میں سراجِ امت محمدیہ
اعظم حضرت نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۵۰ھ) کی شخصیت سب سے
ہے، اس لیے مبتدعین حضرات نے حضرت امام اعظم قدس سرہٗ کو اپنا خصوصی ہدف
۔ تقلید کے بارے میں غیر مقلدین حضرات کے سابق امیر مولوی محمد اسمٰعیل صاحب (المتوفی
۱ھ) نے لکھا ہے:

"اس قسم کی سینکڑوں جزئیات مروجہ فقہ کے دفاتر میں موجود ہیں جو عقل و شعور
کے دامن کو بڑے زور سے جھنجوڑتی ہیں۔ بجز تقلید اور عصبیت کے اُن کے
قبول کے لیے ذہن آمادہ نہیں ہوتا۔ ان گزارشات کا یہ مطلب نہیں کہ فقہ
حنفیہ کے سارے مسائل سطحی اور عدمِ احتیاط پر مبنی ہیں بلکہ بعض مقامات میں
انتہائی تنقید اور گہرائی سے کام لیا گیا ہے اور بڑی محتاط روش اختیار فرمائی
گئی ہے۔ اس لیے دُور اندیش اور محقق علماء کی رائے ہے کہ ان مروجہ

مسالک سے کسی مسلک کے ساتھ کلی وابستگی نہیں رکھنی چاہیے۔ خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل ہونا چاہیے۔" [1]

اس عبارت سے یہ تاثر بھی سامنے آتا ہے کہ احناف یا دوسرے مسالک میں امیرالوہابیہ موصوف کے پائے کا ایک بھی عالم پیدا نہیں ہوا کہ موصوف کو سیکڑوں جزئیات فقہ کا صریحاً غلط ہونا نظر آ گیا لیکن وہ حضرات انہیں دیکھنے سے قاصر رہے۔ اگر غیر مقلدین حضرات برا نہ منائیں تو ہم یہ عرض کیے دیتے ہیں کہ ان حضرات کی توخاک پا بھی آپ کے ان خانہ ساز محققین سے زیادہ عالم تھی، ہاں بعض مسائل میں آپ کو کچھ یا کوتاہی جو نظر آتی ہے، اس کے لیے ذرا غور سے دیکھ لیجیے کہ یہ آپ حضرات کا اپنا ہی بھینگا پن تو نہیں ہے؟ علاوہ بریں غیر مقلد حضرات اگر ایسے ایک بھی مسلّم محقق عالم دین کی نشان دہی نہ کر سکیں جس نے یہ کہا ہو کہ مروجہ مسالک میں سے کسی ایک کے ساتھ کلی وابستگی نہیں رکھنی چاہیے خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدِرْ پر عمل ہونا چاہیے، تو ہم صرف اتنی سی گزارش کریں گے کہ فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ یعنی اپنی جانوں پر ترس کھاؤ اور اس آگ سے خود کو بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

اب نمونے کے طور پر سرگروہ غیر مقلدین یعنی میاں نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولوی عبدالعزیز محمدی رحیم آبادی (المتوفی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) کا دلخراش تبصرہ اور چاند کی طرف تھوکنا ملاحظہ ہو:

"بات یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ سے چونکہ حدیث کی روایت نادر ہے الا ماشاء اللہ اور یہ فن حدیث میں بے مائیگی اور نقصان اجتہاد کی دلیل تھی، لہٰذا النعمانی لوگ اس کو یوں مٹانا چاہتے ہیں کہ امام صاحب کو شروط روایت میں شدت و احتیاط تھی۔ بھلا امام صاحب کو روایت میں تو یہ احتیاط تھی اور قیاس میں احتیاط نہ ہوئی کہ شریعت محمدی میں بلا تامل اپنی عقل پر اعتماد کرکے حکم شرع لگا دیا اور علیٰ ہذا یہ کہنا کہ امام صاحب نے یہ اصول قائم کیے، یہ سب بے سروپا باتیں ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں اور علمائے مقبولین کی تصریحات اس کے خلاف موجود ہیں۔" [2]

---

[1] محمد اسمٰعیل، مولوی: مقدمہ حسن البیان، ص ۱۷

[2] عبدالعزیز رحیم آبادی، مولوی: حسن البیان مطبوعہ لاہور، بار سوم، ص ۴۲، ۴۳

اگر موصوف کی اس زہر افشانی میں ذرا بھی صداقت تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا
مت محمدیہ کے اکثر اکابر جو حضرت امام المسلمین قدس سرہٗ کی شان میں رطب اللسان رہے ہیں اور
ان کی علمیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے آئے ہیں، اُن میں سے ایک بھی زیورِ علم اور تقویٰ و
ین سے آراستہ نہیں تھا کہ علمِ حدیث سے ناواقف اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کو مسخ
نے والے کی امامت پر متفق رہے۔ کاش! یہ مبتدعین حضرات اس طرح اُمتِ مرحومہ کو
ہ ٹھہراتے وقت کبھی گریبانوں میں جھانک کر بھی دیکھ لیا کریں اور اُن بزرگوں کے حضور
لیاقت کا اندازہ کر کے کچھ تو خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو ملحوظ رکھا کریں۔ موصوف نے امام المسلمین
ن سے کدورت رکھنے کا یوں بھی اظہار کیا ہے:

"اُن (محدثین) کا استناد تو کتاب و سنت و آثارِ صحابہ ہی پر ہے البتہ جن لوگوں کے
پاس قیاس کا ہتھکنڈہ موجود تھا اُنھوں نے طلبِ حدیث میں زحمتِ سفر و
مشقت اُٹھانے کی ضرورت دیکھی نہ کی۔ جو مسئلہ پیش آیا اُسی ہتھکنڈے (قیاس)
سے فوراً جواب دے دیا۔ ایسے لوگ اُس وقت قیاس کہلاتے تھے، جیسا کہ
صاحبِ سیرۃ النعمان نے حصہ اول میں خود اقرار کیا ہے۔ علاوہ امام ابوحنیفہ کے
مناظرے جو آپ نے نقل کیے ہیں، وہ بھی اسی کے شاہد ہیں کہ امام ابوحنیفہ
نے قیاس ہی سے جواب دیئے ادلۂ شرعیہ کا وہاں نام بھی نہ تھا۔"[1]

یہ مبتدعین زمانہ کا چاند کی طرف تھوکنا اور ساری اُمتِ محمدیہ کو شریعتِ محمدیہ کا مخالف ٹھہرانا کہ
س ادلۂ شرعیہ سے واقف ہی نہیں تھا، اُسے امام الائمہ اور سراجِ اُمتِ محمدیہ مانتے چلے
رہے ہیں۔ بہرحال وہ اکابر جو اپنے اپنے دور میں سرمایۂ روزگار تھے اور حضرت امام ابوحنیفہ
ۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے آئے۔ اُن کے مقابلے پر چند مبتدعین زمانہ
ی غوغا آرائی کہاں قابلِ التفات ہے؟ علاوہ بریں جب ان حضرات نے توہین و تنقیصِ شانِ
سالت کو اپنا محبوب مشغلہ اور اپنے دین کا رکنِ اعظم بنایا ہوا ہے، تو امام المسلمین قدس سرہٗ

---

[1] عبدالعزیز رحیم آبادی، مولوی: حسن البیان، ص ۹۱

کی ایسے لوگوں کی زبان و قلم سے تنقیص ہونا کون سا محلِ تعجب یا نرالی بات ہے؟ ان حضرات کی ایسی زہر افشانیوں کا جائزہ ہم نے ایک مقالے میں لیا ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ دوبارہ نئی آب و تاب سے منظرِ عام پر جلوہ گر ہونے والا ہے۔

غلاظت پسندی چونکہ وہابی حضرات تقلید سے آزاد اور محقق ہیں کہ شترِ بے مہار کی طرح من مانی کرتے ہیں اس لیے شریعتِ محمدیہ کو ایک کھلونا یا بازیچۂ اطفال بنا لیا ہے۔ منی کے بارے میں ان کے شیخ الکل یعنی میاں نذیر حسین دہلوی کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

"بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منی پاک ہے۔" [1]

بڑے میاں کی تحقیق تھی اب ایک چھوٹے میاں کی زبانی سنیئے اور ان کی طہارت پسندی کی داد دیجئے اُنھوں نے بھی بڑی دھوم دھام سے اپنی تحقیق انیق کے وہابیہ کی خاطر یوں انمول موتی بکھیرے ہیں:

"لیکن صحیح قول یہی ہے کہ منی پاک ہے۔" [2]

"صواب یہ ہے کہ دونوں (مرد و عورت) کی منی پاک ہے۔" [3]

ان حضرات کی طہارت پسندی کا اس سے بھی بڑا تمغہ ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف لکھتے ہیں:

"جب بچہ عورت کی فرج سے باہر نکلے اور اس پر فرج کی رطوبت ہو تو وہ بھی پاک ہے۔" [4]

"زیادہ تر صحیح قول یہ ہے کہ کتے اور خنزیر کے سوا اور سب جانوروں کی منی پاک ہے۔" [5]

وہابیہ کی طہارت کا پانی وہابی حضرات اپنی یا کسی اور کی یا کتے اور خنزیر کے سوا کسی بھی جانور کی منی میں لتھڑے ہوئے ہوں تو ان کی پاکی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب وہ نماز کی تیاری کریں گے۔ وضو کے لیے کیسا پانی درکار ہے؟ چنانچہ کنوئیں کے

---

[1] نذیر حسین دہلوی، مولوی، فتاویٰ نذیریہ، جلد اول، ص ۱۰۷ [2] ابوالحسن، مولوی، فقہ محمدی کلاں، ص ۴۱
[3] ایضاً: ص ۴۱ [4] ایضاً: ص ۲۲
[5] ایضاً: ص ۴۱

پانی کی پاکی ناپاکی کے سلسلے میں میاں نذیر حسین صاحب سے سوال ہوتا ہے جو مع جواب ملاحظہ ہو:

سوال: چہ فرمایند علمائے دین دریں مسئلہ کہ اگر سگ در چاہ افتاد چہ حکم است بینوا۔
جواب: حکم چاہ مذکور آنست کہ اگر آب آں چاہ از افتادن سگ متغیر شدہ است بلکہ بحالِ خود است آں چاہ طاہر است۔" [1]

اب مولوی عبد الستار دہلوی کی سن لیجیے کہ اس بارے میں وہ کیا فرماتے ہیں:

"کنویں میں چوہا وغیرہ گر جائے تو کنواں ناپاک نہ ہوگا کیونکہ آنحضور صلعم کے زمانہ میں مدینہ کے نواح میں بئر بضاعہ تھا، جس میں حیض کے کپڑے، مردار کے گوشت کی ہڈیاں گرتی تھیں، لوگ اس سے پانی پیتے تھے۔ آپ کو بھی اس سے پانی دیا جاتا تھا۔ آپ سے اس کا مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا: ان الماء طهور لا ينجسه شیء۔ کہ پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔" [2]

اپنی غلاظت پسندی کی عادت کو پورا کرنے کی خاطر سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی افترا کر دیا۔ سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کیسی کیسی نجاستوں، غلاظتوں کے پلا دینے کا دعویٰ کر دیا، پھر پانی کے کسی صورت میں ناپاک نہ ہونے کا حکم بھی اس سرکار کی جانب زبان نبوی سے منسوب کر دیا۔ مزید ملاحظہ ہو!

سوال (۱۰۵): ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً دس بارہ سال تھی، کنویں میں گر کر مر گئی اور مردہ حالت میں باہر نکالی گئی، جس کا سر بالکل پھٹا ہوا تھا۔ کنویں کی گہرائی تقریباً ۲۵ گز سے ۴۰ گز ہے۔ اس میں تقریباً پانی آٹھ نو فٹ موجود رہتا ہے۔ اس کی صفائی کا حکم کس طرح ہے؟ تقریباً اس لڑکی کی لاش کنویں میں دو گھنٹے رہی۔

جواب: بصورت مسئولہ میں واضح ہو کہ پانی کا مزہ یا بو یا رنگ بدل گیا ہے

---

[1] نذیر حسین دہلوی، مولوی، فتاویٰ نذیریہ، ج ۱، ص ۲۰۰
[2] عبد الستار دہلوی، مولوی، فتاویٰ ستاریہ، ج ۴، ص ۱۹۷

تو تمام پانی نکالا جائے گا ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ لقولہ علیہ السلام الماء طهور لا ينجسه شئ الا ما غلب ريحه او طعمه او لونه ينجسه تحدث فيه۔ نیز نبی علیہ السلام کا فرمان ہے، اذا كان الماء قلتين لم يحمل الخبث۔ یعنی جبکہ دو مٹکے پانی ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ اب خواہ اس کو کوئی استعمال کرے یا نہیں کرے لیکن شرعاً وہ ناپاک نہیں۔[۱]

[غیر م]قلدین حضرات کے نزدیک قلتین یعنی دو بڑی مشکوں کے برابر پانی کسی جگہ موجود ہو تو وہ جاری پانی [کا ح]کم رکھتا ہے اور جب تک اس کا رنگ، مزہ یا بو نہ بدلے کسی نجاست کے باعث اس پر [نجاست] کی کا حکم جاری نہیں ہوتا۔ وہ پاک ہی قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ میاں نذیر حسین دہلوی نے [لکھ]ا ہے:

"مراد پانی سے یہاں پانی قلیل (دو بڑی مشکوں سے کم) ہے، اگر کثیر (دو بڑی مشکوں کے برابر) ہو، حکم جاری کا رکھتا ہے اور نجس نہیں ہوتا پیشاب وغیرہ سے"[۲]

[ی]ہ ہے غیر مقلدین حضرات کی شان تحقیق اور یہ ہے ان کی حدیث سے وابستگی جس کے بل بوتے پر [یہ] محدثین کہلاتے اور بزرگان دین کو قرآن و حدیث سے ناواقف ٹھہراتے ہیں لیکن خود [ع]الم ہے کہ ابوسفیان ظریف بن شہاب جیسے ضعیف و متروک راوی کی حدیث کے سہارے [س]ارے جہاں کی پلیدی اپنے لیے پاک ٹھہرالی، حالانکہ محدثین نے حدیث قلتین کو مضطرب اور [بع]ض حضرات نے موضوع قرار دیا ہے۔ خود یہ حدیث پر عمل کر صحیح احادیث کو چھوڑ کر مضطرب و [مو]ضوع کو دین و مذہب بنائیں اور اسی کے بل بوتے پر ائمہ دین کی تحقیقات جلیلہ میں کیڑے بتائیں۔ [الل]ہ تعالیٰ عقل و دانش عطا فرمائے، آمین۔

کاش! غیر مقلدین حضرات کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا فرمالیں کہ اگر ان کے ایسے [مس]ائل سے غیر مسلم آگاہ ہو جائیں تو مسلمانوں، اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں وہ

---

[۱] عبدالستار دہلوی: فتاویٰ ستاریہ، جلد چہارم، ص ۵۳، ۵۴، ۵۵

[۲] نذیر حسین دہلوی: معیار الحق، ص ۱۳۱

نظر قایم کریں گے، اگر انھیں معلوم ہوجائے کہ ان لوگوں کے نزدیک دو بڑی مشکوں کے برابر
سی جو ہڑ میں ہوا اور اتنے سے پانی میں پیشاب، پاخانہ یا مرا ہوا کتا، بلی، چوہا یا کوئی اور نجس
چیز پڑی ہو، تو یہ پانی غلاظتوں کا مجموعہ ہونے کے باوجود یہ لوگ پاک سمجھتے ہیں۔ اس سے وضو
کرکے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اسے بے دھڑک پی سکتے ہیں۔ پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی ایسی تربیت
کی کہ مسلمان کنویں سے پانی پیتے تھے، اسی میں حیض کے لتھڑے کپڑے ڈالے جاتے، اسی میں
جانوروں کا گوشت اور ہڈیاں پھینک دیتے تھے اور بے دھڑک اسی پانی کو نہ صرف خود پیتے
بلکہ اپنے نبی کو پلاتے اور مسلمانوں کا نبی انھیں اس حرکت سے روکنے کے بجائے ایسی
ان پر اُبھارتا کہ خود اس پانی کو پی لیتا اور اس کے پاک صاف ہونے کا حکم صادر فرما دیتا تھا۔
اللہ یُحِبُّ الْمُطَّہِّرِیْنَ۔ اللہ پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے لیکن غیر مسلم کہہ سکتے ہیں کہ اگر
اسلام میں پاکی ناپاکی کا معیار یہی ہے جو غیر مقلدین پیش کرتے ہیں تو اس طرح اسلام میں پاکیزگی کا تصور
ہی نہیں پایا جاتا اور غلاظت پسندی کے باعث بہرگز خدا کے پسندیدہ بندے نہیں ہوسکتے۔
امید ہے کہ یہ نرالے محققین ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

غیر مقلدین کی شانِ عبادت گزاری

وہابی حضرات اگرچہ قلتاً پلید جوہڑ کے پانی سے وضو و غسل کرکے بے تکلف عبادات ادا کرسکتے
ہیں، لیکن انھیں اس سے بڑھ کر بھی سہولت حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو کہ جنبی و محدث کا اذان
دینا صاف جائز قرار دیا ہوا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے،

"وجائز است اذانِ محدث اگرچہ طہارت افضل است۔"[1]

سجدۂ تلاوت کے بارے میں ان حضرات کے سرگروہ کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ موصوف نے
لکھا ہے:

"پس اس حدیث سے جواز سجدۂ تلاوت بے وضو نیز ثابت ہوتا ہے۔"[2]

---

[1] نورالحسن خاں، عرف الجادی، ص ۲۴
[2] محمد ابوالحسن، مولوی: فقہ محمدیہ کلاں، ص ۹۷

اب ذرا ان حضرات کے غسل کی مزید کیفیت ملاحظہ فرمائی جائے۔ مولوی محمد ابوالحسن صاحب لکھتے ہیں :

"اگر سارا حشفہ غائب نہ ہو بلکہ بعض غائب ہو اور بعض باہر رہے تو اس کے ساتھ کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا۔ نہ اس پر غسل واجب ہوتا ہے نہ کوئی اور حکم اس کے ساتھ متعلق ہوتا ہے" [1]

اب میاں نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولوی محمد سعید صاحب کی عجیب و غریب تحقیق ملاحظہ ہو، جس سے غیر مقلد حضرات روزانہ فائدہ اٹھاتے اور مزے لوٹتے ہوں گے۔ انھوں نے لکھا ہے :

"جو اپنی بیوی سے جماع کرے اور انزال نہ ہو تو اس کی نماز بغیر غسل کے درست ہے" [2]

اب وہابی صاحب وضو کی جانب رجوع فرماتے ہیں۔ اس میں بھی جدت ملاحظہ ہو :

"کافی ہے مسح کرنا پگڑی پر" [3]

دوسرے غیر مقلد صاحب کا جوشِ تحقیق اور شانِ محققانہ بھی قابلِ دید ہے۔ انھوں نے لکھا ہے :

"وضو میں بجائے پاؤں دھونے کے مسح فرض ہے" [4]

وہابی مرد و زن اکٹھے نماز پڑھیں تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ چنانچہ لکھا ہے :

"اسی طرح اگر عورت مردوں کے ساتھ کھڑی ہو جاوے تو جمہور علماء کے نزدیک اس کی نماز بھی نہیں ٹوٹتی اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر عورت مرد کے برابر کھڑی ہو جائے تو مرد کی نماز ٹوٹ جاتی ہے اور عورت کی نہیں ٹوٹتی، لیکن یہ قیاس مع الفارق ہے" [5]

بلکہ غیر مقلدین حضرات کے شیر پنجاب نے تو اس سے بھی جرأت مندانہ فیصلہ صادر فرمایا ہوا ہے۔

---

[1] محمد ابوالحسن، مولوی : فقہ محمدیہ کلاں، ص ۶۵

[2] محمد سعید، مولوی : ہدایت مکتوب فاسیہ، ص ۳۶

[3] صدیق حسن خاں، مولوی : فتح المغیث، ص ۶

[4] محمد ابراہیم، مولوی، فتاوٰی ابراہیمیہ مطبوعہ الٰہ آباد، ص ۲

[5] محمد ابوالحسن، مولوی، فقہ محمدی کلاں، ص ۱۵۷

سوال: کوئی شخص عورتوں کو عیدگاہ میں لے جانے کی کوشش کرے تو
اس کی مخالفت کرنی جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ہرگز مخالفت جائز نہیں۔[۱]

...ہے غیر مقلد حضرات اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر نماز میں مشغول ہو گئے اب مردوں اور عورتوں
...بلی خارج ہونے لگتی ہے تو اس صورت کے بارے میں انھیں یہ تلقین فرمائی گئی ہے:

"اسی طرح اگر منی اُترکر ذکر کے درمیان آوے اور وہ شخص نماز کے اندر ہو،
وُہ اپنے ذکر کو کپڑے کے اُوپر سے پکڑ رکھے اور منی باہر نہ نکلے، یہاں تک کہ
سلام پھیرے تو اُس کی نماز درست ہو جاتی ہے کیونکہ وُہ ہمیشہ پاک ہے یہاں تک
کہ منی باہر نکلے اور عورت کا حکم بھی مانند مرد کی ہے۔"[۲]

مندرجہ بالا حوالہ جات سے وہابی حضرات کی نماز کا نقشہ ان کی متعارف شان کے باعث یوں
...ننے آتا ہے کہ غیر مقلد صاحب اپنی اہلیہ محترمہ سے صحبت کر رہے تھے کہ کسی مسجد سے اذان کی
...واز سنی، انزال ابھی نہیں ہوا تھا کہ دونوں اُسی طرح لتھڑے ہوئے نماز کی جانب دوڑے،
...ہوں نے اس کنویں کے پانی سے وضو کیا جس میں کتا گر گیا تھا یا کوئی لڑکی گر گئی تھی اور اس کا
...سر بھی پھوٹ گیا تھا یا گاؤں کے جوہڑ پر جا پہنچے جس میں گاؤں کی بھینسیں روزانہ پیشاب گوبر
...کرتی ہیں لیکن اُس میں پانچ دس بڑی مشکوں کے برابر پانی ہے۔ وضو کرتے ہوئے وہابی صاحب
...نے پگڑی پر مسح کیا حالانکہ اللہ جل مجدہٗ نے وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ فرمایا ہے لیکن ان کے
...معتقدین نے وَامْسَحُوْا بِعَمَامَتِكُمْ بنا لیا ہے اور وہابن صاحبہ نے دوپٹے پر مسح
...کر لیا ہوگا۔ اتنی دیر میں ایک صاحب نے حالتِ جنابت میں آکر اذان پڑھ دی۔ مولوی صاحب
...مذکورہ تماشا کر ہی رہے تھے کہ اذان کی آواز سن کر سابقہ وضو سے نماز پڑھانے

---

[۱] ثناء اللہ امرتسری، مولوی، فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۳۳۷

[۲] ...ابوالحسن، فقہ محمدی کلاں، ص ۴۹

مصلے پر کھڑے ہو گئے۔ انزال سے پہلے نماز کی جانب دوڑ آنے والا جوڑا، مولوی صاحب کی اپنی
اور موذن صاحب پیچھے کھڑے ہو گئے۔ سابقہ کرتوت کا خیال آتے ہی مذکورہ جوڑے اور مولوی صا
دسولون صاحب کی منی خارج ہونے لگی۔ فوراً چاروں حضرات کے دائیں ہاتھ اپنے اپنے اُن مقامات
پر ہی پہنچ گئے جہاں پہنچانے کی اُن کے بڑوں نے تلقین فرمائی ہے۔ موذن صاحب نے جب
اندر کے اکھاڑے کا یہ تماشا دیکھا تو اُن کے جذبات بھی بے قابو ہو گئے۔ مجبوراً انہیں بھی
دایاں ہاتھ مقام خاص پر پہنچانا پڑا۔ پانچوں حضرات کا ایک ایک ہاتھ قیام ہو یا قعود رکوع
یا سجدہ ہر حالت میں اُسی مقام پر ڈٹا ہوا ہے جہاں اُس کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے
جہاں پانچوں کی توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔ رفعِ یدین کا مسئلہ بھی بگڑ کر رفع ید ہو کر رہ گیا ہے
سلام پھیرتے ہی پانچوں بغیر دُعا مانگے اُسی طرح ہاتھوں سے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے
جلد از جلد باہر دوڑ گئے۔ اگر دُعا مانگتے تو ہاتھ ہٹانے پڑتے، جس سے مضحکہ خیز سیل رواں آ
یہ تھی وہ مختصانہ نماز جس سے پانچوں نے فراغت پائی۔ بجز غیر مقلد حضرات کے ایسی عبادت
کس کے حصے میں آئی۔ اللہ تعالیٰ جلد مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین۔

غیر مقلدین کے دیگر محبوب مشغلے

وہابی و نجدی حضرات قبر شکنی میں مشہور آفاق
مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی تو اس مرحلے تک
پہنچنے سے پہلے ہی پٹھانوں کے ہاتھوں ذبح ہو چکے تھے۔ غیر مقلد حضرات کے ہاتھوں یہ
ہزار جتن کے باوجود صرف قلم ہے، جس سے وہ اکابر دشمنی کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں چنا
مولوی محمد اسمٰعیل غزنوی نے لکھا ہے:

"آج کل صالحین کی قبور پر جو گنبد اور قبے بنائے گئے ہیں، وہ بھی بطور ایک
بُت کے ہیں۔"[1]

اب غیر مقلد حضرات کا دوسرا مشغلہ ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی عبد الستار دہلوی جواب دیتے ہیں
سوال (۔۔) زید کہتا ہے کہ مسجد میں محراب بنانا ناجائز ہے اور عمرو

---

[1] محمد اسمٰعیل غزنوی، مولوی، تحفۂ وہابیہ، ص ۵۱

کہنا مبدعہ کو جائز ہے۔ جواب طلب امر یہ ہے کہ فریقین میں سے کون سا قول صحیح
اور قابل قبول ہے؟ (عبدالودود۔ قصبہ جالو)
جواب: بے شک مساجد میں محراب مروجہ کا بنانا ناجائز اور بدعت ہے۔" [1]
مسئلہ کرنوافل کی کثرت اور شب بیداری بھی ان حضرات کے نزدیک ممنوع و بدعت ہے۔
وی عبدالستار صاحب سے اس کے متعلق سوال مع جواب ملاحظہ فرمائیے:
سوال (۸۱) شب برات یعنی ۱۴ تاریخ شعبان کو اکثر عورتیں مرد نفلیات
رات بھر پڑھتے ہیں، اس کا ثبوت شریعت محمدیہ میں ہے یا نہیں؟
جواب: شب برات کو رات بھر نفلیات وغیرہ پڑھنا بدعت ہے اور اپنی
جانب سے دین اکمل کے اندر زیادتی کرنی ہے جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔" [2]
تھا مسئلہ سالانہ ہے، جس پر یہ حضرات عید الاضحٰی کو عمل پیرا ہوتے ہوں گے:
سوال (۲۹۰) معروض آنکہ زمانہ حال میں چیزوں کی گرانی حد سے بڑھ
گئی ہے۔ اس وجہ سے امسال قربانی کا جانور پندرہ بیس روپے سے
کم ملنا دشوار ہے۔ بندہ نے سنا تھا کہ پہلے کسی صحیفہ میں یہ مضمون نکل چکا ہے
کہ مرغ کی قربانی بھی جائز ہے۔ فرمان نبوی "الدین یسر" اور فرمان الٰہی
ما جعل فی الدین من حرج کے کلام کے ماتحت اگر آپ مرغ کی قربانی
جائز سمجھتے ہوں تو بندہ کی تحقیق کرادیں۔" (از مولوی محمد ضلع فیروزپور)
جواب: "شرعاً مرغ کی قربانی جائز ہے۔" [3]
جواں مسئلہ مسلمانان اہلسنت و جماعت کو مشرک و بدعتی سمجھنا اور ان سے مناکحہ کرنا بھی
خطہ ہو:

---

[1] عبدالستار، مولوی، فتاویٰ ستاریہ، جلد اول، ص ۹۳
[2] ایضاً، ص ۹۷
[3] فتاویٰ ستاریہ، جلد دوم، ص ۷۲

سوال: نام کا مسلمان، شرکیہ افعال کرنے والے کا نکاح موحد عورت سے جائز ہے یا ناجائز؟

جواب: حرام ہے۔" [1]

سوال (۱۱۱): عنداللہ وعندالرسول نکاح کس بات سے ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب: عورت موحدہ مسلمہ صوم وصلوٰۃ کی پابند ہو اور خاوند مشرک، بدعتی، مولود پرست، گیارھویں پرست، تعزیہ پرست وغیرہ وغیرہ یا تارک صوم وصلوٰۃ ہو وغیرہ وغیرہ یا اس کے برعکس، بس نکاح ٹوٹ گیا۔ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ" [2]

اگر غیر مقلد حضرات کے ایسے فتووں کو شرعی حکم کے مظہر سمجھ لیا جائے تو کتنے فیصد نکاح آج درست قرار پا سکتے ہیں؟ غیر مقلد حضرات غور تو فرمائیں کہ ان کے فتووں کی رُو سے کتنے مدعیانِ اسلام بلکہ اُن کے ہم مشرب بھی ولد الزنا قرار پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ مدعیانِ اسلام کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ آمین۔ اسی تصویر کا یہی افسوسناک رُخ قارئین حضرات مزید ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ مرقوم ہے:

سوال (۲۵۴): اگر نام کا حنفی باپ ہو یا ماں ہی کیوں نہ ہو، ان کی دنیاوی خدمت بجا لانی کیسی ہے اور ان کا جنازہ پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ مخالف اسلام ہونے کی وجہ سے دِل تو اُن کی خدمت کو بھی نہیں چاہتا۔

جواب: والدین کی دنیاوی امور میں اطاعت خدمت کرنی چاہیے لقولہ تعالیٰ وصاحبهما فی الدنیا معروفا (الآیہ) اور اگر بے نماز مشرک ہیں تو نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے۔" [3]

---

[1] فتاویٰ ستاریہ، جلد اول، ص ۴

[2] ایضاً، ص ۶۰

[3] عبدالستار، مولوی: فتاویٰ ستاریہ، جلد سوم، ص ۴۰

سوال: (۲۹۸) مشرک بدعتی کو سلام کرنا یا سلام کا جواب دینا، میل جول رکھنا جائز ہے یا نہیں، اگرچہ وہ کلمہ گو ہو۔

جواب: مشرکین مبتدعین کو سلام کرنا یا اُن سے اسلامی تعلقات و موالات قائم رکھنا شرعاً سخت معیوب و مذموم ہے۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سلام کہلا بھیجا تو عبداللہ بن عمر صحابیِ رسول نے اُس کا جواب نہیں دیا۔۔۔ پس حدیث ھٰذا سے اظہر من الشمس و ابین من الامس ہو گیا کہ مشرکین مبتدعین بدترین فساق و فجار کے ساتھ نشست و برخاست کرنا، اُن کے ساتھ سلام و کلام کرنا اُن کے سلام کا جواب دینا معیوب و مذموم ہے۔ الخ" [۱]

مسلمانانِ اہلسنت و جماعت یعنی سوادِ اعظم کے ساتھ غیر مقلد حضرات کا یہ سلوک کہ اُن سے سلام و کلام تک معیوب و مذموم لیکن انگریزی دشمنِ اسلام حکومت کی چوکھٹ پر ناصیہ فرسائی اور گاندھی جیسے کھلے مشرک، خبیث بت پرست کے سامنے سجدہ ریزی۔ آج اُن غیر مسلموں سے اجتناب پر فتوے کیوں دماغوں سے نکل گئے؟ غیر مقلد حضرات کے ایسے فتوے سُنی مسلمانوں کے خلاف ہونے چاہیے تھے یا نصاریٰ و ہنود کے متعلق؟

وہابی خورد و نوش جس طرح وہابی حضرات کے لیے ہر میدان بڑا وسیع اور اُس میں من مانی کی عام اجازت ہے، اسی طرح کھانے پینے کی چیزوں میں اِن حضرات کے ماکولات و مشروبات کی فہرست بھی کچھ نرالی اور تعجب خیز قسم کی ہے۔ پہلا پسندیدہ مشروب ملاحظہ ہو:

سوال: اونٹ کا پیشاب پینا مریض کے لیے حدیث میں ہے مگر بڑی مکروہ چیز ہے۔ کیسے جائز ہوا؟ ہندو لوگ عورت کو نفاس کی حالت میں گائے کا پیشاب پلاتے ہیں، کیا باعثِ اعتراض نہیں ہے؟

---

۱ عبدالستار دہلوی، فتاویٰ ستاریہ، جلد دوم، ص ۱۴۱

جواب: حدیث شریف میں بطور دوائی استعمال کرنا جائز آیا ہے، جس کو نفرت ہو وہ نہ پئے، لیکن حلت کا اعتقاد رکھے۔ ایسا ہی گائے بکری کے بول کے متعلق بھی آیا ہے: لا بأس ببول ما یؤکل لحمہ۔[1]

اب غیر مقلدین کے دوسرے مشروب مرغوب کا ذکر ہو جانا چاہیے جس کی نہریں تقریباً ہر گھر میں رواں ہیں۔ کسی صاحب کے سوال پر ان حضرات کے شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلوی کا جواب ملاحظہ ہو:[2]

سوال: ایک شخص زوجہ اپنی سے ہم خلوت تھا اور غلیان شہوت بوقت مجامعت کے زوجہ اپنی سے مساس کرتے ہوئے پستان منہ میں لے گیا اور زوجہ اس کی طفل یکسالہ کو دودھ پلاتی تھی، اس شخص کے حلق کے اندر ایک بار یا کہ دو بار دودھ چلا گیا۔ آیا وہ شخص زوجہ اپنی کا فرزند رضاعی ہو گیا یا کہ شوہر رہا اور اس فعل کے باعث سے زوجہ اس کے نکاح میں داخل رہی یا کہ نہ رہی؟

سوال دیگر: یہ کہ مدت رضاعت کی آیا خورد سالی میں ہے یا کہ جوانی میں رہے گی اور عورت کا دودھ اگر کسی زخم میں یا کہ ذکر کے سوراخ میں یا کان میں بحث سکے طبیب کے ڈالا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: یہ شخص اپنی زوجہ کے دودھ پینے کی وجہ سے اپنی زوجہ کا فرزند رضاعی نہیں ہو گیا بلکہ وہ علی حالہ شوہر رہا اور اس کی زوجہ اس کے نکاح میں داخل رہی۔ اس وجہ سے کہ مدت رضاعت میں دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے اور بعد مدت کے ثابت نہیں ہوتی اور مدت رضاعت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ڈھائی برس ہے صاحبین اور علماء جمہور کے نزدیک دو برس ہے اور کسی زخم یا سوراخ ذکر یا کان میں عورت کا دودھ ٹپکانے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ حررہ سید شریف حسین عفی عنہ۔ سید محمد نذیر حسین۔

---

[1] ثناء اللہ امرتسری، مولوی، فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۵۵۵

[2] نذیر حسین دہلوی، مولوی، فتاویٰ نذیریہ، جلد دوم، ص ۲۹۶

یر مقلد حضرات نے اس مرحلے پر اپنی شانِ تحقیق سے ایک عجیب و غریب مسئلہ گھڑا اور عیاشی و
س پرستی کی کتابوں میں ایک نئے باب کا اضافہ کر کے بے راہ روا اور عیاشں طبقے سے خراجِ تحسین
صل کر لیا ہے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ کوئی عورت کسی مرد کو دودھ (اپنی پستان سے) پلا دے
ں کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس مرد کا دودھ پلانے والی عورت کو اور اس عورت کا دودھ پینے والے
کو دیکھ جائز ہو جائے گا۔ ناشر غیر مقلدیت، نواب آف بھوپال جناب مولوی صدیق حسن خان
بی صاحب رقمطراز ہیں:

وَیَجُوزُ اِرْضَاعُ الْکَبِیْرِ وَلَوْکَانَ ذَا لِحْیَۃٍ لِتَجْوِیْزِ النَّظَرِ" لہ

سرے، بیر غیر مقلدیت مولوی وحید الزمان خاں حیدر آبادی یوں لکھتے ہیں:

وَیَجُوْزُ اِرْضَاعُ الْکَبِیْرِ وَلَوْکَانَ ذَا لِحْیَۃٍ لِتَجْوِیْزِ النَّظَرِ خِلَافٌ
لِلْجُمْھُوْرِ" لہ

ں رسے آدمی کو دودھ پلانا جائز ہے خواہ وہ داڑھی والا ہی کیوں نہ ہو اور یہ اس لیے ہے کہ
ں عورت کو دیکھنا جائز ہو جائے اگرچہ یہ نظریہ جمہور کے خلاف ہے۔

اب غیر مقلد حضرات کے خصوصی اور ناپسندیدہ ماکولات کا ذکر ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ
وی عبد الستار دہلوی نے گوہ کی حلت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے
"ضب یعنی گوہ حلال ہے" لہ

صوف نے اپنی تفسیر کی کتاب کے اسی صفحہ پر اپنی اس تحقیق سے بھی نوازا ہے:
"کچھو حلال ہے" لہ

ر نواب صاحب پر کسی گھوڑے نے دولتی جھاڑ دی ہوگی، لہٰذا یوں فتویٰ داغ دیا جاتا ہے:

صدیق حسن خان بھوپالی، مولوی: روضۃ الندیہ، ص ۲۳۶
وحید الزمان حیدر آبادی، مولوی: نزل الابرار، جلد دوم، ص ۷۷
عبد الستار، تفسیر ستاری ضمیمہ، ص ۲۹۴
ایضاً: ص ۲۹۴

"گوشتِ اسپ حلال است" [1]

مولوی عبدالستار صاحب سے بِجّو کی حِلّت و حرمت کے بارے میں سوال ہُوا۔ موصوف نے فیضِ حدیث بن کر جو جواب مرحمت فرمایا وہ قارئین کے پیشِ خدمت ہے:

سوال (۲۰۰) ایک شخص بنام مُنشی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بِجّو کے متعلق فرمایا ہے کہ بجو حلال ہے۔ جو شخص بِجّو کا کھانا حلال نہ جانے، وہ منافق بے دین ہے۔ اُس کی امامت ہرگز جائز نہیں۔ دوسرا شخص بنام محمد کہتا ہے کہ بجو کا کھانا حلال نہیں، ہاں شکار جائز ہے اور بجو کے حلال نہ جاننے والے کو منافق و بے دین کہنا جائز نہیں بلکہ تشدد ہے۔ دونوں میں سے کس کا قول صحیح ہے؟ (سائل حاجی محمد صاحب بہاولپوری)

جواب: مُنشی کا قول صحیح ہے اور موافق حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ بِجّو گو طبعاً مکروہ ممنوع ہے مگر شرعاً ممنوع نہیں۔" [2]

یہاں تک تو اُن حضرات کا ذکر ہے جن سے صرف ایک آدھ جانور ہی حلال ٹھہرایا جا سکا لیکن جب غیر مقلدین کے بقیۃ السلف و عمدۃ الخلف مولوی ثناء اللہ امرتسری کی باری آئی تو حضور نے شیرِ پنجاب بن کر وہ دلیری دکھائی کہ سانپ، گرگٹ، سیہہ اور چیونٹی بھی ہاتھ سے نہ رہ گئے۔ اُن کے جملہ ماکولات غیر مقلدین نے اپنے لیے حلال ٹھہرا لیے۔ اب موصوف کا وہ فتاویٰ ملاحظہ فرمائیے:

سوال: کچھوا، کیکڑا اور گھونگا حرام ہیں یا حلال؟ از روئے قرآن و حدیث جواب ہو۔

جواب: قرآن و حدیث میں جو چیزیں حرام ہیں اُن میں یہ تینوں نہیں اور حدیث شریف میں آیا ہے ذر دنی ما ترکتکم۔ جب تک شریعت بند نہ کرے اس سوال نہ کیا کرو۔

---

[1] نورالحسن خان: عرف الجادی، ص ۱۰

[2] عبدالستار: فتاویٰ ستاریہ، جلد دوم، ص ۲۱

ان چیزوں سے شرع شریف نے بند نہیں کیا، لہٰذا حلال ہیں۔ ؎

وہابی حضرات ذرا ان اشیاء کی فہرست تو پیش کریں جن کو قرآن وحدیث نے حرام قرار دیا ہے۔ تاکہ ہم اُن کے حلال جانوروں کی فہرست میں بیش بہا اضافہ کر دیں۔ فہرست پیش کرنے پر غیر مقلد حضرات کو بھی ان چیزوں کو حلال ماننا پڑے گا جو حلال ہرگز نہیں ہیں یا انھیں برملا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن وحدیث نے حلال وحرام کے بارے میں کچھ اور ہی ضابطہ مقرر فرمایا ہے جسے یہ نام نہاد محققین عوام الناس سے چھپاتے ہیں تاکہ شریعت محمدیہ کا ہر طرف سے اپریشن کرتے رہیں۔

غیر مقلدین کی ازدواجی بے ضابطگی

کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا پروردگار عالم کا کام ہے یا اُس کی عطا سے حبیب خدا، ختم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ودیگر انبیائے کرام علیہم السلام کو حاصل تھا۔ اہل علم کا کام حلال کو حرام قرار دینا نہیں بلکہ اللہ ورسول (جل جلالہٗ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے احکامات کو بیان کرنا ہے۔ غیر مقلدین حضرات نہ صرف محقق بن کر ائمہ مجتہدین کے مقام پر سینہ زوری سے قابض ہونا چاہتے ہیں بلکہ اندرونِ خانہ اللہ اور رسول کا کام بھی خود ہی سنبھال کر حلال وحرام قرار دیتے بیٹھ جاتے ہیں۔ کھوٹے کاریگر کی طرح اس میدان میں بھی ان حضرات نے اپنی تحقیق کے خوب ہی گل کھلائے اور مضحکہ خیز فتوے داغے ہیں، چنانچہ نواب آف بھوپال، مولوی صدیق حسن خاں قنوجی کے فرزند مولوی نورالحسن خاں نے اپنے ہی نطفے کی لڑکی سے نکاح جائز قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ونیست وجہ از برائے منع نکاح	اُس بیٹی سے ممانعتِ نکاح کی کوئی وجہ
با دختر یکہ ایں کس با مادرش زنا	نہیں جس کی ماں سے اُس شخص نے زنا
کردہ زیرا کہ تحریم محارم محرمات	کیا ہو، کیونکہ محرمات کا ذی محرم کے لیے
بشرع است وشرع تحریم بنت	حرام ہونا شرع سے ہے اور شریعت میں
شرعی آمدہ وایں دختر بنت شرعی	شرعی بیٹی کی حرمت آئی ہے جبکہ مذکورہ لڑکی
نیست تا داخل باشد زیر قولہ	شرعی بیٹی نہیں ہے کہ حکم ربانی بیٹیاں تمہاری

ثناء اللہ امرتسری، مولوی، فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۵۵

تعالیٰ و بنت شکر و نتواں گفت کہ اسم بنت لاحق مخلوق بہ آب او ست زیرا کہ ایں طوق اگر بشرع است پس باطل است و اگر مراد آنست کہ غیر شرعی است پس مضر نیست چہ اگرچہ مخلوق از آب اوست لیکن ایں آب نہ آبے است کہ بداں طوق نسب ثابت شود بلکہ آبے است کہ صاحب او را بجز حجر حاصل دیگر نیست " [1]

لیے حرام ہیں کے حکم میں داخل ٹھہرے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ بیٹی کا نام اُس کے مخلوق از پانی کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ (بیٹی کہنا) اگر اسے شرعی قرار دیں تو باطل ہے اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ (بیٹی ہونا) غیر شرعی ہے، تو یہ بات ہمارے لیے مضر نہیں ہے کیونکہ اگرچہ یہ لڑکی اُس کے نطفے سے پیدا ہوئی ہے، لیکن یہ نطفہ وہ نطفہ نہیں ہے جس سے نسب ثابت ہو جائے بلکہ ایسا نطفہ ہے جس سے پتھر کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔

اب عالی جناب مولوی وحید الزمان خان صاحب حیدر آبادی کی تحقیق انیق ملاحظہ ہو:

وَلَوْ زَنَا بِامْرَأَةٍ تَحِلُّ لَهٗ أُمُّهَا وَبِنْتُهَا۔ [2]

اور اگر کسی عورت سے زنا کیا تو اس آدمی کے لیے مذکورہ عورت کی ماں اور بیٹی جائز ہے۔

یہی حیدر آبادی صاحب غیر مقلدین کے لیے مزید گنجائش یوں پیدا فرماتے ہیں:

ولو جامع احد زوجة ابیه سواء كان بالغا او غیر بالغ صغیرٌ او مراهق لم تحرم علی ابیه لما قدمنا ان حرمة المصاهرة لا تثبت بالزنہ [3]

اگر کسی نے اپنے باپ کی زوجہ سے مجامعت کی، خواہ وہ بالغ ہو یا نابالغ، چھوٹا ہو یا بچڑا۔ اُس کے باپ پر وہ عورت حرام نہیں ہوگی، جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں کہ زنا سے حرمتِ مصاہرت ثابت نہیں ہوتی۔

---

[1] نور الحسن خان، مولوی، عرف الجادی، ص ۱۰۹

[2] وحید الزمان خان، نزل الابرار، ج ۲، ص ۲۱ [3] ایضاً، ص ۲۸

آپ ذرا اسی تصویر کا رُخ ملاحظہ فرما کر ان حضرات کی جرأت و جسارت کا اندازہ کیجیے کہ شریعت محمدیہ کو انگریز بہادر کے وظیفوں کی خاطر کس طرح بچے کے ہاتھ کا کھلونا بنایا ہوا تھا، چنانچہ لکھا ہے :

وکذالک لو جامع زوجۃ ابنہ لا تحرم علی ابنہ۔ [۱]	اسی طرح اگر کسی نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے جماع کیا تو وہ عورت اس کے بیٹے پر حرام نہیں ہوگی۔

وہابی مذہب کیا ہوا، عیاشی کے مفت پرمٹ تقسیم کرنے والوں کی منڈلی ہوگئی۔ اپنے نطفے کی لڑکی سے نکاح جائز، بہو سے زنا کیا تو وہ لڑکے پر حرام نہ ہوئی، لڑکے نے باپ سے بدلہ لیا اور اپنی ماں سے زنا کیا تو وہ باپ پر حرام نہیں ہوئی جس سے زنا کیا اس کی ماں اور بیٹی سے نکاح حلال، مفت کے مزے وہابیوں کے گھر میں جمع ہوگئے۔ خیر یہ چھوٹے میاؤں کے فتوے تھے ان پر بڑے میاں اور ان کے شیخ الکل، مولوی نذیر حسین دہلوی کی مُہر تصدیق دکھا دی جائے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ سوال و جواب ملاحظہ فرمائیں :

> سوال : کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے باغوائے نفس امارہ ایک عورت سے زنا کیا۔ بعد اس کے مزنیہ کی لڑکی سے نکاح کیا اور بعد نکاح کے بھی دونوں سے وطی کی، تو نکاح درست ہوا یا نہیں؟ برتقدیر عدم جواز صورت نباہ کی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔
>
> **الجواب :** نکاح مذکور درست ہوا، اس لیے کہ یہ عورت اُن عورتوں میں سے نہیں جن سے نکاح حرام ہے۔ [۲]

عیاشی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر چودھویں صدی کے محققین نے متعہ کی اباحت کا حکم بھی صادر فرمایا ہوا ہے تاکہ ضرورت مند حضرات مزے اڑائیں اور ذرا ان محققین کا شکریہ ادا کریں۔ چنانچہ لکھا ہے :

---

[۱] وحید الزماں خان : نزل الابرار ، ج ۲ ، ص ۲۸

[۲] نذیر حسین دہلوی : فتاویٰ نذیریہ ، جلد دوم ، ص ۱۰۶

وکذلک بعض اصحابنا فی
نکاح المتعة فجوزوھا لانہ
کان ثابتا جائزا فی الشریعة
کما ذکرہ فی کتابہ فما
استمتعتم بہ منھن فاتوھن
اجورھن قرأة ابی بن کعب و
ابن مسعود فما استمتعتم بہ منھن
الی اجل مسمی یدل صراحة
علی اباحة المتعة فاباحتہ
قطعیة لکونہ قد وقع الاجماع
علیہ والتحریم ظنی [1] انتہ

اور اسی طرح ہمارے بعض اصحاب (وہابی
علماء) نے نکاح متعہ کو جائز قرار دیا ہے
کیونکہ شریعت سے اس کا جائز ہونا ثابت
ہے جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے فما
استمتعتم بہ منھن فاتوھن اجورھن (ابی بن
کعب اور عبداللہ بن مسعود کی قرأۃ فما
استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی
متعہ کی اباحت پر صراحۃً دلالت کرتی ہے۔
پس (متعہ کی) اباحت قطعی ہے کیونکہ اس پر
اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اس کی تحریم
ظنی ہے۔

ان محققین نے گھر کے اندر اور باہر عیاشی کے پرمٹ تقسیم فرما دیے خالص زنا پر اباحت و جواز کی شرعی مہریں لگا دیں۔ بعدہٗ خیال آیا ہوگا کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ گھر میں کسی سے زنا کر سکیں نہ متعہ کی استطاعت رکھتے ہوں، اُن کی سہولت کے پیش نظر مشت زنی کو مباح بلکہ واجب تک قرار دے دیا گیا، تاکہ وہابی شریعت کی بہتی گنگا میں وہ بھی ہاتھ دھو لیں اور محروم نہ رہیں۔ چنانچہ سبق پڑھایا ہے،

بالجملہ استنزال منی بکف و بچیزے
از جمادات نزد دعائے حاجت
مباح است ولاسیما چوں فاعل
خاشی از وقوع در فتنہ یا معصیت
کہ اقل احوالش نظر بازیست

بالغرض منی کا ہاتھ سے یا جمادات کی قسم سے
کسی چیز کے ساتھ خارج کر دینا بوقت
ضرورت مباح ہے، خاص طور پر جب
فاعل کو فتنہ یا معصیت میں پڑنے کا خطرہ
ہو، کہ اس کی نگاہ نے اسے مجبور کر دیا ہو

---

[1] وحید الزمان خان: نزل الابرار، جلد دوم، ص ۳

باشد کہ دریں حین مندوب است | تو ایسے موقع پر دشت زنی مباح ہے
بلکہ گاہے واجب گردد۔ [1] | بلکہ کسی وقت واجب بھی ہو جاتی ہے۔

کیا خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

نواب صاحب نے اسی کتاب میں دوسرے مقام پر اس کار بد والی صد نفرین حرکت کو خوف خدا اللہ اور دیر سے عاری ہو کر صحابہ کرام علیہم الرضوان کی جانب منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے:

بعض اہل علم نقل ایں استمناء	بعض اہل علم نے مشت زنی کو صحابہ سے
از صحابہ نزد غیبت از اہل خود	نقل کیا ہے کہ جب کوئی اپنے اہل و عیال سے
کردہ اند و در مثل ایں کار حرجے	دور ہو تو اس وقت اس کام کے کرنے
نیست بلکہ ہمچو استخراج دیگر	میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ جسم کے دوسرے
فضلات موذیہ بدن است۔ [2]	نقصان پہنچانے والے فضلات کی طرح
	خارج کرنا ضروری ہے۔

اگر غیر مسلم ان حضرات کی تعلیمات کو دیکھیں تو جائے غور ہے کہ وہ دین برحق کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ کیا یہی ہیں وہ اسلامی تعلیمات جن کے متعلق اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ فرمایا گیا؟ کیا یہی ہیں وہ اخلاق حسنہ جن کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے سرور کون و مکان صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحب خُلُقِ عظیم بنا کر مبعوث فرمایا تھا؟ ہائے افسوس! اپنے ہی سرِ اپنے دین کی بیخ کنی۔ شاہین بچوں کو خاکبازی سکھانا اور حنادل کو زاغ و بوم بنانا کس کا ثمرہ خونریز ہے؟ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

غیر مقلدین کی الہام بازی

سید احمد بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے تو الہامات کے ڈھیر لگائے ہی تھے اور وحی و عصمت کے

---

[1] نور الحسن خان، عرف الجادی، ج ۲، ص ۲۰

[2] ایضاً، ص ۲۰۰

دعوے کرتے ہوئے مہدیت کے دعوے تک ہی پہنچے تھے کہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے بالاکوٹ میں دفن ہوکر رہ گیا۔ پٹھانوں کے خنجر نے مسلمانوں کی بروقت دستگیری کی اور برٹش گورنمنٹ کے ایسے خود کاشتہ پودے بیخ وبُن سے اُکھاڑ کر پھینک دیے گئے۔ جو بات سید احمد صاحب سے شروع ہوکر مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھوں پوری ہوئی اُسی کی درمیانی کڑیاں مولوی محمد قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند اور مولوی عبداللہ غزنوی غیر مقلد وغیرہ بھی ہیں۔ جب نبوت کا دعویٰ کرنے کی غزنوی مولوی صاحب تیاریاں کر رہے تھے تو اُن کی جانب سے شب و روز الہامات کی بارش برسائی جارہی تھی کہ مسلمان اُن کی رُوحانیت اور مقام و منصب کے قائل ہوکر معتقد بن جائیں، تاکہ بوقتِ دعویٰ کچھ تو آمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہنے والے مل جائیں۔ اب الہامات سُنیے:

(۱)

جب میں الہام کو سمجھتا نہ تھا اور توحید سے بخوبی واقف نہ تھا، ایک بار اپنے دادا محمد شریف کی قبر کے پاس جو اُس دیار میں مرجع اور مقبول انام ہے، گیا تو الہام ہوا: لَا اِلٰہَ غَیْرُکَ۔ لیکن اس وقت میں نے غلطی کی اور میں نے خیال کیا کہ یہ ورد مجھ کو وظیفہ کرنے کے لیے سکھایا گیا ہے۔ اب میں نے جان لیا کہ وہ اللہ کی طرف سے الہام تھا کہ میرے سوا دُوسروں کی طرف رجوع کرنا عبادت اور استعانت میں شرک ہے۔ اکیلے اللہ کی طرف پوری توجہ چاہیے۔ قبروں پر اس نیت سے جانا کہ میرا فلاں مطلب حاصل ہو جائے توحید میں رخنہ ڈالتا ہے اور کلمۂ شہادت یعنی اشھد ان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے معنی کے مخالف ہے۔[۱]

(۲)

بارہا مجھ کو الہام ہوا ہے: یا عبدی ھذا کتابی وھذا عبادی فاقرء کتابی علی عبادی۔ یعنی اے میرے بندے! یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے بندے ہیں، پس پڑھ میری کتاب میرے بندوں پر۔ اور یہ بھی الہام ہوتا ہے: ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی جاءک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا نصیر۔[۲]

---

[۱] عبدالجبار غزنوی، مولوی، سوانح عمری عبداللہ غزنوی، ص ۲
[۲] ایضاً، ص ۱۵

(۳)

سکندرپور کے باغ میں، جو ہزارہ کے علاقے میں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فجر کی نماز
کے بعد یہ القاء ہوا، ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ اور ظالم کی تعریف
منقول ہے معلوم کرائی، والظالمون ھم الذین یخالفون عن امر ربھم ثم لا
یتوبون۔ یعنی ظالم وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادوں کی مخالفت کرتے ہیں اور باز نہیں
آتے۔ اور جن لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے اُن کو اس مضمون کے ساتھ آگاہ کیا، واصبر
نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ۔ اور فرماتے
تھے کہ الہام ہوا، فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ۔ یعنی جو کچھ الہام
ہو، اُسے اُس کے لفظ یاد رکھو اور اُس کا بیان کرنا اور تفسیر ہمارا ذمہ ہے۔ اور فرماتے تھے الہام
ہوا، واما من خاف مقام ربہ (الآیۃ) یعنی وہ شخص کہ ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑا
ہونے سے۔ اور یہ الہام ہوا کہ ہمیشہ بدل خود مطالعہ کردہ باش مبادہ کدورتے از ما سوا
رسیدہ۔ یعنی ہمیشہ اپنے دل میں جھانکتے رہو، ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کدورت
آجاوے۔

اور شہر دہلی میں یہ الہام ہوا؛ ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منھم
زھرۃ الحیٰوۃ الدنیا۔ اور مت پھیلا اپنی آنکھیں طرف اُن کی کہ فائدہ دیا ہم نے ساتھ اُس
کے بھانت بھانت لوگوں کو زندگانی دنیا کی تازگی سے۔ اور باغ سکندریہ میں یہ الہام ہوا؛
دع ازواجک واولادک واتباعک قوموا للہ قانتین یعنی کہ دے اپنی بیبیوں اور
اولاد اور تابعداروں کو کہ کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے تابعدار ہو کر اور اس کے آخر میں
الہام ہوا، انا مجیبک وانیسک فلا تحزن۔ یعنی میں تیرا مددگار ہوں، تو غم نہ کھا
اور یہ بھی الہام ہوا، ما اودعت فی قلبک فان رؤیا المؤمن جزء من ستۃ اربعین
جزءا من النبوۃ۔ یعنی جو تدبر اور تفکر قرآن کا تیرے دل میں ہم نے ڈال دیا ہے اُس کو
مت بھول کیونکہ مومن کا خواب ایک حصہ ہے نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے۔

اور فرماتے تھے دہلی میں یہ الہام ہوا؛ ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا

واتبع هواه وکان امره فرطا۔ اور فرمانبرداری نہ کر اس شخص کی جو غافل کیا ہم نے اس کے دل کو اپنی یاد سے اور پیچھے پڑا اپنی خواہش کے اور ہے کام اس کا حد سے بڑھا ہوا یعنی غافلوں کی غفلت میں پیروی نہ کر۔ اور یہ بھی القاء[1] ہوا: وکن فی الناس کانک لست منہم [illegible] یعنی ہو تو لوگوں میں جیسے دوسرے لوگ ہیں۔ اور القاء[2] ہوا: اگر وقتے غفلت شد تدارک آں وقت دیگر لازم است یعنی کسی وقت غفلت ہو جاوے تو دوسرے وقت میں اس کا تدارک لازم ہے۔[3]

—— (۴) ——

فرماتے تھے، تین بار الہام[1] ہوا: وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ اور واسطے اللہ کے ہے اوپر لوگوں کے حج کرنا بیت اللہ کا جو طاقت رکھے طرف اس کی راہ کی۔ اور فرماتے تھے، الہام[2] ہوا: ولسوف یعطیک ربک فترضی یعنی اور البتہ جلدی دے گا تجھ کو رب تیرا پھر تو خوش ہو جاوے گا۔ اور فرماتے تھے، الہام ہوا: الم نشرح لک صدرک۔ یعنی کیا نہیں کھولا ہم نے سینہ تیرا؟[3]

—— (۵) ——

جنگل کی کسی غار میں اکیلے جا کر چھپ گئے اور کچھ مدت پوشیدہ رہے۔ ان دنوں میں یہ الہام[4] ہوا: فقطع دابر القوم الذین ظلموا فالحمد للہ رب العلمین

—— (۶) ——

مولوی عبدالرحمٰن بن شیخ محمد بارک اللہ (لکھوی) کہ وقت کے عالموں سے مشہور عالم ہیں اور زہد اور تقویٰ اور صلاحیت میں اپنے زمانے کے امام، آپ (مولوی عبداللہ غزنوی) کی صحبت بابرکت سے فیض حاصل کرنے کے لیے ملک پنجاب سے سفر کر کے ملک غزنی تک جو دو ماہ کی مسافت ہے گئے، راستے میں جو انھوں نے مخالفوں سے کچھ کلمات آنجناب

---

[1] عبدالجبار غزنوی، مولوی، سوانح عمری عبداللہ غزنوی، ص ۲۵، ۲۶ [2] ایضاً، ص ۲۶
[3] ایضاً، ص ۱۴

مولوی صاحب کی نسبت سُنے تو حیران ہوتے۔ اُسی رات اُن کو یہ الہام[۲۰] ہوا: فورب السماء
والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون۔ دوسری بار یہ الہام[۲۱] ہوا: وانہ لمن المصطفین
الاخیار۔ تیسری بار یہ الہام[۲۲] ہوا: ان ھو الا عبد انعمنا علیہ۔ لہ

قارئین کرام! یہ ہم نے غیر مقلدوں کے مولوی عبداللہ غزنوی کے چند عنوانات کے تحت صرف
بیس الہام پیش کیے ہیں جن میں سے تین الہام مولوی عبدالرحمٰن لکھوی کے بھی ہیں۔ مسلمانوں کو
گمراہ کرنے اور اُن کے دین و ایمان پر دن دہاڑے ڈاکے ڈالنے کی خاطر جو یہ پُر اسرار جال بچھایا گیا ہے
اس کا شیطانی ہونا خود واضح ہے جس کے لیے کسی خارجی دلیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ اللہ جل مجدہٗ
کے کلام کے ساتھ افترا پردازی، کلامِ الٰہی کے ساتھ قدم قدم پر مذاق، نبی آخر الزماں صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم سے برابری کر کے وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ اور أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ
اپنے اوپر چسپاں کرنا، حالانکہ پوری کائناتِ ارضی و سماوی میں ایسی ذات صرف فخرِ دو عالم
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہے جس کی رضا پروردگارِ عالم کو مطلوب ہے ورنہ اور سب رضائے الٰہی
کے طالب ہیں۔ یہ کس درجہ ستم ظریفی ہے کہ سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مدِ مقابل
غزنوی مولوی فلاں کو تسلیم کر لیا جائے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دین و ایمان سے اس درجہ
بغاوت کرنے والے حضرات کو بزرگ اور صاحبِ کشف و کرامت تسلیم کر کے بزرگ منوانے
کی مہم چلائی جاتی ہے۔

غیر مقلد حضرات کی قرآن و حدیث میں تحریفات، ائمہ دین پر بہتانات اور سہل پسندی
کے تحت مسائل کی خانہ ساز ایجادات کے بارے میں مشعلِ راہ جلد دوم کا اختصار عرض ہے
یہاں بفضلہ تعالیٰ مبرہن کر دکھایا ہے کہ مجدد مأتہ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ
نے ان حضرات کی تخریب کاری کا کس طرح محاسبہ کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی
کر دکھایا تھا۔ تفصیل سے بچنے کی خاطر ہم نے یہاں اُن مسائل کا ذکر نہیں کیا جو غیر مقلدین
حضرات نے شریعت سازی کے تحت اختلافی بنا کر رکھ دیے ہیں۔ ہاں مشعلِ راہ
جلد دوم میں ایسے بعض مسائل کا تفصیلی ذکر آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ بابت مولوی عبداللہ غزنوی

لہ عبدالجبار، سوانح عمری عبداللہ غزنوی، ص ۹

کے الہامات کی بھرمار تھی۔ ذرا موصوف کے سوانح نگار مولوی عبدالجبار غزنوی کا یہ بیان ملاحظہ ہو

"جو الہام اور خوابیں آپ کو کتاب وسنت پر ثابت رہنے اور خلق اللہ کو کتاب وسنت کی طرف بلانے اور تقویٰ اور توکل اور صبر اور خشیت اور زہد و قناعت و ترک ماسوی اللہ اور انابت اور آپ کے مقام احسان میں پہنچنے اور آپ کی حفظ اور نصرت اور مغفرت کے وعدہ پر ہوئے ہیں، وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچتے ہیں۔ ان کے جمع کے لیے ایک بڑی کتاب چاہیے۔"[1]

یہ صرف ایک مولوی صاحب کی بات ہے۔ اسے صرف نمونہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر ہم دوسرے غیر مقلد مولویوں کے الہامات اور کشف و کرامت پر مبنی بیانات لکھنے شروع کردیں تو یقیناً ہمیں بھی یہی کہنا پڑے گا کہ انھیں بیان کرنے کے لیے علیحدہ ایک بڑی سی کتاب چاہیے۔ بہرحال ما قل و کفیٰ خیر مما کثر و الہیٰ۔ اللہ تعالیٰ اپنے زمانہ کو سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

۳۔ دیوبندی جماعت کی تخریب کاری

جب وہابیہ کی اولین جماعت، جس نے محمدی گروہ سے اہلحدیث تک کے اپنے اوپر لیبل لگائے وہ مسلمانوں میں ذرا بھی مقبولیت حاصل نہ کرسکی اور برٹش گورنمنٹ کا خواب افتراق بین المسلمین شرمندۂ تعبیر ہونے سے مجبور ہو کر رہ گیا تو حکومت نے کتاب وہابیت کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا، جو آج دیوبندیت کے نام سے متعارف اور اہل حق کے لیے مکمل دردسر کا باعث ہو کر رہ گیا ہے۔

غیر مقلد حضرات چونکہ اپنے بعض مخصوص افعال یعنی آمین بالجہر، سینے پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا، رفع یدین کرنا اور آٹھ تراویح ایک وتر وغیرہ کے باعث پہچان لیے جاتے تھے اور ایک جاہل مسلمان بھی ان کے پھندے میں نہیں پھنستا تھا۔ تو مسلمانوں نے اس

---

[1] عبدالجبار، مولوی، سوانح عمری عبداللہ غزنوی، ص ۲۰

م کی کوئی جماعت دیکھی یا سُنی تھی اور نہ یہ افعال اس طرح اُن کے مشاہدے یا علم میں آئے تھے
س لیے وہ چند سرپھرے بدعتیوں کی کوئی بات سُننا گوارا ہی نہیں کرتے تھے۔ اس رکاوٹ کو
ور کرنے کی خاطر وہابیوں کی دوسری جماعت ایسی تیار کی جو پُراسرار طریقے پر وہابیت کی نشر و اشاعت
رے۔ دیوبندی حضرات نے منافقت اور عیاری کی انتہا کرتے ہوئے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔
حضرات دعویٰ سُنّی حنفی ہونے کا کرتے ہیں، پیری مریدی تک کا ڈھونگ رچاتے ہیں لیکن
کام سارا وہابیت کا کرتے ہیں۔ یہ خوشنما لیبل محض اس غرض سے لگاتے ہیں کہ مسلمانانِ
اہلسنت وجماعت انھیں وہابی شمار نہ کریں بلکہ سُنّی حنفی جان کر برضا و رغبت ان کے جال میں
پھنستے چلے جائیں۔ جال بھی ان حضرات کے پاس ایسے خوشنما ہیں جو تابیعِ قلوب کے
سامان سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ ہیں۔ اب ان حضرات کی چند خصوصیات پیش
کی جاتی ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

اسمٰعیل پرستی

یہ جماعت بھی اہلحدیث اور دیگر وہابی حضرات کی طرح مولوی محمد اسمٰعیل
دہلوی کو منصبِ الوہیت پر فائز کیے ہوئے ہے، جو قرآنِ کریم کی
اصطلاح میں اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللہِ بنانا کہلاتا ہے۔ دیوبندی حضرات بھی قرآن و حدیث
کے مفہوم و مطالب میں تبدیلی کر لیں گے لیکن مولوی اسمٰعیل دہلوی کی کسی گندی سے گندی
بات کو غلط تسلیم کر لیں، یہ ان حضرات سے بہت بعید ہے۔ بلکہ ان حضرات کے نزدیک
دین کا اولین ماخذ رسوائے زمانہ تصنیف یعنی تقویۃ الایمان ہے۔ اس کتاب کے پیش کردہ
غیر اسلامی عقاید، غلط مسائل اور مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کی شان میں جاری کیے ہوئے بیہودہ
کلمات و مغلظات کو غلط مان لینا دیگر وہابیہ کی طرح ان حضرات کے بس سے باہر ہے۔ دیوبندی
حضرات بھی قرآن و حدیث کی کسوٹی پر تقویۃ الایمان کو پرکھنے کی ہرگز اجازت دینے کے لیے تیار
نہیں ہوتے، ہاں تقویۃ الایمانی مندرجات کی صحت ثابت کرنے کی غرض سے آیات و احادیث
کو کھینچ تان کر اس کی تائید و حمایت میں پیش کرنے کی جسارت ضرور کرتے رہتے ہیں۔ —
تقویۃ الایمان کو اسلام کا نچوڑ ثابت کرنے کی خاطر آیات و احادیث میں معنوی تحریف کرنا
دیوبندیوں کے نزدیک قطعاً جرم نہیں، گناہ نہیں، ہاں اس بات کو ضرور اپنے ساختہ دین و

مذہب سے بغاوت سمجھتے ہیں کہ تقویۃ الایمان کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور آیات و احادیث کو ماخذ بنا کر تقویۃ الایمان کی غلط باتوں کو غلط کہا جائے۔ چنانچہ جس پر ہم اسی باب میں مکمل بحث کر چکے ہیں۔ اب دیوبندی حضرات کے بانی مبانی مولوی رشید احمد گنگوہی آنجہانی کا امام الوہابیہ اور تقویۃ الایمان کے بارے میں نقطۂ نظر ملاحظہ ہو:

(۱)

سوال: وہابی کون لوگ ہیں اور عبدالوہاب نجدی کا کیا عقیدہ تھا اور کون مذہب تھا اور وہ کیسا شخص تھا اور اہل نجد کے عقاید میں اور سنی حنفیوں کے عقاید میں کیا فرق ہے؟
(مرسلہ مولوی شیخ محمد صاحب از ضلع فیروزپور پنجاب ۱۳۱۰ھ)

جواب: محمد بن عبدالوہاب کے مقتدیوں کو وہابی کہتے ہیں۔ ان کے عقاید عمدہ تھے اور مذہب ان کا حنبلی تھا۔ البتہ ان کے مزاج میں شدت تھی، مگر وہ اور ان کے مقتدی اچھے ہیں، مگر ہاں جو حد سے بڑھ گئے ان میں فساد آگیا ہے اور عقاید سب کے متحد ہیں، اعمال میں فرق حنفی شافعی مالکی حنبلی کا ہے۔ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ[1]

(۲)

سوال: وہابی مذہب یہ کون فرقہ ہے؟ مردود ہے یا مقبول؟ اور عقاید ان کے مذہب والوں کے مطابق اہلسنت والجماعت ہیں یا مخالف؟ کسی امام کی تقلید کرتے ہیں یا نہیں؟

جواب: اس وقت اور ان اطراف میں وہابی متبعِ سنت کو دیندار کو کہتے ہیں۔ باقی بندہ آپ کا دعاگو ہے، سب امور کے لیے دست بدعا ہے۔ فقط والسلام[2]

(۳)

سوال: کتاب تقویۃ الایمان کا حال دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کیسی کتاب ہے

---

[1] رشید احمد گنگوہی، مولوی: فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب، مطبع سعیدی کراچی، ص ۲۲۵
[2] ایضاً، ص ۹۶

کو اچھا سمجھنا اور اس کا درس کرنا اور اس پر عمل کرنا کیسا ہے۔ اور مولانا محمد اسحاق صاحب کو برا کہنا
اُن کو کافر و مردود بتانا اور حقیر سمجھنا کیسا ہے؟ مولوی صاحب اگر کسی کے ماں باپ نماز جماعت و وعظ سننے کو
منع کریں تو اس کو چھوڑ دے یا اُن کے کہنے کو رد کرے؟ مولوی صاحب! مجھ عاجز کے واسطے
ایسی دعا کیجیے۔ جو کر تعلیم فرمائیے جس سے کہ وسوسے دور ہوں اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں
پیدا ہو اور عشق حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصیب ہو۔ آپ سے اللہ واسطے عرض کرتا ہوں۔
والسلام۔ (مرسلہ حاجی احمد مراد آبادی)

جواب: کتاب تقویۃ الایمان نہایت عمدہ اور سچی کتاب اور موجب قوت و اصلاح
ایمان کی ہے اور قرآن و حدیث کا مطلب پورا اس میں ہے۔ اس کا مولف ایک مقبول بندہ تھا اور
مولانا محمد اسحاق دہلوی ولی کامل محدث فقیہ عمدہ مقبولین حق تعالیٰ کے تھے۔ جو کوئی ان دونوں کو کافر
جانتا ہے وہ خود شیطان ملعون حق تعالیٰ کا ہے۔ فقط۔ اور اگر کسی کا باپ یا والدہ نماز جماعت
سے منع کرے یا وعظ سننے سے کسی عالم مقبول متدین کا منع کرے تو قول والدین کا ہرگز نہ مانے
اور ان کا مصلحت کرتا رہے اور دفع وسوسہ شیطانی کے واسطے لاحول اور استغفار پڑھا کرو۔
فقط والسلام۔ رشید احمد عفی عنہ

(۴)

سوال: کیا فرماتے ہیں فقہاء و محدثین اس باب میں کہ جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب
مرحوم جو ہمراہ جناب سید احمد صاحب علیہ الرحمۃ کے شہید ہوئے تھے، اُن کو مردود کہنا اور
بے ایمان کافر کہنا درست ہے یا نہیں اور اگر نادرست ہے تو مردود اور بے ایمان کہنے والے کا
کیا حکم ہے اور تقویۃ الایمان جو ایک کتاب تصنیف مولانا مرحوم کی ہے اُس کا مطالعہ کرنا اور
پڑھنا اچھا ہے یا بُرا؟ (مرسلہ مرزا حفیظ اللہ بیگ مرحوم مراد آبادی)

جواب: مولوی محمد اسمٰعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم متقی اور بدعت کے اکھاڑنے
والے اور سنت کے جاری کرنے والے اور قرآن و حدیث پر پورا عمل کرنے والے اور خلق اللہ

ے رشید احمد گنگوہی، مولوی: فتاویٰ رشیدیہ مبوب، ص ۴۰، ۴۱

کو ہدایت کرنے والے تھے اور تمام عمر اسی حالت میں رہے آخرکار فی سبیل اللہ جہاد میں کفار کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ پس جس کا ظاہر حال ایسا ہو وہ ولی اللہ اور شہید ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے وان اولیاءہ الا المتقون اور کتاب تقویۃ الایمان نہایت عمدہ کتاب ہے، اور رد شرک و بدعت میں لاجواب ہے۔ استدلال اس کے بالکل کتاب اللہ اور احادیث سے ہیں۔ اس کا رکھنا اور پڑھنا اور عمل کرنا عین اسلام ہے اور موجب اجر کا ہے۔ اس کے رکھنے کو جو برا کہتا ہے وہ فاسق اور بدعتی ہے۔ اگر اپنے جہل سے کوئی اس کتاب کی خوبی نہ سمجھے تو اس کا قصور فہم ہے کتاب اور مؤلف کتاب کی کیا تقصیر، بڑے بڑے عالم اہل حق اس کو پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کسی گروہ نے اس کو برا کہا تو وہ خود ضال و مضل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الراجی رحمۃ ربہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ [1]

(۵)

جواب: بندہ کے نزدیک سب مسائل اس (تقویۃ الایمان) کے صحیح ہیں اگرچہ بعض مسائل میں بظاہر تشدد ہے اور توبہ کرنا ان کا بعض مسائل سے محض افترا اہل بدعت کا ہے اور ان کو بزرگ نہ جاننے، جھوٹے حالات ان کے سن کر، تو معذور ہے اور اگر کتاب کے خلاف عقیدہ رکھتا تو وہ مبتدع فاسق ہے اور وہ فرماتے تھے کہ جب تک حدیث صحیح غیر منسوخ ملے، اس پر عامل ہوں ورنہ ابو حنیفہ کی رائے کا مقلد ہوں اور سید صاحب کا بھی یہی مشرب تھا اور محمد بن عبد الوہاب کے عقاید کا مجھ کو مفصل حال معلوم نہیں اور نہ خلفاء سید صاحب کا۔ اور مولوی اسمٰعیل صاحب وعظ و رد بدعت میں مصروف رہے پھر جہاد میں جا کر شہید ہو گئے۔ سلسلہ بیعت کا کہاں جاری کرتے اور تمام تقویۃ الایمان پر عمل کرتے تھے فقط

رشید احمد گنگوہی عفی عنہ [2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان کے بارے میں دیوبندی جماعت کے

---

[1] رشید احمد گنگوہی، مولوی، فتاویٰ رشیدیہ مبوب، ص ۴۱

[2] ایضاً، ص ۴۴

...یل وسنگ بنیاد رکھنے والے مولوی رشید احمد گنگوہی کے خیالات فتاویٰ رشیدیہ سے بغیر کسی تنقید
...مرہ کے پیش کر دیے ہیں۔ طوالت کے خوف سے دیگر اکابر دیوبند کے اس بارے میں خیالات پیش
...رنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ لہٰذا ان پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

...کانِ کذب

یہ خبیث عقیدہ جو کبھی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے گھڑا اور اپنے رسالہ
یکروزی کے ذریعے مشتہر کیا تھا اور جو پوری شریعت مطہرہ کو باطل ٹھہرانے
...یلے کافی ہے، ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے اندر دفن ہو گیا تھا۔ غیر مقلد حضرات نے
...باطل نظریے سے دامن چھڑانے کی کوشش کی اور اپنی تصانیف میں اس کی جانب سے خاموشی
... اٹھاون سال بعد مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب نے اس مُردے کو دوبارہ زندہ کیا اور ہزار
...ردید کے باوجود جیتے جی اسے مرنے نہ دیا۔ شاید مولوی محمود حسن دیوبندی کے اس شعر ؎

مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا
اس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابنِ مریم

...یح مفہوم یہی ہے کہ ۱۳۰۴ھ میں براہین قاطعہ کے اندر دوبارہ یہ مسئلہ جہل قدمی کرتا ہوا نظر
...جسے اپنے شاگرد مولوی خلیل احمد انبیٹھوی کے نام سے شائع کروا دیا تھا۔ چنانچہ اس میں
...یا ہے:

"امکانِ کذب کا مسئلہ تو اب جدید کسی نے نہیں نکالا بلکہ قدما میں اختلاف ہوا ہے
کہ خلفِ وعید آیا جائز ہے کہ نہیں۔" [1]

...صفحے پر موصوف نے اسی بات کو یوں دہرایا ہے:

"امکانِ کذب کو خلفِ وعید کی فرع ہے جو قدما میں مختلف فیہ ہو چکا ہے۔" [2]

مشعلِ راہ کی جلد دوم میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس مسئلے پر مفصل بحث ہو گی، اس لیے
یہاں کسی قسم کی تنقید و تبصرہ کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ وہاں واضح کیا جائے گا کہ دیوبندی

...لیل احمد انبیٹھوی، مولوی، براہین قاطعہ، مطبوعہ دیوبند، ص ۹
ایضاً، ص ...

حضرات وقوعِ کذب تک کے قائل ہیں۔

انکارِ ختمِ نبوت

سید احمد صاحب دعوئ نبوت کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن حسرت۔
دعوے تک ہی پہنچے تھے کہ پٹھانوں کے خنجروں نے بنا بنایا کھیل بگاڑ د
ان کے بعد دارالعلوم دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی کو تیار کیا گیا۔ موصوف ۔
تحذیر الناس کتاب لکھ کر عقیدۂ ختمِ نبوت پر تیشہ زنی کی اور خاتمیت مرتبی کے نام سے تو
تیرہ صدیوں کے بعد ایک خاتمیت گھڑی جس کے سننے سے مسلمانوں کے کان نا آشنا ہے
یہ تھا دعوئ نبوت کے لیے چور دروازہ تیار کرنا لیکن عمر نے وفا نہ کی اور کتاب کے منظرِ عام
آنے کے چند سال بعد راہیِ ملکِ عدم ہو گئے اور موصوف کا کھولا ہوا دروازہ مرزا غلام احمد قا
کے کام آیا۔ اب ملاحظہ ہو کہ نانوتوی صاحب نے اس عقیدۂ ختمِ نبوت کو، جس کی تشریح
نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کے لفظوں میں فرمائی تھی، اسی خاتم
کو موصوف نے بے وقوفوں کا خیال اور خلافِ قرآن بتایا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

"عوام کے خیال میں تو رسول اللہ کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیائے سا
کے زمانہ کے بعد اور آپ سب میں آخری نبی ہیں، مگر اہلِ فہم پر روشن ہوگا کہ
تقدم یا تاخر زمانے میں بالذات کچھ فضیلت نہیں، پھر مقامِ مدح میں ولکن
رسول اللہ وخاتم النبیین فرمانا اس صورت میں کیونکر صحیح ہو سکتا ہے
ہاں اگر اس وصف کو اوصافِ مدح میں سے نہ کہیے اور اس مقام کو
مقامِ مدح نہ قرار دیجیے تو البتہ خاتمیت باعتبارِ تاخرِ زمانی صحیح ہو سکتی ہے۔ مگر میں
جانتا ہوں کہ اہلِ اسلام میں سے کسی کو یہ بات گوارا نہ ہوگی کہ اس میں ایک تو
خدا کی جانب نعوذ باللہ زیادہ گوئی کا وہم ہے۔ آخر اس وصف میں اور قد و قامت
و شکل و رنگ و حسب و نسب و سکونت وغیرہ اوصاف میں جن کو نبوت یا اور
فضائل میں کچھ دخل نہیں، کیا فرق ہے، جو اس کو ذکر کیا اوروں کو ذکر نہ کیا؟
دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نقصانِ قدر کا احتمال، کیونکہ اہلِ کمال
کے کمالات ذکر کیا کرتے ہیں اور ایسے ویسے لوگوں کے اس قسم کے احوال

بیان کیا کرتے ہیں۔ اعتبار نہ ہو تو تاریخوں کو دیکھ لیجیے۔ باقی بر احتمالِ مذکور یہی آخری دین تھا، اس لیے سدِ بابِ اتباعِ مدعیانِ نبوت کیا ہے جو کل جھوٹے دعویٰ کر کے خلائق کو گمراہ کریں گے، البتہ فی حد ذاتہٖ قابلِ لحاظ ہے پر جملہ ما کان محمد ابا احد من رجالکم اور جملہ ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین میں کیا تناسب تھا جو ایک کو دوسرے پر عطف کیا اور ایک کو مستدرک منہ اور دوسرے کو استدراک قرار دیا اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی بے ربطی اور بے ارتباطی خدا کے کلام معجز نظام میں متصور نہیں۔ اگر سدِ باب مذکور منظور تھا تو اس کے لیے اور بیسیوں موقع تھے۔"[1]

اس سے آگے موصوف یوں اپنے اظہارِ مدعا کی جانب پیش قدمی کرتے ہیں:

"تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ موصوف بالعرض کا قصہ موصوف بالذات پر ختم ہو جاتا ہے۔"[2]

اسی بات کو نانوتوی صاحب نے دوں یوں مکمل کر بیان کر دیا ہے:

"آپ موصوف بوصفِ نبوت بالذات ہیں اور سوا آپ کے اور نبی موصوف بوصفِ نبوت بالعرض۔ اوروں کی نبوت آپ کا فیض ہے پر آپ کی نبوت کسی اور کا فیض نہیں، آپ پر سلسلۂ نبوت مختتم ہو جاتا ہے۔"[3]

اب اس بات کو بالذات و بالعرض سے علیحدہ ہو کر خاتمیتِ مرتبی و خاتمیتِ زمانی کی اصطلاحوں میں دیکھیے اور نانوتوی صاحب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ موصوف نے کہا ہے:

"ہاں اگر بطور اطلاق یا عمومِ مجاز اس خاتمیت کو زمانی اور مرتبی سے عام لیجیے تو پھر دونوں طرح کا ختم مراد ہوگا پر ایک مراد ہو تو شایانِ شانِ محمدی صلعم خاتمیتِ مرتبی ہے نہ زمانی۔"[4]

---

[1] محمد قاسم نانوتوی، مولوی، تحذیر الناس، مطبوعہ لاہور، ص ۳ [2] ایضاً، ص ۴

[3] ایضاً، ص ۴ [4] ایضاً، ص ۹

اور موصوف کی زبانی اُن کی گھڑی ہوئی خاتمیت مرتبی کا فائدہ بھی سن لیجئے۔ اُنھوں نے کہا ہے:

"غرض اختتام اگر بایں معنی تجویز کیا جاتے جو میں نے عرض کیا تو آپ کا خاتم ہونا انبیاء گزشتہ ہی کی نسبت خاص نہ ہوگا بلکہ اگر بالفرض آپ کے زمانے میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو جب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے۔" [1]

خاتمیت مرتبی کا نانوتوی صاحب نے دوسرا فائدہ یہ بتایا ہے:

"ہاں اگر خاتمیت بمعنی اتصاف ذاتی بوصف نبوت لیجیے جیسا کہ اس ہیچمدان نے عرض کیا ہے تو پھر سوا رسول اللہ صلعم اور کسی کو افراد مقصود بالخلق میں سے مماثل نبوی صلعم نہیں کہہ سکتے بلکہ اس صورت میں فقط انبیاء کی افراد خارجی ہی پر آپ کی افضلیت ثابت نہ ہوگی افراد مقدرہ پر بھی آپ کی افضلیت ثابت ہو جائے گی بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلعم بھی کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔ چہ جائیکہ آپ کے معاصر کسی اور زمین میں یا فرض کیجیے اسی زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے۔" [2]

اگر کوئی کہے کہ اللہ و رسول نے تو خاتمیت سے مراد خاتمیت زمانی بتائی تھی۔ اُمت محمدیہ نے یہی سمجھی اور کہنے والوں کو تیرہ سو سال تک سمجھائی تھی۔ نانوتوی صاحب! آپ اُس خاتمیت زمانی کا تو انکار بلکہ بیخ کنی کر رہے ہیں اور اس کی جگہ ایک خانہ ساز خاتمیت پیش کر رہے ہیں جس کو خاتمیت مرتبی کا نام دیا ہے۔ کیا یہ بزرگوں کی توہین نہیں کہ اُنھیں ایسے ضروری عقیدہ سے جاہل ٹھہرایا جا رہا ہے ورنہ بصورتِ دیگر آپ دین میں ایک نیا عقیدہ پوری اُمتِ محمدیہ کے خلاف داخل کر کے مداخلت فی الدین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں نانوتوی صاحب کا جواب ملاحظہ ہو:

"باقی رہی یہ بات کہ بڑوں کی تاویل کو نہ ماننے تو اُن کی تحقیر نعوذ باللہ لازم آئیگی،

---

[1] محمد قاسم نانوتوی، مولوی: تحذیر الناس، ص ۱۵

[2] ایضاً، ص ۳۲

پرانھیں لوگوں کے خیال میں آسکتی ہے جو بڑوں کی بات فقط از راہِ بے ادبی نہیں
مانا کرتے۔ ایسے لوگ اگر ایسا کہیں تو بجا ہے۔ المرء یقیس علی نفسہ۔
انبیاء وغیرہ نہیں۔ نقصانِ شان اور چیز ہے اور خطا و نسیان اور چیز۔ اگر بوجہ
کم التفاتی بڑوں کا فہم کسی مضمون تک نہ پہنچا تو اُن کی شان میں کیا نقصان آگیا؟
اور کسی طفلِ ناداں نے کوئی ٹھکانے کی بات کہہ دی تو کیا اتنی بات سے وہ عظیم الشان
ہوگیا ہے

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں
بغلط بر ہدف زند تیرے [1]

ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ بانیِ دار العلوم دیوبند ہی نے عقیدۂ ختمِ نبوت پر تیشہ زنی کی لیکن
دیوبندی حضرات کے نزدیک اس سے نانوتوی صاحب کی بزرگی میں بال برابر فرق نہ آیا۔ اس
شکر گزاری پر پردہ ڈالنے بلکہ بے خبر مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے کی خاطر عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ
میں علمائے دیوبند شروع ہی سے علمائے اہلسنت سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے
ہیں حالانکہ حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا جائے تو صاف نظر آنے لگے کہ؎

قائدِ مرزا انہیں کا صاحبِ تحذیر ہے

تنقیصِ رسالت کی ناقابلِ فہم جسارت

مولوی خلیل احمد انبیٹھوی نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب براہینِ قاطعہ میں
فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے محیطِ زمین کے حصولِ علم سے انکار کرتے ہوئے صاف
لکھ دیا:

الحاصل غور کرنا چاہیے کہ شیطان و ملک الموت کا حال دیکھ کر علم محیطِ زمین کا
فخرِ عالم کو خلافِ نصوصِ قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاسِ فاسدہ سے ثابت کرنا
شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے۔ شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت

---

[1] محمد قاسم نانوتوی، مولوی: تحذیر الناس، ص ۲۳

نص سے ثابت ہوئی۔ فخرِ عالم کی وسعتِ علم کی کون سی نص قطعی ہے کہ تمام نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے۔[1]

انبیٹھوی صاحب نے جب علم محیطِ زمین مخلوق میں سے شیطان و ملک الموت کے لیے تسلیم کر لیا اور وہ بھی نصوص سے، تو ثابت ہوا کہ یہ ایسا علم ہے جو مخلوق کو حاصل ہو سکتا ہے اور باری تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر مذکورہ عبارت کے بارے میں چند سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں:

۱۔ فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے محیطِ زمین کے علم کو مخصوص شرک ٹھہرانا جو خاصۂ باری تعالیٰ بھی نہیں، ایسی عبارت کا باعث شانِ رسالت سے بغض و عداوت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

۲۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وسعتِ علم پر تو قرآن و حدیث کی سیکڑوں نصوص شاہد لیکن گنگوہی و انبیٹھوی صاحبان پوچھتے ہیں کہ، کون سی نص قطعی ہے۔ کہیں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ والا معاملہ ہی تو نہیں ہے۔

۳۔ جب اس علم کا حصول فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے لیے ثابت کرنا شرک ہے تو شیطان و ملک الموت کے لیے ثابت ماننا کیونکر شرک نہ ہوا؟ کیا ان دونوں کو خدا کا شریک بنانا جائز ہے؟

۴۔ جس علم کا مخلوق کے لیے اثبات شرک ہے، وہ قرآن و حدیث نے شیطان و ملک الموت کے لیے ثابت کر کے خود شرک کی تعلیم دی یا نہیں؟

عداوت و محبت کا رنگ اپنی اپنی جگہ نرالا ہوتا ہے۔ جس طرح محبت کبھی محبوب کی خرابی سامنے نہیں آنے دیتی اسی طرح عداوت خوبیوں کو نگاہوں سے اوجھل رکھتی ہے۔ گنگوہی و انبیٹھوی صاحبان حقیقت میں سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت میں اتنے

---

[1] خلیل احمد انبیٹھوی، مولوی: براہینِ قاطعہ، ص ۵۵

پختہ کار ہو چکے تھے کہ اوّلین و آخرین کے علوم کی جامع ہستی کا علم ان صاحبان کو نہ شیطان سے برابر نظر آتا تھا، نہ ملک الموت کے برابر، بلکہ ایک اُمتی کے برابر بھی دکھائی نہیں دیتا تھا چنانچہ موصوف کے اُسی زہر آلود و ایمان سوز قلم نے یہ بھی لکھا ہوا ہے:

"ان اولیاء کو حق تعالیٰ نے کشف کر دیا کہ اُن کو یہ حضورِ علم حاصل ہو گیا۔ اگر اپنے فخرِ عالم علیہ السلام کو بھی لاکھ گونہ اس سے زیادہ عطا فرما دے ممکن ہے مگر ثبوتِ فعلی اس کا کہ عطا کیا ہے، کس نص سے ہے کہ اس پر عقیدہ کیا جائے؟"[1]

جبلِ عقل کی اس نارسائی، بخت کی تیرگی اور نورِ ایمان سے محرومی کا رونا کہاں تک رویا جائے کہ جس سرکار کے غلاموں کے لیے بذریعہ کشف اس علم کا حصول خود تسلیم کر لیا، اُسی آقا کے بارے میں اندر اور باہر کی سب آنکھیں بند ہو گئیں، قلم کی روشنائی اور زبان کی قوتِ گویائی دونوں غلاموں خادموں جیسا علم تسلیم کرنے سے جواب دے گئی اور اس پر عقیدہ قائم کرنے کے لیے ایک نص بھی نظر نہ آئی یا بینائی نے ساتھ نہ دیا بلکہ ثبوتِ فعلی کا انکار کر کے کائناتِ ارضی و سماوی کی اس سب سے بڑی بارگاہ کے عقیدت مندوں، خادموں اور غلاموں کے قلب و جگر پر خنجر چلاتے ہوئے واسطے ایسا شرک لکھ دیا جس میں ایمان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ؎

وہی انصاف سے کہہ دیں کہ ہے کس کی جگہ اچھی
بغل میں ان کی ہم، پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

اُدھر مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) سے ایک طویل سوال ہوا جس کے آخر میں سائل نے لکھا ہے: زید کا یہ استدلال اور عقیدہ و عمل کیسا ہے؟ تھانوی صاحب نے جواب میں یہ بھی لکھا:

"آپ کی ذاتِ مقدسہ پر علمِ غیب کا حکم کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہو تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کُل غیب؟ اگر بعض علومِ غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے، ایسا علمِ غیب تو زید و عمرو و بکر بلکہ ہر صبی

---

[1] خلیل احمد انبیٹھوی، مولوی: براہین قاطعہ، ص ۵۱

ومجنون بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کے لیے بھی حاصل ہے کیونکہ ہر شخص کو کسی نہ کسی ایسی بات کا علم ہوتا ہے جو دوسرے شخص سے مخفی ہے۔ تو چاہیے کہ سب کو عالم الغیب کہا جائے۔ پھر اگر زید اس کا التزام کر لے کہ ہاں میں سب کو عالم الغیب کہوں گا تو پھر علم غیب کو منجملہ کمالاتِ نبویہ شمار کیوں کیا جاتا ہے۔ جس امر میں مومن بلکہ انسان کی بھی خصوصیت نہ ہو وہ کمالاتِ نبوت سے کب ہو سکتا ہے اور التزام نہ کیا جاوے تو نبی وغیر نبی میں وجہ فرق بیان کرنا ضرور ہے اور اگر تمام علوم غیبیہ مراد ہیں، اس طرح کہ اس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اس کا بطلان دلیل نقلی وعقلی سے ثابت ہے۔[1]

اِس عبارت میں تھانوی صاحب نے علم غیب کی دو قسمیں کی ہیں (۱) بعض غیب (۲) کل غیب۔ موخر الذکر کے بارے میں موصوف نے صاف لکھ دیا کہ "اگر تمام علوم غیبیہ مراد ہیں اس طرح کہ اس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اس کا بطلان دلیل نقلی وعقلی سے ثابت ہے۔" اب باقی رہ گئی پہلی قسم یعنی بعض غیب۔ اس کے بارے میں موصوف نے بغیر کسی ہیر پھیر کے صاف لکھ دیا کہ "اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے، ایسا علم غیب تو زید وعمرو بلکہ ہر صبی ومجنون بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کے لیے بھی حاصل ہے۔" اس ناپاک عبارت میں تھانوی صاحب نے علی الاعلان کہہ دیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسا علم غیب تو زید وعمرو بلکہ بچوں، پاگلوں اور جانوروں کو بھی حاصل ہے (نعوذ باللہ من ذالک)۔ موصوف سے اس عبارت کو بدلنے اور اسلامی بنانے یا میدانِ مناظرہ میں آکر اسلامی ثابت کر دکھانے کا ہمیشہ مطالبہ رہا لیکن وہ اپنے کفریہ الفاظ کو بدلنے پر عمر بھر تیار نہ ہوئے نہ تقریر و تحریر کے میدان میں اسے اسلامی ثابت کر سکے، نہ موصوف کا کوئی حمایتی اس کفریہ عبارت کو ہرگز اسلامی ثابت کر سکتا ہے کیونکہ اس میں کسی اسلامی و ایمانی پہلو کی تاویل کے لیے گنجائش ہی نہیں ہے۔ موجودہ دیوبندی حضرات کو اللہ تعالیٰ راہ ہدایت و چشم بصیرت عطا فرمائے۔ آمین

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: حفظ الایمان، مطبوعہ تاجی پریس لاہور، ص ۱۶

دیوبندیوں کی پیرپرستی

اہلسنت کو اپنے بزرگوں سے عقیدت ہے اور ہونی چاہیے۔ یہ رشتہ اُن کی ظاہری زندگی میں جس طرح قائم رہتا ہے بعد وصال بھی اس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عقیدت مندوں کی جانب سے مزارات پر حاضری اور بزرگوں کی جانب سے نوازشات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔ بعض متعنتینِ زمانہ کے نزدیک اظہارِ عقیدت کے جملہ طریقے شرک قرار پاتے ہیں اور اپنی خانہ ساز منطق کے تحت وہابی حضرات کو مسلمانانِ اہلسنت وجماعت مشرک اور پیرپرست نظر آتے ہیں حالانکہ سُنیوں کے نزدیک بزرگانِ دین نہ خدا ہیں نہ خدائی میں حصہ دار۔ ہاں وہ خدا کے بندے ہیں لیکن اس کے تابعدار اور مقربِ بارگاہ ہیں۔ اب ہم قارئین کو دکھاتے ہیں کہ اہلسنت وجماعت کو پیرپرست بتانے والے دیوبندی حضرات خود اپنے پیروں کو کیا سمجھتے ہیں۔ مولوی رشید احمد گنگوہی کی وفات پر اُن کے مرید و خلیفہ مولوی محمود الحسن صاحب (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) نے مرثیہ کہا، جس کا ایک شعر یہ ہے:[۱]

جنید و شبلی و ثانی ابو مسعود انصاری
رشیدِ ملت و دیں، غوثِ اعظم، قطبِ ربانی

اس شعر میں مولوی محمود الحسن صاحب نے اپنے پیر مولوی رشید احمد گنگوہی کو غوثِ اعظم بھی بتایا ہے۔ مسلمان اگر حضور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غوثِ اعظم کہتے ہیں تو وہابی حضرات کے نزدیک یہ صریح شرک قرار پاتا ہے کیونکہ ان حضرات کے نزدیک صرف اللہ رب العزت ہی غوثِ اعظم ہے بلکہ دیوبندیوں کے مولوی غلام اللہ خاں صاحب (راولپنڈی) تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے غوثِ اعظم لکھ کر آگے جلّ جلالہٗ بھی رقم فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں اب وہ اپنے گھر کے غوثِ اعظم کو جلّ جلالہٗ سے یاد کریں گے یا نہیں؟ اگلا مرثیہ ملاحظہ ہو:[۲]

وہ تھے صدیق اور فاروق پھر کہیے عجب کیا ہے
شہادت نے تہجد میں قدمبوسی کی گر ٹھانی

۱؎ محمود الحسن، مولوی: مرثیہ گنگوہی، ص ۴
۲؎ ایضاً: ص ۱۱

یہاں سیدنا صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی بڑھا کر دکھا دیا۔ اسی پر بس نہیں؛ آگے چلیے۔ اگر کوئی پوچھے کہ گنگوہی صاحب کس منصب پر فائز تھے تو جواب دیا گیا ہے: ؎

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر، چھوڑ کر سب کو
چھپا چاہِ لحد میں وائے قسمت ماہِ کنعانی[1]

یعنی دیوبندی حضرات کے نزدیک گنگوہی صاحب مسیحائے زماں اور ماہِ کنعانی یعنی حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔ اگر کوئی پوچھے کہ گنگوہی صاحب کیا اعجاز میں عیسیٰ علیہ السلام کے ہی برابر تھے تو اُسے جواب دیا جا رہا ہے: ؎

مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا
اس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابنِ مریم[2]

یہاں بتا دیا کہ گنگوہی صاحب کا مرتبہ عیسیٰ علیہ السلام سے اعجاز میں بڑھ کر ہے کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو صرف مُردے ہی زندہ کر سکتے تھے لیکن گنگوہی صاحب مُردوں کو زندہ کر دینے کے ساتھ ہی زندوں کو مرنے نہیں دیا کرتے تھے۔ اسی لیے کہہ دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اگر حقیقی مسیحائی دیکھنا چاہتے ہیں تو گنگوہی صاحب کی مسیحائی کو آکر دیکھیں۔ جب گنگوہی صاحب کو عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ کر صاحبِ اعجاز بتا دیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کا مرتبہ کون سے نبی کے برابر تھا۔ اس کا یہ جواب دیا ہے: ؎

زباں پر اہلِ اہوا کی ہے کیوں اُعلُ ہُبَل شاید
اُٹھا عالم سے کوئی بانیِ اسلام کا ثانی[3]

یعنی ہوا پرست لوگ جو بتوں کی باتیں کرنے لگ گئے ہیں تو شاید یہ اسی وجہ سے ہے کہ بانیِ اسلام یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہمارے گنگوہی صاحب دنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ علاوہ بریں دیوبندی حضرات کے نزدیک مولوی رشید احمد گنگوہی بعض کمالات میں فخرِ دوعالم

---

[1] محمود الحسن، مولوی، مرثیہ گنگوہی، ص ۶ [2] ایضاً، ص ۲۲

[3] ایضاً: ص ۴

سید عرب و عجم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی بڑھ کر تھے، مثلاً نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
سے استمداد کرنا، حاجت روائی چاہنا دیوبندیوں کے نزدیک شرک ہے لیکن گنگوہی صاحب
کو خدا کا شریک ٹھہرا لینے میں اُن کے نزدیک کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ اِن کے قبلۂ حاجات تھے
چنانچہ اپنے اِس ایمانی شرک کو یُوں شیرِ مادر سمجھ کر بغیر ڈکار ہضم کیا ہوا ہے: ؎

حوائج دین و دنیا کے کہاں لے جائیں ہم یا رب
گیا وہ قبلۂ حاجاتِ روحانی و جسمانی[1]

اِس ستم ظریفی کی بھلا کوئی حد ہے کہ خدا سے ہی سوال کیا ہے کہ اب ہم اپنی دین و دنیا کی حاجتیں
کس سے پوری کروایا کریں گے کیونکہ ہمارا قبلۂ حاجاتِ جسمانی و روحانی چلا گیا ہے؟ اب نہ
انھیں مخلوق میں کوئی اور قبلۂ حاجات نظر آتا ہے نہ خالق ہی سے ایسی توقع۔ لہٰذا اسی حیرانی
میں چیخ پکار مچائی جا رہی ہے۔ علاوہ بریں فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان کے
نزدیک گنگوہی صاحب کو دوسری فوقیت یہ حاصل تھی کہ: ؎

قبولیت اِسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں
عبیدِ سُود کا اِن کے لقب ہے یوسفِ ثانی[2]

اگر کسی کو عبد النبی، عبد الرسول کہو تو دیوبندی حضرات کے نزدیک شرک ہو گیا۔ سید الانبیاء
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عبد ہونا ان کے نزدیک یقینی شرک ہے لیکن گنگوہی صاحب کا عبد
ہونا قطعاً شرک نہیں کیونکہ گنگوہی صاحب کے عبیدِ سُود یعنی کالے عبد بھی یوسف علیہ السلام
کی طرح حسین و جمیل ہیں۔ تیسری خصوصیت جو دیوبندی حضرات کے نزدیک گنگوہی صاحب کو
سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے: ؎

خدا اُن کا مربّی، وہ مربّی تھے خلائق کے
مِرے مولیٰ، مِرے ہادی تھے بیشک شیخِ ربانی[3]

---

[1] محمود الحسن، مولوی: مرثیہ گنگوہی، ص ۷
[2] ایضاً، ص [illegible]
[3] ایضاً: ص ۸

مسلمانوں کا تو یہی عقیدہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہی خلائق کا مربی ہے یعنی رب العٰلمین اُسی کی ذات ہے لیکن دیوبندی حضرات بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین نہیں ہے بلکہ صرف گنگوہی صاحب کا مربی ہے اور جناب گنگوہی صاحب باقی ساری کائنات کے مربی ہیں۔

چوتھی خصوصیت یہ بتائی ہے : ؎

پھریں تھے کعبے میں بھی پوچھتے گنگوہ کا رستہ[1]
جو رکھتے اپنے سینوں میں تھے ذوق و شوق عرفانی

یعنی دیوبندی حضرات کو کعبے میں پہنچ کر بھی کوئی سرور نہیں ملتا بلکہ وہاں ایسے رہتے ہیں جیسے جیل خانے میں قیدی اور وہاں سے گنگوہ جانے کا راستہ پوچھتے رہتے ہیں۔ اگر گنگوہی صاحب کو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قسیم نہ سمجھا گیا ہوتا تو گنگوہ کے بجائے مدینہ منورہ کا راستہ پوچھتے۔

پانچویں خصوصیت یہ بتائی ہے : ؎

چھپائے جانہ فانوس کیونکر شمعِ روشن کو
تھی اُس نورِ مجسم کے کفن میں وہ ہی عریانی[2]

دیوبندی حضرات کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جسمانی لحاظ سے ہرگز نور نہیں ہیں لیکن گنگوہی صاحب نورِ مجسم یعنی سراپا نور تھے، جن کی شعاعیں کفن سے باہر بھی نکل رہی تھیں۔ یہاں آکر ایک سیدھے سادے مسلمان کی حیرت کا پیمانہ بھی چھلک اٹھتا ہے کہ جو باتیں فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے ثابت ماننا ان حضرات کے نزدیک کفر و شرک ہیں وہی باتیں گنگوہی صاحب سے منسوب ہونے پر کس طرح عینِ ایمان ہو گئیں۔ مسلمانوں کی اس حیرانی کو دور کرنے کی خاطر دیوبندیوں کے شیخ الہند صاحب نے صاف لکھ دیا : ؎

تمہاری تربتِ انور کو دے کر طور سے تشبیہ
کہوں ہوں بار بار ارنی مری دیکھی بھی نادانی[3]

---

[1] محمود الحسن دیوبندی، مرثیہ گنگوہی، ص ۹
[2] ایضاً، ص ۱۱
[3] ایضاً، ص ۱۲

گنگوہی صاحب کی قبر کو طور سے، خود کو موسیٰ علیہ السلام سے اور گنگوہی صاحب کو رب العالمین سے تشبیہ دے کر شیخ اللہ صاحب بار بار کہہ رہے ہیں ربّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ۔ یعنی اے میرے رب! تو مجھے اپنی ذات دکھا تا کہ میں تیرا دیدار کروں۔ معلوم ہوا کہ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے گنگوہی صاحب کو بایں وجہ فوقیت دی جا رہی تھی کہ مولوی محمود الحسن صاحب انہیں منصب الوہیت پر فائز کر چکے تھے۔ اب ایک دلخراش خواب ملاحظہ ہو:

حضرت گنگوہی کے بیعت ہونے سے پیشتر حضرت حاجی صاحب نے خواب دیکھا تھا، جس کی تعبیر حضرت گنگوہی کا مرید ہونا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی بھاوج آپ کے مہمانوں کا کھانا پکا رہی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی بھاوج سے فرمایا: "اُٹھ تو اس قابل نہیں ہے کہ امداد اللہ کے مہمانوں کا کھانا پکائے۔ اس کے مہمان علماء ہیں، اس کے مہمانوں کا کھانا میں پکاؤں گا۔"[1]

کیا گنگوہی صاحب کے لیے فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس لیے کھانا پکانے تشریف لائے تھے کہ گنگوہی صاحب نے سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم کو علم شیطان سے کم بتاتا تھا اور اُمتی کہلاتے ہوئے اس سرکار کے خلاف دیوبندی فرقے کے نام سے ایک مستقل محاذ قائم کرنا تھا؟ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دیوبندی حضرات اپنے گنگوہی پیر کا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو باورچی اس لیے دکھا رہے ہیں کہ کائنات میں گنگوہی صاحب کے مرتبے کی کوئی اور ہستی نظر ہی نہ آئی۔ یہی مفتی صاحب اب گنگوہیت کا ڈنکا یوں بجاتے ہیں:

حضرت قدس سرہٗ کے کمالات اور اوصاف کہاں تک بیان کیے جائیں۔ بس اس شعر پر آپ کا تذکرہ ختم کرتا ہوں:

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری[2]

---

[1] عزیز الرحمٰن شہودی، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، ص ۱۱۲
[2] ایضاً: ص ۱۳۹

بھی یہ کمالات انفرادی طور پر انبیائے کرام کو ملے تھے اُن سارے کمالات کی جامع سرکار گنگوہیت مآب مولوی رشید احمد صاحب کی ذات ہے۔ اب مولوی محمد یعقوب صاحب کا مقام ملاحظہ فرمائیے:

"جس زمانہ میں ملکہ کی تاجپوشی کا جلسہ ہوا، اُس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب دلّی میں تھے اور اکثر غائب رہا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کہاں غائب رہتے ہیں؟ فرمایا: مجھے حکم ہوا ہے کہ دلّی میں جس جس جگہ تمہارا قدم جائے گا اُس جگہ کو آباد کریں گے۔ اس لیے شہر اور حوالی شہر میں گشت کیا کرتا ہوں تاکہ ویران مقامات آباد ہو جائیں۔" [1]

یہ مولوی رفیع الدین صاحب دیوبندی اور اُن کے بھائیوں کا مقام ملاحظہ ہو۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"مشہور ہے کہ رات کو اکثر لوگوں نے آپ (شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی) کی قبر سے قرآن شریف پڑھنے کی آواز سنی ہے۔ آپ کے چار بھائی اور تھے۔ محمد صابر، بلند بخت، مقصود علی، سید احمد۔ تینوں مؤخر الذکر حضرات معرکہ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ ان تینوں حضرات کے بارے میں مشہور ہے کہ مولانا فرید الدین صاحب (اپنے والد) کے انتقال کے وقت اُن کے جنازہ میں شریک تھے اور بعد تدفین کے غائب ہو گئے۔" [2]

مصنف تذکرہ مشائخ دیوبند کے اُستاد اور مدرسہ دیوبند کے مدرس کی زبانی مولوی محمود حسن دیوبندی کے بارے میں یہ عجیب و غریب افسانہ تراشا گیا اور نانوتوی صاحب اس کے مصدق بن گئے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:

"جب میں بچہ تھا اور حضرت (مولوی محمود حسن صاحب) کے زنان خانے میں آتا جاتا تھا تو ایک دن میں نے حضرت کے کمرہ کے کواڑوں کے جھروکوں سے

---

[1] عزیز الرحمٰن بجنوری، مفتی، تذکرہ مشائخ دیوبند، ص ۱۰۵ [2] ایضاً، ص ۱۹۲

جا نکب کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کے جسم کے تمام اعضاء ، سر وغیرہ علیحدہ علیحدہ پڑے ہوئے ہیں ۔ میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا اور بھاگ آیا اور باہر آ کر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بیان کیا تو مولانا نے فرمایا ، خاموش ! کسی سے نہ کہنا ، کوئی فکر کی بات نہیں ہے ۔" [1]

اب براہین قاطعہ جیسی رسوائے زمانہ اور ایمان سوز کتاب کے مصنف مولوی خلیل احمد انبیٹھوی (المتوفی ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء) کی شان اُن کے تذکرہ نگار ، مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو :

"حضرت (انبیٹھوی صاحب) کے کمالات کا بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے کہ اُن کا ادراک مجھ جیسے ناکارہ کی تو کیا حقیقت ، بڑوں کو بھی مشکل تھا ۔" [2]

اب اس ادراک سے باہر کمال کی حقیقت تذکرہ نگار موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے :

"شیخ نے کہا جس وقت حضرت مسجد الحرام میں طوافِ قدوم کے لیے تشریف لائے تو احقر مولانا محب الدین صاحب کے پاس (جو کہ اعلیٰحضرت حاجی کے خلفاء میں سے اور صاحبِ کشف مشہور تھے) بیٹھا تھا ۔ مولانا اس وقت درود شریف کی کتاب کھولے اپنا ورد پڑھ رہے تھے کہ دفعۃً میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے ، اس وقت حرم میں کون آ گیا کہ دفعۃً سارا حرم انوار سے بھر گیا ۔ میں خاموش رہا کہ اتنے میں حضرات طواف سے فارغ ہو کر باب الصفا کی طرف سعی کے لیے چلے تو مولانا محب الدین صاحب کے پاس کو آئے کہ وہی جگہ مولانا کی نشست کی تھی ، مولانا کھڑے ہو گئے اور ہنس کر فرمایا : میں بھی تو کہوں آج حرم میں کون آ گیا ۔ یہ کہہ کر مصافحہ و معانقہ ہوا اور حضرت سعی کے لیے آگے بڑھ گئے ۔ مولانا محب الدین صاحب اپنی جگہ بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا : میاں ظفر !

---

[1] عزیز الرحمٰن مشہودی ، مفتی : تذکرہ مشایخ دیوبند ، ص ۲۳۴

[2] عاشق الٰہی میرٹھی ، مولوی : تذکرۃ الخلیل ، ص ۳۵۸

مولانا خلیل احمد تو نور ہی نور ہیں۔ ان میں نور کے سوا کچھ نہیں۔ پھر فرمایا کہ میں نے مولانا رشید احمد صاحب کو نہیں دیکھا اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ قطب الارشاد تھے مگر میں نے مولانا کے خلفاء کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ واقعی وہ قطب الارشاد تھے جو ایسے ایسے کامل بنا گئے۔"[1]

جس شخص نے حبیبِ پروردگار اور عالمِ علومِ اوّلین و آخرین کا شیطان سے کم علم بتایا اور جس کے کفر و ارتداد پر علمائے عرب و عجم کا اتفاق ہے، اُسے کامل بتانا، نور ہی نور ٹھہرانا، عدم کو اُس سراپائے ظلمت سے پکانا اور مولوی رشید احمد گنگوہی جیسے اللہ و رسول کے کھلے دشمن کو قطب الارشاد قرار دینا معلوم نہیں کیسی دینداری اور کہاں کی دیانت داری ہے؟ اب گنگوہی صاحب کے دوسرے خلیفہ مولوی حسین علی بچھرانوی کا ایک واقعہ خود اُن کی زبانی سُنیے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ مجھے بصورتِ معانقہ دوزخ کے پلصراط پر لے گئے ... ورأیت انه یسقط فاسکته واعصمته عن السقوط اور میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا کہ آپ گر رہے ہیں تو میں نے آپ کو تھام کر گرنے سے بچایا۔"[2]

مولوی محمد قاسم نانوتوی صاحب بھی دیوبندیوں کے نزدیک چھوٹے موٹے ولی نہیں۔ اُن کی جانب بھی بے شمار کرامتیں منسوب کی جاتی ہیں۔ موصوف کی ایک عدیم النظیر کرامت ملاحظہ ہو:

"مولانا (نانوتوی صاحب) بچوں سے ہنستے بولتے اور جلال الدین صاحبزادہ محمد یعقوب سے جو اس وقت بچے تھے، بڑی ہنسی کیا کرتے تھے۔ کبھی ٹوپی اُتار دیتے، کبھی کمر بند کھول دیتے تھے۔"[3]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الخلیل ص ۲۵۹ [2] حسین علی، مولوی: بلغۃ الحیران ص ۸
[3] اشرف علی تھانوی، مولوی: حکایاتِ اولیاء، ص ۲۱۶

دیوبندی حضرات کے نزدیک نانوتوی صاحب کا مقام انسانیت سے برتر تھا۔ چنانچہ خود لکھا ہے :

"مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے تھے کہ میں پچیس برس حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور کبھی بلا وضو نہیں گیا۔ میں نے انسانیت سے بالا درجہ اُن کا دیکھا ہے۔ وہ شخص ایک فرشتہ مقرب تھا، جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا۔" ؎۱

کیا دیوبندی حضرات دوسروں کو بھی یہ وجہ بتا سکتے ہیں کہ بارگاہِ نانوتوی صاحب میں یہ متواتر پچیس سال تک باوضو حاضر ہونے کی پابندی اُن کی شریعت کے مطابق کیسی ہے؟ نیز یہ بھی کہ فرشتے کا مقام کیا انسانیت سے بالاتر ہے؟ افسوس!

؎ راہزن خضرِ راہ کی قبا چھین کر
رہنما بن گئے دیکھتے دیکھتے

اب دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر یعنی مولوی حسین احمد کانگریسی صاحب کا وہ منصب ملاحظہ فرمایئے جس پر لوگ دیوبندی حضرات کے نزدیک فائز ہیں جبکہ موصوف کا مقصدِ حیات اور اُن کے کارناموں کا مرکزی نقطہ صرف گاندھی جیسے مشرک کی پیروی اور اُس کے ارشادات کو قرآن و حدیث کے مطابق قرار دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اُن کے بارے میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا گیا تھا:

"ایک خاص نعمت جو اللہ تعالیٰ نے آپ (مولوی حسین احمد کانگریسی صاحب) کو عطا فرمائی تھی، وہ تھی یہ کہ اِس پیکرِ عصمت کی زندگی نے سیدنا یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے جہاں تقدس و استقامت علی الحق، باطل کے مقابلے میں سینہ تان کر السجن احب الی مما یدعوننی کا نعرہ بلند کرنے کا ترکہ پایا تھا، وہیں تاویلِ احادیث کے تمام شعبے بالخصوص تعبیرِ رؤیا

۱؎ اشرف علی تھانوی، مولوی: حکایاتِ اولیاء، ص ۲۸۶

کا کمال بھی حاصل فرمایا تھا۔[1]

حضرت یوسف علیہ السلام جیسے کمالات ایک گاندھی جیسے مشرک و بت پرست کے پیروکار میں ثابت کرنے کی جرأت وہ حضرات تو کر سکتے ہیں جن کے نزدیک کفر و ایمان میں کوئی فرق نہ ہو یا آخرت کی باز پرس جن کے نزدیک ایک فرضی قصّے کہانی سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہ رکھتی ہو اور اس پر ستم ظریفی یہ گاندھوی موصوف کو معصوم قرار دیتے ہوئے اُن کے لیے سیکر عصمت کا لفظ کر دیا حالانکہ عصمت گروہ انبیاء و ملائکہ کا خاصہ ہے۔ اب قارئین کرام ذرا دیوبندی حضرات کی مُلا پرستی کا ایک المناک ڈرامہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام گویا کسی شہر میں جامع مسجد کے قریب ایک حجرہ میں تشریف فرما ہیں اور متصل ایک دُوسرے کمرے میں کتب خانہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کتب خانے سے ایک جلد کتاب اُٹھائی، جس میں دو کتابیں تھیں، ایک کتاب کے ساتھ دوسری کتاب تھی، وہ خطباتِ جمعہ کا مجموعہ تھا اس مجموعہ خطب میں وہ خطبہ نظر انور سے گزرا جو مولانا حسین احمد مدنی خطبہ جمعہ پڑھا کرتے ہیں، جامع مسجد میں بروز جمعہ مصلیوں کا مجمع بڑا ہے مصلیوں نے فقیر سے فرمائش کی کہ تم حضرت خلیل اللہ سے سفارش کرو کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام مولانا مدنی کو جمعہ پڑھانے کا ارشاد فرمائیں۔ فقیر نے جرأت کر کے عرض کیا تو حضرت خلیل علیہ السلام نے مولانا مدنی کو جمعہ پڑھانے کا حکم فرمایا۔ مولانا مدنی نے خطبہ پڑھا اور نماز جمعہ پڑھائی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مولانا مدنی کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا فرمائی۔ فقیر بھی مقتدیوں میں شامل تھا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام ضعیف العمر تھے۔ ریش مبارک سفید تھی۔[2]

یہ بات تو اپنے عرفانی ذوق، ایمانی حرارت اور عقل سلیم سے تعلق رکھتی ہے کہ ایک نبی اور وہ بھی خلیل جیسی جلیل القدر ہستی کی اقتداء کے لیے کس کے دل میں تمنائیں مچلتی ہیں اور خلیل اللہ کو نظر انداز کر کے اپنے مُلاؤں کو امام بنانے بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر کو اُن کی اقتداء پر مجبور کرنے

---

[1] شیخ الاسلام نمبر، ص ۸۰   [2] ایضاً، ص ۱۹۳

سعادت کون لوگ کیا کرتے ہیں ؟ کیا انبیائے کرام سے اِس طرح اپنے علماء کو بڑھا کر دکھانا اُنھیں بنانا مِنْ دُوْنِ اللہ بنانے کی ایک کڑی تو نہیں ہے ؟ خواب تو گھڑ لیا ، ٹانڈوی صاحب کو رسول پر بٹھا کر خود دکھا دیا لیکن اتنا خیال نہ کیا کہ اِس طرح تمام نمازیوں کے ساتھ گانڈھوی صاحب کو بھی انبیائے کرام کا گستاخ مان لیا کہ لوگوں کی یہ غلط اور غیر اسلامی خواہش دیکھ کر بھی اُنھوں نے نہیں فرمایا کہ خلیلِ خدا کا مجھے امام بنا کر کیوں اپنے ساتھ میرے بھی دین و ایمان کا بیڑہ غرق کرتے ہو ؟ یہی تو اتنا ہی کہہ دیتے کہ ہماری سعادت اِسی میں ہے کہ ہم انبیائے کرام کی اقتدا کریں۔ لیکن :

سے رہِ منزل میں سب گم ہیں مگر افسوس تو یہ ہے
امیرِ کارواں بھی ہیں اُنھیں گم کردہ راہوں میں

اب مولوی حسین احمد گانڈھوی صاحب کا یہ منصب و مقام بھی تو ملاحظہ فرمایئے :

"اب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ (مولوی حسین احمد صاحب) عالمِ نور میں رہتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں بھی نور ہے ، اُن کے داہنے نور ہے ، اُن کے بائیں نور ہے ، اُن کے چاروں طرف نور ہی نور ہے ، وہ خود نور ہو گئے ہیں" [1]

جب یہی الفاظ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کی زبان سے سرورِ کون ومکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو دیوبندی حضرات کفر وشرک کی توپوں سے دھواں دھار گولہ باری شروع کر دیتے ہیں اور اس عقیدے کو قرآن وحدیث کی تعلیمات سے سراسر بغاوت قرار دیتے ہیں لیکن وہی عقیدہ اگر سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بجائے گانڈھوی صاحب سے متعلق کر دیا جائے تو عین ایمان ہو جاتا ہے۔ اب نہ کفر وشرک رہا ، نہ قرآن وحدیث کی تعلیمات سے بغاوت رہی۔ اس ستم ظریفی کا جواب کیا ! اِسلام کو اِس طرح بازیچۂ اطفال بنانے والوں کو اللہ تعالیٰ ہی راہِ ہدایت دکھائے۔ آمین

جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مدرس مولوی سمیع الحق صاحب نے ٹانڈوی صاحب کے بارے میں اُن کے گانڈھوی منصب کے پیشِ نظر اپنے تاثرات یوں قلمبند فرمائے ہیں :

"میں کہا کرتا ہوں ، حضرت مدنی کی نظیر نہیں ہے۔ اُن جیسا جامع الصفات

---

[1] شیخ الاسلام نمبر ، ص ۱۲

تمام عالمِ اسلام میں نہیں تھا۔" [1]

نجم المدارس کلاچی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے مہتمم مولوی عبدالکریم دیوبندی نے گاندھی کے بارے میں ایسی بات کر کے اپنا مشاہدہ بنا کر سپردِ قلم کیا ہوا ہے:

"میں بارہا مکہ معظمہ گیا ہوں، اہل اللہ کے جھنڈ کے جھنڈ ہوتے ہیں، مگر میں نے حضرت مدنی کے مرتبہ کا کوئی ولی نہیں دیکھا۔" [2]

جس کوچے سے روحانیت و ولایت کا گذر بھی نہیں ہو سکتا، وہاں کے رہنے والوں کو نہ صرف زبانِ زدی سے ولی بتایا جاتا ہے بلکہ اولیاء اللہ سے بڑھا چڑھا کر دکھاتے ہیں۔ کاش یہ اہلِ قلم حضرات کبھی اتنا ہی غور فرما لیا کرتے کہ اللہ و رسول (جل جلالہٗ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے دشمنوں اور گاندھی کے پجاریوں کا بھلا ولایت سے رشتہ ناطہ کیا؟ ابھی مولوی کسی .... صاحب کا ایک بیان اور ملاحظہ فرما لیا جائے:

"حضرت رائے پوری مدظلہٗ (مولوی عبدالقادر صاحب) سے کہا گیا کہ حضرت مدنی کانگرس میں اکیلے ہیں۔ فرمایا ہم اُس اکیلے کے ساتھ ہیں۔ میں تیرہ مرتبہ حجاز گیا۔ حرمین الشریفین میں پوری دنیا کے اولیاء اللہ جمع ہوتے رہتے ہیں، میں نے کہیں بھی حضرت مدنی کی نظیر نہیں دیکھی۔" [3]

اب گاندھی صاحب کے بارے میں دیوبندی حضرات کا یہ فیصلہ بھی مدِ نظر رکھا جائے:

"مگر اب آہ میرے مسیحا! دنیا میں تو اس وقت قیامت برپا ہے۔ ہندوستان کا تو بس ایک سہارا تھا سو قیامت میں ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔" [4]

اگر اولیائے کرام بلکہ خود سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنا سہارا کہا جائے تو دیوبندی حضرات کے نزدیک یہ کفر و شرک ہے، قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف ہے فوراً تقویۃ الایمان کے ساختہ فرامین سنانے شروع کر دیئے جاتے ہیں کہ کوئی کسی کا وسیلہ

---

[1] ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۷ [2] ایضاً، ۲۲ فروری ۱۹۶۲ء
[3] ایضاً، ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۷ [4] الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص ۹۰

ارشی نہیں ہے۔ کوئی نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ نہ بالفعل ان کو کسی کام میں
ن ہے نہ اللہ کے دینے سے۔ جو انھیں خدا کے دینے سے بھی اختیار مانے وہ اور ابوجہل
رک میں برابر ہیں۔ لیکن اختیارات کی نسبت اگر دیوبندی حضرات کے دشمنوں یعنی انبیائے کرام
ولیائے عظام کے بجائے دیوبندیوں کے اپنے مولویوں ملاؤں کی طرف ہو جائے تو چاہے
اروں گنا زیادہ اختیار مانتے چلے جائیں، اب نہ کفر و شرک، نہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف۔
دو ہی عقیدہ اب عین دین و ایمان ہو جائے گا۔ کیا اب بھی کوئی شک و شبہ باقی رہتا ہے
ر اس یقین کو پوری تقویت نہیں پہنچتی کہ وہابیت حقیقت میں انبیائے کرام اور اولیائے عظام
سے بغاوت کا نام ہے اور وہابی وہی ہے جس کے دل میں انبیاء و اولیاء کی عداوت کوٹ کوٹ کر
بھری ہوئی ہوگی اگرچہ بظاہر کتنی ہی عقیدت کا اظہار کریں یا منافقانہ طور پر عشقِ رسول کا بلند بانگ
دعویٰ بھی کرتے پھریں۔ اس زندہ حقیقت کا اگر خود معائنہ کرنا ہو تو بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے
سوال کیجیے کہ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ظاہر ہے
کہ دیوبندی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والا مفتیِ اعظم و قطب الارشاد کہلانے والے سے
لے کر ایک جاہلِ مطلق تک ہر وہابی یہی جواب دے گا کہ وہ ہماری ہی طرح کے بشر تھے۔
اس سوال کا جواب دینے میں انھیں قطعاً کوئی دقت نہیں اٹھانی پڑے گی، نہ کوئی جھجک یا
ندامت محسوس ہوگی، نہ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی یا الجھن کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن
حبیبِ کردگار کی جگہ اگر بات ان لوگوں کی کہی جائے جن کی وہ غیر محسوس طریقے پر رات دن پرستش
میں مصروف رہتے ہیں، جن کی بارگاہوں میں عقیدت کے سجدے لٹاتے رہتے ہیں، جن کی
بندگی سے وہ کسی وقت تائب ہونے کے لیے تیار نہیں یعنی ان کے مولویوں کے بارے
میں پوچھا جائے تو یوں بھول بھلیاں کی سیر کرنے لگ جاتے ہیں:

آپ (ٹانڈوی صاحب) کے فضائلِ علمیہ اور کمالاتِ باطنیہ کی صحیح اطلاع
یا تو خداوند قدوس ہی کو ہو سکتی ہے (یعنی صرف امکان تسلیم کیا ہے) یا
ان اولیائے کرام اور علمائے ربانیین کو ہو سکتی ہے جن کو مبداءِ فیاض نے
چشمِ بصیرت عطا فرمائی ہے، ہم جیسے کور چشم آپ کی ذاتِ قدسی صفات کو

کیا پہچان سکتے ہیں؟ [1]

دیوبندیوں سے ٹانڈوی صاحب کا منصب و مقام کیوں نہیں پہچانا جاتا تھا؟ آخر گاندھی کی آ
میں بگلے کی طرح اڑنے والے اور کانگرس کی دریوزہ گری کرنے والے مولوی صاحب کا مرتبہ
جاننے میں کون سا پہاڑ حائل تھا؟ بات دراصل یہ ہے کہ دیوبندی حضرات اپنے گھدڑ پوش
ٹانڈوی صاحب کو منصبِ الوہیت پر فائز کر چکے تھے، جیسا کہ خود لکھا ہے:

"تم نے کبھی خدا کو بھی اپنے گلی کوچوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے؟ کبھی خدا کو بھی
اُس کے عرشِ عظمت و جلال کے نیچے فانی انسانوں سے فروتنی کرتے دیکھا ہے؟
تم کبھی تصور بھی کر سکتے کہ ربُ العالمین اپنی کبریائیوں پر پردہ ڈال کے تمہارے
گھروں میں بھی آ کر رہے گا؟" [2]

اِسی کبریائی کے باعث ٹانڈوی صاحب کو بڑے ذوق و شوق سے علیم بذات الصدٗ
جیسا کہ تشہیر کی ہے۔ مسلمان اگر دیوار کے پرے والی چیز سے سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کو خبردار مانیں تو مشرک اور دیوبندی حضرات اپنے گھدڑ پوش کبریا یعنی عالی جناب
ٹانڈوی صاحب کو دلوں کے خطرات سے بھی واقف بتائیں تو عین ایمان اور ٹانڈوی صاحب
کے کامل ہونے کی دلیل۔ چنانچہ جامعہ مدنیہ لاہور کے امیر احمد میاں صاحب جو ٹانڈوی صاحب
خلیفۂ مجاز بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد مولوی احمد علی لاہوری صاحب نے
ٹانڈوی صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا۔ اُدھر سے جو جواب آیا اُسے لاہوری صاحب
اپنے لیے ذریعہ نجات قرار دے کر محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے ایسا کیوں کیا؟ دیکھ
لیجیے:

"حضرت شیخ التفسیر (مولوی احمد علی لاہوری) رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے
اپنے خط میں ایسا تاثر ظاہر نہیں کیا تھا لیکن حضرت مدنی قدس سرہٗ کامل تھے
اس لیے میری قلبی کیفیت اُن پر منعکس ہوئی کہ میں نے اگرچہ الفاظ ایسے نہیں

---

[1] شیخ الاسلام نمبر، ص ۶۷ [2] ایضاً، ص ۵۹

گئے تھے لیکن لکھتے وقت مجھ پر رقت کا عالم تھا۔ حضرت مدنی نے جواب میں میری
قلبی کیفیت کا خیال فرمایا اور یہی شیخ کا کمال ہے۔" ۱؎

مجھے کہنے دیجیے کہ قلوب پر مطلع ہونا اگر کامل ہونے کی دلیل ہے تو فخرِ دوعالم صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کی علمیت پر دیوبندی حضرات پھو بٹھانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ جتنا علم
ٹانڈوی صاحب کے لیے تسلیم و مشتہر کیا ہے کوئی دیوبندی مرتے دم تک بھی اتنا علم
اس ہستی کے لیے تسلیم نہیں کرتا جو اولین و آخرین کے علوم کی جامع ہے۔ کیا یہ حبیب پروردگار
کو ناقص ٹھہرانے، فضل و کمال سے خالی بتانے اور غلامی کے پردے میں دل کی لگی بجھانے
کا اظہار کا اندر بار نہیں ہے؟ ورنہ ٹانڈوی صاحب تو دلوں پر بھی مطلع اور سید الانبیاء دیوار
کے پس والی چیزوں سے ناواقف۔ کیا اس فیصلے میں محبت اور نفرت کے جذبات کی
کارفرمائی نہیں ہے؟ نہ ان حضرات کے پاس ایک بھی دلیل کہ ٹانڈوی صاحب قلوب پر
مطلع ہیں نہ ایسا کوئی ثبوت کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پس دیوار کی چیزوں سے
ناواقف تھے۔ بات بس اتنی ہے کہ ٹانڈوی صاحب سے عقیدت ہے تو بغیر دلیل بھی
ان کے کمالاتِ المصنوعہ مان لیے گئے اور سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
سے عداوت ہے تو دنیا و ما فیہا سے واقف ہونے کے باوجود پس دیوار سے ناواقف
ٹھہرا دیے گئے۔ قلب کی اس بیماری کا علاج سوائے اللہ رب العزت کے اور کسی کے
پاس نہیں۔ تعصب اسی مرض کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو دین و ایمان کی اس ٹی بی سے
محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔ ٹانڈوی صاحب کی شان میں کہے گئے اس شعر کے تیور بھی
قارئین کرام بغور ملاحظہ فرمائیں: ؎

آج اس مشفق، مربی، شیخ کامل کا ہے ساتھ
جس کی نظروں سے گداؤں کو شہنشاہی ملے

دیوبندی حضرات کے نزدیک فخرِ دوعالم، سید عرب و عجم تو کسی کو نفع نقصان پہنچا نہیں

۱؎ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۱۳

سکتے تھے بلکہ اپنی صاحبزادی کے کام آنے تک سے مجبور و معذور تھے لیکن ٹانڈوی صاحب یہ کمال ان کے نزدیک ضرور حاصل تھا کہ یہ پلک جھپکنے میں خاک نشینوں کو تخت نشین اور گدا کو بادشاہ بنا دیا کرتے تھے۔ کیا یہ ایک شرمناک جسارت اور دیانت و انصاف کا سرِ بازار خون نہیں کیا جا رہا ہے؟ اب مولوی حسین احمد ٹانڈوی کے عاشقِ زار اور لاہور میں دیوبند کے سابق علمبردار مولوی احمد علی لاہوری (المتوفی ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) کے بارے میں مولوی سعید احمد جالندھری لکھتے ہیں:

"میں اپنے علم و ایقان اور مطالعہ کی کسوٹی پر جب کبھی حضرت شیخ التفسیر علیہ الرحمۃ کو کس کر دیکھتا ہوں، بے ساختہ زبان سے یہ کلمہ ادا ہو جاتا ہے حضرت مولانا احمد علی یقیناً اس دور کے حسن بصری ہیں۔"[۱]

نوشہرہ چھاؤنی کے جناب احمد عبد الرحمن صدیقی نے اپنے پیر مولوی احمد علی لاہوری کو صدیقِ اکبر کے مقام پر فائز بتاتے ہوئے تصریحاً لکھا اور دیوبندی حضرات نے اسے یوں شائع کیا ہے:

"۵ دسمبر ۱۹۵۵ء سوموار کے دن بیعت کی اور واپس نوشہرہ گیا تو چند ایام کے بعد خواب میں دیکھا کہ ایک جگہ ہے اور لوگ بتلا رہے ہیں، یہ حضرت صدیق اکبر اور بقیہ صحابہ کے مکانات ہیں۔ حضرت صدیق اکبر کے مکانات کے دروازے سبز تھے۔ میں نے دستک دی۔ اندر سے ایک بچہ نکلا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ حضرت صدیق اکبر کہاں ہیں؟ تو اس نے سامنے چوبارے کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سامنے درسِ قرآن دے رہے ہیں۔ میں نے جب دیکھا تو وہ حضرت لاہوری تھے۔ اس کے بعد میں جاگ اٹھا اور اس معمہ کو نہ سمجھ سکا۔ تب سمجھ میں آیا جب حضرت کے انتقال پر علامہ اللہ صابری صاحب ہندوستان سے بسلسلۂ تعزیت تشریف لائے تو انھوں نے کہا کہ حضرت لاہوری مقامِ صدیقیت

---

[۱] خدام الدین، ۱۳ر اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۲

پر فائز تھے۔ تب مجھے اپنے خواب کی تعبیر معلوم ہوئی۔[1]

ندی حضرات جب اپنے مولویوں کے لیے کوئی مقام ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے لیے عموماً
ہے گھڑتے اور گھڑے گھڑائے خوابوں کے سہارے اپنا خیالی شیش محل تعمیر کر لیا کرتے ہیں۔
ارادہ تھا کہ اسی باب کے اندر ہم دیوبندی حضرات کے ایسے خوابوں اور ان کے متضاد
ں اور متضاد عقاید و بیانات کو دو مستقل عنوانات کے تحت ضبطِ تحریر میں لاتے لیکن ان
ں عنوانات کی وسعت کے تحت بخوفِ طوالت یہاں انھیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔
کا ارادہ ہے کہ جلد از جلد ان عنوانات پر مستقل کتابیں پیش کی جائیں گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔
یہاں تو ذکر ہے مولوی احمد علی لاہوری کا۔ مولوی مناظر حسین نظر لکھتے ہیں کہ ختمِ نبوت کی
ب کے سلسلے میں جب احمد علی صاحب اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی ملتان جیل
تھے تو قاضی صاحب نے مولوی احمد علی صاحب لاہوری کو کس رنگ روپ میں دیکھا یہ
ی مناظر صاحب کے قلم سے پوچھیے!

قاضی صاحب کہتے ہیں کہ میں اُن (لاہوری صاحب) کی کوٹھری کے پاس
سے گزرا تو یہ معلوم ہوا کہ اللہ کا نور، اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہے۔[2]

اب بھی اِس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ وہابیت اصل میں انبیاءِ کرام
لیاءِ عظام سے بغض و عناد ہی کا نام ہے۔ اگر کائناتِ ارضی و سماوی کی سب سے ممتاز
ستی اور بعد از خدا بزرگ تری کے منصب پر فائز ہونے والے محبوبِ پروردگار کے لیے
کا نور کہے تو وہابیوں کا مفتیِ اعظم سے جاہلِ مطلق تک یہ پکا یقین رکھتا ہے کہ ایسا کہنے والے
نے کفر کیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدائے وحدہٗ لاشریک کا شریک ٹھہرا دیا۔ لیکن
ں بات پر کفر و شرک کا فتویٰ جڑنے والے قلم کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہونے پاتی کہ
پنے مولویوں اور مُلّاؤں کے لیے اللہ کا نور لکھ دیا جاتا ہے۔ آخر یہ دھاندلی ایک روز رنگ
ئے گی۔ اِنَّ مَوْعِدَكُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ۔

---

[1] خدام الدین، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۲، ۳، ۴، ۶
[2] خدام الدین، ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۸

دیوبندی حضرات کے نزدیک مولوی عبدالقادر رائے پوری (المتوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء)
بڑے ولی کامل اور صاحب کشف و کرامت بزرگ ہو گزرے ہیں۔ موصوف کے خلیفہ
مولوی جمیل احمد میواتی نے اپنے پیر کے علیم بذات الصدور ہونے کے بارے
تحریر کیا ہے:

"شام کا وقت تھا۔ مہمان چونکہ ابھی تھوڑے ہی تھے لہٰذا پڑھے لکھے ہیں
حضرت اقدس کے ساتھ ہی کھانا کھانے کی سعادت ملی۔ درمیان میں حضرت
اقدس تکیہ سے ٹیک لگائے چار زانو بیٹھے ہوئے کھانا نوش فرما رہے تھے۔
دائیں بائیں دو قطاروں میں مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ بائیں قطار کے سب
سے آخر میں، میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت کو چار زانوں بیٹھے ہوئے دیکھ کر
میرے دل میں خیال آیا کہ بھائی! ہم نے تو سنا تھا کہ یہ بہت بڑے بزرگ ہیں
مگر کھانا تو اُن میں طریقوں کے خلاف کھا رہے ہیں جو ہم کو جماعت میں بتائے
گئے ہیں۔ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ، ساری دنیا جن کے کمالات بزرگی
کی قائل ہے اور اُن کا لوہا مانتی ہے اور جن کی کرامتوں میں سے سب سے
بڑی کرامت یہی بھی جاتی ہے کہ ساری عمر حضرت نے اپنی کسی حرکت و سکون
سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھ میں بھی کوئی کمال ہے، وہیں سے بیٹھے بیٹھے
میرے دل میں سے گزرنے والے خطرہ کو اپنے کشف عالیہ کے ذریعے سے
معلوم کرتے ہوئے میری اصلاح کی غرض سے فرمایا: بھائی! جی تو میرا بھی
یہی چاہتا ہے کہ ویسے ہی کھاؤں لیکن میں بوڑھا ہوں اور بیماری کے سبب
معذور بھی ہو چکا ہوں۔"[1]

جب بات انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی ہو تو وہابی حضرات کا ہر قلم دین و ایمان
پر نشتر زنی کا کام کرتا چلا جاتا ہے لیکن جب اُن میں سے کسی قلم کا رُخ اپنے ملاؤں

---

[1] خدام الدین، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۵، ۱۶

ب ہوا، تو ابھی ابھی جب باتوں کو کفر و شرک قرار دیا تھا وہ عین ایمان اور قرآن و حدیث
تعلیم کے بالکل مطابق قرار پا جائیں گی۔ باطل کا ہمیشہ سے یہی خاصہ رہا ہے اور دیوبندی
حضرات کے ایسے دوغلے پن کے پیش نظر بے ساختہ کہنا پڑ جاتا ہے: ؎

اللہ رے خود ساختہ قانون کا نیرنگ

حدیث کی اصطلاح میں جسے احسان کہتے ہیں، اُسی کا نام
صاحب دیوبند کا تصوف تصوف ہے۔ غیر مقلد اور مودودی نما وہابیوں کے نزدیک
تصوف کا سارا شعبہ ہی بدعت اور شجرِ ممنوعہ ہے جبکہ دیوبندی حضرات اس کے قائل ہی نہیں
بلکہ پیری مریدی کا جال بچھا کر عوام الناس کو اپنے دامِ تزویر میں پھنساتے رہتے ہیں۔
گذشتہ عنوان کے تحت قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ دیوبندی حضرات نے شاید ہی
اپنے کسی مولوی کو چھوڑا ہو جسے منصبِ الوہیت پر فائز نہ کر سکے ہوں ورنہ رسول اللہ صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم سے فضائل و کمالات میں بڑھ چڑھ کر دکھانا تو ان حضرات کے بائیں ہاتھ کا
کھیل ہے۔ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعے سے ایک بے خبر آدمی کو یہی محسوس ہو گا
کہ دنیا میں اگر کہیں صاحب کمال پیدا ہوئے تو وہ علمائے دیوبند ہیں جبکہ اہلِ نظر پر واضح ہے
کہ حقیقت اس کے سراسر برعکس ہے۔ یہ بزرگی کے دعوے، یہ کرامتوں کے چرچے، یہ
کشف و الہام جیسے محض دنیاوی کاروبار کو چمکانے اور خود کو اہلسنّت و جماعت باور کروانے
کی خاطر اختیار کر رکھے ہیں۔ آئیے دیوبندی حضرات نے جو تصوف و رُوحانیت کا فلک بوس
شیش محل تعمیر کیا ہوا ہے، اُس کے اندر تو جھانک کر دیکھیں۔ چنانچہ حافظ ضامن صاحب
کے بارے میں مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے بروایت مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب
لکھا ہے:

"حضرت حافظ صاحب کے مزاح اور خوش مزاجی کے بہت قصے بیان فرمایا
کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا: حافظ صاحب کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔
ایک بار نہر پر شکار کھیل رہے تھے، کسی نے کہا: حضرت! ہیں۔ آپ نے
فرمایا: اس کے ماروں تیری؟" [1]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، حصہ دوم، ص ۲۷۰

یہ واقعہ حکایاتِ اولیاء، مرتبہ مولوی اشرف علی تھانوی، مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۳۳۹ پر ہے۔

اب مولوی رشید احمد گنگوہی کا ایک خواب مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی زبانی سنیئے:

"آپ (گنگوہی صاحب) ایک مرتبہ خواب بیان فرمانے لگے کہ مولوی محمد قاسم کو میں نے دیکھا کہ دلہن بنے ہوئے ہیں اور میرا نکاح اُن کے ساتھ ہوا۔ پھر خود ہی تعبیر فرمائی کہ آخر اُن کے بچوں کی کفالت کرتا ہی ہوں۔" [1]

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو خواب مولوی محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد دیکھا گیا کیا یہ نانوتوی صاحب کی زندگی میں کبھی اپنے اصلی رنگ روپ میں بھی دیکھا جاتا تھا یا نہیں؟ اس کا جواب ملاحظہ ہو:

"حضرت والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب وعم محترم مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ گنگوہ کی خانقاہ میں مجمع تھا۔ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے مرید و شاگرد سب جمع تھے اور یہ دونوں حضرات بھی وہیں مجمع میں تشریف فرما تھے کہ حضرت گنگوہی نے حضرت نانوتوی سے محبت آمیز لہجہ میں فرمایا کہ یہاں ذرا لیٹ جاؤ۔ حضرت نانوتوی کچھ شرما سے گئے مگر حضرت نے پھر فرمایا تو بہت ادب کے ساتھ چت لیٹ گئے۔ حضرت (گنگوہی صاحب) بھی اسی چارپائی پر لیٹ گئے اور مولانا کی طرف کو کروٹ لے کر اپنا ہاتھ اُن کے سینے پر رکھ دیا جیسے کوئی عاشقِ صادق اپنے قلب کو تسکین دیا کرتا ہے۔ مولانا ہر چند فرماتے ہیں کہ میاں کیا کر رہے ہو یہ لوگ کیا کہیں گے؟ حضرت نے فرمایا۔ لوگ کہیں گے کہنے دو۔" [2]

دیوبندیوں کے نزدیک مولوی محمد قاسم نانوتوی بہت بڑے بزرگ اور حجۃ الاسلام تھے۔ موصوف کے بزرگانہ ارشادات کی ایک جھلک دیوبندی حضرات ہی کی زبانی ملاحظہ ہو:

---

[1] تذکرۃ الرشید، حصہ اول، ص ۲۳۵

[2] اشرف علی تھانوی، مولوی: حکایاتِ اولیاء، ص ۳۳۹

"والد صاحب نے فرمایا کہ ایک دفعہ چھتے کی مسجد میں مولانا فیض الحسن صاحب استنجے کے لیے لوٹا تلاش کر رہے تھے اور اتفاق سے سب لوٹوں کی ٹونٹیاں ٹوٹی ہوئی تھیں، فرمانے لگے کہ توبہ، سارے لوٹے مختون ہی ہیں۔ حضرت (نانوتوی صاحب) نے ہنس کر فرمایا، پھر آپ کو تو بڑا استنجا نہیں کرنا ہے (گویا مختون سے کیا ڈر ہے)۔" [1]

مولوی اشرف علی تھانوی دیوبندی حضرات کے نزدیک بہت بڑے بزرگ، بلکہ مجدد، بلکہ جامع المجددین تھے۔ موصوف نے اپنے بچپن کے واقعات بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ مریدوں کو بتایا:

"ایک روز ایسا ہوا کہ بھائی پیشاب کر رہے تھے، میں نے اُن کے سر پر پیشاب کرنا شروع کر دیا۔" [2]

حکیم الامت صاحب کی مہمان نوازی کا ایک بے نظیر واقعہ ملاحظہ فرمایا جائے:

"ایک صاحب تھے سیکری کے، ہماری سوتیلی والدہ کے بھائی، بہت ہی نیک اور سادہ تھے۔ والد صاحب نے اُن کو ٹھیکے کے کام پر رکھ چھوڑا تھا۔ ایک مرتبہ کسٹ سے گرمی میں بھوکے پیاسے گھر آئے اور کھانا نکال کر کھانے میں مشغول ہوئے۔ گھر کے سامنے بازار ہے، میں نے سڑک پر سے ایک کتے کا پلا چھوٹا سا پکڑ کر، گھر لا کر، اُن کی دال کی رکابی میں رکھ دیا۔ بیچارے روٹی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔" [3]

نہ صرف گھر میں اور کس قسم کی کرامتیں دکھایا کرتے تھے۔ خود اُن کی زبانی ایک واقعہ سُنیے اور اندازہ کیجیے کہ

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: حکایاتِ اولیاء، ص ۲۸۶

[2] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۳۰۶

[3] ایضاً، ص ۲۰۳

ہم لوگ والد صاحب کے پاس رہتے تھے۔ تین چار پائیاں برابر بچھی ہوئی تھیں،
والد صاحب اور ہم دونوں بھائیوں کی۔ میں نے رسّی سے کر سب کے پائے ملا کر
خوب کس کر باندھ دیئے اور لیٹ کر سو گئے۔ پھر والد صاحب بھی آکر لیٹ گئے۔
اتفاق سے بارش آئی تو والد صاحب اُٹھے اور ..... اپنی چارپائی گھسیٹی۔ اب
وہاں تینوں چارپائیاں ایک ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ بیحد خفا ہوئے اور فرمایا کہ
ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔" [1]

اب ذرا یہ ملاحظہ ہو کہ تھانوی صاحب مسجدوں میں کیسی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ موصوف نے ا
ایک ایسی کرامت اپنے مریدوں کے سامنے یوں فخریہ بیان فرمائی اور اس کی اشاعت کروائی

"ایک مرتبہ میرٹھ میں میاں الٰہی بخش صاحب مرحوم کی کوٹھی میں جو مسجد ہے میں
نے سب نمازیوں کے جوتے جمع کر کے اس کے شامیانے پر پھینک دیئے۔
نمازیوں میں غل ہوا کہ جوتے کیا ہوئے۔" [2]

موصوف بچکانہ مسجدیں بناتے اور اُن میں نماز با جماعت کا اہتمام بھی کر دیا کرتے تھے۔ ا
دیوبندیوں کے حکیم الامت صاحب کی زبانی سُنئیے کہ وہ مسجد اور امامت کیسی ہوتی تھی۔

"ایک روز سب لڑکے اور لڑکیوں کے جوتے جمع کر کے اُن کو برابر رکھا اور ایک
جوتے کو سب کے آگے رکھا، وہ گویا کہ امام تھا اور پلنگ کھڑے کر کے ان میں
پر کپڑے کی چھت بنائی، وہ مسجد قرار دی۔" [3]

تھانوی صاحب اپنی ایسی حرکتوں کے باعث اپنے خاندان اور والد مرحوم کے لیے باعث ننگ
مشہور ہو چکے تھے، چنانچہ اس امر کا انہوں نے اپنے مریدوں کے سامنے خود یوں اعتراف
کیا تھا:

"جہاں اس قسم کی کوئی بات شوخی کی ہوتی تھی۔ لوگ والد صاحب کا نام لے کر

---

[1] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۲۷۲ [2] ایضاً، ص ۲۷۳
[3] ایضاً، ۲۷۲

کہتے کہ ان سے لڑکوں کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔" [1]

بندی حضرات یہ کہہ سکتے ہیں تھانوی صاحب کی یہ نازیبا حرکات اُس وقت کی ہیں جب وہ شعور کو نہیں پہنچے تھا۔ چلیے ایسا ہی ہو گا کہ جناب مولوی صاحب کو اُس وقت اپنے مریدوں معتقدوں میں ایسی بیہودہ باتوں کے تذکرے اور اُنھیں شایع کروانے کی کیا ضرورت پیش تھی جب کہ ان کی علامگی اور دیوبندی فرقے میں اُن کے حکیم الامت اور مجدد دین و ملت ہونے کے ڈھول بجائے جا رہے تھے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ مریدوں کے سامنے ایسی نازیبا باتوں کا برسبیل تذکرہ ہی نہ کرتے۔ بہرحال اب تھانوی صاحب کی اُس دور کی تہذیب و شرافت ملاحظہ فرمایئے، جب اُن کی علامگی اور خانہ ساز بزرگی کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ناظرین کرام! علماء دیوبندیوں کے حکیم الامت اور مجددِ دین و ملت کہلانے والے کی طرزِ گفتگو اور شرافت اور مریدوں کی تربیت کا اندازہ ملاحظہ فرمائیں۔ تھانوی صاحب فرماتے ہیں:

"ایک شخص نے مجھ سے شکایت کی کہ ذکر میں جو پہلے مزہ آتا تھا، اب نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ میاں مزہ تو رنڈی میں ہوتا ہے، یہاں کیا مزہ ڈھونڈتے پھرتے ہو!" [2]

دیوبندیوں کی تہذیب و شرافت کا ایک نادر شہکار اور ملاحظہ ہو۔ مولوی لطف اللہ دیوبندی نے لکھا ہے:

"مکتب کے لڑکوں نے حافظ جی کو نکاح کی ترغیب دی کہ حافظ جی نکاح کرلو، بڑا مزہ ہے۔ حافظ جی نے کوشش کرکے نکاح کیا اور رات بھر روٹی لگا لگا کر کھائی۔ مزہ کیا خاک آتا؟ صبح کو لڑکوں پر خفا ہوتے ہوئے آئے کہ تم سب کہتے تھے کہ بڑا مزہ ہے، ہم نے روٹی لگا کر کھائی ہمیں تو نمکین معلوم ہوئی، نہ میٹھی، نہ کڑوی۔ لڑکوں نے کہا کہ حافظ جی! مارا کرتے ہیں۔ آئی شب، حافظ جی نے بیچاری کو خوب زدوکوب کیا۔ دے

---

[1] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۲۶۳

[2] الافاضات الیومیہ، جلد اول، ص ۳۰۷

مجرتا، دے جوتا، تمام محلہ جاگ اٹھا اور جمع ہو گیا اور حافظ جی کو برا بھلا کہا۔ پھر صبح آئے اور کہنے لگے کہ سسروں نے دق کر دیا۔ رات ہم نے مارا بھی کچھ مزہ نہ آیا اور رسوائی بھی ہوئی۔ تب لڑکوں نے کھول کر حقیقت بیان کی کہ مارنے سے یہ مراد ہے اب جو شب آئی تب حافظ جی کو حقیقت منکشف ہوئی۔ صبح کو جو آئے تو مونچھوں کا ایک ایک بال کھل رہا تھا اور خوشی میں بھرے ہوئے تھے۔[1]

مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کی حکیمانہ تعلیمات ملاحظہ ہوں جن کی مریدوں کو تلقین کرتے رہا کرتے تھے چنانچہ موصوف نے بغیر شرمائے ایک واقعہ اپنے مریدوں کے سامنے یوں بیان کیا جو ملفوظات کا حصہ قرار پایا،

"عوام کے عقیدہ کی بالکل ایسی حالت ہے جیسے گدھے کا عضو مخصوص، بڑھے تو بڑھتا ہی چلا جائے اور جب غائب ہو تو بالکل پتہ ہی نہیں۔ واقعی عجیب مثال ہے۔"[2]

یہ عجیب مثال ہے تو تھانوی صاحب کی زبانی ذہانت کا کمال ملاحظہ ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ
"ایک شخص کسی مکان میں اندر سے کنڈی لگا کر کسی عورت سے زنا کر رہا تھا۔ لوگوں نے دستک دی تو اب اندر سے کہتا ہے کہ میاں! یہاں جگہ کہاں ہے یہاں خود ہی آدمی پر آدمی پڑا ہے۔ دیکھ لیجیے کیسا سچا آدمی تھا۔ جھوٹ نہیں بولا۔ کیسی ذہانت کا جواب ہے۔"[3]

تعبیر یہ تو تھانوی صاحب نے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں جھوٹ نہ بولنے کی تلقین فرمائی تھی۔ اب بزرگی کے اظہار اور حقائق و معارف بیان کرنے کا طریقہ بھی جامع المجددین صاحب ہی سے معلوم کرنا چاہیے کیونکہ ان کے سوا اس شرافت سے بھلے چھوٹے کوچہ کا شناسا

---

[1] لطف اللہ، مولوی: علمائے حق، ص ۱۲

[2] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۷

[3] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۵۰۰

...ی ہوسکتا ہے۔ موصوف نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

"...نامن صاحب بولے کہ میں بالکل ننگا ہو کر بازار میں ہو کر نکلوں۔ اس طرح ایک شخص تو آگے سے میرے عضوِ تناسل کو پکڑ کر کھینچے، ساتھ میں لڑکوں کی ...ج ہو اور وہ یہ شور مچاتے جاویں، بھڑوا ہے، بھڑوا ہے اور اس وقت ...یں حقائق اور معارف بیان کروں" [1]

...تھانوی صاحب کا یہ حکیمانہ ملفوظ گرامی بھی دیوبندیوں کی تربیت کے لیے مشتہر کیا گیا ہوگا۔
...لکھا ہے:

"...قصبہ رامپور میں حضرت مولانا گنگوہی نے ایک واقعہ میں طلاق کے متعلق کوئی فتویٰ دیا تھا۔ کسی عورت نے قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اس کے خلاف یہ فتویٰ دے دیا کہ قرآن میں یہ لکھا ہے۔ حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے بیان کیا۔ فرمایا وہ کیا جانے چند دکھیں کی" [2]

...یال ہے کہ دیوبندی حضرات کے بقیۃ السلف و عمدۃ الخلف عالیجناب تھانوی صاحب کے ...ت مذکورہ بالا ہی اس جماعت کی تہذیب و شرافت اور بزرگی کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔
...ی کے پیشِ نظر، طوالت سے بچنا اور ان پر ہی اکتفا کرنا مناسب ہے، قارئینِ کرام ...ں سے ہی بخوبی محسوس کر لیا ہوگا کہ:

ہیں ستارے کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

۴۔ بانیٔ جماعتِ اسلامی کے کارنامے

یوں تو عالیجناب مودودی صاحب نے اپنی بلند قامت ہستی اور بین الاقوامی شہرت ...ت شخصیت ہونے کے باعث ملتِ اسلامیہ پر کتنے ہی مخصوص احسانات فرمائے ہیں

---

[1] ...افاضات الیومیہ، جلد ہشتم، ص ۸۲
[2] ایضاً، ص ۵۰

جو تاریخ کا ایک پُراسرار اور المناک باب بن چکے ہیں، لیکن یہ احسان اپنی جگہ پر نرالی ہی شان ہ
کہ جو ملّت پہلے ہی متعدد فرقوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے اُس پر ایک تازہ فرقے کا بوجھ
لا دیا۔ اللہ اور رسول نے فرقہ بازی سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے والوں
یا رے میں سخت وعیدیں سُنائی گئی ہیں لیکن بین الاقوامی شخصیت ہونے کے باعث جناب
مودودی صاحب نے اُن کی ذرا پروا نہ کی۔ وہابیت کا تیسرا ایڈیشن مرتب کر کے شائع ف
اور جماعتِ اسلامی کے خوشنما نام سے مسلمانوں کی فہرست میں ایک فرقہ اور شامل کر دیا۔
وہ ایسا وبال اپنے سر نہ لیتے اور اپنا زورِ قلم بکھرے ہوئے مدعیانِ اسلام کو جوڑنے اور بہک
جانے والوں کو راہِ راست پر لانے میں صرف کرتے۔ اگر راہِ راست سے انھیں چڑ تھی اور وہا
پر جان چھڑکنا اور اسی کی تبلیغ و اشاعت کرنا وہ ضروری خیال کرتے تھے اور باعث نجات گردا
تو غیر مقلدوں یا دیوبندیوں میں شامل رہتے لیکن نیا فرقہ کھڑا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ
یہ حقیقت ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے پہلے پاک و ہند میں وہابیت کا نام و
بھی نہیں تھا اور محمد بن عبد الوہاب نجدی سے پہلے روئے زمین پر اس جماعت کا کہیں
نظر نہیں آتا تھا۔ اسی طرح مولوی رشید احمد گنگوہی سے پہلے دیوبندی عقاید و نظریات
اِس نام سے کوئی جماعت نہ تھی۔ سر سید احمد خاں علی گڑھی سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھ
نیچریت کون سے درخت کا نام ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے پہلے مرزائی فرقہ، خواہ
قادیانی ہوں یا لاہوری، ہرگز نہ تھا۔ غلام احمد پرویز سے پہلے خود کو اہلِ قرآن بتانے
پرویزی ٹولہ دنیا کے جیتے پر ناپید تھا اور مودودی صاحب دی گریٹ سے پہلے کوئی فرقہ
جماعتِ اسلامی کے نام سے انسانوں میں متعارف نہیں تھا۔ مؤخر الذکر دونوں فرقوں
بانی تاحال بقیدِ حیات ہیں۔ کاش! اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو ہدایت بخشے کہ
بنانے کا جو وبال اپنے سر لیا ہے، اُس سے تائب ہو کر، راہِ ہدایت اختیار کر لیں
پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ
عمل کر لیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہماری ہدایت کے لیے مبعوث

سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی ہادیٔ کل اور ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ قیامت تک
آنے والوں مدعیانِ اسلام میں سے راہِ ہدایت پہ وہی شمار ہوگا جو اُس آقائے کائنات کے
سنائے ہوئے دین پر ثابت قدم رہے اور اُسے بغیر کسی قسم کی کاٹ چھانٹ نہ کرے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسلام صحابۂ کرام نے سیکھا، اُن سے تابعین نے
ان سے تبع تابعین نے، غرضیکہ اسی طرح ہر نئی نسل اپنے بزرگوں سے دین حاصل کرتی اور اُسے
اگلی نسل تک پہنچاتی رہی۔ قیامت تک اسی طرح دین جاری رہے گا۔ اِس حقیقت کی روشنی میں
قارئین کرام غور تو فرمائیں کہ جو جماعتیں اور فرقے کل یا پرسوں کی پیداوار ہیں اگر اُن میں سے کسی کی
حقانیت کا ڈھول پیٹا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حقانیت اُنھیں بطورِ میراث ملی ہے یا
ان پر نازل ہوئی ہے؟ دونوں میں سے ہر شق محتاجِ ثبوت ہے۔ جن کی جماعتوں کا ماضی میں وجود
ہی نہیں اُنھیں کسی کی میراث ملتی؟ رہا نزول کا معاملہ تو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
کے دین کا منسوخ ہونا اور کسی فردِ دوسرے پر برحق دین کے نازل ہونے کا اب سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ بدلے ہوئے حالات دینِ مصطفیٰ کے دشمنوں اور ملتِ اسلامیہ کے بدخواہوں نے یہ راستہ
اختیار کیا کہ سید الانبیاء سے دین کی میراث پانے والوں کو غلط اور اہلِ باطل قرار دیا، اُن کی
بعض کوتاہیوں اور کمزوریوں کو سامنے رکھ کر اصلاح کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے، جب بعض
بھولے بھالے مسلمان اُن کی اصلاحی سرگرمی سے متاثر ہو کر ہمنوا بنے تو اپنا رنگ یوں دکھانا
شروع کیا کہ مقدس شجرِ اسلام میں بعض خود ساختہ عقاید و نظریات کے پیوند لگا کر نیا اور تازہ
بتازہ دین پیش کرنے لگ گئے۔ علمائے ملت جب اُن خود ساختہ ایجادات پر گرفت کرتے تو
اپنا اصلاحی رنگ سامنے کر کے مسلمانوں کو ورغلاتے کہ دیکھیے یہی لوگ ہیں جو فلاں فلاں غلطیاں
اور کوتاہیوں کے مرتکب ہیں اور اصلاح سے کس درجہ کاٹتے اور دشمنی رکھتے ہیں۔ گمراہ گروں کا
یہی وہ طریقہ ہے جس کے باعث ہر تخریب کار اور فرقہ ساز اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتا
رہا ہے۔ اِس حقیقت کو خود جناب مودودی صاحب نے یوں بیان کیا ہے۔

"یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ برائی کی کھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے
عموماً اُسے جال میں پھانسنے کے لیے ہر داعیٔ شر کو خیرخواہ کے بھیس ہی

میں آتا پڑتا ہے۔" [1]

مودودی صاحب کا خدا

خالقِ کائنات جل جلالہٗ ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ لیکن مودودی صاحب کا خدا شاید ایسے امور و صفات کو معلقات گرداننا ہے کہ ان سے بچنا چنداں ضروری نہیں سمجھتا۔ چنانچہ عالی جناب مودودی صاحب نے سورۂ بقرہ کے الفاظ اَللّٰہُ یَسْتَہْزِئُ بِہِمْ کا قلم خود ترجمہ یوں کیا ہے :

"اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے۔" [2]

سورۃ التوبہ کی آیت ۷۹ کا ترجمہ یوں کیا ہے :

"اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے۔" [3]

ہنسی مذاق عام طور پر جھگڑے فساد کی بنیاد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اچھا ہوتا اگر مودودی صاحب یہ بھی بتا دیتے کہ جب ان کا پروردگار اکثر اوقات منافقینِ مدینہ سے مذاق کرتا رہتا تھا تو کبھی ہاتھا پائی یا جوتم پیزار تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ اگر معمول میں فرق در آیا ہو تو عدالتی چارہ جوئی تک نوبت بھی پہنچی ہو۔ بہرحال اچھا ہوتا کہ بین الاقوامی محقق صاحب مذکورہ بالا امور پر بھی روشنی ڈال دیتے۔ جناب مودودی صاحب نے اپنے خدا کی شان، خود اس کی زبانی یوں بھی بیان کی ہے :

"کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں۔" [4]

"میری چال کا کوئی توڑ نہیں۔" [5]

"اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔" [6]

"یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انھیں خبر نہ تھی۔" [7]

---

[1] مودودی صاحب، مولوی، تفہیم القرآن، جلد دوم، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۹

[2] ایضاً، جلد اول، ص ۵۳ — [3] ایضاً، جلد دوم، ص ۲۱۲

[4] ایضاً، جلد دوم، ص ۶۱ — [5] ایضاً، جلد دوم، ص ۱۰۴

[6] ایضاً، جلد دوم، ص ۱۴۱ — [7] ایضاً، جلد سوم، ص ۵۹۴

لفظ جلال ذو معنی ہے۔ اس میں ناقابلِ اعتراض مفہوم بھی موجود ہے اور قابلِ اعتراض پہلو سے بدرجہا زیادہ ہے۔ مودودی صاحب جیسی بین الاقوامی شخصیت کو اپنے پروردگار کے بارے میں ایسا لفظ استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا جو زیادہ تر قابلِ اعتراض معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں کہ لفظ رَاعِنَا ہرگز ذو معنی ہے۔ اس میں کوئی قابلِ اعتراض مفہوم شامل نہیں، لیکن یہودی اپنے بغض و عناد کی آگ سے جلتے ہوئے دلوں کو کسی قدر ٹھنڈک پہنچانے کی خاطر اس لفظ سے ناجائز فائدہ اُٹھا لیا کرتے تھے یعنی بظاہر یوں معلوم ہوتا کہ وہ رَاعِنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ کہہ رہے ہیں لیکن حقیقت میں رَاعِیْنَا اور رَاعُوْنَ وغیرہ الفاظ ادا کیا کرتے تھے۔ اللہ جل مجدہ نے یہود کی شرارت کے پیشِ نظر صحابہ کرام جیسی قدسی جماعت اور عشقِ مصطفیٰ کی اُن مُنہ بولتی تصویروں کو بھی لفظ رَاعِنَا کے استعمال سے روک دیا۔ پروردگارِ عالم نے اپنے حبیب اور برگزیدہ ترین ہستی کی شان میں وہ لفظ استعمال کرنے سے روک دیا جس میں کوئی قابلِ اعتراض معنی نہیں لیکن بدباطن اُس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر توہین و تنقیص کا پہلو پیدا کر دیتے تھے۔ کیا خدائے ذوالجلال اپنے متعلق ایسا لفظ پسند فرمائے گا، جو زیادہ تر قابلِ اعتراض معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ ناراض ہونے کی نسبت غور کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ وقار کا مسئلہ بنا کر اَڑ جانا فضول ہے کیونکہ ایمان جیسی متاعِ عزیز کا حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا ہی اصل زندگی ہے۔

انبیائے کرام پر تیر اندازی

مودودی صاحب کا قلم جب اپنے پروردگار کو نظر انداز نہیں کر سکتا تو حضرات انبیائے کرام کو اپنی تیر افگنی کا ہدف بنائے بغیر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب نے سیدنا ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت کو داغدار کرتے ہوئے یوں اپنا تحقیقی رنگ دکھایا ہے:

"بعض لوگوں نے اس میں عزم نہ پایا کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم نے اُس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا یعنی اس نے جو کچھ کیا، نافرمانی کے عزم کی بنا پر نہیں کیا، لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلّف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا

عَلَی الْعِصْیَانِ کہا جاتا نہ کہ محض لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فقدانِ عزم سے مراد اطاعتِ حکم کا فقدان ہے نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان ؛ [1]

انبیائے کرام کا معصوم ہونا ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس پر تمام مسلمانوں کا ہمیشہ اتفاق رہا ہے لیکن جن حضرات کو شیطان اپنی نیابت میں اس مقدس گروہ کے خلاف کھڑا کرتا ہے وہ اپنے ملعون قائد کی طرح علمی ساز و سامان سے لیس ہو کر محسوس یا غیر محسوس طریقے پر حفاظتِ توحید یا زورِ تحقیق کا بہانہ لے کر انبیائے کرام جیسی پاکیزہ ہستیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے بغیر نہیں چھوڑتے۔ کاش! مودودی صاحب اتنا غور فرما لیتے کہ وہ اس آیت میں لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا سے نافرمانی کے عزم کا فقدان اس مجبوری کے تحت مراد نہیں لے سکے کہ اس آیت کے الفاظ لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا عَلَی الْعِصْیَانِ نہیں ہیں تو انہیں فقدانِ عزم سے اطاعتِ حکم کا فقدان مراد لینے کیلئے کیا انہیں اس آیت میں عَلَی الطاعۃ بھی لکھا ہوا نظر آ گیا ہے؟ مودودی صاحب! اگر اس آیت میں علی العصیان نہیں ہے تو علی الطاعۃ بھی نہیں ہے۔ اس صورت میں غور طلب یہ امر ہے کہ انبیائے کرام کی عصمت پر یقین رکھنے والا آخر لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا سے نافرمانی کے عزم کا فقدان مراد لے سکتا ہے اور ایک مسلمان کی روح بھی اس بات کے تصور تک سے کانپنے لگے گی کہ وہ انبیائے کرام جیسی مقدس ترین ہستیوں میں اطاعتِ حکم کا فقدان بتائے اور ایسی بات کی تشہیر سے تو اس کا ہر بُنِ مُو اِبا کرے گا۔ آگے ملاحظہ ہو کہ یہی انا قرامی مفکر صاحب نے اپنی تحقیق کے دریا بہاتے ہوئے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی عظمت کو کس طرح داغدار کرنے اور مسلمانوں کے دلوں سے عصمتِ انبیاء کے عقیدے کو نکال دینے کی کوشش کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں :

"اس سلسلے میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب حضرت ابراہیم

---

[1] مودودی صاحب، مولوی، تفہیم القرآن، جلد سوم، طبع سوم ۱۹۶۹ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۳

ستارے کو دیکھ کر کہا، یہ میرا رب ہے، اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر انھیں اپنا رب کہا، تو کیا اُس وقت عارضی طور پر ہی سہی، وُہ شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طالب حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھہرتا ہے، اصل اعتبار اُن منزلوں کا نہیں ہوتا، بلکہ اصل اعتبار اُس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اُس آخری مقام کا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جویائے حق کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان پر ٹھیرنا بسلسلۂ طلب و جستجو ہوتا ہے نہ کہ بصورتِ فیصلہ۔ اصلاً یہ ٹھیراؤ سوالی و استفہامی ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالب جب ان میں سے کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ ایسا ہے۔ اور تحقیق سے اُس کا جواب نفی میں پا کر وُہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وُہ ٹھیرتا رہا، وہاں وُہ عارضی طور پر کفر یا شرک میں مُبتلا رہا۔" ے

مودودی صاحب نے کتنے پیچ در پیچ حیلوں بہانوں سے زہریلی دوائی مسلمانوں کے حلق سے اُن کا خیر خواہ بن کر، اُتارنے کی کوشش کی ہے کہ واقعی ابراہیم علیہ السلام تارے چاند اور سورج کو اپنا رب کہتے رہے اور واقعی وہ کفر و شرک میں مبتلا ہوتے رہے۔ عصمت اُن کے نزدیک تک پھٹکنے سے گریز کرتی رہی، فضلِ خداوندی اُن کی دستگیری سے قاصر ہوتا رہا لیکن انھیں کفر و شرک میں مبتلا شمار نہ کیجیے کیونکہ یہ وقتی اور عارضی بات تھی۔ وہ تحری کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں، جدھر وہ جا رہے ہیں اُس سمت پر اعتبار کیجیے۔ درمیان میں سو کفر یا پانچسو شرک بھی کر لیں تو اُس کا کوئی اعتبار نہ کرنا، درمیانی کفریات و شرکیات کو کفر و شرک شمار نہ کرنا۔ مودودی صاحب کو تیر افگنی میں حیرت انگیز مہارت حاصل ہے کہ ایک ہی تیر میں بے شمار شکار کر لیتے ہیں۔ اِدھر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر

ے مودودی صاحب، مولوی، تفہیم القرآن جلد اوّل طبع ہفتم ۱۹۹۸ء، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵۸۔

پیغمبر اور اللہ جل شانہٗ کے خلیل کی عظمت و عصمت کو اس درجہ داغدار کرنے کی کوشش کی گرا ہیں کا فر و مشرک تک بنا کر رکھ دیا، دوسری جانب ہزاروں کافروں، مشرکوں اور گمراہوں بدمذہبوں کو برأت کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ جب اُن پر گرفت کی جائے تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہماری درمیانی منزلیں ہیں ان کا کیوں اعتبار کرتے ہو، اعتبار ہماری اُس سمت کا کرو جدھر ہمارا منہ ہے یا ہماری آخری منزل کا اعتبار کرنا معلوم نہیں مودودی صاحب نے پورے دین اور اس کے جملہ احکامات کو یکسر معطل اور حرفِ غلط کی طرح بیکار ٹھہرانے کی یہ جسارت کس خوشی میں فرمائی ہے، ستم بالائے ستم تو یہ کہ حبیبِ پروردگار، خلاصۂ کائنات، سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا،

"نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضور کے ذہن میں یہ تصور تک نہ آیا تھا کہ آپ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے یا ملنی چاہیے، بلکہ آپ سرے سے کتبِ آسمانی اور ان کے مضامین سے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اسی طرح آپ کو اللہ پر ایمان تو ضرور حاصل تھا، مگر آپ شعوری طور پر اس تفصیل سے واقف نہ تھے کہ انسان کو اللہ کے متعلق کیا کیا باتیں ماننی چاہئیں اور نہ آپ کو یہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کتبِ الٰہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفارِ مکہ سے بھی چھپی ہوئی نہ تھیں۔ مکہ معظمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضور کی زبان سے کتابِ الٰہی کا کوئی ذکر سنا ہو یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہو کہ لوگوں کو فلاں فلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے۔" [۱]

جہاں تک کفارِ مکہ کا ایسی بات کے سننے سے محروم رہنے کا تعلق ہے تو یہ بات درست ہے لیکن فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اعلانِ نبوت سے پہلے جاہلِ محض ہونے کا حکم صادر کرنے

---

[۱] مودودی صاحب، مولوی: تفہیم القرآن، جلد چہارم، طبع سوم ۱۹۷۰ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۹۸

سے پہلے کاش! مودودی صاحب کا بیباک قلم ٹوٹ گیا ہوتا۔ کاش! مودودی صاحب اپنے اس سراسر غیر اسلامی عقیدے پر نظرِ ثانی کر کے حیاتِ مستعار کے ان آخری لمحات میں ایمان جیسی متاعِ عزیز کو حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کر لیں۔ جملہ انبیائے کرام کے بارے میں مودودی صاحب کے قلم نے یوں اپنا زورِ تحقیق دکھایا ہے :

"عصمت دراصل انبیاء کے لوازمِ ذات سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لیے بھی ان سے منفک ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں، خدا نہیں۔" [1]

معلوم نہیں جناب مودودیت مآب کو عصمتِ انبیاء سے کیا چڑ ہے! کیا منصبِ نبوت سے انہیں کوئی خاص پرخاش ہے یا خود اس کے طلبگار تھے اور محروم رہنے کے باعث انبیائے کرام کی عصمت سے منکر ہونے اور ان ہستیوں پر کیچڑ بازی کی مشق فرمانے لگے ہیں! حفاظت تسلیم کر کے گویا انبیائے کرام کو منصبِ ولایت پر تو فائز سمجھ لیا لیکن فوراً ہی موصوف کا بیباک قلم جو شوخی پر آیا تو طرارے بھرتا ہوا سارے انبیائے کرام کو عام گنہگاروں کی صف میں کھڑا کر گیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

یہ چند عبارتیں محض اس لیے پیش کر دی ہیں کہ مودودی صاحب جیسے دین سازوں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنا کر جن حضرات نے اپنے دلوں اور دماغوں پر مسلط کر رکھا ہے وہ شاید غور و فکر کو کچھ کام میں لا سکیں اور یہ سوچنے کی توفیق پا سکیں کہ شریعتِ مطہرہ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور صحابۂ کرام کو اس کی عملی تصویریں بنا کر اللہ کے آخری

---

[1] مودودی صاحب، مودودی، تفہیمات جلد دوم، ص ۴۳

پیغمبر نے تیار کیا تھا، اُن سے تابعین نے، اُن سے تبع تابعین نے، غرضیکہ اسی طرح آج
حیت پہنچا لیکن یہ کیا ستم ہے کہ پچھلوں کا سمجھا ہوا دین بیکار ہو کر رہ گیا، چودہ سو سالہ دین
معنی غلط قرار دے دی گئی اور دین صرف مودودی صاحب کے قلم ناحق رقم کی رطب و یابس
تمام ہو گیا؛ کاش! اُن کے معتقد لوگ یہ یقین کر لیں کہ مودودی صاحب ہرگز نبی نہیں ہیں کہ
ت کی تشریح حرفِ آخر قرار پائے۔ تصریحات وہی قابلِ تسلیم ہیں جو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ
سلم اور آپ کے غلاموں یعنی ہمارے آقاؤں سے منقول ہیں، اُن کے خلاف ہر بات محض
سلاح کے نام پر فساد اور مقدس اسلام کی جگہ خانہ ساز اسلام پیش کرنے کی شرمناک سازش
ہے۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا)

صحابہ کرام پر نرالی کرم نوازی

جب مودودی صاحب نے انبیائے کرام تک کو اپنی مشقِ ستم کا نشانہ بنائے بغیر نہ چھوڑا تو صحابہ
بھلا کیسے نظر انداز کر سکتے تھے؟ صحابہ کرام جیسے مقدس گروہ جس کو اللہ تعالیٰ نے فَاِنْ
اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِہٖ فرما کر معیارِ حق قرار دیا۔ جس کو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
نے اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّہِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ کی سند کے ذریعے معیارِ حق ہونے
کی منادی کروائی، انبیائے کرام کے سوا انسانوں کے باقی ہر گروہ سے اس نرالی جماعت کو
ممتاز قرار دیا، اُسی کے بارے میں بین الاقوامی مفکر صاحب یوں اپنے تفکرات پیش
کرتے ہیں:

> "رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ
> سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی
> معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو
> اُس کو اسی درجے میں رکھے۔"[۱]

ہے اسی مقدس گروہ یعنی حضرات صحابہ کرام کے بارے میں عالی جناب مودودی صاحب

---

[۱] مودودی صاحب: دستورِ جماعتِ اسلامی، دفعہ ۶، ص ۲۴

سرایئی حکم ملاحظہ فرما لیا جائے :

"معیاری مسلمان تو دراصل اُس زمانے میں بھی وہی تھے اور اب بھی وہی ہیں
جو قرآن و حدیث کے علوم پر نظر رکھتے ہوں اور جن کے رگ و پے میں قرآن کا
علم و رنبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا نمونہ سرایت کر گیا ہو۔" [1]

[مو]دودی صاحب کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے دورِ خلافت میں ایک اندیشہ تھا
[کہ] اپنے متوقع جانشینوں کو اس کے بارے میں سمجھاتے بھی رہے۔ نتیجہ کیا برآمد ہوا! یہ
[مو]دودی صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو :

"حضرت عمرؓ کو اپنے آخر زمانے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ان کے بعد
عرب کی قبائلی عصبیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود ابھی
بالکل ختم نہیں ہو گئی تھیں) پھر نہ جاگ اٹھیں اور ان کے نتیجے میں اسلام کے اندر فتنے
برپا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے
انھوں نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے حضرت عثمانؓ کے متعلق کہا : "اگر میں ان کو
اپنا جانشین مقرر کروں تو وہ بنی ابی معیط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط
کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے
ایسا کیا تو عثمانؓ یہی کریں گے اور اگر عثمانؓ نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب
کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمانؓ کو قتل کر دیں گے۔" [2]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد واقعی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی مقرر
ہوئے۔ مقبوضین کے بین الاقوامی محقق صاحب نے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ
کے بارے میں عمال کے سلسلے میں یوں زہر افشانی کرتے ہوئے دین و دیانت کا سر بازار
خون کیا ہے :

---

[1] مودودی صاحب، تفہیمات، ج ۱، ص ۳۱۹

[2] مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، طبع نہم ۱۹۷۰ء، ص ۹۸، ۹۹

"اُن کے بعد جب حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ اِس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ اُنھوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کیے اور اُن کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو معزول کر کے اُنھوں نے کُوفے کی گورنری اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی مُعَیط کو مقرر فرمایا اور اُس کے بعد یہ منصب اپنے ایک اور عزیز سعید بن عاص کو دیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامرؓ کو اُن کی جگہ مامور کیا۔ حضرت عمروؓ بن العاص کو مصر کی گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سَرح کو مقرر کیا۔ حضرت معاویہؓ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں صرف دمشق کی ولایت پر تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اُن کی گورنری میں دمشق، حمص، فلسطین، اُردن اور لبنان کا پورا علاقہ جمع کر دیا۔ پھر اپنے ماموں زاد بھائی مروان بن الحکم کو اُنھوں نے اپنا سیکرٹری بنا لیا جس کی وجہ سے سلطنت کے پورے در و بست پر اِس کا اثر و نفوذ قایم ہو گیا۔ اِس طرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں سارے اختیارات جمع ہو گئے۔"[۱]

اِس مزعومہ طرزِ عمل پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے:

"فطری طور پر یہ بات کسی کو پسند نہ آسکتی تھی کہ سابقین اوّلین جنھوں نے اسلام کو سربلند کرنے کے لیے جانیں لڑائی تھیں اور جن کی قربانیوں ہی سے دین کو فروغ نصیب ہوا تھا، پیچھے ہٹا دیے جائیں اور اُن کی جگہ یہ لوگ اُمت کے سرخیل ہو جائیں۔"[۲]

مروان بن الحکم کے باعث خلیفۂ ثالث کی دُوسری جرم فردیوں سُنائی جاتی ہے:

---

[۱] مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، طبع پنجم، ۱۹۷۰ء، ص ۱۰۶ تا ۱۰۸

[۲] ایضاً، ص ۱۰۹

مروان کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں
آسکتی ہے کہ اس کا سیکرٹری کے منصب پر مقرر کیا جانا لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ
ہوسکتا تھا۔ لوگ حضرت عثمانؓ کے اعتماد پر یہ تو مان سکتے تھے کہ حضورؐ نے ان کی
سفارش قبول کر کے حکم کو واپسی کی اجازت دینے کا وعدہ فرما لیا تھا، اس لیے
اُسے واپس بلا لینا قابلِ اعتراض نہیں ہے، لیکن یہ مان لینا لوگوں کے لیے
سخت مشکل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسی معتوب شخص کا بیٹا اس
بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابرِ صحابہ کو چھوڑ کر اُسے خلیفہ کا سیکرٹری بنا دیا جائے
خصوصاً جبکہ اُس کا وہ معتوب باپ زندہ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعے
حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔"[1]

مذکورہ دونوں امور کے بارے میں عالی جناب مودودی صاحب کی عدالت سے خلیفۂ رسول
کے بارے میں یہ فیصلہ سنایا گیا:

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا اور غلط کام بہرحال
غلط ہے، خواہ وہ کسی نے کیا ہو۔ اُس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح
ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے اور نہ دین ہی کا
یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔"[2]

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ
عنہم کو خارجیت کا پیاک قلم کس طرح مجرم ٹھہراتا اور اُن کے جرائم کی فہرست مرتب کرتے ہوئے
انھیں باغی بتاتا، اسلام سے انحراف کرنے والے باور کراتا ہوا یوں زہر افشانی کرتا ہے:

"حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ، جسے لے کر دو طرف سے دو فریق اُٹھ کھڑے
ہوئے۔ ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور دوسری طرف حضرت

---

[1] مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، ص ۱۱۰، ۱۱۱

[2] ایضاً، ص ۱۱۶

معاویہؓ - ان دونوں فریقوں کے مرتبہ و مقام اور جلالتِ قدر کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ دونوں کی پوزیشن آئینی حیثیت سے کسی طرح درست نہیں مانی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ جاہلیت کے دور کا قبائلی نظام تو نہ تھا کہ کسی مقتول کے خون کا مطالبہ لے کر جو چاہے اور جس طرح چاہے اٹھ کھڑا ہو اور جو طریقہ چاہے اُس کو پورا کرانے کے لیے استعمال کرے۔ یہ ایک باقاعدہ حکومت تھی جس میں ہر دعوے کے لیے ایک ضابطہ اور قانون موجود تھا۔ خون کا مطالبہ لے کر اٹھنے کا حق مقتول کے وارثوں کو تھا، جو زندہ تھے اور وہیں موجود تھے۔ حکومت اگر مجرموں کو پکڑنے اور اُن پر مقدمہ چلانے میں واقعی دانستہ ہی تساہل کر رہی تھی تو بلا شبہ دوسرے لوگ اُس سے انصاف کا مطالبہ کر سکتے تھے، لیکن کسی حکومت سے انصاف کے مطالبے کا یہ کون سا طریقہ ہے اور شریعت میں کہاں اس کی نشان دہی کی جا سکتی ہے کہ آپ سرے سے اُس حکومت کو جائز حکومت ہی اُس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ آپ کے اس مطالبے کے مطابق عمل درآمد کر دے۔ حضرت علیؓ اگر جائز خلیفہ تھے ہی نہیں تو پھر اُن سے اس مطالبے کے آخر معنی کیا تھے کہ وہ مجرموں کو پکڑیں اور سزا دیں؟ کیا وہ کوئی قبائلی سردار تھے جو کسی قانونی اختیار کے بغیر جسے چاہیں پکڑ لیں اور سزا دے ڈالیں؟

اس سے بھی زیادہ غیر آئینی طریقِ کار یہ تھا کہ پہلے فریق نے بجائے اس کے کہ وہ مدینے جا کر اپنا مطالبہ پیش کرتا، جہاں ملزمین اور مقتول کے ورثاء سب موجود تھے اور عدالتی کارروائی کی جا سکتی تھی، بصرے کا رُخ کیا اور فوج جمع کر کے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی کوشش کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ ایک خون کے بجائے دس ہزار مزید خون ہوں اور مملکت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ شریعتِ الٰہی تو درکنار، دنیا کے کسی آئین و قانون کی رُو سے بھی اسے ایک جائز کارروائی نہیں مانا جا سکتا۔"[1]

---

[1] مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، ص ۱۲۴، ۱۲۵

یہ ہے مجموعہ سید المرسلین اور متعدد صحابہ کرام کے بارے میں مودودی صاحب کے قلم و رقم کی وہ شنیع غلطی جس پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کرتے بلکہ قارئین کرام کے دین و دیانت پر ان کا معاملہ چھوڑتے ہوئے محض ایسی چند عبارتوں کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔ اب سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں موصوف کی تحقیق ملاحظہ ہو:

"اس سے بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرزِ عمل دوسرے فریق یعنی حضرت معاویہؓ کا تھا جو معاویہ بن ابی سفیان کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت سے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھے، مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کیا، گورنری کی طاقت اپنے اِس مقصد کے لیے استعمال کی اور مطالبہ بھی یہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمانؓ پر مقدمہ چلا کر اُنھیں سزا دیں، بلکہ یہ کیا کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کو اُن کے حوالہ کر دیں تاکہ وُہ خود اُنھیں قتل کریں۔ یہ سب کچھ دورِ اسلام کی نظامی حکومت کے بجائے زمانۂ قبلِ اسلام کی قبائلی بدنظمی سے اشبہ ہے۔
خونِ عثمانؓ کے مطالبے کا حق اوّل تو حضرت معاویہؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ کے شرعی وارثوں کو پہنچتا تھا۔ تاہم اگر رشتہ داری کی بنا پر حضرت معاویہؓ اِس مطالبہ کے مجاز ہو بھی سکتے تھے تو اپنی ذاتی حیثیت میں نہ کہ شام کے گورنر کی حیثیت میں۔ حضرت عثمانؓ کا رشتہ جو کچھ بھی تھا، معاویہ بن ابی سفیان سے تھا، شام کی گورنری اُن کی رشتہ دار نہ تھی۔ اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرمین کو گرفتار کرنے اور اُن پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ گورنر کی حیثیت سے اُنھیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی، جس کی خلافت کو اُن کے زیرِ انتظام صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی، اُس کی اطاعت سے انکار کر دیتے اور اپنے زیرِ انتظام علاقے کی فوجی طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلے میں استعمال کرتے اور ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ کے طریقے پر یہ مطالبہ کرتے کہ قتل کے ملزموں کو عدالتی کارروائی کے بجائے مدعیٔ قصاص کے حوالہ کر دیا جائے

تاکہ وہ خود اُن سے بدلہ لے۔" [۱]

مودودی صاحب کا قلب صحابۂ کرام کی دشمنی سے اتنا لبریز ہے کہ انھوں نے روافض کو بھی ختم کر دی۔ برگزیدہ صحابی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر انھوں نے تاریخ کے دور بے سروپا واقعات کا سہارا لے کر وہ جھوٹے الزامات عاید کیے ہیں جن کی کوئی صاحب عقل و دانش مسلمان ہرگز ہرگز جسارت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سبائی رافضی ٹولے کو تقویت پہنچانے کی غرض سے انھوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے۔

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور اُن کے حکم سے اُن کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبرِ رسولؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور اُن کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبۂ جمعہ میں سبِ علی کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کر دی: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (النحل ـ ۹۰)" [۲]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مودودی صاحب نے دین و دیانت سے عاری ہو کر گھناؤنا الزام بھی عائد کیا ہے۔

---

[۱] مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، ص ۱۲۵، ۱۲۶

[۲] ایضاً، ص ۱۷۴

"مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنّتِ رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنّت کی رُو سے پُورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے اور باقی چار حصّے اُس فوج میں تقسیم ہونے چاہییں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا اُن کے لیے الگ نکال لیا جائے، پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔" [1]

مودودی صاحب کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک سنگین الزام اور پیش کیا جاتا ہے، اُنھوں نے مختلف کمزور تاریخی روایات کے سہارے عائد کیا ہے، چنانچہ موصوف لکھتے ہیں،

"حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور اُن کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُن کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا۔ ایک شخص نے دورانِ خطبہ میں اُس کو کنکر مار دیا۔ اس پر عبداللہ نے اُس شخص کو گرفتار کرایا اور اُس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رُو سے یہ ایسا جُرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کر دُوں گا، مگر میرے عُمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔ زیاد کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کے ساتھ کُوفے کا بھی گورنر مقرر کیا اور وُہ پہلی مرتبہ خطبہ دینے کے لیے کوفے کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ لوگوں نے اُس پر کنکر پھینکے۔ اُس نے فوراً مسجد کے دروازے بند کرا دیے اور کنکر پھینکنے والے تمام لوگوں کو (جن کی تعداد ۳۰ سے ۸۰ تک بیان کی جاتی ہے) گرفتار کرا کے اُسی وقت اُن کے ہاتھ کٹوا دیے۔ کوئی مقدمہ اُن پر نہ چلایا گیا۔ کسی عدالت میں وہ پیش نہ کیے گئے۔ کوئی باقاعدہ

---

[1] مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، ص ۱۷۴

قانونی شہادت ان کے خلاف پیش نہ ہوئی۔ گورنر نے محض اپنے انتظامی حکم سے اتنے لوگوں کو قطع ید کی سزا دے ڈالی جس کے لیے قطعاً کوئی شرعی جواز نہ تھا۔ مگر دربارِ خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ اس سے بڑھ کر ظالمانہ افعال بُسر بن ابی ارطاۃ نے کیے جسے حضرت معاویہؓ نے پہلے حجاز و یمن کو حضرت علیؓ کے قبضے سے نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لیے مامور کیا تھا۔ اس شخص نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبید اللہ بن عباسؓ کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ان بچوں کی ماں اس صدمے سے دیوانی ہو گئی۔ بنی کنانہ کی ایک عورت جو یہ ظلم دیکھ رہی تھی، چیخ اٹھی کہ "مردوں کو تو تم نے قتل کر دیا، اب ان بچوں کو کس لیے قتل کر رہے ہو؟ بچے تو جاہلیت میں بھی نہیں مارے جاتے تھے اے ابن ارطاۃ! جو حکومت بچوں اور بوڑھوں کے قتل اور بے رحمی و برادر کشی کے بغیر قائم نہ ہو سکتی ہو اس سے بُری کوئی حکومت نہیں۔" اس کے بعد اسی ظالم شخص کو حضرت معاویہؓ نے ہمدان پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا جو اس وقت حضرت علیؓ کے قبضے میں تھا۔ وہاں اس نے دوسری زیادتیوں کے ساتھ ایک ظلمِ عظیم یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں پکڑی گئی تھیں، انھیں لونڈیاں بنا لیا۔ حالانکہ شریعت میں اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ یہ ساری کارروائی گویا اس بات کا عملاً اعلان تھی کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے اور سیاسی معاملات میں وہ شریعت کی کسی حد کے پابند نہیں ہیں۔" [1]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک اور الزام بڑے معصومانہ انداز میں خیر خواہ اسلام و مسلمین بن کر عائد کیا ہے:

"سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی، جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا،

---

[1] مودودی صاحب: خلافت و ملوکیت، ص ۱۷۶، ۱۷۷

اِسی دَور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔[1]

ب۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعی دورِ حکومت کے بارے میں سرکارِ مودودیت مآب کا یہ فیصلہ ملاحظہ ہو:

"حضرت معاویہؓ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض کے لیے شریعت کی حدیں توڑنے کی جو ابتدا ہوئی تھی، اُن کے اپنے نامزد کردہ جانشین یزید کے عہد میں وہ بدترین نتائج تک پہنچ گئی۔"[2]

صحابۂ کرامؓ کے بارے میں جناب مودودی صاحب کا نظریہ دکھانے کی خاطر یہ چند عبارتیں بغیر کسی تبصرے کے پیش کر دی ہیں۔ اہلِ علم اور اہلِ دین و ایمان اُن کی ایسی دل آزار عبارتوں اور موصوف کے مخصوص نظریات سے پہلے ہی نالاں ہیں جس کے باعث ہمیں تبصرہ کرنے یا کسی تفصیل میں جانے کی چنداں حاجت نہیں۔

مودودی صاحب کے اسلام اور مسلمانوں پر احسانات مخصوص

قرآن و حدیث پر مہربانیاں

کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ سرِدست چند نوازشات کا تذکرہ ہی مَا قَلَّ وَ کَفٰی کے تحت کیا جا رہا ہے۔ دین کا اولین ماخذ چونکہ قرآن کریم ہے اور اس کے مفہوم و مطالب سے روشناس ہونے میں ہم اکابر کی تصریحات کے محتاج ہیں کیوں کہ صاحبِ قرآن سے صحابۂ کرام نے، اُن سے تابعین عظام نے، غرضیکہ اسی طرح اگلی نسل کے اہلِ علم پچھلی نسل کے بزرگوں سے سیکھتے اور آنے والوں کو سکھاتے آئے ہیں۔ لیکن جس نے اللہ تعالیٰ کے کلامِ معجز نظام میں معنوی تحریف کا دروازہ کھولنا ہو اُسے قرآن سیکھنے والوں کا رابطہ اکابر سے توڑنا ضروری ہو جاتا ہے ورنہ وہ اپنے مقصد میں ہرگز کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اور ہرگز اپنی ذات کو فخرِ اکابر نہیں منوا سکتا اور نہ مرجعِ خلائق بن سکتا ہے۔ مودودی صاحب کا فہم ہمیشہ دُور کی کوڑی لاتا ہے اور زیرک اتنے ہیں کہ زہر بھی ایسی میٹھی گولیوں کی شکل میں کھلا سکتے ہیں۔

---

[1] مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، ص ۱۷۷

[2] ایضاً، ص ۱۷۳

عہ   کرہو نخچیر کے دل میں بھی پیدا ذوقِ نخچیری

اندرونی زہر سے بےخبر حضرات بیرونی چاشنی پر ایسے مست ہوتے ہیں کہ اُن کی زہریلی اور
مہلک گولیاں کھانے کے لیے دیوانہ وار پھرنے لگتے ہیں۔ بزرگانِ دین جنھوں نے بالواسطہ یا
بلاواسطہ سیدالمرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسلامی تعلیمات حاصل کیں اُن سے مسلمانوں کا
رابطہ توڑنے کی مودودی صاحب یُوں تلقین فرماتے ہیں:

"قرآن اور سنت کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے
نہیں، اُن کے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہییں جو قرآن و سنت کے مغز کو
پا چکے ہوں۔"[۱]

دُوسرے مقام پر اسی بات کو بیان کرتے ہُوئے یُوں اکابر سے بغاوت کی تلقین فرمائی ہے:

"جب تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ قرآن اور سنت تک بلاواسطہ دسترس حاصل
نہ کرے گا اسلام کی رُوح کو نہ پا سکے گا، نہ اسلام میں بصیرت حاصل کر سکے گا،
وہ ہمیشہ مترجموں اور شارحوں کا محتاج رہے گا۔"[۲]

موصوف کس طرح مسلمانوں کو قرآن سکھانا چاہتے ہیں؟ اس امر کی وضاحت میں یُوں خامہ فرسائی
کی ہے:

"قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی ہے
جس نے قرآن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور
سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔"[۳]

کچھ سمجھے کہ سرکارِ مودودیت مآب کے دربار سے کیا حکم ملا؟ یہی کہ تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں
کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے، مترجموں اور شارحوں کا محتاج نہیں رہنا چاہیے، بزرگوں نے قرآن و
حدیث کے مغز کو پایا ہی نہیں تھا، وہ قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب کو بھی بغیری زندگی

---

[۱] مودودی صاحب: تنقیحات، ص ۲۰۵

[۲] ایضاً، ص [illegible]

[۳] ایضاً: ص ۲۴۲، ۲۴۳

بیٹھے تھے ، قرآن کریم کو آج حقیقت میں وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کا بنظرِ غائر مطالعہ کرے اور
اعلیٰ درجے کا پروفیسر ہی ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان مودودی صاحب کی اس تلقین پر عمل کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائے پچھلے
بزرگوں کو مودودی صاحب کی ہدایت کے مطابق ناقابلِ اعتماد گردان کر تفسیر و حدیث کے کسی
ذخیرے کو ہاتھ بھی نہ لگائے ۔ حدیث تو سرے سے اس کے ہاتھ سے گئی کہ نیا ذخیرہ ایک
دنیا میں موجود نہیں ، اگر کوئی ہو بھی تو مواد سارا پرانے ذخیروں کا ، لہٰذا وہ بھی ناقابلِ اعتماد
صرف کلامِ الٰہی باقی رہ گیا جو بغیر کسی ترجمے اور تفسیر کی مدد کے سمجھنا ہے ، مطلب اپنے ذہن سے
تشخیص کرنا ہے ۔ جو بھی عربی یا مجوس کی صورت میں زید و عمرو کے دماغوں سے برآمد ہو یہ مودودی صاحب
کے نزدیک قابلِ اعتماد اور جو بزرگانِ دین نے صاحبِ قرآن سے مفہوم و مطالب سیکھے وہ ناقابلِ یقین۔
کیا مودودی صاحب کی شریعتِ مطہرہ کے علمبرداروں سے بغاوت کرنے اور مسلمانوں کو بغاوت
پر ڈنکے کی چوٹ اُبھارنے کا کوئی جواب ہے ؟

چلیے مودودی صاحب کی تلقین کو عملی جامہ پہنانے والے کے ہاتھ میں ایک معری قرآن کریم
آ گیا ، لیکن یہ بھی تو اُن ناقابلِ اعتماد ہستیوں کی وساطت ہی سے ملا ہے ، اِس میں کوئی کمی بیشی
نہیں کی گئی ۔ دریں حالات اِس امر کا کیا ثبوت ہو گا ؟ اگر آیۂ کریمہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ
. . . . پڑھ کر سنائی جائے تو یہ آیت بھی تو اُسی مجموعۂ کلامِ الٰہی کی ہے جو ناقابلِ اعتماد حضرات کی
معرفت ملا ہے ، لہٰذا اس سے استناد تو اُسی صورت میں ہو سکے گا جب اِس مجموعہ (قرآن کریم)
کی صحت کا اُن ناقابلِ یقین ہستیوں کے علاوہ کوئی دوسرا یقینی ثبوت فراہم کر دیا جائے ، جو
اِس کی صحت پر آفتابِ نیم روز کی طرح دلالت کر رہا ہو ۔ مودودی صاحب اگر ہماری جسارت کو
معاف فرمائیں تو ہم یہ عرض کرنے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ موصوف نے جن ہستیوں
پر بے اعتمادی کا اظہار فرمایا ہے وہ اُن بزرگوں کو نظر انداز کر کے قرآن و حدیث کی صحت کا
کوئی ایک ثبوت قبر کی کوٹھری میں جانے تک بھی پیش نہ کر سکیں گے۔

ثانیاً ، مودودی صاحب نے تفہیم القرآن کیوں لکھی ؟ اِس پر قوم کا لاکھوں روپیہ کیوں
ضائع کیا جا رہا ہے ؟ تلقین تو یہ فرمائی تھی کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ براہِ راست قرآن و

سنت کا علم حاصل کرے، کسی مترجم یا شارح کا محتاج نہ بنے، اپنے ترجمہ اور تفسیر کو پڑھنے۔
مودودی صاحب مذکورہ تلقین کی روشنی میں منع کیوں نہیں فرماتے؟ منع نہ فرمانے سے تو
مترشح ہوتا ہے کہ موصوف صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُمتِ محمدیہ اپنے جلیل القدر اکابر سے را
ختم کر کے، یہ سمجھتے ہوئے مودودی صاحب کے قدموں سے لگ جائے کہ اگرچہ چودہ سو سال
میں کسی نے حقیقت میں قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب کو سمجھا ہے تو وہ ہستی صرف عالیجناب
مودودیت مآب کی ہے۔

ثالثاً: کیا ہم مودودی صاحب سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ موصوف نے جن ذخیروں
دُور رہنے کی مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے، خود زمانۂ حال کے جانباز فرقہ ساز صاحب نے
کیوں اکٹھا کیا ہوا ہے؟ ہر تصنیف کے اندر اُن سے استناد کس روشنی میں کیا جاتا ہے؟
مکرم شمار عذر بکلیہ والا معاملہ کہاں تک لائقِ تحسین و قابلِ ستائش ہے؟

رابعاً: تفسیر و حدیث کے تمام ذخائر کو ایک طرف رکھتے ہوئے مودودی صاحب
مسلمانوں کو بتا سکتے ہیں کہ کسی آیت کا حقیقی مفہوم متعین کرنے کی اُن کے پاس کسوٹی کیا ہے؟
کیا اس طرح ہر شخص آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم و مطالب وہی نہ بتاتا پھرے گا جسے اس
دماغ نے درست قرار دے دیا ہے جبکہ ایسے ہی دوسرے محقق کے نزدیک وہ بالکل غلط
ہو سکتا ہے؟ اس حالت میں یہ فیصلہ کرنا کہ دونوں میں سے کس کی بات درست ہے؟ آخر
اس کا فیصلہ کس طرح ہوگا؟ کیا اس طرح ایسا ہر شخص ایک فرقہ نہ بن جائے گا اور یہ اُمتِ محمد
میں ایک زبردست فتنے کا دروازہ تو نہیں کھولا جا رہا؟ کیا اس صورت میں ایسے تمام محققین
آپس میں دست و گریباں نہ ہوتے رہیں گے؟ کیا وہ رات دن مسلمانوں میں پھوٹ ڈلواتے
رہیں گے؟ کاش! مودودی صاحب اپنے اِن نظریات کی مضرت کو محسوس کرتے اور
ملتِ اسلامیہ کے افراد کو فتنہ باز و فتنہ ساز بننے کی دعوت نہ دیں بلکہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے
کی تلقین فرمایا کریں، جس کا تعین اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے ذریعے فرمایا گیا ہے۔

کہنے کو اُن سے کہہ رہا ہوں حالِ دل مگر
ڈر ہے کہ شانِ ناز پہ شکوہ گراں نہ ہو

فرقہ سازی

ملتِ اسلامیہ جو پہلے ہی متعدد فرقوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ ہر فرقہ اہلِ حق سے برسرِ پیکار تھا۔ اس حالت میں موصوف نے اُمتِ محمدیہ پر کرم بالائے کرم کرتے ہوئے اُمتِ محمدیہ کو جماعتِ اسلامی کے نام سے ایک تازہ فرقہ اور مرحمت فرمایا۔ اس فرقے کی معجونِ مرکب کے سارے اجزاء وہابیت ہی کے پنساری سے مشتمل ہیں لیکن اُسے مودودی صاحب نے اپنے انانیت کے ہاون میں گوندھ کر تیار کیا ہے۔ سیاسی جماعت کے طور پر یہ فرقہ منظرِ عام پہ آیا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ایک مذہبی فرقے کی شکل اختیار کر گیا۔ مودودیت زدہ حضرات کی نظر میں اپنے پیشوا عالیجناب مودودی صاحب کا مقام اتنا بلند و بالا ہے کہ ایسے حضرات ہر بزرگ پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ صحابۂ کرام کو ہدفِ تنقید بنتا ہوا خندہ پیشانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ مودودی صاحب کا قلم انبیائے کرام کی عصمت اور سید الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی عظمت کو داغدار کرتا چلا جائے تو ان کی پیشانی پر بل یا زبان پر ایک حرفِ شکایت تک نہیں آتا بلکہ مرحبا اور زندہ باد کے نعرے بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں لیکن مودودی صاحب پر اگر کوئی تنقید کرے یا کسی طرح موصوف کا نام الف کے تلے آئے تو یہ حرکت مودودی صاحب اینڈ کمپنی کے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت ہے کیونکہ مودودی صاحب کو تو انبیائے کرام جیسے مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ پر تنقید کرنے کا پرمٹ ملا ہوا ہے، وہ اس حرکتِ قبیحہ کا پیدائشی حق رکھتے ہیں لیکن کسی دوسرے کو بانیٔ جماعتِ اسلامی کی کسی کوہ ہمالیہ سے بھی وزنی غلطی کو غلطی کہنے کا حق دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ یہی تو وہ افسوسناک صورت ہے جسے قرآنِ کریم میں اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ٹھہرایا گیا ہے۔ یہی ہے جماعتِ اسلامی کے سومنات کا وہ سب سے بڑا بُت جس کی پورے اہتمام سے پوجا پاٹ کا انتظام کیا ہوا ہے۔ اس جماعت کا ہر فرد اپنے اُس چلتے پھرتے بُت کے آگے جُھکنا ہی ذریعۂ نجات جانتا اور مسلمانوں کو بھی اسی راستے پر گامزن ہونے کی دعوت دینے میں شبانہ روز مصروف رہتے ہیں۔

وہابیہ کے سابق دونوں فرقے (اہلحدیث و دیوبندی) یہی سلوک مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک راہِ ہدایت اور ذریعۂ نجات یہی ہے، جس پہ

گامزن ہونے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا اور اس صراطِ مستقیم کا تعین فرماتے ہوئے کثرت سے یوں دعا مانگنے کے لیے ارشاد فرمایا تھا، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی انعام یافتہ حضرات کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، جو انبیاء، صدیق، شہداء اور صالحین ہیں، لیکن وہابیہ کی دونوں اوّلین جماعتوں نے تو اس فرمانِ الٰہی کو یوں بدلا ہوا ہے کہ صِرَاطَ الَّذِيْ كَانَ عَلَيْهِ اِسْمٰعِيْلَ الدِّهْلَوِيْ اور جماعتِ اسلامی کے قبیلے میں اس آیت کریمہ کو عملاً یہ صورت دی ہوئی ہے کہ صِرَاطَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْمَوْدُوْدِيْ۔ اللہ تعالیٰ جملہ مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے (آمین)

وہابیہ کی اوّلین جماعت کی عبرتناک ناکامی کے بعد برٹش گورنمنٹ نے کتاب وہابیت کا دوسرا ایڈیشن دیوبندی جماعت کی صورت میں شائع کیا، یہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو گمراہ کرنے کی خاطر سُنی حنفی بن کر سامنے آئے۔ بعض غیر ضروری مسائل میں عوام الناس کو اصلاحی رنگ دیا گیا اور اس طرح اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ خاطر خواہ کامیابی یوں بھی حاصل نہ ہوئی ایک مرحلے پر انگریزی حکومت نے مولوی محمد الیاس کاندھلوی دیوبندی سے علاقہ میوات میں پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ پر تبلیغ کروائی۔ رفتہ رفتہ تبلیغی سسٹم دیوبندیت کا حصہ بن گیا۔ اب یہ جال پورے عالمِ اسلام میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ حضرات سروں پر بستر اٹھائے یا مسجدوں میں ڈیرے جمائے ہوئے عام مل جاتے ہیں۔ یہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو اپنے جال میں گرفتار کرنے، اپنا ساتھی بنا کر انہیں محمد رسول اللہ کی اُمت کے زمرے سے نکال کر محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکاروں میں شامل کرنے کی خاطر تالیفِ قلوب کے ہر ساز وسامان سے لیس ہو کر آتے ہیں۔ دراز ریش، اونچے ٹخنے، ہاتھ میں تسبیح، خاموشی کے مجسمے، زبانوں پر ذکرِ الٰہی، نگاہیں نیچی، ایک امیر کے تابع، کوئی سخت کلامی سے پیش آئے تب بھی غصہ نزدیک نہیں آنے دیتے، عقیدہ پوچھو تو ہرگز نہیں بتاتے کسی اختلافی مسئلے پر بولنا اُن کے مشن سے خارج، ابتدائی مرحلہ کلمہ اور نماز کی تلقین ہے آگے بات مسجد میں اہلسنت کو بلا کر انہیں مولوی محمد زکریا کاندھلوی دیوبندی کا تبلیغی نصاب سنانا اور اس کے بعد اپنے جال میں پھنسنے والوں سے چلّت پھرت کے لیے تین، سات، دس یا چالیس دن وقف کرنے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگانا اور خوشامد تک کرنا۔ اس عیاری کے باعث دیوبندی جماعت

گمراہ گری میں اتنی کامیابی ہوئی ہے جتنی ان کے علماء صدیوں میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔
تبلیغی سلسلے کی کامیابی کو دیکھ کر مودودی صاحب نے سیاست کا جال بچھایا، اسلامی نعرے لگائے، مسلمان لیڈروں کی بعض غلط حرکات اور کوتاہیوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ سیاسی موضوعات کے ساتھ دینی عقائد و مسائل میں کتابیں لکھ کر اپنے جال میں پھنسنے والوں کے سامنے مقابلۃً اپنا لٹریچر رکھا، ہر بڑی سے بڑی ہستی میں کیڑے دکھا کر اپنی پاکبازی کا لوہا منوایا۔ اپنوں کے ذہنوں میں بٹھا دیا کہ ہر بڑی سے بڑی ہستی کم و بیش گناہ میں ضرور ملوث ہوئی، غلطی کر گئی، لہٰذا اس پر تنقید کرنا بھی عیب نہیں بلکہ حقیقتِ نفس الامری کا اظہار ہے۔ اپنی ذات کو ہر غلطی سے مبرا اور تنقید سے بالاتر دکھایا، چنانچہ جماعتِ اسلامی کا کوئی فرد مودودی صاحب پر تنقید قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔
غرضیکہ وہابی جس رنگ میں بھی مسلمانوں کے سامنے آئے ملتِ اسلامیہ کی بدخواہی اُن کی منزلِ مقصود رہی۔ رہنمائی کے بھیس میں رہزنی ہی کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ ہر وہابی جماعت کا مشن مسلمانوں کے ہاتھوں سے اللہ کی رسّی کو چھڑانا اور انبیائے کرام اور اولیائے عظام کا گستاخ بنا کر اُن کی متاعِ ایمانی کو لوٹنا ہے۔ ان کی غایت درجہ کوشش یہی رہی ہے کہ مسلمانوں کا رُخ حرم سے پھیر کر لندن، سومنات، نجد اور واشنگٹن کی جانب پھیر دیا جائے۔ مسلمانانِ عالم کے زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب وہابیت کا ظہور ہے۔ خلافت سے لے کر ہر ملک کی اسلامی حکومت تک، جسے بھی غیر مسلم طاقتوں نے تاراج کیا، اس کی تہہ میں وہابیوں کی فتنہ سامانی اور اسلام دشمنی کارفرما ضرور رہی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ غیر مسلموں کے دست و بازو بن کر مسلمانوں کے مفادات پر کاری ضربیں لگائیں اور ملتِ اسلامیہ کے لیے مارِ آستین ثابت ہوئے۔ مسلمانوں کو اقتدار سے محروم کروانے کے بعد اُن کے خرمنِ اتحاد میں آگ لگانے میں مصروف رہے اور کبھی مسلمانوں کو متحد نہیں ہونے دیا۔ خود فتنوں کا دروازہ کھولنا اور خود اُسے بند کرنے کے لیے، مجاہد و مصلح کہلانے کی خاطر مہم چلانا ان کی تکنیک رہی ہے تاکہ بھولے بھالے مسلمان انہیں مصلح، ریفارمر اور ملتِ اسلامیہ کے ہمدرد جان کر ان کے پیچھے لگ جائیں اور اس طرح ملی وحدت کا جنازہ نکل جائے۔ دوسرے گمراہ فرقے جلد مٹ جایا کرتے تھے لیکن یہ وہابیت کا فتنہ غیر مسلم طاقتوں کی بدولت دو سو سال سے پھلتا پھولتا اور اپنی جڑیں وسیع کرتا ہی جا رہا ہے۔

مخبر صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خوارج کا یہی خاصہ بتایا تھا کہ یَقْتُلُوْنَ اَھْلَ الْاِسْلَامِ وَیَدَعُوْنَ اَھْلَ الْاَوْثَانِ۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کی شرپسندی اور فتنہ انگیزی سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین)

۵- بانیٔ نیچریت کے کارنامے

گاندھی نے ایک جانب انڈین نیشنل کانگرس بنا کر برٹش گورنمنٹ کے ہندوؤں کے بارے میں جو شکوک و شبہات تھے انھیں دور کرنا شروع کیا اور حکومت کی حمایت کا دم بھرنا کانگرسی لیڈروں کا شعار بنا دیا اور دوسری طرف ہندو قوم کے سامنے ایسے اصول رکھے کہ چند ہی سالوں میں دولت، تعلیم، خوشحالی اور ظاہری عزت ہندوؤں کے پاس جمع ہونی شروع ہو گئی۔ ہندو قوم ہر لحاظ سے اتنی مضبوط و مستحکم ہو گئی کہ وہ جب چاہتے تو حکومت وقت کی چولیں ہلا کر رکھ دیتے اور انگریز کی حکومت نہ ہوتی تو مسلمانوں کو علی الاعلان کچا چبا جاتے، کیونکہ حکومت کی مشینری کے بیشتر کل پرزے ہندو تھے۔

اس صورتِ حال کے ابتدائی تیور دیکھتے ہی برٹش گورنمنٹ کی نظرِ انتخاب نے مسلمانوں میں سر سید احمد خاں صاحب کو چن لیا۔ مسلمان قوم کو انگریزوں کے قریب لانے کی تلقین کی جائے سابقہ اور موجودہ حاکم قوموں کے درمیان جو منافرت پیدا ہو چکی تھی وہ دور ہو جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ ملتِ اسلامیہ کو غیرتِ ملی سے عاری کر کے اینگلو انڈین مسلمان بنا دیا جائے، ان کا رخ حرم سے لندن کی جانب پھیر دیا جائے نیز انگریزوں اور مسلمانوں میں "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ ہو۔ ایک انگریز اور مسلمان میں ماسوائے اس کے اور کوئی فرق نہ ہو کہ وہ خود کو عیسائی اور یہ مسلمان کہتا ہے۔ سر سید احمد خاں صاحب اسی بات پر آمادہ ہو گئے اور اُنھوں نے ایک جانب مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لانے کی کوشش شروع کر دی تو دوسری طرف اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔

اسلام ہی ایک سچا دین ہے اور اس کے علاوہ جتنے بھی مذاہب ہیں سب جھوٹے اور باطل ہیں۔ اسلام ایسا کامل اور مکمل دین ہے جس میں کسی غیر اسلامی نظریے کو شامل کرنے کی

ا گنجائش نہیں ہے۔ جھوٹے مذاہب میں سے ایک مذہب والا اگر دوسرا مذہب اختیار کرے
دوسرے مذہب کے قریب ہوجائے تو اُس کا اُسی طرح کچھ نہیں بگڑتا جس طرح ایک نجاست
دوسری ملادینے سے پلیدی میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اسلام میں باطل مذاہب کا ایک نظریہ
ل کرلینے سے وہی نتیجہ سامنے آتا ہے جو دودھ کے کسی بھرے ہوئے ٹب میں پیشاب کا ایک
و ڈالنے سے برآمد ہوتا ہے کہ سارا دودھ پلید اور ناقابلِ استعمال۔ اسی طرح کسی مسلمان کہلانے
الے کا ایک غیر اسلامی نظریہ اختیار کرلینا اُس کے اسلامی دعوے کو غلط بنادیتا ہے اور شریعت
و ایسے کسی بھی شخص کو مسلمان تسلیم کرنے کی روادار نہیں ہے۔

گاندھی اگر اپنی قوم کو انگریزوں اور عیسائیت کے قریب لے گیا تو اس سے ہندوؤں کی
ذہبی میں کیا فرق آیا؟ لیکن عیسائیت کے نزدیک جانے والے مسلمانوں کے پلے کیا رہ گیا؟
د ایمان سے ہاتھ دھونے کے بعد اگر دولت و وجاہت ہاتھ بھی آئی تو یہ دنیاوی زینت
رت میں کس کام آئے گی جبکہ ایمان جیسی متاعِ عزیز ہی گنوادی جس پر اُخروی نجات کا
ہے۔

سرسید احمد خاں صاحب نے مسلمانوں کو برٹش گورنمنٹ کے قدموں میں جھکانے کی جو کوشش
ی اُس کے بارے میں موصوف اور اُن کے حامیوں کے چند بیانات بابِ چہارم میں پیش کیے
ئیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ یہاں صرف یہ پہلو اجاگر کرنا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو عیسائیت
ے نزدیک لے جانے نیز اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹانے کی کہاں تک کوشش کی؟ ہمارے
ورہ بالا خیالات کو سرسید احمد خاں صاحب کے دستِ راست یعنی خواجہ الطاف حسین
احب حالی پانی پتی کے مندرجہ ذیل بیان کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

> "سرسید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جن دو باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ بہبودی کے لیے
> ضروری سمجھا تھا، اُن کے لیے انگلستان کا سفر کرنا ضروری تھا۔ اُن کا خیال یہ تھا
> کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں
> میں موانست اور میل جول پیدا نہ ہوگا اُس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور
> ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ گو وہ اب تک اِن دو تدبیروں

برابر سرگرم رہے مگر جس حد تک وُہ اپنا منصوبہ پُورا کرنا چاہتے تھے اُس کے لحاظ سے اِن کو ولایت کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔" [1]

ہوسکتا ہے کہ یہاں کوئی صاحب یہ فرمانے لگیں کہ مذکورہ بیان سے مغربی تعلیم کا حصول [illegible] سے میل جول کی کوشش تو ضرور ثابت ہوتی ہے لیکن اسے عیسائیت کے قریب لے جانا نہیں دیا جاسکتا۔ ایسے حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ سر سید احمد خاں صاحب نے قرآن [illegible] ایک تفسیر بھی لکھی تھی، جس میں آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم و مطالب ساری اُمت کو [illegible] ہی کچھ بتائے ہیں۔ حالی صاحب اِس تفسیر کی توصیف میں یوں رقمطراز ہیں:

"الحمدللہ اِس حق گو تفسیر کی بدولت روحانی مہلک بیماریوں کو آج غسلِ صحت [illegible] مسلمانوں کے پاک دلوں میں وُہ گندی گندی باتیں جمی ہوئی تھیں جیسے کیچے [illegible] میں بتاں۔ اب اُن کا ایک بیک دُور ہونا خدا کے مقدس کلام کی سچی تفسیر کا نتیجہ ہے [illegible] ہم اِس احسان کے بدلے اپنی کھال کی جُوتیاں بنا دیں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرے کا معاوضہ ہوگا۔" [2]

سر سید احمد خاں صاحب نے بائبل کی تفسیر بھی لکھی اور عیسائی حضرات کو اطمینان دلا [illegible] اپنا مطمحِ نظر یُوں بیان کیا:

"یقیناً میں بھی بائبل کا اُتنا ہی طرف دار اور مؤید ہوں جس قدر کہ آپ [illegible] مقصد ہے کہ میں ڈاکٹر کلنزو کے اعتراضات کا اپنی تفسیر کے مناسب مقول [illegible] میں، جب اُن کا موقع آئے، جواب دوں۔" [3]

مذکورہ تفسیر کے بارے میں خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے تاثرات یُوں سپردِ قلم کیے:

"یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے، جیسا کہ اب تک خیال تھا، واجب التعظیم بیان کرتی ہے، اور اس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے، اِس قابل ہے کہ

---

[1] الطاف حسین حالیؔ، حیاتِ جاوید، ص ۲۰۱

[2] ایضاً: ص [illegible]

[3] ایضاً: ص ۱۶۲

وس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو کیونکہ مسلمانوں کے
واسطے سے اس سے مفید بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اُسی عزت کی
نگاہ سے دیکھنے لگ جائیں جس نگاہ سے وہ قرآن کو دیکھتے ہیں۔[1]

جناب حالی صاحب کے آخری الفاظ بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔ کیا اب بھی کوئی شک و شبہ
باقی رہ گیا کہ مسلمانوں کو ایمان سے محروم کر کے نیم عیسائی بنانے کی یہ ایک پُراسرار سازش تھی
جس کا جال برٹش گورنمنٹ نے پھیلایا اور سر سید احمد خاں صاحب نے حکومت کے اس منصوبے
کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ موصوف نے اسی منصوبے کے تحت پُورے
دین میں ترمیم کی اور حکومت کے اشارے پر ایسا اسلام مرتب کیا، جس کے پیروکار اور ایک سکھ
غیر مسلم میں ماسوائے مسلم اور غیر مسلم کہلانے کے اور کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ سر سید احمد خاں صاحب
نے مقدس اسلام میں جو کتر بیونت کی اُس کا خلاصہ جناب حالی پانی پتی نے یُوں پیش کیا ہے:

۱۔ اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔

۲۔ قیاس حجت شرعی نہیں ہے۔

۳۔ تقلید واجب نہیں ہے۔

۴۔ قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہُوا تھا کسی دُوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا
اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہُوئی اور سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کہ
ما ننسخ من ایۃ او ننسھا۔ قرآن کی کسی آیت کا ناسخ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد
نہیں ہے بلکہ اُس کا بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے۔

۵۔ قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل واقع نہیں ہُوا۔ وُہ جس طرح اور جس قدر نازل
ہُوا تھا اُسی قدر زمانۂ نزول سے آج تک منقول ہے اور جن روایتوں سے زیادتی یا کمی
یا تغیر و تبدل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال سے قرآن کا تواتر ہونا پایا جاتا ہے وہ سب
موضوع و مفتریٰ ہیں۔

---

[1] حالی پانی پتی، حیات جاوید، ص ۱۰۲

۶۔ صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو، جب تک اصولِ علم حدیث کے موافق اُن کی جانچ نہ کی جائے، قابلِ وثوق نہیں سمجھنا چاہیے۔

۷۔ شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارج میں اور مراد نہیں ہے، بلکہ خود انسان میں جو نفسِ امّارہ یا قوتِ بہیمیہ ہے، وہ مراد ہے۔

۸۔ طیور مخنقہ جن کو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو، مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہے۔

۹۔ چونکہ خبرِ واحد میں احتمالِ صدق و کذب باقی رہتا ہے، اس لیے جو اعتراض اخبارِ احاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کیے جاتے ہیں، اسلام اُن کا جواب دہ نہیں ہے۔

۱۰۔ سوا اُن کفار و مشرکین کے جن کا قرآن کی اِس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اِس آیت کے مصداق ہوں کہ: انما ینھٰکم اللّٰہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولوھم۔ تمام کفار و مشرکین سے دوستی و موالات کرنا جائز ہے۔

۱۱۔ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی کتابوں میں تحریفِ لفظی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریفِ معنوی ہے مگر اسی کے ساتھ اُن کا اوّل سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلّم ہے۔

۱۲۔ ہر شخص اُن مسائل میں جو قرآن یا حدیثِ صحیح میں منصوص نہیں ہیں، آپ اپنا مجتہد ہے۔

۱۳۔ حضرت ہاجرہ جو اسمٰعیلؑ کی ماں ہیں وہ جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے، درحقیقت لونڈی نہ تھیں بلکہ رقیون بادشاہِ مصر کی بیٹی تھیں۔ رقیون نے اُن کو صرف تربیت کے لیے حضرت سارہ کے ساتھ کر دیا تھا۔

۱۴۔ وضع و لباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبّہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔

۱۵۔ قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا، جیسا کہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لیے کیا ہے، مقصدِ شارع کے برخلاف ہے کیونکہ جن آیتوں سے اِس مسئلہ کو استنباط کیا جاتا ہے، اُن آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ آنحضرت مسئلہ مذکور کے متعلق بحث کرنے والوں پر غضب ناک ہو کر یہ نہ فرماتے کہ: اَبِھٰذَا اُمِرْتُمْ اَمْ بِھٰ

اُمورِ مسلّمہ۔

۱۶۔ معراج اور شقِ صدر دونوں رؤیا میں واقع ہوئے ہیں نہ کہ بیداری میں، کیا مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک اور کیا مسجدِ اقصیٰ سے آسمانوں تک۔

۱۷۔ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فروتر مخلوقات موجود ہے اسی طرح اس سے بالاتر مخلوقات، جس کا ہم کو علم نہیں، موجود ہو، لیکن ملائک یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں اُن سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے مختلف قویٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے مادّے میں ودیعت کیے ہیں جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوتِ جذب و دفع و امثال ذالک، اُنھیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۸۔ آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعے کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرائے میں انسان کی فطرت اور اُس کے جذبات اور قوتِ بہیمیہ جو اُس میں ودیعت کی گئی ہے، اُس کی بُرائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے اور اس قسم کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں۔

۱۹۔ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا۔

۲۰۔ قرآن میں آنحضرت صلعم سے کسی معجزہ کے صادر ہونے کا ذکر نہیں ہے۔

۲۱۔ آیہ الذین آتینٰھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم میں جو ضمیر مفعول لفظ یعرفونہ میں ہے، وہ جیسا کہ عام مفسرین کہتے ہیں، آنحضرت کی طرف عائد نہیں ہوتی بلکہ جیسا ابن عباس، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے تحویلِ قبلہ کے معاملے کی طرف پھرتی ہے، جس کا ذکر اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کیا گیا ہے۔

۲۲۔ آیتِ میراث سے وصیت کا حکم، جو آیتِ وصیت میں والدین اور دیگر ورثاء کے لیے تھا، منسوخ نہیں ہوا۔ پس جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ ہے۔

۲۳۔ جو لوگ بمشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیہ وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعض دیگر علماء فدیہ کی

اجازت کو خاص کر معذور لوگوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں مگر سرسید کے نزدیک یہ حکم عام اُن
لوگوں کے لیے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو، خواہ بڈھے ہوں اور خواہ جوان۔ لیکن بہ نسبت
فدیہ دینے کے اُن کو روزہ رکھنا بہتر ہے۔

۲۴۔ جس ربا یعنی سُود کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس سے اُسی قسم کا ربا مراد ہے
جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سُود خوار
اور ربٹیوں میں، جن کا پیشہ سُود خواری ہے، پائی جاتی ہے۔ مگر اس سے اُس منافع
کی حرمت جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہے ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے سوا کسی گورنمنٹ
یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لیے روپیہ قرض لے، اُس کو سُود پر روپیہ دینا یا کسی
جماعت کا رفاہِ عام کے کام کے لیے چندہ جمع کرے، اُس روپیہ کا سُود میں لگا
اور اُس کے منافع سے رفاہِ عام کے کام کرنا، یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے۔

۲۵۔ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرت عیسیٰؑ کا زندہ آسمان پر اُٹھایا جا
ثابت ہو۔

۲۶۔ شہدا کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ اُن کو مُردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اس سے اُن
علوِ درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثالِ قابلِ تقلید چھوڑنا مراد ہے، نہ یہ کہ
وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے پیتے ہیں۔

۲۷۔ صُور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اُس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل نرسنگھے یا سنکھ یا ترہی
یا قرنا کے مراد نہیں ہے بلکہ یہ محض استعارہ ہے کہ جس طرح تری کی آواز پر لشکر جمع ہو جاتے
ہیں اسی طرح خدا کی مشیت اور ارادہ سے بعث و حشر واقع ہوگا۔

۲۸۔ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسماء و افعال کے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان
ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے اور اسی طرح معاد کے
متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر۔

۲۹۔ قرآن میں جو خدا کا زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے، اس سے کسی واقعہ
کی خبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اِس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ

خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا اور اسی لیے جو کہ اُن کا عقیدہ خلقِ زمین و آسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اُسی طرح بیان کر کے فرمایا کہ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۔ کیونکہ شارع کا مقصد حقائقِ اشیاء سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر ردّ و قدح کرنا نہیں ہے بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تہ نشین ہوں اُن کا زائل کرنا ہے۔

۳۰۔ قرآن میں جابجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے، کسی کو زلزلہ سے، کسی کو ٹڈیوں اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو کسی اور کسی کو کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے، اِس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہولناک حادثے دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب ہوتے ہیں اور انبیائے کرام کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوئے ہیں اگر وہ خیالات مقاصدِ نبوت کے منافی نہیں ہیں بلکہ اُن کی تائید کرنے والے ہیں تو وہ اُن خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ اُنھیں خیالات کے موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں۔

۳۱۔ خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبیٰ میں، نہ اِن ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے اور نہ دل کی آنکھوں سے۔

۳۲۔ قرآن مجید میں جو جنگِ بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے اُن لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا۔

۳۳۔ صفاتِ باری تعالیٰ عینِ ذات ہیں، نہ غیرِ ذات اور نہ لاعین ولاغیر، جیسا کہ اشاعرہ کا مذہب ہے۔

۳۴۔ حضرت عیسیٰ کا بِن باپ کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا۔
۳۵۔ کوئی امر عادتِ الٰہی اور قانونِ طبیعی کے خلاف کبھی وقوع میں نہیں آتا۔

۳۶۔ قرآن میں جو کفار سے بطور معارضہ کے کہا گیا ہے کہ تم کو اس کتاب کے بعض حصوں [illegible] ہو سکے یا شک ہو تو اس کی مثل کوئی سورت یا چند آیتیں تم بنا لاؤ۔ اس سے جیسا کہ اکثر اہلِ اسلام خیال کرتے ہیں، یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں، صحرا نشین بدوؤں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لیے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو، بنا لینا تمہاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے۔

۳۷۔ نبوت کا ملکہ نبی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اَلنَّبِیُّ نَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ۔ وہ ماں کے پیٹ سے نبی ہوتا ہے اور جس طرح تمام ملکات اور قویٰ فطری بتدریج ترقی کرتے ہیں، اسی طرح ملکۂ نبوت بتدریج ترقی پاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجے کو پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اس کا مقتضیٰ ہوتا ہے اور جس کو عرفِ عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے جو وحی اس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی ایلچی یا قاصد (یعنی فرشتہ) کی وساطت سے نازل نہیں بلکہ خود بخود ایک چیز اس کے دل سے اٹھتی ہے اور اسی پر گرتی ہے۔

۳۸۔ قرآن سے جنّات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلے سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں، جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ، ثابت نہیں ہوتا۔

۳۹۔ انبیائے بنی اسرائیل اور قومِ بنی اسرائیل کے قصّے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں ان میں جس قدر باتیں بظاہر قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، وہ [illegible] حقیقت کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسرینِ اہلِ اسلام نے یہودیوں کی پیروی کر کے ان کے معانی ایسے بیان کیے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہیں۔

۴۰۔ طوفانِ نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، عام نہ تھا بلکہ اسی قوم اور اسی ملک میں محدود تھا جس پر حضرت نوح مبعوث ہوئے تھے۔

۴۱۔ حضرت اسحاق کی ولادت کے وقت حضرت سارہ کی عمر اس حد کو نہیں پہنچی تھی جبکہ عادۃً

ہونا غیر ممکن ہے۔[1]

نوٹ: اس سے بھی بڑھ کر سر سید احمد خاں صاحب نے چند مسائل و نظریات سے ذریعے شریعتِ محمدیہ کو غتر بود کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ مسلمان اپنی ایمان جیسی متاع عزیز کو گنوا کر صرف اینگلو انڈین مسلمان بن جائیں۔ چنانچہ موصوف نے امتِ محمدیہ سے ایسے جتنے نظریات میں اختلاف کیا اُن کا خلاصہ حالی پانی پتی کے لفظوں میں گزشتہ ترتیب سے ساتھ پیش خدمت ہے۔

۴۲۔ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے اور آیہ من وفداء جو سورۂ محمد میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے۔

۴۳۔ دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے الدعاء هوا لعبادة، پس دعا کے مستجاب ہونے سے اُس کا مطلب جس کے لیے دعا کی جاتی ہے، حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں، وہی معنی دُعا کے مستجاب ہونے کے ہیں۔

۴۴۔ آیت یا آیاتِ بینات کے الفاظ جو قرآن مجید میں جا بجا آتے ہیں اُن سے وہ احکام یا مواعظ و نصائح مراد ہیں، جو خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں، نہ کہ معجزات جیسا کہ عموماً علمائے اسلام نے بیان کیا ہے۔

۴۵۔ حضرت عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اُن کو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسائی کہتے تھے کہ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر قتل کیا تھا، یہ دونوں قول غلط ہیں بلکہ بلا شبہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لیے قرآن میں وما قتلوہ وما صلبوہ کے الفاظ واقع ہوئے ہیں، جس سے یہ مراد ہے کہ موت جو مصلوب کرنے سے مقصود تھی، وہ واقع نہیں ہوئی۔

۴۶۔ اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ متعدد ازواج میں عدالت کر سکے گا، تو اُس کو ایک سے زیادہ

---

[1] حالی پانی پتی، حیات جاوید، ص ۹۰۴ تا ۹۱۰

جور و کی اجازت نہیں ہے۔

۴۷۔ سارق کے لیے قطعِ ید کی سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر لازمی ہوتی تو فقہا اُس کو مال مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے۔ نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقعوں پر سارق کو صرف قید کی سزا نہ دی جاتی۔

۴۸۔ قرآن میں جن اور اجنہ کے الفاظ سے چھپے ہوئے پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں، نہ کہ وہ وہمی مخلوق جو دیو اور بھوت وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے۔

۴۹۔ سورۂ فیل میں جن الفاظ سے اصحابِ فیل پر ابابیل کا کنکریاں پھینکنا مراد لیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرضِ چیچک سے استعارہ ہے، جس کی نسبت تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے پہل مرضِ چیچک عرب میں اُسی سال نمودار ہوا جب ابرہہ نے حرم پر چڑھائی کی تھی۔

۵۰۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور تمام انبیائے سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلافِ قانونِ فطرت معلوم ہوتے ہیں، جیسے یدِ بیضا، عصا کا اژدہا بن جانا، فرعون اور اُس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلی کا ہونا، گوسالۂ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، من و سلویٰ کا اُترنا، عیسیٰ کا گہوارہ میں بولنا، خلقِ طیر، مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ اُن کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا۔

۵۱۔ قرآن مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے، ایک مقصود اور دوسرا غیر مقصود۔ پس جو کلام غیر مقصود ہے اُس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کفار کے رحمتِ الٰہی سے محروم ہونے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ چونکہ اصل مقصود اُن کے حرمان کا بیان ہے اور اُس کو ایک پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے، اس لیے اس کلام کو غیر مقصود سمجھا جائے گا اور اس سے اس بات پر کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں، استدلال نہ ہو سکے گا۔

۵۲۔ شریعتِ اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں، ایک اصلی اور دوسرے محافظ احکام اصلی۔ جن احکام پر اسلام کی بنیاد قائم ہے وہ صرف احکام اصلی ہیں، اُن میں حکم ایسا نہیں کرتی قانون

فطرت کے خلاف ہو، اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکام اصلی کی محافظت مقصود ہے نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں۔ پس اُن کی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہے کہ وہ قانونِ فطرت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ لیکن چونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق اصل حکم صرف توجہ الی اللہ ہے، باقی جس قدر احکام اس سے متعلق ہیں مثل وضو و قیام و قعود و رکوع و سجود اور استقبالِ قبلہ وغیرہ یہ سب اسی کے محافظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہو سکتے ہیں مگر توجہ الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی۔ لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجا لانا ضروری ہے۔" [۱]

شریعتِ مطہرہ کو انگریز بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بازیچۂ اطفال بنا کر یوں بیدردی سے پامال کرنا جس شخص نے اپنا شعار بنا لیا ہو اور مسلمانوں کو علی الاعلان ایسا ہی مسلم نما عیسائی بننے کی دعوت دیتا رہا ہو، چاہیے تو یہی تھا کہ اسلام کی حقانیت پر یقین رکھنے والے اس سے کنارہ کش رہتے اور اکثر حضرات نے ایسا ہی کیا لیکن برٹش گورنمنٹ کے پجاریوں نے اُس دشمنِ دین و ایمان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیے، چنانچہ خواجہ الطاف حسین حالی نے لکھا ہے:

> "سر سید احمد خاں کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں، اُنہیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں، جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے مطابق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پاتے۔" [۲]

خدا کا شکر ہے کہ سرسید احمد خاں صاحب کا جاری کردہ نیچری فرقہ کبھی کا اپنی موت مر چکا ہے لیکن اس کے زہریلے اثرات تا حال مسلمانوں کے خرمنِ دین و ایمان کو تباہ و برباد کر رہے ہیں

---

[۱] حالی پانی پتی: حیاتِ جاوید، ص ۶۱۰ تا ۶۱۲

[۲] ایضاً، ص ۶۲

زیادہ تر اِسی نحوست کا شکار سکولوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا ہے اور دوسری جانب
پرویزیت وہی سرسید احمد خاں کی صدائے بازگشت بنی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو سچی ہدایت
نصیب فرمائے۔ آمین

سرسید احمد خاں بھی وہابی تھے۔ مولوی مملوک علی صاحب کی سرکردگی میں جو دہلی کالج سے
حکومت اپنے مقصد کے لوگوں کی کھیپ تیار کروا رہی تھی آنجناب بھی اُن میں سے ایک تھے۔
دیوبندی اور نیچری فرقوں کا بیک وقت دیوبند اور علی گڑھ سے ظہور ہوا تھا۔ ہاتھی کے دانت کھانے
کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر تخریب کار کی تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں
ایک جانب سے وہ بدصورت معلوم ہوتا ہے تو دوسری جانب سے حسین و جمیل۔ ایک طرف سے
دیکھیں تو تخریب کار نظر آئے گا اور دوسری طرف سے مصلح و ریفارمر۔ اِس سمت سے بالکل بدخواہ
نظر آتا ہے تو اُدھر سے خیرخواہ۔ یہ دوغلا پن ہی ایسے حضرات کو منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے جہاں
مقصد تخریب کاری اور اہلِ دین کی بدخواہی ہوتا ہے تاکہ کسی سے منہ مانگا انعام پا سکیں۔ لیکن جب
اہلِ علم و دانش اُن کی حرکتوں سے آگاہ ہو کر بازپرس کرتے اور عوام الناس کو اُن کے شر سے محفوظ
رہنے کی ہدایت کرتے ہیں، تو ایسے حضرات اپنی دوغلی تصویر کا دوسرا رُخ سامنے کر دیتے ہیں کہ
دیکھیے صاحب اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ لیکن علمائے کرام اُن کے دھوکے میں
آنے والے کہاں! وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ نئے لباس میں وہی پرانے بہروپیے آگئے ہیں
جن کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ
مسلمانوں کو چاہیے کہ ہمیشہ علمائے اہلسنّت و جماعت سے وابستہ رہیں اور اسی دین و مذہب
کو اپنا مقصدِ حیات بنائے رکھیں جس پر اللہ تعالیٰ کے جملہ مقبول بندے چل کر دونوں جہانوں
کی کامیابی حاصل کر گئے اور جن کا نام آج تک مخلوقِ خدا کی زبانوں پر بصد عزت و احترام
آتا ہے اور ہر صاحبِ عقل و دانش اُن کی عقیدت کا دم بھرنے پر مجبور ہے۔ اِن حضرات کے
راستے کے علاوہ جو کسی اور راستے پر چلنے کی تلقین کرے یا اہلسنّت و جماعت کے مذہب کی
اُس کے بعض عقاید و نظریات کو اپنی تحقیق کے سانچے میں ڈھالے اور اپنے عقلی ڈھکوسلوں
قرآن و حدیث کا ماحصل اور شریعتِ مطہرہ کا منشا بتائے وہ رہبر کے بھیس میں رہزن ہے۔ اللہ

ملا حضرات سے مسلمانوں کو ہر وقت خبردار رہنا چاہیے - یعنی: ؎

بخوبی جانچ کر سے جنس کی بازارِ ہستی میں
فریب ان جو فروشوں سے دکھا گندم نمائی کا

۶- بانیٔ خاکسار پارٹی کے کارنامے

جناب عنایت اللہ مشرقی (المتوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء) اس تحریک کے بانی تھے - شروع میں خاکسار پارٹی ایک سیاسی جماعت کے بطور نمودار ہوئی - بیلچہ اُن کا علامتی نشان تھا بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہندی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ان کا نصب العین ہے لیکن حقیقت میں یہ بھی برٹش گورنمنٹ کی ایک پراسرار اور خوشنما چال تھی - مشرقی صاحب کے بارے میں پیرزادہ بہاء الحق قاسمی امرت سری نے مؤتمر خلافت قاہرہ کے پیش نظر لکھا تھا:

"نام نہاد مؤتمر خلافت قاہرہ مصر منعقدہ ۱۳ مئی ۱۹۲۶ء میں جب علامہ عنایت اللہ مشرقی ہندی مسلمانوں کا خود ساختہ نمائندہ بن کر شریک ہوا تو ہندوستان اور ترکی و مصری اخبارات نے مشرقی کو برطانوی جاسوس قرار دیا - چنانچہ روزنامہ "زمیندار" لاہور نے، جو آجکل اپنی مخصوص مصلحتوں کے ماتحت اسی جاسوس کی تحریک خاکساری کا بہت بڑا حامی ہے، ۴ جولائی ۱۹۲۶ء کی اشاعت کے صفحہ ۲ پر اخبار البلاغ مصر مجریہ ۵ جون ۱۹۲۶ء کے ایک مقالہ کا ترجمہ شائع کیا، جس میں ترکی کے مشہور اخبار "وقت" کے حوالہ سے مشرقی کو برطانوی جاسوس کہا گیا تھا - اس پر خود مدیر زمیندار نے جولائی ۱۹۲۶ء کی اشاعت کے صفحہ ۲ پر لکھا ہے؛

"ہم نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ بعض حلقوں میں یہ شبہ کیا جا رہا ہے کہ مشرقی صاحب کی حیثیت طوطیٔ پسِ آئینہ کی ہے اور اُن کی یہ نقل و حرکت اپنے استاذِ ازل کے ایماء و اشارہ کا نتیجہ ہے - اس کے ساتھ ہی ہم نے لکھا تھا کہ اگر یہ شبہ غلط اور بے بنیاد ہے تو حکومت کو چاہیے کہ وہ بے تعلقی کا اعلان

کر دے نیز بتا دے کہ مشرقی صاحب کس بنا پر اور کس سے پروانۂ نمائندگی حاصل کر کے مؤتمر قاہرہ میں شریک ہوئے۔ لیکن افسوس کہ حکومت اب تک اپنے دامن کی صفائی پر متوجہ نہیں ہوئی۔ کیا اس سے دنیا کو یہ سمجھنے کا موقع نہیں دیا گیا کہ یہ شبہ کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور رکھتا ہے۔ ترکی کے مشہور اخبار "وقت" نے مؤتمر قاہرہ پر بحث کرتے ہوئے عنایت اللہ صاحب مشرقی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مؤتمر کے ایک رکن عنایت اللہ صاحب کی نمائندگی کے متعلق گوناگوں شبہات محض مسلمانانِ ہند ہی کے دلوں میں پیدا نہیں ہوئے بلکہ بیرونِ ہند کے مسلمان بھی موصوف کو کھلم کھلا برطانوی جاسوس کہتے ہیں۔[1]

جناب بہاء الحق قاسمی صاحب نے علمائے مصر، ترکی اور فلسطین کی خدمت میں متعلقہ مشرقی ایک استفتاء مولوی محمد یوسف جوری پشاوری کی معرفت عربی میں پیش کر کے حکم شرعی دریافت کیا۔ اس کا مستفتی مولوی عبداللہ شاہ پشاوری کو بتایا گیا۔ بخوفِ طوالت ہم یہاں صرف اس استفتاء کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

"کیا فرماتے ہیں علمائے جامع ازہر و فضلائے قاہرہ اس مسئلہ میں کہ ایک شخص جس کا نام عنایت اللہ مشرقی ہے اور جو صوبہ پنجاب (ہندوستان) کے ایک صوبہ میں پیدا ہوا اور اس کی تعلیم و تربیت غلط طریق پر انگریزی درسگاہوں میں ہوئی اور اس کے بعد اس نے ایک تفسیر لکھی جس کا نام اس نے تذکرہ رکھا ہے جو کہ اردو زبان میں ہے اور اس کے مقدمے کا ایک دیباچہ عربی زبان میں ہے جس میں اس نے (علاوہ اور خرافات کے) صفحہ ۳ پر مندرجہ ذیل عقائد کا بھی اظہار کیا ہے کہ:

"مسلمانو! یہ خیال نہ کرو کہ اطاعتِ رسول کا مطلب وہی ہے جو تمہارے جاہل علماء بکتے ہیں کہ احادیثِ نبوی کی پیروی کی جائے بلکہ اس عہدِ حاضر میں اس

---

[1] بہاء القاسمی، مولوی، ضرب کاری بر مذہب خاکساری، ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء، ص ۱۲

(اطاعتِ نبوی) سے وہ اطاعت (سیاسی) مراد ہے جس کے متعلق بالمشافہ رو برو ہو کر مسلمانوں کو (تسلیم کرلینے کا) آپ حکم فرمایا کرتے تھے اور اس وقت اطاعتِ رسول کا سوائے اس کے کوئی مطلب نہیں کہ اپنے امیر کی اطاعت کی جائے (یعنی مشرقی تمھارا امیر ہے اُس کی اطاعت کرو) صفحہ ۴۷ میں بھی یہ مضمون ہے۔

نیز صفحہ ۵ میں ایک اور بات لکھی ہے (جسے مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے) کہ مومن صالح صرف یورپین عیسائی ہیں اور یہی فلاح یافتہ ہیں۔ پھر صفحہ ۸ میں لکھتا ہے کہ اہلِ یورپ ہی صرف قرآن ماننے والے ہیں کیونکہ وہی لوگ اسے سمجھتے ہیں اور وہی اس پر عمل کر رہے ہیں۔ صفحہ ۹، ۱۰، ۱۱، پر بھی یہی مضمون ہے نیز اپنی تفسیر کے صفحہ ۱۲۸ و ۱۲۹ پر لکھتا ہے کہ صراطِ مستقیم صرف دنیا میں غلبہ اور حکومت اور سلطنت کا نام ہے اور انگریز ہی اس وقت (صراطِ مستقیم پر چلنے کے حکم پر) عمل پیرا ہیں (بخلاف اس کے) مسلمان گمراہ اور مغضوب علیہم اور ضالین ہیں۔

صفحہ ۱۴۴ میں لکھتا ہے کہ مذاہبِ اسلامی کی پیروی کرنا شرک ہے۔ صفحہ ۱۷ میں لکھتا ہے کہ مغضوب علیہم اور ضالین وہ مسلمان ہیں جن کو زمین کا ایک ٹکڑا بھی نصیب نہیں ہوا۔ صفحہ ۵۶ میں تحریر کرتا ہے (جس کا مختصر خاکہ یہ ہے) کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور کلمۂ شہادت اُمتِ محمدیہ کے لیے صرف شناخت کا نشان ہیں جن سے وہ شناخت ہو سکتی ہے، ورنہ یہ چیزیں دراصل اسلام کی بنیاد نہیں ہیں بلکہ وہ دس احکام ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے (مشرقی نے اس مقام پر اُن کا ذکر کیا ہے) اور (اس کے بعد) صفحہ ۵۵ میں مسلمانوں کی نماز اور دیگر عبادات پر مذاق اڑایا ہے۔ صفحہ ۵۲ میں ائمہ مجتہدین پر پھبتی اڑائی ہے۔ صفحہ ۴۶ و ۴۷ میں لکھتا ہے کہ ملائکہ (کیا ہیں؟) وہی فطری طاقتیں (جن پر دنیا قائم ہے اور) دنیا میں (ہر جگہ موجود ہیں) اور اس وقت یہی طاقتیں (بصورتِ ملائکہ) یورپین انگریزوں کو (بصورتِ آدم) سجدہ کر رہی ہیں

اور شیطان سے مراد وہ حیوانی طاقت ہے (جو انسان میں کھانے پینے کے لیے موجود ہے۔ اِس کے بعد) اُس نے (دینی خرافات کو جاری رکھتے ہوئے) وہ خیالات پیش کیے ہیں جن کو کوئی ایمان دار بلکہ عقلمند بھی زبان پر نہیں لاسکتا۔ پھر تعجب ہے (کہ اِن خرافات کے متعلق زور سے کہتا ہے) کہ یہی حق اور اصل اسلام ہیں اور اُس کا دعویٰ ہے کہ میرے سوا قرآن مجید کو (کسی نے آج تک نہیں سمجھا) اور اُسے یہ بھی دعویٰ ہے کہ اِس وقت (مسلمانوں کا) امیر (اور خلیفۃ المومنین) میں ہی ہوں۔ پھر حکم دیتا ہے کہ زکوٰۃ مجھے دیا کرو (اور یہ بھی کہتا ہے کہ) میری ذات ہی صدقات کا صحیح مصرف ہے۔

(علاوہ بریں) اپنے ہفتہ وار اخبار الاصلاح میں اور اپنے رسالہ مولوی کا غلط مذہب میں اور اپنی اردو تفسیر میں اور اپنی کتاب اشارات میں وہ خیالات پیش کیے ہیں جو اُمتِ محمدیہ کے عقاید کو پاش پاش اور اجماعِ امت کی بوٹی بوٹی کرتے ہیں اور قرآن مجید کی قطعی آیات اور متواتر احادیث نبویہ کے صریح خلاف ہیں۔ دیکھو متقدم عربیہ صفحات مندرجہ ذیل ..... (تاکہ) اُس کی خرافات کا آئینہ (آپ کے سامنے آجائے) غرضیکہ اُس کے یہ چند خیالات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ علاوہ بریں ایک اور عجیب خرافات یہ بھی ہے اور بڑے دعوے سے کہتا ہے کہ علمائے ازہر نے مجھے علامہ کا خطاب دیا ہے اور میری تفسیر کی نہایت تعریف کی ہے۔ اب اِن خرافات کے متعلق جناب کی رائے کیا ہے؟ اور اُس تفسیر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ جو ان [illegible] پر مشتمل ہے اور اس شخص کے متعلق اور اِس کے فہم قرآن کے متعلق کیا فتویٰ ہے (اور یہ بھی بتایا جائے کہ، کیا واقعی علمائے ازہر نے اِس کتاب کو دیکھ کر اِسے علامہ کا خطاب دیا ہے؟

المستفتی: عبداللہ شاہ مبلغِ اسلام پشاور۔ ہندوستان"

۱؎ بہاء الحق قاسمی، مولوی: ضرب کاری بر مذہب خاکساری، ص ۲ تا ۶

اس استفتاء کا جامعہ ازہر کے بزرگ ترین عالم علامہ یوسف الدجوی المالکی نے عربی میں طویل جواب لکھا اور اُن کے فتوے پر چھ علمائے کرام کی تصادیق مع مہر و دستخط ہیں، جن کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ شیخ مصطفیٰ حمامی، شاہی خطیب، مسجد زینبی، قاہرہ، مصر۔
۲۔ علامہ محمد حبیب اللہ الشنقیطی، نائب پرنسپل، جامعہ ازہر، مصر۔
۳۔ شیخ عبد الرحمٰن الجزیری الشافعی، استاد جامعہ ازہر، مصر۔
۴۔ علامہ محمد زاہد الکوثری، شیخ الاسلام، وکیل دولتِ عثمانیہ، ترکیہ۔
۵۔ شیخ مصطفیٰ صبری، سابق شیخ الاسلام، ترکی۔
۶۔ شیخ خلیل خالدی حنفی، خطیب بیت المقدس۔

مذکورہ فتوے کے بارے میں ابو الضیا جناب پیرزادہ محمد بہاء الحق قاسمی نے مشرقی صاحب کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض ضروری امور کی وضاحت بھی فرمائی ہے۔ موصوف کا وہ بیان قارئین کرام کی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر پیشِ خدمت ہے:

"عنایت اللہ مشرقی کے پیشِ نظر کوئی تعمیری پروگرام قطعاً نہیں۔ اس کا مقصدِ وحید تخریب اور صرف تخریب ہے۔ علمائے کرام کا وجود باوجود اُس کے تخریبی پروگرام کی تکمیل میں چونکہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے وہ ان حضرات کے خلاف مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے اعدائے اسلام کی طرح منافرت پھیلا کر اپنے ملحدانہ مقاصد کی اشاعت کے لیے راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ہندوستان کے علمائے کرام کو گالیاں دیں کیونکہ یہی حضرات اُس کے قریب سے آگاہ تھے اور انہیں سے اُس کو واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن مصر کے علماء کی نسبت اُس نے یہ بے بنیاد اور سراسر جھوٹا پروپیگنڈا کیا کہ وہ تذکرہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور کہ وہ صاحبِ تذکرہ کو علامہ کا خطاب دے چکے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

مجلسِ علمی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت کی طرف سے جامعہ کے

فاضل مدرس مولانا سید محمد یوسف شاہ بنوری پشاوری بعض ضخیم کتب فقہ کی
طباعت اور علمائے ممالک اسلامیہ کے ساتھ روابط پیدا کرنے کے سلسلے میں
مصر، بیت المقدس، ٹرکی اور حجاز مقدس کو تشریف لے گئے اور آپ نے وہاں
کے علما کے سامنے مشرقی کی کتاب تذکرہ کو پیش کر کے اُن سے اس کی نسبت
فتویٰ طلب کیا۔ چنانچہ مصر کے جلیل القدر عالم علامہ یوسف دجوی مالکی نے فتویٰ
لکھا، جس کی تائید و تصدیق مصر کے دوسرے علما کے علاوہ ٹرکی، بیت المقدس
اور مکۂ معظمہ کے علمائے کرام نے فرمائی۔ یہ فتویٰ حکومت مصر کے سرکاری رسالہ
الاسلام مجریہ ۱۱ر شوال ۱۳۵۵ھ مطابق ۹ر دسمبر ۱۹۳۸ء میں چھپ چکا ہے،
اس لیے کسی اَلَدُّ الخِصَام کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ یہ فتویٰ جعلی ہے۔
یہ فتویٰ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ مشرقی کی تکفیر اور اُس کے عقائد کی تغلیط
و تکذیب میں علمائے ہند متفرد نہیں ہیں بلکہ ممالک اسلامیہ کے علما بھی اس
باب میں علمائے ہند کے ہمنوا ہیں۔ اب اس کے بعد مشرقی کے لیے اس کے
سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے کہ یا تو اس فتوے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے
ہوئے اپنے عقاید کفریہ سے توبہ کرے یا حسبِ عادت پوری دلیری سے
علمائے ہند کی طرح علمائے مصر وغیرہ کو بھی بے نقط گالیاں دے کر اپنے دل
کی بھڑاس نکالے۔"[1]

دوسرا استفتاء علمائے مکۂ مکرمہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، جس کا امام مسجدِ حرام
جناب ابو السمح نے ۱۱ر محرم ۱۳۵۸ھ کو جواب تحریر فرمایا اور اپنے فتوے میں مشرقی صاحب
کے متعلق لکھا کہ "لاشك فی کفرہ و جہلہ"۔ اس فتوے کی مسجدِ حرام کے ایک مدرس
محمد سلطان المعصومی نے تصدیق کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ انگریز بہادر کے چلے جانے کے بعد
یہ فرقہ پاکستان کے اندر ایک عضوِ معطل بن گیا اور عالیجناب مشرقی صاحب کی وفات کے ساتھ

---

[1] بہاءالحق قاسمی: ضرب کاری بر تذبذب خاکساری، ص ۴

ہی خاکساری فتنہ بھی زندہ درگور ہو گیا تھا۔ اب چند خاکساروں کا وجود اگر کہیں نظر آجاتا ہے تو ایسے حضرات اُس آندھی کے تنکے یا فتنے کی اُس گرم بازاری کے آثارِ قدیمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہر فتنہ باز و فرقہ ساز کے شر سے بچائے۔ آمین۔ برٹش گورنمنٹ نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلام دشمنی سے سرشار ہو کر مسلمانوں کے خرمنِ دین و ایمان میں آگ لگانے کی خاطر مصلحین کے رُوپ میں کیسے کیسے تخریب کار کھڑے کیے، جو قوم کے سامنے بڑے خوشنما رنگوں میں آئے اور رہبری کے بھیس میں رہزنی کرتے رہے۔ اتنے لصوصِ دین کھڑے کر دینے پر بھی انگریزی حکومت کی اسلام دشمنی کا جذبہ سرد ہونے میں نہ آیا۔ مسلمانوں کے خلاف اُس کی بھڑکی ہُوئی آتشِ غیظ و غضب بجھنے کا نام نہ لیتی تھی؛ جسے دیکھ کر ہر صاحبِ نظر بے ساختہ کہہ اُٹھتا تھا، ؎

بسمل تو ہوتے سیکڑوں ہی سرد تڑپ کر
ٹھنڈا مرے قاتل کا مگر دل نہیں ہوتا

۷۔ بانیِ پرویزیت مسٹر غلام احمد پرویز کی تخریب کاریاں

یہ فرقہ سر سید احمد خاں صاحب کی نیچریت کے سہارے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اس معجون کے اکثر اجزا نیچریت کے ہیں، کچھ کمیونزم اور سوشلزم کا مواد ہے اور باقی مسٹر غلام احمد پرویز صاحب کی اپنی ایجادات۔ مذکورہ تینوں قسم کے اجزا سے پرویزیت کی معجون مرکب تیار کی گئی ہے۔ پرویزی حضرات خود کو اہلِ قرآن کہتے، قرآن فہمی کے ٹھیکیدار بناتے ہیں اور پرویز صاحب کے متعلق اُن کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ رسولِ خدا کے بعد اگر اسلام کے اِس چودہ سو سالہ دور میں کسی نے قرآنِ کریم کی آیات کے حقیقی مفہوم و مطالب کو سمجھا ہے تو وہ صرف اور صرف مسٹر غلام احمد پرویز کی ذات ہے۔ مسلمانوں میں یہ فرقہ پرویزی، منکرینِ حدیث اور منکرینِ سنت کے ناموں سے متعارف ہے۔ پرویز صاحب اور پرویزی حضرات کو اپنے اہلِ قرآن ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ مسلمانوں کے قرآنِ مجید کی تعلیمات سے دُور اور نفور رہنے کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں لیکن حقیقت میں اسلام کا دعویٰ کرتے ہُوئے پرویز صاحب سے بڑا شاید ہی قرآنِ کریم کا کوئی مخالف پیدا ہُوا ہو۔ موصوف نے قرآنی تعلیمات اور اُس کے مفہوم و مطالب میں تحریف کا وہ

دروازہ کھولا ہے کہ احکامِ خداوندی کی حقیقی صورت کو مسخ کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا ہے۔ اگر یہ قرآن فہمی ہے تو قرآن دشمنی کس درخت کا نام ہوگا؟ جو کسی کی لولی لنگڑی عقل آیاتِ قرآنیہ کا مطلب بتاتی جائے اگر آیات کا حقیقی مفہوم وہی ہوگا تو اس طرح ہزاروں افراد، ہزاروں قسم کے مفہوم و مطالب بتاتے پھریں گے، کیا وہ سب تعبیریں حقیقی اور درست ہوں گی؟ اگر نہیں اور ہرگز درست شمار نہیں ہوں گی تو مسٹر پرویز صاحب کی عقل کو قرآنِ کریم کی کون سی آیت نے حقانیت کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے کہ موصوف جو مفہوم بتاتے جائیں آیاتِ قرآنیہ کا حقیقی مفہوم وہی ہوگا؟ آخر قرآنِ کریم نے یہ کس جگہ تصریح کی ہے کہ کلامِ الٰہی کا حقیقی ترجمان مسٹر غلام احمد پرویز ہے؟ جو کچھ پرویز صاحب قرآنِ کریم کے بارے میں فرمائیں وہ درست اور دوسرے جو چاہیں کہتے پھریں وہ سب کچھ غلط۔ کیا پرویزی حضرات مسلمانوں کو یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ کلامِ الٰہی میں یہ تصریح کس جگہ فرمائی گئی ہے؟ پرویز صاحب مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ باور کرانے پر مُصر ہیں کہ:

"دین کے ساتھ برادران! جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ہاتھوں ہوا تھا وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قرآنِ کریم میں مکمل کیا اور حضور نے اس قرآن کو امت کو دے دیا، لیکن حضور کی تشریف برآری کے تھوڑے عرصے بعد مفاد پرست قوموں نے اُجڑنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ پہلے ملوکیت آئی، اس کے ساتھ سرمایہ داری اور ان دونوں نے اپنے تحفظ کے لیے دین کو مذہب میں بدلنا شروع کر دیا، چنانچہ یہ دین بھی آہستہ آہستہ اسی طرح مذہب میں تبدیل ہوگیا، جس طرح سابقہ انبیائے کرام کا لایا ہوا دین تبدیل ہوا تھا۔"[1]

اگر بقول مسٹر پرویز صاحب سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دین کو اُن کے اصطلاحی مذہب میں بدل دیا گیا تو اس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ اس وقت سے لے کر اب تک جتنے مسلمان کہلانے والے ہوئے ہیں وہ سب بے دین اور

---

[1] غلام احمد پرویز، مسٹر، بہارِ نو، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ۱۹۹۵ء، ۳۴۹

اسلام کے دشمن تھے۔ اِن حالات میں کئی سوالات پردۂ ذہن پر اُبھرتے ہیں، لیکن دو سوال پیشِ خدمت ہیں:

۱۔ جب اِس تقریباً تیرہ سو سال کے درمیانی عرصے میں سارے مسلمان دین کے بدخواہ اور اُسے تبدیل کرنے والے ہی پیدا ہوتے رہے اور اُنھیں روکنے ٹوکنے والی کوئی طاقت نہ تھی تو اُنھوں نے قرآنِ کریم کے اندر معنوی تحریف کے ساتھ لفظی تحریف کرنے میں کون سی کسر اُٹھا رکھی ہوگی؟ دریں حالات پرویز صاحب موجودہ قرآن کی صحتِ لفظی کس طرح ثابت کریں گے؟ اگر وہ آیۂ کریمہ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ...... سے استدلال کریں تو بالکل بے معنی بات ہوگی کہ اُمتِ مرحومہ کو اُمتِ ملعونہ ٹھہرا دینے کے سبب تو قرآنِ کریم کی صحت مشکوک ہوگئی کہ جو کتاب دشمنوں بدخواہوں کے ہاتھوں میں رہی، اُس کی صحت اور کمی بیشی سے محفوظ رہنے پر کس طرح یقین کیا جائے؟ ایسی حالت میں قرآنِ مجید کی کسی آیت یا آیات سے کس طرح استدلال صحیح ہو سکے گا کیونکہ یہ شک اپنی جگہ قائم رہے گا کہ ممکن ہے اِس آیت یا اِن آیات کو اُن بدخواہوں نے گھڑ کر اپنی جانب سے شامل کر دیا ہو۔ لہٰذا اِن حالات میں صداقت اُس وقت ثابت ہو سکے گی جب کوئی خارجی دلیل قائم کر دی جائے۔ لیکن پرویز صاحب مرتے دم تک ایسی دلیل قائم نہیں کر سکیں گے۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔

۲۔ جب دین کو مٹے اور مذہب کو اُس کی جگہ سنبھالے اتنی صدیاں گزر گئیں۔ دین کو جاننے والا اور اُس پر چلنے والا کوئی نہ رہا تو اِتنا عرصہ گزرنے کے بعد پرویز صاحب کو کس ذریعے سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دین کی یہ شکل و صورت بتائی تھی اور قرآنی آیات کے مفہوم و مطالب یہی بتائے تھے جو مسٹر پرویز بتا رہے ہیں؟ اگر پرویز صاحب اِس کا کوئی تسلی بخش جواب مرحمت فرما دیں تو اُن کا مسلمان قوم پر احسان ہوگا۔

پرویز صاحب نے قرآنی تعلیمات کو اِس بیدردی سے بدلا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اِس آخری پیغام کو بچوں کا کھلونا یا مداری کا تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ بغیر کسی دلیل و حجت کے جو منہ میں آتا ہے آیات کا مطلب بتاتے چلے جاتے ہیں۔ اسلام کی غربت کا اِس سے

...ا ک دَور اور کب آیا ہوگا کہ قرآن کریم کے ایسے اشد ترین مخالف اور کلامِ الٰہی کے بے باک ...یف سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں کہ یہ کیا خبط بے ربط پھیلایا جا رہا ہے؟ کیوں رہنمائی کا ...زی کرکے رہزنی کی خوشیاں رچا رہے ہو؟ ہائے غربتِ اسلام! وا سیفا قرآن کریم تیری ...س مپرسی!! موصوف نے اپنی مخصوص ترنگ میں اللہ رب العزت کے اسمِ ذات (اللہ) کا ...طلب یہ بتایا ہے:

"اس اہم نکتہ کو اگر تم سمجھ لو تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل تو بخود تمل آ جائے گا، یعنی ان مقامات میں اللہ کی جگہ اللہ کا قانون کہہ دیا کرو، تو بات بالکل واضح ہو جائے گی، مثلاً اَللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ..... اللہ کا قانون مارتا ہے اور وہی زندہ رکھتا ہے۔" [1]

...حکمِ خداوندی اَطِيعُوا اللّٰهَ یعنی احکاماتِ الٰہیہ کی اطاعت کا پرویزی مفہوم ملاحظہ ہو:

"چونکہ خدا عبارت ہے اُن صفاتِ عالیہ سے جسے انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لیے قوانینِ خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی..... اطاعت ہے کسی غیر کی نہیں۔" [2]

...جیسے پرویز صاحب کے لفظوں میں ایمان بالغیب کا جدید مفہوم بھی ملاحظہ فرما لیجئے:

"مستقبل کے مفاد کے لیے وہی کوشش کرے گا جسے ان دیکھے نتائج پر پورا پورا یقین ہو۔ قرآن اسے ایمان بالغیب کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔" [3]

...موصوف نے قرآن کریم کو کھلونا بناتے ہوئے شرک کا مطلب یہ گھڑا ہے:

"شرک کے معنی ہیں کہ انسان زندگی کے ایک دائرے میں کوئی اور قانون مان سکے اور دوسرے دائرے میں کوئی اور۔" [4]

...یسے اسی انداز پر رئیس المحرّفین صاحب نے کفر کا مفہوم یہ بتایا ہے:

---

[1] مسٹر پرویز: سلیم کے نام خطوط، ص ۱۵۶ [2] مسٹر پرویز: معراجِ انسانیت، ص ۲۰۰
[3] مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۳۰ [4] ایضاً، ص ۵۳

"وہ لوگ جو اپنے حال ہی کی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں ..... انہیں ..... کفار کا
گروہ کہہ لیجیے یعنی مستقبل سے یکسر منکر۔" ۱؎

قیامت یعنی روزِ جزا و سزا موصوف جیسے مادیت پرست کی نگاہوں میں کیا ہے؟ ملاحظہ ہو:

"ظہورِ نتائج کے وقت میں اختلاف ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے واضح کر دیا
کہ یوم الدین ..... اس وقت بھی موجود ہے۔ یہ تو ملّا کی قیامت ہے جس
کا اس زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔" ۲؎

حیات بعد الحیات کو مسٹر پرویز صاحب نے کس چابکدستی سے اسی زندگی میں سمویا ہے، موصوف
کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"حیات بعد الحیات ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔
زندگی ایک جوئے رواں ہے ..... اس میں انقطاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" ۳؎

زندگی میں انقطاع کا سوال پیدا ہوتا ہے یا نہیں، اس کا موصوف کو مرتے دم تجربی علم ہو جائے گا،
گوچہ آج گمراہ گری کا بازار گرم رکھتے ہوئے وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں، کون زبان پکڑ سکتا ہے؟
قرآن پر اعمال تُلنے کی تصریح موصوف نے یوں کی ہے:

"قرآنی جنت کی رُو سے ہماری زندگی کی ایک ایک سانس میں حساب اور کتاب
پوشیدہ ہے۔ کارگاہِ حیات میں ایک ایک قدم پر میزان قائم ہے، جس میں
ہمارے اعمال تُلتے ہیں اور یہیں موت اور زندگی کے پروانے ملتے ہیں۔" ۴؎

متاعِ دنیا اور سامانِ آخرت کا مفہوم جو پرویز صاحب نے گھڑا ہے، اسے موصوف کی زبانی ہی
سماعت فرمایا جائے:

"قرآن ..... کے نزدیک متاعِ دنیا سے مفہوم ہوتا ہے وہ مفاد جو انسان
صرف اپنی ذات کے لیے تلاش کرتا ہے اور سامانِ آخرت سے مقصود ہوتا ہے

۱؎ مسٹر پرویز، اسباب زوال اُمت، ص ۴۲
۲؎ مسٹر پرویز، اسباب زوال اُمت، ص ۲۹
۳؎ مسٹر پرویز، فردوسِ گم گشتہ، ص ۲۲۱
۴؎ مسٹر پرویز، فردوسِ گم گشتہ، ص ۲۲۶

وہ متاع جسے وہ آنے والی نسلوں کے لیے جمع کرتا ہے۔"[۱]

ب تقویٰ اور پرہیزگاری کا مطلب، جو پرویز صاحب کا خانہ ساز ہے، ملاحظہ فرمایا جائے:

"قانونِ فطرت ..... سے ہم آہنگی کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی کے معنی ہیں گھوڑے کے سموں کو اس طرح گھسا کر وہ ہموار ہو جائیں۔"[۲]

ج ارض و آسمان یعنی ارض و سماء کا پرویز صاحب نے کیا معنی گھڑا ہے، یہ بھی موصوف کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"قرآن نے معاشی زندگی کے لیے ارض کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے اور آفاقی قوانین کو جو کائنات میں جاری و ساری ہیں سماء کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔"[۳]

د اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز قائم کرنے کے بارے میں موصوف کیا تحقیق جھاڑتے ہیں، ان کے ہی لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"مجوسیوں کے ہاں پرستش کی شکل کو نماز کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ انہی کا ہے..... لہٰذا صلوٰۃ کی جگہ نماز نے لے لی۔"[۴]

"اب اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا صحیح مفہوم سامنے آسکتا ہے یعنی معاشرے میں ایسی فضا پیدا کر دی جائے جس سے ہر فردِ معاشرہ ان مستقل اقدار کو اپنے اندر سموتے ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اپنے دل کی مرضی اور خدا کی خوشنودی سے دوسروں کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کی فکر میں لگ جائے۔ قرآن نے اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃ کا لازمی نتیجہ یہی بتایا ہے۔"[۵]

"جہنم والوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا جرم کیا تھا، جس کی وجہ سے تمہاری

---

[۱] مسٹر پرویز، اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۲۹ — [۲] ایضاً، ص ۳۳

[۳] ایضاً، ص ۵۵ — [۴] مسٹر پرویز، قرآنی فیصلے، ص ۱۴۰

[۵] مسٹر پرویز، نظامِ ربوبیت، ص ۱۹۰، ۱۹۱

یہ حالت ہوگئی ؟ وہ کہیں گے ہم مصلی نہیں بنے تھے (قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ○ ۷۴:۴۳) یعنی ہماری کیفیت یہ تھی کہ ہم اُن لوگوں کے لیے سامانِ پرورش نہیں فراہم کرتے تھے جو حرکت سے محروم ہوگئے تھے۔"[1]

زکوٰۃ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے موصوف نے ایک عجیب سوال بھی کردیا ہے۔ دونوں باتیں خود اُن کے لفظوں میں ملاحظہ ہوں:

"یہ حکم کہ زکوٰۃ دو، قرآن میں اور یہ حکم کہ زکوٰۃ بشرح ڈھائی فیصدی دو، قرآن سے باہر کیا ...... اِس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا؟"[2]

واقعی زکوٰۃ کی شرح قرآن سے باہر ہے اور اس کے بیان کردینے سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ بھی نہیں تھا لیکن مسٹر پرویز نے ایمان اور توحید سے لے کر چھوٹے مسائل تک قرآن کریم کی تمام اصطلاحوں کو جو من مانے مفہوم و مطالب کا جامہ پہنا دیا ہے، کیا اِن کے متعلق قرآن کریم کے اندر ذرا بھی کوئی اشارہ پایا جاتا ہے کہ واقعی فلاں اصطلاح کا یہی مفہوم ہے جو پرویز صاحب بیان کر رہے ہیں۔ ہم پُوری ذمّہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ اپنے بیان کردہ مطالب کی تائید قرآن مجید سے ہرگز پیش نہ کرسکیں گے۔ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ○ یہ کیا قیامت ہے کہ کائنات کی سب سے بزرگ ترین ہستی، جس پر کلامِ الٰہی نازل ہوا وہ قرآن کریم کی کسی اصطلاح کا مفہوم بتائیں تو پرویز صاحب کے نزدیک ناقابلِ قبول اور ناقابلِ یقین لیکن خود جو اَٹ سَنٹ معانی گھڑ کر پیش کریں اُن کی صحت و صداقت کا ایسے وثوق سے ساتھ ڈھنڈورا پیٹتے ہیں جیسے اللہ رب العزت نے انھیں بتایا ہو کہ واقعی میری نازل کردہ آیات کے حقیقی معانی یہی ہیں۔ موصوف نے کتنے دھڑلے اور بیباکی کے ساتھ مسلمانوں سے یہ سوال کیا ہے کہ:

"رسول اللہ سے بہتر کوئی شخص قرآن کو نہیں سمجھتا لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن

---

[1] مسٹر پرویز: نظامِ ربوبیت، ص ۱۹۲ [2] مسٹر پرویز: سلیم کے نام خطوط، ص ۳۷

کی جو تفسیر رسول اللہ نے فرمائی وہ آج ہے کہاں ! [۱]

جو سوال پرویز صاحب مسلمانوں سے کر رہے ہیں اگر یہی کچھ مسلمان اُن سے مطالبہ کریں کہ کیا آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ قرآنی تفسیر ہے ؟ یقیناً پرویز صاحب کا جواب نفی میں ہوگا۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف آیاتِ قرآنیہ کے جو مفہوم و مطالب بتا رہے ہیں اُن کے بارے میں کیا ثبوت ہے کہ وہ رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ تفسیری بیانات کے بالکل مطابق ہیں اور اُن کے مخالف یا من گھڑت نہیں ہیں ؟ موصوف نے بعض قرآنی الفاظ کے مفہوم و مطالب کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"قیامت کے قرآنی مفہوم کے لیے مشعلِ راہ کی آخری جلد کا انتظار فرمائیے " [۲]

"قصۂ آدم کے صحیح مفہوم کے لیے جلد دوم باب آدم دیکھیے " [۳]

"ثواب کے قرآنی مفہوم کے لیے دیکھو میرا مضمون نجات مدت " [۴]

"جنت اور جہنم کے قرآنی مفہوم کے متعلق ..... دیکھیے میرے مقالات نجات مدت " [۵]

"قرآن کے نظامِ صلوٰۃ کی تفصیل کے لیے مشعلِ راہ کی آئندہ جلد کا انتظار فرمائیے " [۶]

پرویز صاحب نے مسلمانوں پر تو یہ حجت قائم کرنے کی کوشش فرمائی تھی کہ زکوٰۃ کی شرح بیان کر دینے سے کیا قرآن کا حجم بڑھ جاتا ؟ مسلمان بھی اُن سے یہی سوال کرتے ہیں کہ پرویز صاحب بتائیے تو سہی کہ قیامت ، ثواب ، جنت و دوزخ اور نظامِ صلوٰۃ وغیرہ قرآنی اصطلاحوں کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ اپنے آخری پیغام میں وہی کچھ بیان کر دیتا جو آپ بیان کر رہے ہیں تو کونسا حجم بڑھ جاتا ؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے بیان کردہ مفہوم و مطالب قطعاً قرآن کریم میں بیان نہیں فرمائے تو آنجناب کس خوشی یا خوش فہمی میں کلامِ الٰہی کے اندر معنوی تحریف کر کے اُدھم

---

[۱] مسٹر پرویز ، مقامِ حدیث ، ص ۸

[۲] مسٹر پرویز ، اسبابِ زوالِ امت ، طبع ۴۴

[۳] ایضاً ، ص ۴۸

[۴] ایضاً ، ص ۱۱

[۵] ایضاً ، ص ۱۱

[۶] ایضاً ، ص ۱۱۰

نسب الٰہی قرار دے رہے ہیں اور ادھر بھولے بھالے مسلمانوں کی بے خبری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر
انہیں گمراہ کر رہے ہیں!

اگر مسٹر پرویز کی طرح کسی سیاستدان کو تحقیق کا شوق چرائے اور وہ قرآن دانی کا مدعی بن کر
کہنے لگے کہ ایمان سے وزارت کا حصول، اقامِ الصلوٰۃ سے پارٹی کا استحکام، ثواب سے
ووٹ کا ملنا، جنّت و دوزخ سے ہار جیت اور قیامت سے مراد وزارت سے معزول ہونا ہے
اسی طرح ایک لیبر لیڈر پکارنے لگے کہ ایمان سے کارخانے ہونا، اقامتِ صلوٰۃ سے کوٹھیوں کاروں
کا حصول، ثواب سے قارونی دولت، جنّت و دوزخ سے مزدوروں کا خوش رہنا یا ہڑتال
کر دینا اور قیامت کا مطلب کارخانوں کا قومی ملکیت میں چلے جانا ہے یا کوئی مزدور کہے کہ
ایمان سے نوکری ملنا، اقامتِ صلوٰۃ سے مالک کا کام سے خوش ہونا، ثواب سے مزدوری کا
زفت مل جانا، جنّت و دوزخ سے نوکری میں کمی بیشی اور قیامت سے مراد نوکری سے جواب
مل جاتا ہے تو ایسے حضرات کی ذہنی تک بندیوں اور مسٹر پرویز کے سراسر عقلی ڈھکوسلوں
میں آخر فرق کیا ہوگا!

قرآن کریم کے مفہوم و مطالب میں مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے ساتھ ساتھ پرویز صاحب نے
دوسرا میدان حدیث کی مخالفت کو بنایا جس کے جواب میں علمائے کرام بہت کچھ لکھ چکے ہیں تیسرا
میدان تحریک پاکستان کا منتخب کیا ہوا ہے، جس کو لے کر پاکستانی باشندوں کو مغالطے میں مبتلا
کرنا بھی موصوف کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کے ایک پیروکار چودھری حبیب احمد صاحب نے
بھی اپنی تصنیف تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء میں یہی تاثر پیش کیا ہے۔ دیندار طبقے
سے اہلِ دین کو متنفر کرنے کی خاطر پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ:

"غیروں کی حکومت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہیں رہ سکتا۔ آپ
احباب کو معلوم ہے کہ تحریک پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے
مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت دین اور مذہب کی وہی
کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز باہمدگر ستیزہ کار چلی رہی ہے۔"[1]

---

[1] مسٹر پرویز: بہار نو، ص ۲۷

آگے موصوف نے مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آپ نے غور فرمایا کہ تحریک پاکستان کی کشمکش کس طرح درحقیقت دین و مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز ستیزہ کار چلی آرہی ہے۔ مذہبی طبقہ کی اس قدر مخالفت کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا اور اس کے ساتھ ہی مخالفین کا لشکر بھی ادھر اُمنڈ آیا۔ اب وہی کشمکش پندرہ سولہ برس سے یہاں بھی جاری ہے۔ اس طبقہ کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پائے۔ اس کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ اولاً یہاں مذہبی تھیاکریسی قائم ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس انداز کی سیکولر حکومت قائم ہو جائے جس میں پبلک لاز حکومت کے ہاتھ میں رہیں اور پرسنل لاز مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں"[1]

ان عبارتوں میں پرویز صاحب نے دل کھول کر دھاندلی کی ہے۔ چند ایک کی نشان دہی کرتا ہوں:

اولاً: دین اور مذہب کی من مانی تعبیریں کر کے خود کو دین کا پیروکار اور مسلمانوں کو محض مذہب کے پرستار قرار دے دیا۔ حالانکہ نہ دین و مذہب میں کوئی تفریق ہے نہ پرویز کو دین سے کوئی سروکار، نہ مسلمانوں میں کوئی دین سے بیزار اور کسی غلط مذہب کا پیروکار۔

ثانیاً: سب مسلمانوں کو تحریک پاکستان کا مخالف قرار دے دیا، یہ ہمالیہ پہاڑ سے بھی بڑا مغالطہ ہے۔ تحریک پاکستان کی مخالفت صرف ان علماء نے کی تھی جو گاندھی کے پرستار تھے یعنی نیشنلسٹ علماء، جن میں جمعیۃ العلمائے ہند اور احراری وغیرہ حضرات شامل تھے یہ ملت اسلامیہ کے لیے مسٹر پرویز کی طرح ہمیشہ مار آستین ہی رہے تھے۔ مسلمانوں کے سواد اعظم یعنی اہلسنت وجماعت نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا، یہی حضرات اس تحریک کا علم بلند کرنے والے اور یہی اسے ساحلِ مراد تک پہنچانے والے تھے۔ جنہیں گرا[illegible] نے بریلوی فرقہ کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے حالانکہ یہ وہی قدیم جماعت ہے جسے اہل[illegible]

---

[1] مسٹر پرویز، بہار نو، ص ۲۷۱

نے اپنے آخری پیغام میں حزب اللہ اور اُمّتِ وسطیٰ کہا ہے اور فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
نے جس کی مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ کے لفظوں سے تخصیص فرمائی اور اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَم
سے جس کی پہچان بتائی ہے۔ جس کے علمی و عملی اور تبلیغی و مجاہدانہ کارناموں سے دنیا جگمگا رہی ہے
اور خدا کا آخری پیغام دنیا کے ہر گوشے میں پہنچا اور جو ہمیشہ کفر کا غرور توڑتے آئے اور طاغوتی
طاقتوں کے مقابلے پر ایسی مضبوط چٹان ثابت ہوتے رہے کہ ان کے سائے میں مار آستین
ثابت ہونے والے گمراہ گروں کو بھی آرام سے بیٹھنا نصیب ہوتا رہا ورنہ دنیا سے کفر کے مقابلے
پر اہلحدیث، دیوبندی، نیچری، پرویزی اور شیعہ وغیرہ حضرات نے اپنی پوری تاریخ میں کون کون سے
ملکوں میں اسلام پھیلایا؟ کفر کی طاقتوں سے کتنی دفعہ ٹکر لی؟ جواب صفر۔ اہلسنت و جماعت کو
ایک جانب رکھ دینے کے بعد باقی سارے فرقے دیکھیں کہ کافروں، غیر مسلموں کے مقابلے پر اُن
کی جمعیت و طاقت کیا ہے؟ کیا کافروں کے حلقے میں اُن کی ایک ایک ہڈی بھی آتی ہے؟
اہلسنت کا سایہ ہٹتے ہی کیا کچے نہ چبا لیے جائیں گے؟

پرویز صاحب! اسی اہلسنت و جماعت کے پانچ ہزار مشائخ و علماء سُنی کانفرنس کے
اجلاس منعقدہ ۲۷ تا ۳۰ اپریل میں بنارس کے مقام پر اکٹھے ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ سے زائد
سُنی مسلمانوں کی موجودگی میں تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا تاریخی اعلان فرمایا۔
علی الاعلان کہہ دیا کہ برطانیہ کے سارے خود کاشتہ پودے یعنی تمام فرقے پاکستان کی مخالفت
پر کمربستہ ہوگئے تو مذکورہ کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں متفقہ اعلان کیا گیا کہ سُنی مسلمان پاکستان
بنا کر رہیں گے اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک پاکستان معرضِ وجود میں
نہ آجائے۔ حتیٰ کہ پیر مانکی شریف نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مسلمانانِ اہلسنت و جماعت
پاکستان بنانے پر کمربستہ نہ ہوتے تو مسٹر جناح کے ساتھ تھا کون! کون مسلم لیگ کا جھنڈا
اٹھاتا اور کہاں اس کا دفتر قائم ہوتا؟ بلکہ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ
علیہ نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ مسٹر جناح بھی اگر مطالبۂ پاکستان سے دست بردار ہونا چاہیں تو
ہو سکتے ہیں لیکن سُنی مسلمان پاکستان بنا کر ہی دم لیں گے۔ غرضیکہ تمام علماء اور مشائخ نے
تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پیرانِ عظام نے اپنے ہزاروں اور لاکھوں مریدوں کو

مطالبۂ پاکستان کا منہ بولتا اشتہار بنا دیا۔ اکیلے حضرت امیر ملت، پیر حافظ جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے چالیس لاکھ مریدوں سمیت حمایت پر کمربستہ تھے اور تحریک پاکستان کامیابی سے ہمکنار کرنے کی خاطر دن رات ایک کر دیے۔ کیا مسٹر پرویز اینڈ کمپنی ان بزرگوں سے کسی ایک بزرگ کے برابر پاکستان کی تحریک میں اپنا حصہ ثابت کر سکتے ہیں؟ جانے دیجیے پاکستان کی بنیاد پر جو الیکشن ہوا اور مسلم لیگ نے سو فیصد کامیابی حاصل کی، کیا مسٹر پرویز ثابت کر سکتے ہیں کہ اُن میں سے ایک ممبر بھی ایسا ہے جو پرویزی حضرات کے ووٹوں سے کامیاب ہوا ہو؟ مسٹر پرویز اور پرویزی حضرات ہمیں بتا سکتے ہیں کہ اہلسنت وجماعت کے مقابلے پاکستان کے لیے ان کی قربانیوں کا تناسب کیا ہے! سوائے اس کے وُہ اور کیا کارنامہ دکھائیں کہ چند سٹ علماء کے خلاف لکھے ہوئے چند بیانات دکھا دیں گے، حالانکہ وُہ علماء بھی امت محمد کے لیے ہمیشہ اپنی تاریخ میں پرویز صاحب کی طرح مارِ آستین ہی بن کر رہے ہیں۔ اپنے چند صفحات لکھنے کی یہ قدر و قیمت اور ملتِ اسلامیہ کے اتنے عظیم الشان کارنامے، بے شمار جانی اور مالی قربانیوں سے یوں آنکھیں بند بلکہ دشمنِ دین و ملت قرار دینے کے پابند،

؎ شرم تم کو مگر نہیں آتی

ثالثاً: پرویزی حضرات نے کس روز انگریزوں یا ہندوؤں سے مقابلہ کیا۔ اگر آپ حضرات کی جانب سے ایسا ایک لفظ بھی منہ سے نکلتا تو اس پورے ٹولے کو برٹش گورنمنٹ یا ہندو اکثریت ایک پرکاہ یا کسی مکھی اور مچھر کے برابر بھی تو اہمیت نہ دیتی۔ لیکن یہ ٹولہ پاکستان کی تحریک اور دین کا عَلَم بردار بنتا ہے جو دین کے ابجد سے بھی واقف نہیں اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو دین و دیانت سے پیچھا چھڑا کر، آنکھیں بند کر کے تحریک پاکستان کا مخالف بتلا دیا۔ کیا پرویز صاحب یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ اُن سے تحریک پاکستان یا مملکت پاکستان کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟ دین سے بغاوت کرنے والے چند سرپھرے ملک و ملت کا کیا بھلا کر سکتے ہیں؟

رابعاً: موصوف کا لکھنا کہ "اس طبقہ کی انتہائی کوشش ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پائے" ایسے عالم آشکار میں قطعاً سفید جھوٹ اور نری گپ ہے۔ مسلمان تو دل و جان سے

ﮯ ہیں کہ یہاں قرآن کریم کی حکومت ہو جائے، قرآن وسنّت کا آئین رائج ہو جائے، نظامِ مصطفیٰ
ؐ ہو جائے، خلافتِ راشدہ کے قوانین نافذ ہو جائیں۔ اگر قرآن کی حکمرانی سے پرویز صاحب
راد اپنے ذاتی خیالات ہیں تو ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ پرویز صاحب جیسے دشمنِ قرآن کریم کے خیالات
ا اسلامیہ پر حاوی ہوں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ :

ع ایں خیال است و محال است و جنوں

پرویز صاحب نے علامہ اقبال کو اپنے خیالات کا داعیِ اوّل، اپنی غیر اسلامی تحریک کا علمبردار
ٹھہرا کر اُن کی عقیدت کا دامن سنبھالا ہوا ہے۔ یہ پرویز صاحب کی دھوکے بازی کا چوتھا نمونہ ہے
یکہ شاعرِ مشرق علامہ سر محمد اقبال، سُنّی مسلمان اور ایک عظیم مفکر تھے۔ پرویزیت سے موصوف کا
ئی واسطہ نہیں تھا۔ کفرزارِ ہند کے قلب میں بیٹھ کر اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کرنے والے سلطان الہند
معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شاعرِ مشرق نے کہا تھا :

ع چشتی نے جس چمن میں پیغامِ حق سُنایا

ت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار یُوں
تھا :

ے وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

ا جلال الدین رومی صاحبِ مثنوی کو علامہ اقبال نے اپنا پیر قرار دے کر پیرِ رومی اور اپنے لیے
ہندی کہا اور مولانا روم سے ڈاکٹر اقبال اتنے متاثر تھے کہ بصد حسرت و یاس کہا کرتے تھے :

ے نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وُہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

مہ اقبال بزرگانِ دین کو پیغامِ حق سنانے والے اور سرمایۂ ملّت کے نگہبان قرار دے رہے ہیں
بجیسے اور پیدا ہونے کی دُعائیں کرتے تھے لیکن پرویز صاحب ایسے علامہ اقبال کے عاشق ہیں
علامہ کے ممدوحین کو دین کے دشمن اور مذہب کے پرستار بتا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دین و
نت نصیب فرمائے (آمین)

۸۔ شیعہ حضرات

شیعہ فرقے کا ظہور ایک یہودی سازش ہے۔ عبداللہ ابن سبا یہودی پہلے ہی دل میں اسلام کی عداوت سے سرشار ہو کر ازراہِ منافقت مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں سے دھتکارے جانے کے بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وافر عقیدت کا دم بھرنے لگا۔ اِس لحاظ سے شیعانِ علی نے سر آنکھوں پر جگہ دی۔ اپنے مخصوص حلقے میں پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت کا شوشہ چھوڑا اور اس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب و شتم کا دروازہ کھولا۔ جب ان دونوں قسم کے خیالات بعض حضرات نے قبول کر لیے اور اُس کا ایک حلقہ قائم ہو گیا تو اصحابِ ثلاثہ اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر زبانِ طعن دراز کرنی شروع کر دی اور یہ دعویٰ کر دیا کہ خلافت بلافصل درحقیقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق تھا، جن لوگوں نے اُنھیں اِس حق سے محروم کیا وُہ غاصب، اہلِ بیت کے دشمن اور مسلمانوں کے بدخواہ ہیں۔

اُس بدبخت عبداللہ ابن سبا کے اِس پروپیگنڈے سے بعض لوگ ایسے متاثر ہوئے کہ اُن ظالموں نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خونِ ناحق اپنے سر لے کر دارین کی روسیاہی خریدی۔ اِس حادثۂ فاجعہ سے خلافت کی آب و تاب جاتی رہی اور ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ کچھ اِس طرح منتشر ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے زیرک ترین اور قابلِ فخر و عدیم المثال مدبر کے سنبھالے بھی نہ سنبھل سکا، حتیٰ کہ ایسے ہی حالات میں ایک بدبخت سبائی ابنِ ملجم کے قاتلانہ حملے سے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جنت الفردوس میں تشریف فرما ہوئے۔

عبداللہ ابن سبا کے پروپیگنڈے نے شیعانِ علی کو عجیب موڑ پر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں تک حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں زبان کھولنے کا تعلق ہے تو اِس کی حسبِ منشا صحابۂ کرام کیلئے اُس وقت گنجائش موجود تھی لیکن اصحابِ ثلاثہ اور ازواجِ مطہرات سے بدظنی اور سب و شتم بھلا کوئی مسلمان کس طرح برداشت کر سکتا ہے۔ اکثر مسلمان حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت وحمایت پر متفق ہیں لیکن شیعانِ علی کی مذکورہ کرتوت سے نالاں تھے۔ یُوں خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ

ا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حامیوں کو اُس مکار یہودی کی سازشوں نے ایک مرکز پر جمع نہ ہونے دیا،
کے باعث وہ اپنے مخالفین پر، جنہیں اسی سازش نے خلیفۂ وقت کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا،
ی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ شیعانِ علی کی اسی سازش سے تنگ آ کر حضرت امام حسن رضی اللہ
ی عنہ نے مسندِ خلافت پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سمجھوتا کر لیا۔ اسی صورتِ حال کی بدولت
لگوں نبا استیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے خانوادے پر شیعانِ علی کے ہاتھوں
ن کربلا میں قیامت گزر گئی۔ یہ گروہ اس ٹولے کی اہلِ بیت و ائمۂ اطہار سے عقیدت کے عدیم النظیر
ملے۔ اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات اُس نہج البلاغت کتاب سے
یکیے جاتے ہیں جو شیعہ حضرات کے نزدیک اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ ایک مکتوبِ گرامی
امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، جس کا قارئین کی سہولت کے پیشِ نظر صرف
پیش کرتا ہوں، عربی کے شائق اصل کتاب کی جانب رجوع کریں۔

"میں خدا سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس گروہ سے جلدی دُور کر دے۔ خدا کی قسم اگر
دشمن سے مقابلے کے وقت مجھے شہادت کی جانب رغبت نہ ہوتی اور اپنی جان کو
جان آفریں کے سپرد کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار نہ رہتا، تو میری آرزو یہ ہے
کہ ایک روز بھی اس گروہ کے ساتھ نہ رہوں اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملوں۔"[1]

ے ایک خطبے میں حضرت امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے شیعہ گروہ کے بارے میں
ں اظہارِ خیال کیا،

"خدا کی قسم جو دلوں کو مردہ کر دیتا ہے اور عقل و فہم کو کھینچ لیتا ہے، میں اُن کا
باطل پر اجتماع اور تمھاری حق پر پراگندگی دیکھتا ہوں۔ خدا تمھیں ذلیل و رُسوا کرے
کہ تم از خود تیروں کا نشانہ بن گئے۔ لوگ تمھیں غارت کرتے ہیں اور تم سے کچھ
نہیں بن پڑتا، لوگ تم پر جہاد کرتے ہیں لیکن تم جہاد سے عاری ہو گئے اور خدا کی
نافرمانی تمھیں خوش کرتی ہے۔ جب میں اُن پر یلغار کرنے کے لیے تم سے گرمی
میں کہتا ہوں تو گرمی کی شدت کا عذر پیش کر دیتے ہو اور موسمِ گرما نکلنے تک

---

[1] حضرت علی، خلیفۂ چہارم، نہج البلاغت بحوالہ تحفہ اثنا عشریہ، ص ۱۸۲

مہلت مانگتے ہو۔ جب سردی میں تم سے جہاد کرنے کو کہتا ہوں تو سردی کی شدت کا بہانہ بنا کر سردیاں گزرنے تک کی مہلت طلب کرتے ہو۔ یہ تمھارا سردی گرمی سے بھاگنا ہے تو خدا کی راہ میں تلوار اٹھانے سے تو امکان بھر بھاگو گے۔ تم مردوں کی شکل میں نامرد، بچوں جیسی عقل والے اور زیور پہننے والی عورتوں کی مانند ہو۔ میری انتہائی کوشش یہی ہے کہ تمھاری شکل بھی نہ دیکھوں اور تم میرے لیے انجانوں کی طرح ہو جاؤ۔" [1]

اسی خطبے میں مولا مشکل کشا، شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تاثرات کا یوں بھی اظہار فرمایا:

"تمھیں خدا ہلاک کرے بے شک تم نے میرے دل کو پیپ سے اور میرے سینے کو غصّے سے بھر دیا ہے۔ تم نے مجھے پے در پے رنج و غم کے جام پلائے۔ تم نے ترکِ خلافت اور حکم عدولی کے ذریعے میری تمام تدبیروں کو خاک میں ملا دیا، یہاں تک کہ قریش یہ کہنے لگے کہ بیشک ابو طالب کا بیٹا جری اور جانباز ضرور ہے لیکن فوجوں کو لڑانے کے قواعد سے نابلد ہے کہ مخالفین پر قابو پائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت میدانِ جنگ کا مجھ سے بڑھ کر آزمودہ کار کون ہے؟ جب میں نے عمر کی بیس منزلیں بھی طے نہیں کی تھیں اس وقت سے میدانِ ضرب و حرب میں قدم رکھا ہے حالانکہ اب میری عمر ساٹھ سال سے بھی تجاوز کر گئی ہے لیکن جس امیر کا حکم نہ چلے اُس کی تدابیر کیا رنگ دکھا سکتی ہیں؟" [2]

دوسرے خطبے میں صاحبِ ذوالفقار، شہ دلدل سوار نے اپنے ساتھیوں کی جوانمردیوں کا تذکرہ یوں فرمایا:

"میں کہاں تک تمھاری حفاظت اس طرح کروں جیسے نازک بدن کمسن عورتوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ کہاں تک تمھیں پرانے کپڑے کی طرح سنبھالوں

---

[1] حضرت علی، خلیفۂ چہارم: نہج البلاغت بحوالہ تحفۂ اثنا عشریہ، ص ۱۸۲

[2] ایضاً، ص ۱۸۳، ۱۸۴

> جسے ایک طرف سے سیا جاتا ہے تو دوسری جانب سے پھٹ جاتا ہے۔ جب سرداران شام سے کوئی سردار تم پر یلغار کرتا ہے تو تم اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے ہو اور اپنے گھروں میں اس طرح گھس جاتے ہو جیسے گوہ اپنے سوراخ میں گھس جاتی ہے یا بجو اپنے بھٹ میں داخل ہو جاتا ہے۔"[1]

یہ ہے ان حضرات کی ائمہ اطہار سے عقیدت کہ زندگی میں تو سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفاقت کا دم نہ بھرا، جھوٹے وعدے کر کے عقیدت کا ڈھول بجاتے رہے، وقت آنے پر انجان بن جاتے۔ شیعہ حضرات کی اس منافقت نے شیر خدا کو ایک دن بھی آرام سے کارِ خلافت انجام دینے کی مہلت نہ دی اور ان جھوٹے عقیدت مندوں کی دھوکے بازی سے اسلام کا وہ جلیل القدر اور خدا کا عدیم النظیر شیر خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود اپنے ہی ایک صوبے پر تا زیست قابو نہ پا سکا۔ لیکن ان کی وفات سے لے کر آج تک انھیں بلافصل خلافت دلانے اور وصی رسول بنانے کی مہم چلائے ہوئے ہیں، جیسے سب کر کچھے وکیل کر آج انھیں تختِ خلافت پر بٹھا کر ہی دم لیں گے۔ وقت گزرنے پر حمایت کی ہانڈی میں ایسا ابال اور دورِ خلافت میں حمایت و غیرت کا اس درجہ کال۔ جب حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمایت کرنے، جانبازی دکھانے کا وقت تھا تو روپوشی میں کامل ہو گئے۔ شیرِ خدا کا وصال ہوا تو یہی حضرات اگلی کٹا کر حمایتی شہیدوں میں آشامل ہوئے۔ بعدہٗ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حمایت کا یقین دلا کر خلافت پر آمادہ کر لیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مقابلہ کرنے ایک لشکر جرار نکل کھڑا ہوا۔ امام عالی مقام کے سامنے ان حمایتیوں کا دوغلا پن اپنے اصلی رنگ روپ میں موجود تھا۔ اپنے والد محترم کے ساتھ ان کا سلوک دیکھ چکے تھے، لہٰذا ان کی حمایت پر امیر معاویہ سے صلح کرنے اور خلافت ان کے سپرد کر دینے کو ترجیح دی۔ گویا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ان کی جھوٹی حمایت کے دعووں کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تھوڑی دیر کے لیے ان لوگوں کی حمایت کے بلند بانگ دعاوی کو ذرا سی اہمیت

---

[1] حضرت علی بطلیۂ چہارم، نہج البلاغت بحوالہ تحفۂ اثنا عشریہ، ص ۱۸۵، ۱۸۶

دے دی۔ امام مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر اپنی بیعت کرنے والوں کو اپنا حمایتی سمجھ لیا۔ تو اِن حمایتی حضرات کے ہاتھوں گلستانِ مرتضیٰ کے ہر گل ٹوٹے اور چمنستانِ زہرا کی بے کھلی کلیوں پر بھی بیتا کربلا میں جو قیامت گزر گئی وہ شیعانِ علی کے ماتھے پر ایسا اَنمٹ داغ ہے جو قیامت تک اِن ماتم کرنے، آنسو بہانے اور حمایتِ اہلِ بیت کے فرضی ڈھول پیٹنے سے مٹ نہیں سکتا۔ دستِ پر بیعت کرنے والوں کے گھروں میں امام مسلم اور ان کے بچوں کو پناہ تک نہ مل سکی۔ اُن بے گناہ کے لاشے اِن حمایتیوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے لیکن حمایتی (اِس درجہ سنگ بلکہ سیاہ دل بلکہ دوستی کے پردے میں دشمنی سے بھرپور تھے کہ کسی پھوٹی آنکھ میں آنسو نہ آیا حالانکہ اب ماتم کرتے پھرتے ہیں، کسی بدبخت کی زبان سے ہمدردی کا ایک کلمہ نہ نکلا حالانکہ قیا گزرنے کے بعد حمایت میں سینے پھاڑ پھاڑ کر چلاتے آ رہے ہیں۔ کربلا میں قیامت گزر رہی تھ لیکن حیدرِ کرّار کا دارالخلافہ خاموش ہی نہیں تھا بلکہ شہیدانِ کربلا کے خلاف صف آرا تھا۔ وقت آ پر شیعانِ علی نے امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بچوں کو تہِ تیغ کرنا یزید، ابن زیاد اور شمر کا ساتھ دے کر گلشتِ زہرا کو پامال کرنا ہی اہلِ بیت کی محبت کا تقاضا سمجھ

؎ بھلانے پہ بھی قصۂ عہدِ ماضی
بھلایا نہ جائے گا تم سے نہ ہم سے

انکارِ قرآن مجید

شیعہ حضرات کے متقدمین و متاخرین قرآن کریم کی صحت کے منکر اور اسے تحریف شدہ بتاتے نیز بیاضِ عثمانی ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ ان حضرات کی مشہور و معروف کتاب اصولِ کافی، جو صحاحِ اربعہ میں شمار کی جاتی ہے، اس کی روایت ملاحظہ ہو۔

عن جابر قال سمعت اباجعفر	جابر سے روایت ہے کہ میں نے امام محمد باقر سے سنا کہ
یقول ما ادعی احد من الناس	لوگوں میں کذاب کے سوا کوئی یہ دعویٰ نہیں کرے گا کہ جتنا قرآن
انه جمع القرآن کله کما انزل الا	نازل ہوا تھا وہ سب جمع کر لیا گیا ہے۔ قرآن کو علی بن ابی طالب
کذاب وما جمعه وحفظه کما نزله الله	اور ان کے بعد والے ائمہ کے سوا کسی نے اُس طرح جمع اور محفوظ
الا علی بن ابی طالب والائمة من بعده[1]	نہیں کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُسے نازل کیا۔

[1] ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی، اصولِ کافی، مطبوعہ نولکشور، ۱۹۰۲ء، ص ۳۹

شیعہ حضرات کے نزدیک جو قرآن مکمل اور معتبر ہے اُس کی آیات کی تعداد کے بارے میں یہ روایت ملاحظہ ہو:

عن هشام بن سالم عن ابی عبد الله علیه السلام قال ان القرآن الذی جاء به جبرائیل علیه السلام الی محمد صلی الله علیه وآله وسلم سبعة عشر الف آیة۔[1]

ہشام بن سالم ، امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا ، جس قرآن کو جبرئیل علیہ السلام ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر آئے تھے ، اُس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں۔

شیعہ حضرات کے بلند پایہ مفسر ، علامہ محسن کاشی نے تفسیر عیاشی کے حوالے سے تحریفِ قرآن کے متعلق لکھا ہے:

فی تفسیر العیاشی عن ابی جعفر قال لولا انه زید فی کتاب الله ونقص منه ما خفی حقنا علی ذی حجی ولو قد قام قائمنا صدقه القرآن وفیه عن ابی عبد الله علیه السلام لو قرئ القرآن کما انزل لالفیتنا فیه مسمین۔[2]

تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام جعفر نے فرمایا کہ اگر قرآن میں کمی بیشی نہ کی ہوتی تو ہمارا حق کسی عقلمند پر پوشیدہ نہ رہتا اور اگر ہمارے امام قائم علیہ السلام ظاہر ہو کر رہیں تو قرآن اُن کی تصدیق کرے اور اسی میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے کہ اگر قرآن وہ پڑھا جائے جو نازل ہوا تو اس میں ہمارا ذکر نام بنام ملے۔

محققین شیعہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ موجودہ قرآن تحریف شدہ ہے۔ چنانچہ اسی تفسیر صافی میں تصریحاً لکھا ہے:

اما اعتقاد مشائخنا رحمهم الله

ہمارے مشائخ رحمہم اللہ کا اعتقاد اس بارے میں

---

[1] محمد بن یعقوب کلینی ، اصول کافی ، کتاب فضل القرآن ، ص ۶۷

[2] محسن کاشی ، تفسیر صافی ، ص ۱۱

في ذلك فالظاهر من ثقة الاسلام محمد بن يعقوب الكليني طاب ثراه انه كان يعتقد التحريف والنقصان في القرآن لانه روى روايات في هذا المعنى في كتابه الكافي ولم يتعرض لقدح فيها مع انه ذكر في اول الكتاب انه يثق بما رواه فيه وكذلك استاذه علي بن ابراهيم القمي فان تفسيره مملوء منه وله غلو فيه وكذلك الشيخ احمد بن ابي طالب الطبرسي قدس سره ايضاً نسج على منوالهما في كتاب الاحتجاج۔ ؎

یہ ہے کہ ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی طاب ثراہ کی نسبت یہ واضح ہے کہ وہ قرآن میں تحریف نقصان کے قائل تھے کیونکہ انہوں نے اسی مضمون کی کتنی ہی روایتیں اپنی کتاب کافی میں نقل کی ہیں اور اُن پر کوئی اعتراض وارد نہیں کیا، بلکہ اپنی کتاب کے شروع میں لکھ دیا کہ اس کتاب میں جو حدیثیں نقل ہو رہی ہیں اُن کی صحت پر وثوق ہے اور اسی طرح اُن کے استاذ علی بن ابراہیم قمی بھی تحریف پر یقین رکھتے تھے کیونکہ اُن کی تفسیر تو ایسی روایتوں سے پُر ہے اور اُن کو اس عقیدے میں غلو بھی ہے اور اسی طرح شیخ احمد بن ابو طالب طبرسی قدس سرہٗ بھی تحریف کے قائل تھے کیونکہ اپنی کتاب الاحتجاج میں وہ بھی ان دونوں حضرات کے نقش قدم پر چلے ہیں۔

شیعہ حضرات نے تمام مسلمانوں کو غیر مسلم ٹھہرانے کی خاطر بڑے شدومد سے یہ بھی تو کہہ دیا کہ موجودہ قرآن کریم تحریف شدہ ہے اور اپنے مقصد کی تائید میں حدیثیں بھی گھڑ کر اپنی کتابوں میں شامل کرلیں لیکن اس سے شیعہ حضرات کو کون سی حقانیت کی سند مل گئی؟ اگر بقول اُن کے دوسروں کے پاس محرّف کلام الٰہی ہے تو روافض کے پاس کیا ہے؟ اُن کے پاس تو سرے سے کچھ بھی نہیں۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے مسلمان کہنے کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ اُن کے دین کا ماخذ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں روافض کا مضحکہ خیز موقف ملاحظہ ہو!

؎ محسن کاشی، تفسیر صافی، ص ۱۴

قال یا ابا محمد وان عندنا لَلجامعة وما یدریھم ما الجامعة قال قلت جعلت فداك وما الجامعة قال صحیفة طولھا سبعون ذراعا۔[1]

فرمایا امام جعفر صادق نے ، اے ابو محمد! بیشک ہمارے پاس ایک جامعہ ہے اور وہ کیا جانیں کہ جامعہ کیا ہے۔ میں نے کہا ! میں آپ پر قربان ، ارشاد فرمائیں کہ وہ جامعہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ ستر گز لمبا قرآن ہے۔

پتہ نہیں شیعہ حضرات نے اتنا لمبا چوڑا قرآن رکھا ہوا کہاں ہے ؟ اُسے اٹھاتا اور پڑھتا کون ہے ؟ کیا یہ ایسے عالم آشکار میں سفید جھوٹ اور نری گپ نہیں؟ اسے علمی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کہنا چاہیے یا اور کچھ ؟ اگر شیعہ حضرات ایسا قرآن نہ دکھا سکیں تو آن کے دعویٰ اسلام کا ثبوت اور ایمان کیسے مانے کی دلیل کیا ؟ اسی طرح کا حضرات شیعہ نے ایک قرآن اور گھڑا ہوا ہے۔ اُس کے بارے میں یہ روایت ملاحظہ ہو۔

وان عندنا لمصحف فاطمة علیھا السلام وما یدریھم ما مصحف فاطمة قال مصحف فیه مثل قرانکم ھذا ثلاث مرات والله ما فیه من قرانکم حرف واحد۔[2]

وامام نے فرمایا اور ہمارے پاس مصحفِ فاطمہ علیہا السلام ہے اور لوگ کیا جانیں کہ مصحفِ فاطمہ کیا ہے ؟ فرمایا وہ ایسا مصحف (قرآن) ہے جو تمہارے قرآن سے تین گنا ہے ۔ خدا کی قسم ، تمہارے قرآن کا اُس میں ایک لفظ بھی نہیں ہے۔

قرآن کریم عربی زبان میں ہے اور عربی کے اٹھائیس حروفِ تہجی ہیں جبکہ مصحفِ فاطمہ کے اندر ان میں سے کوئی حرفِ تہجی حسبِ روایت بالا استعمال نہیں ہوا ، تو اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ مصحفِ فاطمہ یقیناً عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہے۔ شیعہ علماء کو چاہیے کہ وہ اپنے مذکورہ قرآنوں کی تلاوت کیا کریں اور شیعہ عوام کو اپنے علماء سے ان قرآنوں کی زیارت کا ضرور مطالبہ کرنا چاہیے کیونکہ دین کا ماخذ قرآن ہے ، جب قرآن سے عمر بھر محروم رہے تو دین و

---

[1] محمد بن یعقوب کلینی ، اصولِ کافی ، ص ۲۳۹ [2] ایضاً ، ص ۲۳۹

ایمان کیسا؟

تحریف قرآن کے بارے میں شیعہ حضرات کا تفصیلی عقیدہ مندرجہ ذیل عبارت سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے:

المستفاد من مجموع هذه الاخبار وغيرها من الروايات من طريق اهل البيت عليهم السلام ان القرآن الذي بين اظهرنا ليس بتمامه كما انزل على محمد صلى الله عليه واله وسلم بل منه ما هو خلاف ما انزل الله ومنه ما هو مغير محرف وانه قد حذف عنه اشياء كثيرة منها اسم علي عليه السلام في كثير من المواضع ومنها لفظة آل محمد غير مرة ومنها اسماء المنافقين في مواضعها ومنها غير ذلك وانه ليس ايضاً على الترتيب المرضي عند الله وعند رسوله وبه قال علي بن ابراهيم۔[1]

ان تمام حدیثوں اور ان کے علاوہ جو دوسری روایتیں اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہیں، ان سے مستفاد ہے کہ جو قرآن ہمارے سامنے موجود ہے وہ سارا اس طرح نہیں ہے جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا، بلکہ اس میں بعض باتیں ما انزل اللہ کے خلاف ہیں اور بعض میں تغیر و تبدل کر دیا گیا ہے اور بے شک کتنی ہی باتیں اس سے حذف کر دی گئی ہیں جیسے کتنے ہی مقامات سے حضرت علی علیہ السلام کا نام اور کئی جگہ سے آل محمد کا لفظ اور متعدد جگہ سے منافقین کے نام اور ان کے علاوہ کئی چیزیں، علاوہ بریں اس کی ترتیب اللہ اور رسول کی پسندیدہ ترتیب کے مطابق نہیں۔ یہی خیالات علی بن ابراہیم کے ہیں۔

یہ ہے شیعہ حضرات کا قرآن کریم کے بارے میں واضح عقیدہ۔ ان حضرات کے معتمد و موقر اکابر سے

---

[1] محسن کاشی، علامہ: تفسیر صافی، ص ۳

ان چار حضرات ایسے ہیں جنہوں نے اپنے اکابر اور اپنی جماعت کے برخلاف عقیدۂ تحریف پر عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اُن کے نام یہ ہیں،

۱۔ ابی جعفر محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی الملقب بالصدوق (المتوفی ۳۸۱ھ)

۲۔ شیخ مفید، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ (المتوفی ۴۳۶ھ)

۳۔ شیخ الطائفہ، ابوجعفر محمد بن حسن طوسی (المتوفی ۴۶۰ھ)

۴۔ ابو علی طبرسی (المتوفی ۵۴۸ھ)

گویا چھ صدیوں میں شیعہ حضرات کے اندر ان چار کے علاوہ کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا، جس کا قرآن کریم کے حرف حرف پر عقیدہ نہ ہو۔ حالانکہ ان چاروں حضرات کی سارے شیعہ اکابر نے بے دردی سے نفی کی اور دیگر اکابر شیعہ نے جو تحریف قرآن کے بارے میں احادیث اپنی اُن مایۂ ناز کتابوں میں شامل کی ہوئی ہیں جن پر ان کے مذہب کا دارومدار ہے نیز اکابر اہل بیت و ائمہ دین کے تحریف قرآن کے متعلق بیانات نقل کیے ہوئے ہیں، اُن کے بالمقابل ان چاروں حضرات کے بغیر کسی دلیل کے، ذاتی اقوال و نظریات کی وقعت اور قدر و قیمت کیا ہے ؟ اللہ تعالیٰ رشد و ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

علاوہ بریں یہ چاروں حضرات بھی ہرگز اس بات کے قائل نہیں کہ موجودہ قرآن کریم وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر نازل فرمایا تھا، بلکہ اب کا عقیدہ بھی یہ ہے کہ اصلی قرآن تو واقعی سترہ ہزار آیات کا یا ستر گز لمبا ہی تھا، اس میں سے کتنی ہی سورتیں، آیتیں اور بعض آیتوں کے الفاظ صحابہ کرام نے حذف کر دیے تھے، اس طرح موجودہ قرآن ہے تو اسی قرآن منزل من اللہ کا حصہ لیکن یہ پورا اور مکمل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ چاروں حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ قرآن کریم کے الفاظ وہی ہیں جو اصلی قرآن کے تھے، اس میں اضافہ قطعاً نہیں ہوا ہے، ہاں کمی بہت کچھ کر دی گئی ہے۔ اسی لیے ان چاروں نے شیعہ حضرات کو یہ تلقین بھی کی کہ وہ بے کھٹکے اپنی نمازوں میں اس قرآن مجید کی تلاوت کر سکتے ہیں کیونکہ اس میں کسی بشر کا کلام شامل نہیں ہے۔

ان چاروں حضرات نے اپنی مزعومہ احادیث، ائمہ کی جانب گھڑتے ہوئے نظریات اور

اپنے اکابر کی تصریحات کے خلاف اس قرآن کریم کی صحت پر کیوں زور دیا ؟ بات اصل میں یہ ہے کہ شیعہ حضرات اپنے مخالفین کے رُوبرو حدیث ثقلین کو بڑی شد و مد سے پیش کرتے رہے ہیں تاکہ اہلبیت اطہار کی عقیدت کے زور کو علمبردار بن سکیں ، لیکن اہلبیت تو ثقل دوم ہیں جبکہ ثقل اوّل قرآن مجید ہے۔ یہ حدیث پیش کرتے ہوئے رافضی مناظرین کو یہ دقت پیش آتی تھی کہ موجودہ قرآن کو تحریف شدہ ماننے کے بعد شیعہ حضرات کو مسلمان ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا ، کیونکہ دین اوّلین ماخذ تو یہی کلام الٰہی ہے ، جن کے مذہب کا مدار قرآن مجید پر نہیں اس کے پاس دین کہاں

صحابہ کرام سے دشمنی

قرآن کریم کو محرّف ثابت کرنے کی غرض سے شیعہ حضرات کو عبداللہ ابن سبا کے اتباع میں بغض صحابہ سے سرشار ہونا پڑا اور صحابہ کرام کے خلاف حدیثیں گھڑ کر ، فرضی الزامات قائم کر لیے اور ان پاکباز ہستیوں کو غدار کہنا پر ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا چنانچہ اصول کافی میں ہے

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قول اللہ عز وجل ان الذین امنوا ثم کفروا ثم امنوا ثم کفروا ..... قال نزلت فی فلان وفلان وفلان امنوا بالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی اول الامر وکفروا حیث عرضت علیہم الولایۃ حیث قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من کنت مولاہ فعلی مولاہ ثم امنوا بالبیعۃ لامیر المؤمنین علیہ السلام ثم کفروا حیث مضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلم یقروا بالبیعۃ ثم ازدادوا

ارشاد باری تعالیٰ : ان الذین امنوا ثم کفروا ثم امنوا ثم کفروا ..... کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت فلاں ، فلاں اور فلاں کے حق میں نازل ہوئی ، جو پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے اور جب آپ پر ولایت اور امامت علی پیش کی گئی تو کافر ہو گئے جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس کا آقا میں ہوں اسی طرح علی بھی اس کا آقا ہے۔ پھر امیر المؤمنین علیہ السلام کی بیعت پر ایمان لائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کافر ہو گئے

...یأخذهم من بیعته بالبیعة لهم فهؤلاء لم یبق فیهم من الایمان شیئا۔ [1]

انھوں نے بیعت کا اقرار نہ کیا، پھر امیر المومنین کی بیعت کا اقرار کرنے والوں سے اپنی بیعت لے کر کفر میں اور بڑھ گئے یہ وہ ہیں جن میں ایمان کا کوئی ذرہ باقی نہ رہا۔

اصول کافی کی تفسیر صافی میں ہے کہ فلاں اور فلاں سے مراد حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ اسی اصول کافی میں متصلاً یہ حدیث بھی ہے:

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قول اللہ تعالیٰ ان الذین ارتدوا علی ادبارهم من بعد ما تبین لهم الهدی فلان وفلان وفلان ارتدوا عن الایمان وترك ولایة امیر المؤمنین علیه السلام۔ [2]

ارشاد باری تعالیٰ: ان الذین ارتدوا علی ادبارهم من بعد ما تبین لهم الهدی کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ مراد فلاں و فلاں و فلاں ہیں جو امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت کو ترک کرنے سے ایمان سے پھر گئے (مرتد ہو گئے) تھے۔

تفسیر صافی والے نے فلاں و فلاں کی نشان دہی کرتے اور باقی جملہ صحابہ کرام کو منافق ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے کہ: "مراد عثمان بود ابو سفیان و معاویہ است۔ برگشتند از ایمان در مجلس منافقان بسبب ترک ولایت امیر المومنین"۔ ان حضرات نے سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ افراد یعنی صحابہ کرام جیسی عدیم النظیر جماعت کو اپنی مشق ستم کا نشانہ بناتے ہوئے مسلمانوں کی دلآزاری کا [illegible] تک، [illegible] رکھا۔

عن حمران بن اعین قال قلت

حمران بن اعین کہتے ہیں کہ میں نے امام

---

[1] محمد بن یعقوب کلینی، اصول کافی، کتاب الحجۃ، ص ۲۶۵ [2] ایضاً، ص ۲۶۵

لابی جعفر علیہ السلام جعلت فداك ما اقلنا لو اجتمعنا على شاة ما افنيناها فقال الا احدثك باعجب من ذالك المهاجرون و الانصار ذهبوا الا واشار بيده ثلاثة.[1]

محمد باقر علیہ السلام سے عرض کیا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں، ہم (شیعہ) تو بہت کم ہیں کہ اگر کسی دستر خوان پر ایک بکری کھانے کے لیے جمع ہوں تو ساری بکری نہیں کھا سکتے۔ آپ نے فرمایا کیا میں تجھے اس سے بھی عجیب بات نہ بتاؤں۔ مہاجرین و انصار (حضور کے بعد) سب مرتد ہو گئے ما سوائے تین کے جو ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

مذکورہ تین حضرات کی نشان دہی فروع کافی میں یوں کی گئی ہے:

عن ابی جعفر قال كان الناس اهل ردة بعد النبی الا ثلاثة فقلت و من الثلاثة فقال المقداد ابن الاسود و ابو ذر الغفاری و سلمان الفارسی.[2]

امام محمد باقر سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ نبی مکرم کی وفات کے بعد تین کے علاوہ باقی سب مرتد ہو گئے تھے میں نے پوچھا وہ تین کون ہیں؟ فرمایا مقداد بن الاسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی۔

سرِ نظر لیجئے تو ملاحظہ ہو کہ یہاں سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جن تین حضرات کا اسلام پر قائم رہنا بیان ہوا ہے اس کی رو سے سارے اہلبیت بلکہ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اسلام سے پھر جانے والوں میں شامل کر دیا۔ ان حالات میں ناطقہ سر بگریباں ہے اور پڑھنے والے سرگرداں رہ جاتے ہیں کہ یا الٰہی! یہ لوگ جو اہلبیت کی محبت کا ڈھول پوری طاقت سے بجاتے پھر رہے ہیں، ان کے بڑے خوشنما نعرے

۱۔ محمد بن یعقوب کلینی: اصول کافی، کتاب الحجہ، ص ۲۴۹ ۲۔ فروع کافی جلد سوم، [illegible]

کی حقیقت کیا ہے؟ دوسری جانب قرآن کریم کو محرف اور اہل بیت کو مظلوم دکھانے کی غرض سے صحابۂ کرام کو منافق و مرتد دکھانے اور باور کرنے کا وبال اپنے سر لیا۔ مخالفت صحابہ پر اپنے متبعین کو آمادہ کر لینا حقیقت میں عبداللہ بن سبا جیسے مسلم نما یہودی کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمت کے درمیان سے اُس مضبوط ترین واسطے کو نکال دیا جو گروہ صحابہ کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور و معروف ہے۔ جن حضرات نے اس عظیم الشان واسطے کو ناقابل یقین تسلیم کر لیا، اُن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین حاصل کرنے کا آخر ذریعہ کیا ہے؟ کاش! یہ حضرات اب بھی عقل و دانش کو کام میں لاتے ہوئے اگر اس سراسر غیر اسلامی روش کو ترک کر دیں، اُن مقدس ہستیوں پر تبرا بازی کر کے اُس شمع رسالت کی دلآزاری نہ کریں جس کی وہ گرویدہ تھے اور ملتِ اسلامیہ کو روحانی اذیت نہ پہنچایا کریں تو اس میں خود اُن کا بھی بھلا ہے۔ وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسے افکار و مسائل جو مختلف جماعتوں کے درمیان بُعد اور منافرت کا سبب بنیں، اُن پر ٹھنڈے دل و دماغ سے نظر ثانی کر کے اتفاق و اتحاد کی جانب قدم اٹھایا جائے ورنہ وہ دن دُور نہیں کہ غیر اسلامی نظریات اور دین سے بغاوت کا جو سیلاب پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے وہ اتنی شدت اختیار کر لے گا کہ کسی بھی تنہا جماعت کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے گا۔ ہمیں امید واثق ہے کہ یہ حضرات غصے میں آنے اور جھنجلانے سے بجائے عقل سے کام لیتے ہوئے بہتری کا راستہ اختیار کریں گے وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

یہ حقیقت ہے کہ اصحابِ ثلاثہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں انتہائی محبت اور عقیدت و احترام کے رشتے پوری طرح استوار تھے۔ ان میں سے ہر بزرگ ایک دوسرے کو اپنی جان سے عزیز سمجھتا تھا اور خصوصاً اہل بیت اطہار سے تو جمیع صحابہ کرام کو جو آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قرب کی بدولت محبت و عقیدت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہاتھوں پر برضا و رغبت بیعت کی۔ بحیثیت اُن کے مشیر خاص اور دست و بازو بنے رہے۔ یہ چاروں بزرگ فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد اُمتِ محمدیہ کے سرپرست اور ان حضرات کی تمام تر توانائیاں اسلام اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے وقف تھیں۔ ذاتی

دنیاوی منفعت کا سایہ تک ان میں سے کسی بزرگ کے نزدیک سے نہ گزر سکا۔ سادہ سے سادہ بھی الفقر فخری
کا نمونہ اور یادِ الٰہی و دو جہاں کے نقوشِ قدم کو مشعلِ راہ بنائے ہوئے تھا۔

برا ہو نفسانیت کا کہ ایک یہودی عبداللہ بن سبا کی سازش سے بعض مدعیانِ اسلام نے
اُن حضرات کے رشتۂ محبت و اخوت کو بغض و عداوت بتانا شروع کر دیا۔ یہ دیرینہ سازش
آج تک اپنے قدم جمائے ہوئے ہے اور مسلمان کہلانے والوں میں آئے دن سر پھٹول کا سبب
بن جاتی ہے۔ جب ان حضرات سے کہا جاتا ہے کہ جن بزرگوں میں آپ عداوت و نفرت جانتے ہیں
اُن کے بارے میں تو فریقین کی تصانیف یہ بتا رہی ہیں کہ کمال محبت تھی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ
عنہ نے اُن بزرگوں کے ہاتھوں پر بخوشی بیعت کی اور تینوں کے ساتھ تا زیست محبت و موافقت
رہی۔ اس کے جواب میں شیعہ حضرات یہ شگوفہ چھوڑتے ہیں کہ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ
تعالیٰ عنہ اور حضرات خلفائے ثلاثہ کے مابین انتہائی عداوت اور نفرت تھی لیکن شیر خدا ہو کر اُن کے
ہاتھوں پر بیعت کی، تا زیست اُن کے دست و بازو بنے رہے اور اُن حضرات کی تعریف و توصیف
میں رطب اللسان رہے تو یہ سب کچھ بربنائے تقیہ تھا۔ چنانچہ اسی بنائے فاسد کو مضبوط و مستحکم
کرنے کی خاطر یہ حضرات حسب منشا احادیث و آثار گھڑنے اور اپنی تصانیف میں شامل کرنے کی
کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب یہ منسوب کیا:

قال ابو جعفر علیہ السلام التقیۃ	امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ تقیہ
من دینی ودین آبائی ولا ایمان	میرا اور میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔
لمن لا تقیۃ لہ۔[1]	تقیہ نہ کرے اُس کا ایمان ہی نہیں ہے۔

امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب تقیہ جیسے صریح کذب، منافقت اور خبیث خباثت کو
درست ثابت کرنے کی خاطر، کمال جسارت سے یہ الفاظ منسوب کر دیئے:

قال ابو عبد اللہ علیہ السلام	امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ
یا ابا عمران تسعۃ اعشار الدین	اے ابو عمران! دین کے نو حصے تقیہ میں

---

[1] محمد بن یعقوب کلینی، اصول کافی، ص ۴۸۴

في التقية ولا دين لمن لا تقية له۔ [1] — اور جو تقیہ نہ کرے اس کا کوئی دین نہیں ہے۔

نیز امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اسلام کے بطلِ جلیل کی جانب یہ قول بھی منسوب کیا ہوا ہے:

يا سليمان انكم على دين من كتمه اعزه الله ومن اذاعه اذله الله۔ [2] — اے سلیمان! تم ایسے دین پر ہو کہ جو اسے چھپائے اللہ تعالیٰ اس کو عزت دے گا اور جو اسے ظاہر کرے خدا اسے ذلیل کرے گا۔

بلکہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب گھڑا ہوا یہ حکم بھی نشر کرتے رہتے ہیں:

من اذاع علينا شيئا من امرنا كمن قتلنا عمدًا ولم يقتلنا خطأ۔ [3] — جس نے ہمارے دین میں سے کسی چیز کو ظاہر کیا، وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے غلطی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر ہمیں قتل کیا۔

شیعہ حضرات کی خدمت میں ہماری عاجزانہ التماس ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذکورہ ارشاد پر وہ حضرات عمل فرمائیں اور خلفائے اربعہ کے مابین جو انھوں نے بغض و عداوت کی کہانیاں گھڑی ہوئی ہیں، انھیں ازراہِ تقیہ ہی سہی، نشر کرنے سے باز رہا کریں۔ آخر جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس فرضی عداوت کا کسی سطح پر تا زیست اظہار نہ کیا، حضرت امامین عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کبھی یہ نہ کہا کہ ہمارے گھرانے اور حضرات خلفائے ثلاثہ میں کسی قسم کی شکر رنجی تھی، اگر شیعہ حضرات کے نزدیک یہ سب کچھ تقیہ کے باعث تھا، تو یہ حضرات بھی ایسا ہی تقیہ اختیار کر لیں اور ان بزرگوں کی طرح عداوت و نفرت کے شگوفے نہ چھوڑا کریں اور بقول حضرت امام جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے دین بننے اور خود کو اہلِ بیت اطہار کا

---

[1] محمد یعقوب کلینی، اصول کافی، ص ۴۸۲ — [2] ایضاً، ص ۴۸۵ — [3] ایضاً، ص ۵۵۲

قائل ودکانے سے اجتناب کریں۔ اگر واقعی اس باب میں اکابر اہلبیت تقیہ فرماتے تھے تو شیعہ حضرات کیوں اس تقیہ پر عمل پیرا نہیں ہوتے ؟

نے فرحت محکم و نے از اصول
شرم بادت از خدا و از رسول

متعہ شیعہ حضرات نے ایک جانب دین کو حرف غلط ٹھہرانے کی مہم چلائی کہ قرآن کریم تحریف شدہ اور صحابہ کرام کو اسلام سے پھر جانے والے باور کروانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا ہے تو دوسری جانب مسلمانوں کے اخلاق و کردار کا جنازہ نکال دینے کی خاطر متعہ کو قیامت تک کے لیے جاری بتایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد رسالت میں ایک مدت تک یہ مباح رہا اور اس کے بعد قیامت تک کے لیے اسے حرام قرار دے دیا گیا شیعہ حضرات نے نہ صرف حرام کو حلال ٹھہرانا اپنا منشور بنا لیا بلکہ جو امر کسی وقت مباح تھا اُسے اپنے دین کا ایسا ضروری جزو اور لازمی رکن قرار دے دیا کہ عقل انسانی انگشت بدنداں رہ جاتی ہے اس حرکت قبیحہ کے احادیث و آثار گھڑ کر وہ فضائل بیان کیے ہیں کہ ان کی صداقت پر یقین رکھنے والے خواہ نماز روزے کے نزدیک نہ جائیں لیکن متعہ کے ذریعے جنت الفردوس کا ٹکٹ ضرور حاصل کریں گے چنانچہ علامہ علی حائری لاہوری کے والد سید ابوالقاسم نے لکھا ہے :

قال ابوعبد اللہ علیہ السلام	امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کوئی
ما من رجل تمتع ثم اغتسل	شخص ایسا نہیں کہ وہ متعہ کرنے کے
الا خلق اللہ من کل	بعد غسل کرے مگر اللہ تعالیٰ ہر ایک
قطرۃ تقطر منہ	قطرے کے بدلے جو اس سے گرتا ہے
سبعین ملکا یستغفرون الی	ستر فرشتے پیدا کرتا ہے جو قیامت تک
یوم القیامۃ۔ [1]	استغفار کرتے رہتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک اور روایت شیعہ حضرات کی معتبر تفسیر منہج الصادقین سے ملاحظہ ہو :

---

[1] سید ابوالقاسم ، برہان المتعہ ، مطبوعہ امپیریل پریس لاہور ، ص ۵۰

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا،
من تمتع مرۃً امن سخط	جو ایک مرتبہ متعہ کرے وہ خدائے جبار کے
الجبار ومن تمتع	قہر سے نجات پا گیا اور جو دو مرتبہ کرے
مرتین حشر مع الابرار و	اس کا حشر نیک لوگوں کے ساتھ ہوگا
من تمتع ثلاث مرات	اور جو تین دفعہ متعہ کرے تو جنت میں
صاحبنی فی الجنان۔ [1]	میرا ساتھی ہوگا۔

اس سے بھی اعلیٰ فضائل بتانے والی، شیعہ حضرات کی گھڑی ہوئی یہ حدیث بھی قابلِ غور ہے،

قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ	نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا،
وسلم من تمتع مرۃً درجتہ	جو ایک دفعہ متعہ کرے اُس کا مرتبہ حسن
کدرجۃ الحسن ومن	جیسا ہے اور جو دو مرتبہ متعہ کرے تو
تمتع مرتین درجتہ کدرجۃ	حسین کا درجہ پائے اور جس نے تین
الحسین ومن تمتع ثلاث مرات	دفعہ متعہ کیا اس کا درجہ علی جیسا ہے
درجتہ کدرجۃ علیؑ ومن تمتع اربع	اور جو چار مرتبہ متعہ کرے تو اس کا مقام
مرات درجتہ کدرجتی۔ [2]	میرے جیسا ہے۔

ان احادیث کی صحت پر یقین رکھنے والوں کو کیا پڑی ہے کہ نیکیاں کرنے اور برائیوں سے بچنے کی مصیبت میں پھنستے پھریں۔ کیوں نہ مزے سے متعہ کرتے جائیں اور ایسے درجے حاصل کرتے جائیں جن کا کوئی نیکوکار تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس مسئلے سے انسانی اخلاق وکردار پر کیا اثر پڑ رہا ہے، کاش! مجوزینِ متعہ کبھی اس پر بھی ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ شیعہ حضرات نے مسائل سے قطع نظر کتنے ہی ایسے نظریات کو اسلامی عقاید منوانے کی مہم چلائی ہوئی ہے جو قرآن وحدیث کے سراسر خلاف ہیں۔ مثلاً،

۱۔ شیعہ حضرات بارہ اماموں کو انبیائے کرام کی طرح معصوم قرار دیتے ہیں۔

---

[1] ملا فتح اللہ کاشانی، تفسیر منہج الصادقین، ص ۳۵۶ [2] ایضاً، ص ۳۵۶

۲۔ ائمہ کا مرتبہ انبیائے کرام کے برابر بلکہ ان سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔

۳۔ ائمہ کو خدائی میں دخیل اور بالکل مالک و مختار ٹھہراتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مرتے بھی اپنے اختیار سے ہیں۔

۴۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مرتبہ جملہ انبیائے کرام سے بھی بلند ٹھہراتے ہیں۔

۵۔ روافض کے بعض فرقے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو الوہیت کا حامل بتاتے ہیں۔

۶۔ حضرت امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غار سرمن رائے میں چھپا ہوا بتاتے ہیں۔

۷۔ دعویٰ کرتے ہیں کہ پورا اور اصلی قرآن امام مہدی کے پاس ہے جو بوقت ظہور لے کر آئیں گے۔

۸۔ حدیثیں گھڑنے میں انتہائی جری ہیں اور اپنے مذہب کی بنیاد اسی گھڑنت پر رکھی ہوئی ہے۔

۹۔ باغ فدک کو چھیننے اور یار غار رسول کو ناحق بدنام کرنا اپنا مشن بنائے ہوئے ہیں۔

۱۰۔ حدیث قرطاس کو ناحق بہانہ بنا کر فاروق اعظم جیسی جلیل القدر ہستی کو خواہ مخواہ مطعون کرتے رہتے ہیں۔

۱۱۔ یوم غدیر کے واقعے کو بغیر کسی ادنیٰ قرینے کے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بلافصل کی دلیل بناتے ہیں۔

۱۲۔ اسلامی کلمہ پر محض سینہ زوری سے اضافہ کر کے اپنا مسلمانوں سے علیحدہ کلمہ گھڑا ہوا ہے

حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو بانی رفض یعنی عبد اللہ بن سبا کو ملک بدر کر دیا تھا لیکن شیعہ حضرات اس مسلم نما یہودی کے خیالات کو اپنے دلوں سے نکالنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسی عبد اللہ بن سبا کے بارے میں رجال کشی کے حوالے سے شیعہ حضرات کے ایک نامور مجتہد استر آبادی نے لکھا ہے:

فانظروا الی عبارۃ الکشی ذکر	عبارت کشی ملاحظہ ہو، بعض اہل علم نے
بعض اهل العلم ان عبد الله	ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن سبا حقیقت
ابن سبا کان یهودیا واسلم	میں یہودی تھا۔ وہ مسلمان بن گیا اور
ووالی علیا وکان یقول وهو	اور حضرت علی کی محبت کا علم بلند کرنے لگا

وعلی یہودیتہ فی یوشع وصی
بالغلو فقال بعد اسلامہ بعد
وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم فی علی مثل ذالک فکان
من اشہر بالقول بفرض
امامۃ علی علیہ السلام
البرأۃ من اعدائہ وکاشف
مخالفیہ واکفرہم فمن ہٰہنا قال من
خالف الشیعۃ اہل التشیع والرفض
من الیہودیۃ۔ [1]

جب وہ یہودی تھا تو حضرت یوشع کے
وصی ہونے میں غلو کرتا تھا اور مسلمان ہونے
پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال
کے بعد اُسی طرح حضرت علی کے بارے
میں کہنے لگا۔ یہی ہے جس نے امامت علی
کی فرضیت کا ڈھول بجایا، اُن کے
مخالفین پر تبرا کیا، فرضی مخالفین کو مرتد
اور اُن کی تکفیر کی۔ بایں وجہ مخالفین شیعہ
کہتے ہیں کہ اہلِ تشیع اور رفض کی اصل
یہودیت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو جس طرح خارجیت ایک شجرِ ممنوعہ ثابت ہوتی ہے اُسی طرح رفض بھی ایسی نادان دوستی کا مظہر ہے جو دشمنی سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ شرف صرف اور صرف اہلسنت و جماعت ہی کو حاصل ہے کہ ہر قابلِ احترام ہستی کا احترام ملحوظ رکھتے اور حفظِ مراتب کا لحاظ کرتے ہیں۔ یہاں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ اپنے محبین و مخالفین کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

سیہلک فیّ صنفان محب مفرط
یذہب بہ الحب الی
غیر الحق ومبغض مفرط
یذہب بہ البغض الی
غیر الحق وخیر
الناس فیّ حالاً

عنقریب میرے بارے میں دو فریق ہلاک
ہوں گے، محب دوستی میں افراط کرنے
کے باعث کہ دوستی کو حق سے دور لے
جائے گا اور دشمن کہ دشمنی میں افراط سے
دشمنی کو حق سے دور لے جائے گا، بہترین
انسان میرے بارے میں وہ ہے جو

---

[1] رجال کشی، ص ۷۱

النمط الاوسط فالزموا السواد الاعظم فان يد الله على الجماعة واياكم والفرقة فان الشاذ من الناس للشيطان كما ان الشاذ من الغنم للذئب الا من دعا الى هذا الشعار فاقتلوه ولو كان تحت عمامتي هذه۔ لہ

میانہ روی اختیار کرے۔ تم سب سے بڑی جماعت کے اتباع کو لازم جانو، کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ فرقہ بازی سے بچ کر رہنا کیونکہ جماعت سے علیحدہ رہنے والا انسان شیطان کا شکار ہے جیسے ریوڑ سے جدا ہونے والی بکری بھیڑیئے کا شکار ہوتی ہے۔ خبردار جو تمہیں جماعت سے علیحدگی کی دعوت دے اُسے قتل کر دو خواہ وہ میری اس دستار کے نیچے ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشادِ گرامی سنہری حروف میں لکھنے کے قابل اور سلمانوں کے لیے بہترین لائحہ عمل ہے۔ محبت کے افراط کی شیعہ حضرات اور عداوت کے افراط ی خارجی حضرات منہ بولتی تصویریں ہیں۔ بفضلہ تعالیٰ اہلسنت وجماعت ہی میانہ روی اختیار کیے ہے اور مسلمانوں کا سوادِ اعظم (سب سے بڑی جماعت) ہیں، جن کے ساتھ رہنے کی حضرت لا مشکل کشا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تاکید فرمائی اور جس سے جدا ہونے والے کو قتل کرنے کا حکم ادر فرمایا ہے۔ والحمد للہ علی ذالک۔

سلمانوں سے بغض وعداوت

مسلمانوں سے شیعہ حضرات کی دشمنی اظہر من الشمس ہے۔ زندوں سے دوستی یا دشمنی پھر اور بات ہے ین ملتِ اسلامیہ سے ان کی عداوت کسی مسلمان کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی۔ ن کے نزدیک مسلمانانِ اہلسنت وجماعت ہر حالت میں غیر مسلم اور قابلِ لعنت ہیں، چنانچہ ھا ہے کہ کسی سنی کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے اور اگر کسی غیر شیعہ کی نمازِ جنازہ پڑھنی پڑ جائے تو چوتھی تکبیر سے پہلے یوں بددعا کرے:

لہ نہج البلاغت، مطبوعہ تہران، ص ۵۵

اللّٰھم اخز عبدك فی عبادك	اے اللہ اس بندے کو اپنے بندوں
اللّٰھم اصمہ حر بلادك	اور شہروں میں ذلیل کر، اے اللہ اسے
اللّٰھم اذقہ اشد	نارِ جہنم میں ڈال۔ اے اللہ اسے سخت
عذابك۔ ۱	عذاب چکھا۔

ع
بسمل تو ہوئے سیکڑوں ہی سرد تڑپ کر
ٹھنڈا مرا قاتل کا مگر دل نہیں ہوتا

مسلمانوں کو شیعہ حضرات کی اس حرکت قبیحہ کا کہاں تک افسوس ہو جبکہ ان حضرات نے فرضی سنیت کے مرکز و محور یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات والا صفات کو بھی سبّ و شتم سے نہ بچنے دیا۔ چنانچہ خود ان کی جانب یہ فرضی قول منسوب کیا ہوا ہے،

ان علیا علیہ السلام قال علی	بے شک حضرت علی علیہ السلام نے
منبر کوفہ یا ایھا الناس	کوفے کے منبر پر جلوہ افروز ہو کر فرمایا،
ستدعون الی سبی	اے لوگو! تمہیں ایک چیز (میری سب و
فسبونی ۔ ۲	شتم) کی جانب بلایا جائے گا، تو مجھے
	گالیاں دے لینا۔

ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

۹۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے کارنامے

مرزا غلام احمد قادیانی کی حتمی تاریخ پیدائش تو کسی کو معلوم نہیں، ہاں مرزا صاحب نے کتاب البریہ میں ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۰ء بتائی ہے لیکن تریاق القلوب میں ۱۸۴۵ء لکھی ہے۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی اور انگریزی میں ابجد خواں تھے۔ سیالکوٹ کچہری میں

---

۱ تحفۃ العوام، جلد اول، ص ۱۳۸

۲ محمد بن یعقوب کلینی: اصول کافی، ص ۳۸۳

بمشاہرہ پندرہ روپیہ ماہوار چار سال تک محرر بھی رہے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ آباؤ اجداد سکھ
اور انگریزوں کے وفادار اور ملازم رہتے آئے تھے۔ والد کا نام مرزا غلام مرتضیٰ تھا۔ مرزا غلام احمد
نے قانونی مختار کاری کا امتحان بھی دیا لیکن فیل ہونے پر تعلیم سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ ضعفِ د
دماغ تمام عمر جولانی پر رہا۔ قوتِ مردمی سے اکثر اوقات محروم رہے۔ تشنجِ قلب، اسہال، د
دورانِ سر، مالیخولیا اور ذیابیطس وغیرہ امراض موصوف کی زندگی کے ساتھی تھے۔ ۲۶ مئی ۱۰۸
لاہور میں موصوف کا شدتِ اسہال یا ہیضہ سے انتقال ہوا تھا۔ بعد وفات اُن کے منہ سے
نکلتے ہوئے دیکھا گیا جو حاضرین کی عبرت کا باعث ہوا۔ مرزا صاحب کے خلفاء اس صورت حا
تسدید کرتے رہے۔ والعلم عنداللہ۔

۱۸۸۹ء سے مرزا صاحب نے اپنی نبوت کی بنیاد رکھنی شروع کی، لیکن ایسے گول مو
لفظوں میں جو صرف کشف و الہام وغیرہ پر مبنی تھے اور براہین احمدیہ میں اپنے سکے جما رہے تھے
قادیان سے براہین احمدیہ اور مدرسہ دیوبند سے تحذیر الناس بیک وقت نکلی گئیں۔ علی گڑھ کالج کا ا
مدرسہ دیوبند کی تاسیس اور براہین احمدیہ کی تصنیف کا زمانہ ایک ہے، گویا برٹش گورنمنٹ ۔
ملت اسلامیہ کے خلاف بیک وقت چار فتنے دہلی، علی گڑھ، دیوبند اور قادیان سے کھڑے کر
چاروں فتنے اپنے اپنے رنگ میں نرالے، انتہائی پُراسرار اور مسلمانوں کے خرمنِ دین و ایمان
آگ لگانے والے تھے۔ افسوس! ان فتنوں کی کما حقہ مضرت سے مسلمانوں کی اکثریت تا حا
باخبر نہیں ہو سکی ہے۔ اگر حقیقت کی تہہ میں جھانک کر دیکھا جائے تو صاف نظر آنے لگتا ہے ک
انگریزی حکومت اپنے اسلام دشمن مقاصد میں انتہائی کامیاب رہی تھی۔ کاش! ہم اب بھی ۵
فتنوں کی مضرت کو بھانپ جائیں۔ دہلی سے شش مثل کی آواز، علی گڑھ سے نیچریت کا ظہور
دیوبند سے براہین قاطعہ اور فتاوٰی گنگوہی متعلقہ و ترجیح کذبِ باری اور قادیان سے فتح اسل
توضیح مرام اور ازالۂ اوہام کی اشاعت ان فتنوں کی دوسری کڑیاں ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے جملہ تحریک کاروں سے بڑھ کر وبال اپنے سر لیا کہ نبوت کا دع
کر کے دجالوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اپنی دنیا سنبھالنے کی خاطر کروڑوں مسلمانوں
عاقبت برباد کر گئے۔ اب موصوف کے چند مخصوص کارنامے ہم بڑے اختصار سے نقل

۔۔۔مرزا غلام احمد قادیانی کی تصانیف سے پیش کرتے ہیں۔ مرصوف برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کو ۔۔۔ت بد ذاتی اور گناہ سمجھتے تھے۔ اب باقی کارگزاری کی جھلک ملاحظہ ہو۔

مخالفتِ جہاد

تخریب کاری کے چاروں مراکز یعنی دہلی، علی گڑھ، مدرسہ دیوبند اور قادیان میں دو باتیں قدرِ مشترک تھیں:

۱۔ حکومت کی تائید و حمایت

۲۔ جہاد کی مخالفت

۔۔۔ قادیانی گروہ ان میدانوں میں اپنے حلیفوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے ۔۔۔ بارے میں فرمایا ہے:

"دوسرا امر قابلِ گزارش یہ ہے کہ میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول ہوں تا مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں، جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔"[۱]

۔۔۔صاحب نے مخالفتِ جہاد کے سلسلے میں جو کارنامہ دکھایا اُس کا یوں فخریہ ذکر کیا ہے:

"میں نے مخالفتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں اُن سے بھر سکتی ہیں۔"[۲]

طوقِ استعمارِ مغرب خود کیا زیبِ گلو
اور گواہ اِس پہ ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

بروزی نبوت کا دعویٰ

۱۸۸۶ء میں کشف و الہام کے دعاوی کرنے کے بعد ۱۸۹۰ء میں مرزا صاحب نے کہنا شروع کر دیا کہ

---

[۱] ۔۔۔م احمد قادیانی، تریاق القلوب، ص ۲۹
[۲] ایضاً، تبلیغ رسالت، ج ۷، ص ۱۰
[۳] ۔۔۔یضاً، تریاق القلوب، ص ۲۵

میں مسیح موعود اور عیسیٰ بن مریم ہوں۔ چنانچہ موصوف نے خود لکھا ہے:

"مریم کی طرح عیسیٰ کی رُوح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا اور آخر کئی مہینے کے بعد، جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اس الہام کے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابنِ مریم ٹھہرا۔" [۱]

اپنے مسیح موعود ہونے کے دعوے کو مرزا صاحب نے ان لفظوں میں بھی بیان کیا ہے:

"میرا دعویٰ یہ ہے کہ میں وہ مسیح موعود ہوں، جس کے بارے میں خدا تعالیٰ کی تمام پاک کتابوں میں پیش گوئیاں ہیں کہ وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔" [۲]

دوسری جگہ موصوف نے اپنے اسی دعویٰ کو ان لفظوں میں دُہرایا ہے:

"جس آنے والے مسیح موعود کا حدیثوں سے پتہ لگتا ہے، اُس کا اُن ہی حدیثوں سے یہ نشان دیا گیا ہے کہ وہ نبی ہوگا اور اُمتی بھی۔" [۳]

اس سے آگے موصوف نے خود کو عیسیٰ علیہ السلام سے افضل بتانے کی مہم شروع کر دی۔ چنانچہ لکھا ہے:

"خدا نے اس اُمت میں سے مسیح موعود بھیجا جو اُس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بہت بڑھ کر ہے۔ مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر مسیح ابن مریم میرے زمانے میں ہوتا تو وہ کام جو میں کر سکتا ہوں وہ ہرگز نہ کر سکتا اور وہ نشان جو مجھ سے ظاہر ہو رہے ہیں، وہ ہرگز نہ دکھلا سکتا۔" [۴]

مرزا صاحب نے اپنے اس شیطانی دعوے کی دلیل ان مضحکہ خیز لفظوں میں پیش کی ہے:

"جب خدا نے اور اُس کے رسول نے اور تمام نبیوں نے آخری زمانہ کے مسیح کو اُس کے کارناموں کی وجہ سے افضل قرار دیا ہے پھر تو یہ شیطانی وسوسہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ کیوں تم مسیح ابنِ مریم سے اپنے تئیں افضل قرار

---

[۱] غلام احمد قادیانی: کشتی نوح، ص ۴۷
[۲] غلام احمد قادیانی: تحفۂ گولڑویہ، ص ۱
[۳] ایضاً: حقیقۃ الوحی، ص ۲۶
[۴] ایضاً: ص ۱۴۸

دیتے ہوئے۔[1]

مرزا صاحب نے مسیح موعود کے ساتھ آدم ہونے اور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بروز ہونے کو منطقی انداز میں، ان لفظوں کے ساتھ بیان کیا ہے:

"آج خدا نے مجھ کو آدم بنایا اور مجھ کو وہ سب چیزیں بخشیں اور مجھ کو خاتم النبیین اور سید المرسلین کا بروز بنایا اور بھید اس میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابتداء سے ارادہ فرمایا تھا کہ اس آدم کو پیدا کرے گا جو آخری زمانہ میں خاتم الخلفاء ہو گا جیسا کہ زمانہ کے شروع میں آدم کو پیدا کیا جو اس کا پہلا خلیفہ تھا اور یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ فطرت کا دائرہ گول ہو جائے۔"[2]

مرزا صاحب نے بروزی ظلی کے معاملے کو بڑھاتے ہوئے خود کو تمام انبیائے بنی اسرائیل کا ظل ان لفظوں میں بتایا ہے:

"یہ خدا تعالیٰ پر بدظنی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی بدی کا تو حصہ دار ٹھہرا لیا ہے، یہاں تک کہ ان کا نام یہود بھی رکھ دیا مگر ان کے رسولوں اور نبیوں کے مراتب میں سے اس امت کو کوئی حصہ نہ دیا۔ پھر یہ امت خیر الامم کس وجہ سے ہوئی؟ بلکہ شر الامم ہوئی کہ ہر ایک نمونہ شر کا ان کو ملا مگر نیکی کا نمونہ نہ ملا۔ کیا ضرور نہیں تھا کہ اس امت میں بھی کوئی نبیوں اور رسولوں کے رنگ میں نظر آوے جو بنی اسرائیل کے تمام نبیوں کا وارث اور ان کا ظل ہو۔"[3]

موصوف نے سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بروز ہونے کا خطبہ الہامیہ میں جو دعویٰ کیا تھا اسے اور آگے بڑھاتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیوض کا کامل نمونہ ہوں، مرزا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"خدا تعالیٰ نے ابتداً سے ارادہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات متعدیہ کے اظہار و اثبات کے لیے کسی شخص کو آنجناب کی پیروی اور متابعت

---

[1] غلام احمد قادیانی: حقیقۃ الوحی، ص ۱۵۵ [2] ایضاً: خطبہ الہامیہ، ص ۱۷۰

[3] ایضاً: کشتی نوح، ص ۴۴

کی وجہ سے وہ مرتبہ کثرت مکالمات اور مخاطبات الٰہیہ بخشے کہ جو اس کے وجود میں عکسی طور پر نبوت کا رنگ پیدا کر دے۔ سو اس طرح سے خدا نے میرا نام نبی رکھا یعنی نبوت محمدیہ میرے آئینۂ نفس میں منعکس ہو گئی اور ظلی طور پر نہ اصلی طور پر مجھے یہ نام دیا گیا۔ تا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض کا کامل نمونہ ٹھہروں"[1]

موصوف نے اپنی بروزی منطق کا ہیر پھیر لفظوں کی چکر بازی میں یوں بھی دکھایا ہے:

"چونکہ میں اس کا رسول یعنی فرستادہ ہوں مگر بغیر کسی نئی شریعت اور نئے دعوے اور نئے نام کے بلکہ اسی نبی کریم خاتم الانبیاء کا نام پا کر اور اسی میں ہو کر اور اسی کا مظہر بن کر آیا ہوں"[2]

یہی بات موصوف نے اگلے صفحے پر ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"اس نکتہ کو یاد رکھو کہ میں رسول اور نبی نہیں ہوں یعنی باعتبار نئی شریعت اور نئے دعوے اور نئے نام کے اور میں رسول اور نبی ہوں یعنی باعتبار ظلیت کاملہ کے۔ میں وہ آئینہ ہوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا کامل انعکاس ہے اور میں کوئی علیحدہ شخص نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہوتا تو خدا تعالیٰ میرا نام محمد اور احمد اور مصطفیٰ اور مجتبیٰ نہ رکھتا"[3]

حقیقی نبوت کا دعویٰ

ابتدا میں مرزا صاحب نے اپنے دعوائے نبوت کو ظلی بروزی وغیرہ پردوں میں ملفوف رکھا لیکن ان کا قدم وقت کے ساتھ ساتھ آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر انیسویں صدی عیسوی ختم ہوئی اور ادھر مرزا صاحب نے پچھلے دعاوی کو چھوڑتے ہوئے ۱۹۰۱ء میں حقیقی نبوت کا دعویٰ کر دیا یعنی کمال شعبدہ بازی دکھاتے رہے اور لفظوں کا ہیر پھیر آخری دم تک سلامت رکھا۔ مثلاً لکھتے ہیں:

"ہلاک ہو گئے وہ جنہوں نے ایک برگزیدہ رسول (یعنی مرزا صاحب) کو قبول

---

[1] غلام احمد قادیانی، حاشیہ چشمۂ معرفت، ص ۳۲۴ [2] ایضاً: نزول المسیح، ص ۲
[3] ایضاً، ص ۳

دیکھا۔ مبارک وہ جس نے مجھ کو پہچانا۔ میں خدا کی سب راہوں میں سے آخری راہ ہوں اور اُس کے سب نوروں میں سے آخری نور ہوں۔ بدقسمت ہے وہ جو مجھے چھوڑتا ہے کیونکہ میرے بغیر سب تاریکی ہے۔"[1]

مرزا صاحب کی جیسی شیطانی نبوت تھی اُسی کے مطابق وحی بھی نقدی کی صورت میں ہوتی تھی، جس کی خاطر موصوف نے یہ سارا شیطانی ڈرامہ رچایا تھا۔ چنانچہ ٹیچی ٹیچی فرشتے کی ایک آمد کا موصوف نے یُوں تذکرہ کیا ہے:

"ایک دفعہ مارچ ۱۹۰۵ء کے مہینے میں بوقتِ قلّتِ آمدنی لنگر خانہ کے مصارف میں بہت دقّت ہُوئی کیونکہ کثرت سے مہمانوں کی آمد تھی اور اُس کے مقابل پر روپیہ کی آمدنی کم۔ اس لیے دُعا کی گئی۔ ۵ مارچ ۱۹۰۵ء کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص جو فرشتہ معلوم ہوتا تھا میرے سامنے آیا اور اُس نے بہت سا روپیہ میرے دامن میں ڈال دیا۔ میں نے اُس کا نام پُوچھا۔ اُس نے کہا، نام کچھ نہیں۔ میں نے کہا، آخر کچھ تو نام ہوگا؟ اُس نے کہا، میرا نام ہے ٹیچی ٹیچی۔ پنجابی زبان میں وقت مقررہ کو کہتے ہیں یعنی عین ضرورت کے وقت آنے والا۔ تب میری آنکھ کھل گئی۔ بعد اس کے خدا تعالیٰ کی طرف سے کیا ڈاک کے ذریعے سے اور کیا براہِ راست لوگوں کے ہاتھوں سے اِس قدر مالی فتوحات ہُوئیں جن کا وہم و گمان نہ تھا اور کئی ہزار روپیہ آگیا۔ چنانچہ جو شخص اس کی تصدیق کے لیے حضرت ڈاکخانے کے رجسٹری ۵ مارچ ۱۹۰۵ء سے آخر سال تک دیکھے اُس کو معلوم ہوگا کہ کس قدر روپیہ آیا تھا۔"[2]

درحقیقت اس خوشحال ملک کی دولت کو لوٹ رہی تھی وہ اگر اپنے کسی خود کاشتہ پودے پر دس بیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ کرتی رہے تو کون سا اُسے اپنے کنگال ملک سے لانا پڑتا تھا۔ آخر وہ وقت مقررہ پر پہنچنے والے ٹیچی ٹیچی جو ہُوئے۔ ضرورت خود معلوم کرتے رہتے تھے اور ادھر سے

---

[1] غلام احمد قادیانی، کشتی نوح، ص ۵۶ [2] ایضاً، حقیقۃ الوحی، ص ۳۳۲

مطالبے بھی پہنچتے ہوں گے، جنہیں الہام کا نام دے کر مرزا صاحب رقمطراز ہیں،

"یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی مجھ سے یہ عادت ہے کہ اکثر جو نقد روپیہ آنے والا یا اور چیزیں تحائف کے طور پر ہوں اُن کی خبر قبل از وقت بذریعہ الہام یا خواب کے مجھ کو دے دیتا ہے اور اس قسم کے نشان پچاس ہزار سے کچھ زیادہ ہوں گے"[1]

بہرحال یہ تو دعویٰ نبوت کے سلسلے میں مرزا صاحب اور اُن کی مربی حکومت کا معاملہ تھا۔ یہ دعویٰ نبوت کے سلسلے میں موصوف کی چند عبارتیں پیش کرنا ذیر نظر ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے علی الاطلاق سے تحریر کیا ہے:

"خدا کا کلام اس قدر مجھ پر نازل ہوا ہے کہ اگر وہ تمام لکھا جائے تو بیس جزو سے کم نہیں ہوگا۔"[2]

موصوف نے اپنے تئیں حضرت نوح علیہ السلام پر فضیلت دیتے ہوئے صاف لکھا ہے،

"خدا تعالیٰ میرے لیے اس کثرت سے نشان دکھلا رہا ہے کہ اگر نوح کے زمانہ میں وہ نشان دکھلائے جاتے تو وہ لوگ غرق نہ ہوتے۔ مگر میں اُن کو کس سے مثال دُوں، وہ اس خیرہ طبع انسان کی طرح ہیں جو روز روشن کو دیکھ کر پھر بھی اس بات پر ضد کرتا ہے کہ رات ہے دن نہیں۔"[3]

حضرت یوسف علیہ السلام سے خود کو افضل بتاتے ہوئے موصوف نے تحریر کیا ہے،

"اس اُمت کا یوسف یعنی یہ عاجز اسرائیلی یوسف سے بڑھ کر ہے کیونکہ یہ عاجز قید کی دُعا کر کے بھی قید سے بچایا گیا مگر یوسف بن یعقوب قید میں ڈالا گیا اور اس اُمت کے یوسف کی بریت کے لیے پچیس برس پہلے ہی خدا نے آپ گواہی دے دی اور بھی نشان دکھلائے مگر یوسف بن یعقوب اپنی بریت کے لیے انسانی گواہی کا محتاج ہوا۔"[4]

---

[1] غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی ص ۳۳۳ [2] ایضاً، ص ۳۹۱

[3] ایضاً، ص ۳۹۱ [4] ایضاً، براہین احمدیہ، حصہ پنجم، ص ۷۶

مرزا صاحب نے اپنی ذات کو تمام انبیائے کرام کے کمالات کی جامع بتاتے ہوئے صاف لکھا ہے:

"دنیا میں کوئی نبی نہیں گزرا جس کا نام مجھے نہیں دیا گیا۔ سو جیسا کہ براہین احمدیہ میں خدا نے فرمایا ہے کہ میں آدم ہوں، میں نوح ہوں، میں ابراہیم ہوں، میں اسحاق ہوں، میں یعقوب ہوں، میں اسمٰعیل ہوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں، میں عیسیٰ ابن مریم ہوں، میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یعنی بروزی طور پر، جیسا کہ خدا نے اسی کتاب میں یہ سب نام مجھے دیئے اور میری نسبت جری اللہ فی حلل الانبیاء فرمایا، یعنی خدا کا رسول، نبیوں کا پیر ہوں۔ سو ضرور ہے کہ ہر ایک نبی کی شان مجھ میں پائی جائے۔" [1]

مرزا صاحب اپنے متعلق بشارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کتنے فخریہ انداز میں انبیائے کرام کی تمنا اور آرزوؤں کا مرکز بن بیٹھے چنانچہ ان امور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اے عزیزو! تم نے وہ وقت پایا ہے جس کی بشارت تمام نبیوں نے دی ہے اور اس شخص کو تم نے دیکھ لیا جس کے دیکھنے کے لیے بہت سے پیغمبروں نے بھی خواہش کی تھی۔ اس لیے اب اپنے ایمانوں کو خوب مضبوط کرو اور اپنی راہیں درست کرو۔" [2]

موصوف نے اپنے فرضی معجزات کی کثرت کے پیش نظر انبیائے کرام کی توہین کا یہ اہتمام کیا تھا:

"اس (خدا) نے میرا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے اس قدر معجزات دکھائے ہیں کہ بہت ہی کم نبی ایسے آئے ہیں جنہوں نے اس قدر معجزات دکھائے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے اس قدر معجزات کا دریا رواں کر دیا ہے کہ باستثناء ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی تمام انبیاء علیہم السلام میں ان کا ثبوت اس کثرت

---

[1] غلام احمد قادیانی، تتمہ حقیقۃ الوحی، ص ۸۴ [2] ایضاً، اربعین ۴، ص ۱۴

کے ساتھ قطعی اور یقینی طور پر محال ہے اور خدا نے اپنی حجت پوری کر دی ہے اب چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔" [1]

مرزا صاحب نے اپنے فرضی معجزات کی تعداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"میری تائید میں اس نے وہ نشان ظاہر فرمائے ہیں کہ ..... اگر میں اُن کو فرداً فرداً شمار کروں تو میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ تین لاکھ سے بھی زیادہ ہیں" [2]

لیکن اپنے اسی قلم ناحق رقم سے سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات کی تعداد گنتے ہوئے لکھا ہے :

"تین ہزار معجزات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئے۔" [3]

بہرحال موصوف کو اپنے معجزات وغیرہ کا پورا مزہ مل رہا ہو گا۔ برطانوی نبوت خوب رنگ بھی ہو گی۔ موصوف نے اپنی اسی مخصوص ترنگ میں اپنے معجزات کی کثرت کا یہ فرضی افسانہ شیطانی قصہ بھی سنایا تھا :

"خدا تعالیٰ نے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ میں اُس کی طرف سے ہوں، اس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر وہ ہزار نبی پر تقسیم کیے جائیں تو اُن کی بھی ان سے نبوت ثابت ہو سکتی ہے لیکن چونکہ یہ آخری زمانہ تھا اور شیطان کا مع اپنی تمام ذریت کے آخری حملہ تھا، اس لیے خدا نے شیطان کو شکست دینے کے لیے ہزارہا نشان ایک جگہ جمع کر دیے لیکن پھر بھی جو لوگ انسانوں میں سے شیطان ہیں، وہ نہیں مانتے۔" [4]

مرزا صاحب نے جملہ انبیائے کرام پر اپنی افضلیت بتاتے ہوئے فارسی میں یہ تین شعر بھی لکھے تھے :

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے   من بعرفاں نہ کمترم ز کسے

---

[1] غلام احمد قادیانی : حقیقۃ الوحی ، ص ۲۹۱
[2] ایضاً : تحفہ گولڑویہ ، ص ۹۳
[3] ایضاً ، ص ۹۷
[4] ایضاً ، چشمۂ معرفت ، ص ۳۱۷

آنچہ داد است ہر نبی را جام — داد آں جام را مرا بہ تمام

کم نیم زاں ہمہ بروئے یقین — ہر کہ گوید دروغ ہست لعین[1]

مقدس بارگاہوں میں دریدہ دہنی مرزا صاحب نے یوں تو کتنے ہی بزرگوں کی توہین وتنقیص کی ہے لیکن حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں تو ایسے ایسے بیہودہ کلمات لکھے اور شائع کیے ہیں جن کی ایک مسلمان ہرگز جسارت نہیں کرسکتا۔ موصوف نے لکھا ہے:

"تم نے حسین کو نبیوں پر فضیلت دینا بیہودہ خیال ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ بھی خدا کے راستباز بندوں میں سے تھے، لیکن ایسے بندے تو کروڑہا دنیا میں گزر چکے ہیں اور خدا جانے آگے کس قدر ہوں گے۔ پس بلاوجہ اُن کو تمام انبیاء کا سوار بنا دیا خدا کے پاک رسولوں کی سخت ہتک کرنا ہے۔ ایسا ہی خدا نے اور اُس کے پاک رسول نے بھی مسیح موعود کا نام نبی اور رسول رکھا ہے اور تمام خدا تعالیٰ کے نبیوں نے اُس کی تعریف کی ہے اور اُس کو تمام انبیاء کے صفاتِ کاملہ کا مظہر ٹھہرایا ہے۔ اب سوچنے کے لائق ہے کہ امام حسین کو اُس سے کیا نسبت ہے؟ ...... کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن اور احادیث اور تمام نبیوں کی شہادت سے مسیح موعود حسین سے افضل ہے اور جامع کمالاتِ متفرقہ ہے۔ پھر اگر میں حقیقت میں وہی مسیح موعود ہوں تو خود سوچ لو کہ حسین کے مقابل مجھے کیا درجہ دینا چاہیے اور اگر میں وہ نہیں ہوں تو خدا نے صدہا نشان کیوں دکھلائے اور کیوں وہ ہر دم میری تائید میں ہے؟"[2]

دوسرے مقام پر مرزا صاحب شیعہ حضرات کو مخاطب کرکے امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یوں کسرِ شان کرتے ہیں:

"اے قومِ شیعہ! اس پر اصرار مت کرو کہ حسین تمہارا منجی ہے کیونکہ میں سچ سچ

---

[1] غلام احمد قادیانی: درثمین، ص ۲۸۷، ۲۸۸ [2] ایضاً، نزول المسیح، ص ۴۵

کہتا ہوں کہ آج تم میں ایک ہے کہ اس حسین سے بڑھ کر ہے۔

کربلائیست سیر ہر آنم
صد حسین است در گریبانم [۱]

اری بتول حضرت مریم علیہا السلام پر نکاح کرنے کی تہمت لگا کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی
ی کرتے ہوئے مرزا صاحب نے یوں اپنے کذاب ہونے کا ثبوت دیا ہے:

"مریم کی وہ شان ہے جس نے ایک مدت تک اپنے تئیں نکاح سے روکا، پھر
بزرگان قوم کے نہایت اصرار سے بوجہ حمل کے نکاح کر لیا۔ گو لوگ اعتراض کرتے ہیں
کہ برخلاف تعلیم توریت عین حمل میں کیوں کیا گیا اور بتول ہونے کے عہد کو کیوں ناحق
توڑا گیا اور تعدد ازدواج کی کیوں بنیاد ڈالی گئی یعنی باوجود یوسف نجار کی پہلی بیوی کے
ہونے کے مریم کیوں راضی ہوئی کہ یوسف نجار کے نکاح میں آوے، مگر میں کہتا
ہوں کہ یہ سب مجبوریاں تھیں جو پیش آ گئیں۔" [۲]

یوسف نجار کو مرزا صاحب نے اپنی خصلت سے مجبور ہو کر عیسیٰ علیہ السلام کا والد بھی لکھا ہے۔
لکھا:

"حضرت مسیح ابن مریم اپنے باپ یوسف کے ساتھ بائیس ۲۲ برس تک نجاری کا
کام بھی کرتے رہے ہیں۔" [۳]

رت عیسیٰ علیہ السلام کے ظاہر و باہر معجزات کے بارے میں مرزا صاحب یوں آنکھوں میں
دل جھونکتے ہیں:

"عیسائیوں نے بہت سے آپ کے معجزات لکھے ہیں مگر حق بات یہ ہے کہ آپ سے
کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا اور اس دن سے کہ آپ نے معجزہ مانگنے والوں کو گندی
گالیاں دیں اور ان کو حرام کار اور حرام کی اولاد ٹھہرایا، اسی روز سے شریفوں نے

---

[۱] غلام احمد قادیانی: درثمین، ص ۲۸۶
[۲] غلام احمد قادیانی: کشتی نوح، ص ۱۶ — [۳] غلام احمد قادیانی، ازالہ اوہام، ص ۳۰۳

آپ سے کنارہ کیا۔" [1]

دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار اور پیشگوئیوں کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اگر مسیح کے اصلی کاموں کو اُن حواشی سے الگ کر کے دیکھا جائے جو محض افترا کے طور پر یا غلط فہمی کی وجہ سے گھڑے گئے ہیں، تو کوئی عجوبہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مسیح کے معجزات اور پیشگوئیوں پر جس قدر اعتراض اور شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی اور نبی کے خوارق یا پیش خبریوں میں کبھی ایسے شبہات پیدا ہوئے ہوں۔ کیا تالاب کا قصہ مسیحی معجزات کی رونق دُور نہیں کرتا اور پیشگوئیوں کا حال اس سے بھی زیادہ تر ابتر ہے۔ کیا یہ بھی کچھ پیش گوئیاں ہیں کہ زلزلے آئیں گے، مری پڑے گی، لڑائیاں ہوں گی، قحط پڑیں گے۔" [2]

اسی تالاب کا بہانہ بنا کر مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ خلق طیر کے بارے میں تحریر کیا ہے :

"یہ اعتقاد بالکل غلط اور فاسد اور مشرکانہ خیال ہے کہ مسیح مٹی کے پرندے بنا کر اور ان میں پھونک کر اُنھیں سچ مچ کے جانور بنا دیتا تھا۔ نہیں بلکہ صرف عمل ترب (مسمریزم) تھا جو رُوح کی قوت سے ترقی پذیر ہو گیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسیح ایسے کام کے لیے اس تالاب کی مٹی لاتا تھا، جس میں رُوح القدس کی تاثیر رکھی گئی تھی۔ بہرحال یہ معجزہ صرف کھیل کی قسم میں سے تھا اور مٹی درحقیقت ایک مٹی ہی رہتی تھی جیسے سامری کا گوسالہ۔" [3]

اسی معجزے کے بارے میں مرزا صاحب نے اپنے خیالات کا اس طرح بھی اظہار کیا ہے :

"حضرت مسیح کا معجزہ پرندے بنا کر اُن میں پھونک مار کر اُڑانا، حضرت سلیمان کے معجزہ کی طرح صرف عقلی تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اُن دنوں ایسے امور کی طرف

۱۔ غلام احمد قادیانی: ازالۂ اوہام، ص ۳۰۳ — ۲۔ ایضاً، ص ۷

۳۔ ایضاً، ص ۳۲۲

لوگوں کے خیالات جھکے ہوئے تھے کہ جو شعبدہ بازی کی قسم میں سے دراصل بے سود اور عوام کو فریفتہ کرنے والے تھے۔"[۱]

مرزا صاحب نے مذکورہ تالاب کو سراہتے ہوئے اعجازِ عیسوی کے بارے میں اپنی فطرت سے بھوکر یوں دریدہ دہنی کی ہے:

"اگر آپ سے کوئی معجزہ بھی ظاہر ہوا ہو، تو وہ آپ کا نہیں بلکہ اسی تالاب کا معجزہ ہے اور آپ کے ہاتھ میں سوائے مکر و فریب کے اور کچھ نہ تھا۔"[۲]

معجزات کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر مرزا صاحب کا براہِ راست جارحانہ حملہ ملاحظہ ہو:

"یہود عیسیٰ کے بارے میں ایسے قوی اعتراض رکھتے ہیں کہ ہم بھی جواب میں حیران ہیں، بغیر اس کے کہ یہ کہہ دیں کہ ضرور عیسیٰ نبی ہے کیونکہ قرآن نے اس کو نبی قرار دیا ہے اور کوئی دلیل اُن کی نبوت پر قائم نہیں ہو سکتی بلکہ ابطالِ نبوت پر کئی دلائل قائم ہیں۔"

اب عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر پر زنا ذخال کے اس دجّال کے ظالمانہ اور جارحانہ حملے ملاحظہ ہوں:

"مسیح کی راستبازی اپنے زمانے میں دوسرے راستبازوں سے بڑھ کر ثابت نہیں ہوتی بلکہ یحییٰ کو اس پر ایک فضیلت ہے کیونکہ وہ شراب نہ پیتا تھا اور کبھی نہ سنا کہ کسی فاحشہ عورت نے اپنی کمائی کے مال سے اس کے سر پر عطر ملا تھا یا ہاتھوں اور اپنے سر کے بالوں سے اس کے بدن کو چھوا تھا یا کوئی بے تعلق جوان عورت اس کی خدمت کرتی تھی۔ اسی وجہ سے خدا نے قرآن میں یحییٰ کا نام حصور رکھا مگر مسیح کا نہ رکھا کیونکہ ایسے قصے اس نام کے رکھنے سے مانع تھے۔"[۳]

اسی روش کو جاری رکھتے ہوئے مرزا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے:

---

۱ غلام احمد قادیانی: ازالہ اوہام، ص ۳۰۲
۲ ایضاً: اعجاز احمدی، ص ۱۳
۳ ایضاً: حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم، ص ۶
۴ ایضاً: دافع البلاء، ٹائٹل پیج، ص ۴

"آپ کا کنجریوں سے میلان اور صحبت بھی شاید اسی وجہ سے ہو کہ جدی مناسبت درمیان ہے ورنہ کوئی پرہیزگار انسان ایک جوان کنجری کو یہ موقع نہیں دے سکتا کہ وہ اس کے سر پر اپنے ناپاک ہاتھ لگا دے اور زناکاری کی کمائی کا پلید عطر اس کے سر پر ملے اور اپنے بالوں کو اس کے پیروں پر ملے۔ سمجھنے والے انسان سمجھ لیں کہ ایسا انسان کس چلن کا آدمی ہو سکتا ہے۔"[1]

مصنف نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر افترا کیا کہ ان کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

"مسیح تو مسیح، میں اس کے چاروں بھائیوں کی بھی عزت کرتا ہوں۔ مسیح کی دونوں ہمشیروں کو بھی مقدس سمجھتا ہوں۔"[2]

عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری کے بارے میں مرزا صاحب کے تاثرات یہ ہیں:

"خدا ایسے شخص کو کسی طرح دوبارہ دنیا میں نہیں لا سکتا جس کے پہلے فتنے نے ہی دنیا کو تباہ کر دیا ہے۔"[3]

مرزا صاحب اپنی دریدہ دہنی اور فتنہ پردازی کی خود سزا بھگت رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سارے مسلمانانِ عالم کو ایسے دجالوں کے شر سے محفوظ و مامون رکھے اور ہمیں انبیائے کرام و اولیائے عظام کا سچا غلام اور وارث بنائے۔ آمین

ابن اللہ ہونے کا دعویٰ

مرزا صاحب نے جب تمام انبیائے کرام سے افضل اور باکمال ہونے کے دعوے کو خوب مشتہر کر لیا۔ انبیائے کرام کی دل کھول کر توہین و تنقیص کر چکے تو ابن اللہ ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔ چنانچہ لکھا ہے:

"تو نے مجھ سے ایک خرید و فروخت کی ہے یعنی ایک چیز میری تھی جس کا تو مالک بنایا گیا اور ایک چیز تیری تھی جس کا میں مالک بن گیا۔ تو بھی اس خرید و فروخت کا

---

[1] غلام احمد قادیانی: ضمیمہ انجام آتھم، ص ۷ [2] ایضاً: کشتی نوح، ص ۱۷

[3] ایضاً: دافع البلاء، ص ۱۵

اقرار کر اور کہہ دے کہ خدا نے مجھ سے خرید و فروخت کی۔ تو مجھے ایسا ہے جیسا کہ اولاد
تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔ [1]

دوسرے مقام پر لکھا ہے:

انت منی بمنزلۃ ولدی۔ [2]
یعنی تو مجھ سے بمنزلہ میرے فرزند کے ہے

دعوئ الوہیت

نبوت سے ابن اللہ اور ابن اللہ سے خود اللہ ہونے کا مرزا صاحب نے بقلم خود اعلان مشہور و مشتہر کیا تھا۔ چنانچہ موصوف نے عربی زبان میں تحریر فرمایا ہے:

رأیتنی فی المنام عین اللہ	میں نے نیند میں اپنے آپ کو ہو بہو اللہ
وتیقنت اننی ھو فخلقت	دیکھا اور میں نے یقین کر لیا کہ میں وہی
السموات والارض وقلت	(اللہ) ہوں۔ پھر میں نے آسمان اور
انا زینا السماء الدنیا	زمین بنائے اور کہا کہ ہم نے آسمان کو
بمصابیح۔ [3]	ستاروں کے ساتھ سجایا ہے۔

اقبالی ڈگری

مرزا صاحب نے ایک طرف تو نبوت کا دعویٰ ڈنکے کی چوٹ کیا ہے لیکن دوسری جانب اُسے ظلی بروزی یا غیر تشریعی وغیرہ کے پردوں میں چھپانے اور آسانی سے بزہر مسلمانوں کے حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش کی ہے لیکن خدا کی قدرت کہ موصوف نے دعائے نبوت کو کفر بھی قرار دیا ہے۔ مثلاً جامع مسجد دہلی میں مرزا صاحب نے یہ اعلان کیا:

"ان تمام امور میں میرا وہی مذہب ہے جو دیگر اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔
اب میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار اس خانۂ خدا (جامع مسجد دہلی) میں کرتا ہوں کہ میں جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اُس کو بے دین اور

---

[1] غلام احمد قادیانی، دافع البلاء، ص ۶
[2] غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی، ص ۸۶
[3] ایضاً، آئینہ کمالات اسلام، ص ۵۶۴، ۵۶۵

دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔" ۱

دوسرے مقام پر مرزا صاحب نے مدعیانِ نبوت کے بارے میں یوں حکمِ شرعی بیان کیا ہے:

"میں سیدنا و مولانا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین کے بعد کسی دوسرے مدعی نبوت اور رسالت کو کاذب اور کافر جانتا ہوں۔" ۲

حکومت پاکستان نے بھی ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو یہی فیصلہ سنایا تھا کہ جو مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت و رسالت کا قائل ہے یا کم از کم ایسے دجال و کذاب کو مسلمان شمار کرتا ہے وہ کافر و مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ کذالک العذاب ولعذاب الآخرة اکبر لو کانوا یعلمون ○

مسلمانوں سے علیحدگی

مرزا صاحب کے نزدیک غیر احمدی ہرگز مسلمان نہیں تھے۔ چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

"جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا اور تیرا مخالف رہے گا وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہے۔" ۳

موصوف کے خلیفہ مرزا محمود قادیانی نے اس دائرے کو اور بھی وسیع کرتے ہوئے صاف لکھ دیا:

"کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے، خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا، وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔" ۴

اور مرزا غلام احمد قادیانی نے اس معاملے کو ان دو ٹوک لفظوں میں صاف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا۔" ۵

احمدی حضرات کسی غیر احمدی کے جنازے کی نماز پڑھنا جائز شمار نہیں کرتے۔ مثلاً:

"حضرت مرزا صاحب نے اپنے مرحوم (فضل احمد صاحب) کا جنازہ محض اس لیے

---

۱ غلام احمد قادیانی، تبلیغ رسالت، جلد دوم، ص ۴۴ — ۲ ایضاً، ص ۲۲

۳ ایضاً، جلد نہم، ص ۲۷ — ۴ مرزا محمود احمد، آئینۂ صداقت، ص ۳۵

۵ غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی، ص ۱۶۳

نہیں پڑھا کہ وہ غیر احمدی تھا؟[1]

احمدی حضرات کے نزدیک غیر احمدی کو لڑکی دینا قطعاً ممنوع اور ناقابلِ معافی جُرم ہے۔ مثلاً: حضرت مسیح موعود نے اس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔ آپ سے ایک شخص نے بار بار پُوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اُس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اُس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفہ اوّل حکیم نورالدین نے اُس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی، باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔[2]

مرزا صاحب نے اپنے پیروکاروں کو غیر احمدی حضرات کے پیچھے نماز پڑھنے سے قطعی طور پر منع کر دیا تھا۔ چنانچہ موصوف نے غیر احمدیوں کی تین قسمیں بنا کر تینوں کے بارے میں یُوں خدا کی طرف منسوب کرکے حکم سنایا تھا:

"پس یاد رکھو کہ جیسا کہ خدا نے مجھے اطلاع دی ہے تمہارے پر حرام ہے اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفر اور مکذب یا متردد کے پیچھے نماز پڑھو۔ بلکہ چاہیے کہ تمہارا وہی امام ہو جو تم میں سے ہو۔ اسی کی طرف حدیث بخاری کے ایک پہلو میں اشارہ ہے کہ امامکم منکم یعنی جب مسیح نازل ہوگا تو تمہیں دُوسرے فرقوں کو جو دعویٰ اسلام کرتے ہیں، بکلّی ترک کرنا پڑے گا اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ پس تم ایسا ہی کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا الزام تمہارے سر پر ہو اور تمہارے عمل حبط ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو؟"[3]

خلیفہ قادیان، میاں محمود احمد صاحب نے احمدی اور غیر احمدی کے مسئلے کا فیصلہ یُوں سُنایا

---

[1] اخبار الفضل قادیان، ۱۵ دسمبر ۱۹۱۷ء
[2] خلیفہ مرزا محمود احمد، انوارِ خلافت، ص ۹۳
[3] غلام احمد قادیانی، اربعین ۳، ص ۳۴

...اسے ہے

ہمارا یہ فرض ہے کہ غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں اور اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھیں کیونکہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں ۔ یہ دین کا معاملہ ہے ۔ اِس میں کسی کا اپنا اختیار نہیں کہ کچھ کر سکے ۔" [۱]

...ا صاحب نے اپنے مریدوں کو سبق پڑھایا تھا کہ احمدیوں کو غیر احمدی حضرات سے تعلقات قطع رکھنے چاہییں ، موصوف کے نزدیک مرزائی کار آمد اور مسلمان بیکار شے تھے ۔ چنانچہ ...کا ایک فیصلہ یوں منقول ہے :

"پھر ہم نے دوسرے مدعیانِ اسلام سے قطع تعلق کیا ہے اوّل تو یہ خدا تعالیٰ کے حکم سے تھا ، نہ اپنی طرف سے اور دوسرے وہ لوگ ریا پرستی اور طرح طرح کی خرابیوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور اُن لوگوں کو اُن کی ایسی حالت کے ساتھ اپنی جماعت کے ساتھ ملانا یا اُن سے تعلق رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عمدہ اور تازہ دودھ میں بگڑا ہوا دودھ ڈال دیں ، جو سڑ گیا ہے اور اُس میں کیڑے پڑ گئے ہیں ۔ اِس وجہ سے ہماری جماعت کسی طرح اُن سے تعلق نہیں رکھ سکتی اور نہ ہمیں ایسے تعلق کی حاجت ہے ۔" [۲]

...احقر نے بڑے اختصار کے ساتھ مرزا غلام احمد قادیانی کے مخصوص نظریات اور ...دی چند عنوانات کے تحت بغیر کسی خاص تبصرہ اور تردید کے پیش کر دیے ہیں تاکہ مسلمانوں کو ...حضرات کی منافرت ، اسلام دشمنی اور خارج عن الاسلام ہونے کا کسی قدر اندازہ ہو جائے ...طرح گزشتہ سطور میں احقر نے رئیس المبتدعین مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے لے کر ...ودی صاحب اور پرویز صاحب تک کے مخصوص نظریات اختصار کے ساتھ پیش کر دیے ہیں ...ظاہر ہے کہ میرا مقصد اُن کے متبعین کی خیر خواہی اور مسلمانوں کو اُن کے سراسر غیر اسلامی

---

[۱] ...بیان محمود احمد خلیفہ ، انوارِ خلافت ، ص ۹۰

[۲] غلام احمد قادیانی : رسالہ تشحیذ الاذہان ، جلد ۶ ، نمبر ۸ ، ص ۳۶

اور منافقانہ اندازِ فکر سے مطلع کرتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ پراگندہ سطور کتنے ہی حضرات کی ہدایت
باعث بن جائیں اور جو سُنّی مسلمان صلح کلیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور فرضی اتحاد
رواداری کا جنھیں ہیضہ ہوگیا ہے، ممکن ہے یہ سُرمہ اُن کی چشمِ بصیرت کے لیے مفید ثابت
ہوجائے۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ
توکلت والیہ انیب ط وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیدنا و مولانا محمد
وآلہ وصحبہ اجمعین۔

خاکپائے علماء، محمد عبدالحکیم خاں مجددی مظہری
المعروف بہ اختر شاہجہانپوری
دارالمصنفین لاہور

باب چہارم

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ ہو نخچیر کے دل میں بھی پیدا ذوقِ نخچیری

(اقبالؔ)

انگریز دوستی کی کہانی، انگریز دوستوں کی زبانی

قارئین کرام! گزشتہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ انگریزوں نے بعض علماء کو کس طرح خرید کر اپنے تخریبی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اسلام کا حلیہ بدلنے اور مسلمانوں کی مختلف ٹولیاں بنانے میں کس طرح اُن حضرات نے اسلام دشمن حکومت کا ہاتھ بٹایا۔ انگریزوں کے ساتھ اس تخریب کاری میں متفق الرائے ہونے والے بعض علماء کی گزشتہ صفحات میں نشاندہی کی جا چکی ہے۔

بعض مبتدعین کے علماء و مورخین بغض معاویہ میں یا اپنے اکابر کی انگریز دوستی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے علمائے اہلسنت کے بارے میں عوام کو چھیڑنے اور جہلاء میں اپنا بھرم جمائے رکھنے کی غرض سے مفروضات کا سہارا لے کر لکھا کرتے ہیں کہ اگر فلاں عالم انگریزوں کا ایجنٹ نہیں تھا تو اُس نے ہمارے فلاں فلاں بزرگ کی تکفیر کیوں کی؟ یا چونکہ فلاں عالم نے تحریک خلافت یا فلاں گاندھوی منصوبے کی حمایت نہیں کی تھی لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ مولوی انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ ایسے انصاف دشمن اور اسلامی تعلیمات سے نا آشنا حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح خلاف دیانت لکھنا اور غلط تاثرات پھیلانا حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ آخر خدا کے ولیوں اور مقبول بندوں سے بغض و عداوت رکھ کر، اللہ تعالیٰ سے لڑائی مول لینے میں دارین کی کون سی بھلائی کا راز پنہاں ہے؟

ایسے حاسدین اور انصاف کا خون کرنے والے محققین کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت اور اصلیت کے میدان میں یہ اگر، مگر اور چونکہ، چنانچہ کے سہارے بے معنی اور فضول ہوا کرتے ہیں۔ کیا کسی پر اتنا بڑا الزام صرف مفروضات کی بنا پر عائد کیا جا سکتا ہے؟ کیا فرضی مغالطوں میں بھی عقلاء کے نزدیک کوئی وزن ہوا کرتا ہے؟ اگر مخالفین اہلسنت اور مبتدعین زمانہ کے پاس علمائے اہلسنت کی انگریز دوستی کا ایک بھی ٹھوس اور یقینی ثبوت ہے تو بڑے شوق سے پیش کریں۔ لیکن یہ مد نظر رہے کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا

النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ○ اگر ایک ثبوت بھی نہ لاسکو اور ہم کہے دیتے ہیں ہرگز نہ لاسکوگے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

برٹش گورنمنٹ کے پروردہ علماء نے شریعتِ اسلامیہ کو ختم یا رد کرنے کی جو کوششیں کی تھیں، قارئین گزشتہ باب میں ملاحظہ فرما چکے۔ ان حضرات کی انگریز دوستی کے اگرچہ سیکڑوں بیانات پیشِ نظر ہیں لیکن بخوفِ طوالت مَاقَلَّ وَدَلَّ کے تحت چند حوالے پیشِ خدمت ہیں وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْق۔

۱۔ سید احمد صاحب بریلوی

سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کا جب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے معاملہ طے ہوا تو آپ نواب امیر خاں پنڈاری کے ہاں جاکر ملازم ہوگئے۔ وہاں ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۶ء تک تقریباً سات سال رہے۔ ان ایام میں نواب امیر خاں کی پوزیشن کیا تھی؟ اس بارے میں غلام رسول مہر یوں لکھتے ہیں:

"غرض امیر خاں آخری دور کے آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے بڑھ کر طاقتور تھا۔ ایک موقع پر اس کے پاس چالیس ہزار جانباز جمع ہوگئے تھے اور ایک سو پندرہ توپیں تھیں۔ اتنی عظیم الشان قوت کو انگریز قلبِ ہند میں آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہوسکتے تھے، لیکن انھیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کھلے میدان میں ٹکرائیں، اس لیے کہ جانتے تھے، منچلا آدمی ہے، مقابلے پر ڈٹ جائے گا تو ممکن ہے دوسری ملکی قوتیں بھی جو بظاہر دب گئی تھیں، ابھر آئیں اور ہمیں بستر بوریا سنبھال کر ہندوستان سے نکل جانا پڑے۔ وہ امیر خاں سے ٹکراتے نہیں، لیکن جو عناصر اس کے لیے کمک و یاوری کا سرچشمہ بن سکتے تھے انھیں ایک ایک کرکے آہستہ آہستہ توڑتے رہے یہاں تک کہ اس کی فوج میں بھی انگریزی ریشہ دوانیاں خاصی پھیل گئی تھیں۔"[1]

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، بار سوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۹۱، ۹۲

جب نواب امیر خاں انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا تو دونوں کو دونوں سے راہ ہوتی ہے، اُن دنوں سید صاحب کو بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح الہام ہو رہا تھا۔ کس بات کا الہام ہو رہا تھا؟ مہر صاحب بتاتے ہیں :

"خود سید صاحب کا بیان ہے کہ غیبی اشاروں کی بنا پر وہ نواب صاحب کے لشکر میں گئے تھے۔ وقائع میں ہے کہ جب وہ لشکر میں تھے تو ایک روز فرمایا:

"قصبہ رائے بریلی میں مجھ کو جناب الٰہی سے الہام ہوا کہ یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر میں جا اور وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی، وہاں ہم کو تجھ سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔ یہ مژدۂ غیبی سن کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ چند روز میں آکر ملازمت نواب صاحب ممدوح کی حاصل کی۔" [1]

نیز منظورہ صفحہ ۲۲۴ کے حوالے سے موصوف یوں رقمطراز ہیں :

"از زمانیکہ حضرت امیر المومنین ——— بنا بر الہامیکہ درباب اقامت جہاد می شد، راہگرائے لشکر ظفر اثر ——— امیر الدولہ نواب امیر خاں بہادر مرحوم شدند" جس زمانے میں حضرت امیر المومنین اقامت جہاد کے متعلق غیبی اشارے کی بنا پر امیر الدولہ نواب امیر خاں مرحوم کے لشکر ظفر اثر کی جانب روانہ ہوئے۔ [2]

شاید کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے سید صاحب نے نواب موصوف کی فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ کیا تھا، کیونکہ وہ پیر و مرشد تھے۔ جناب غلام رسول مہر اس خیال کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کی تحقیق یہی ہے کہ شاہ صاحب کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

"جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے صاف آشکارا ہے کہ سید صاحب نے بطور خود یہ فیصلہ فرمایا، شاہ صاحب کے امر و حکم کو اس اقدام سے کوئی تعلق

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، بار سوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۸۷

[2] ایضاً : ص ۸۷

نہ تھا۔ انھیں راستے بریلی ہی میں غیبی اشارہ ہُوا کہ نواب کے پاس جاؤ، چنانچہ وُہ نکل پڑے اور دہلی ہوتے ہُوئے راجپوتانہ پہنچ گئے۔" ۱

نواب کی فوج میں بھرتی ہونے کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی یُوں رقمطراز ہیں:

"جب سیّد صاحب نے سواروں میں نام لکھوایا ہے تو آپ امیر خاں کے آگے پیش کیے گئے۔ وُہ دیکھ کے بہت خوش ہُوا اور اس نے یہ کہا، اگر اپنی جان کھپا کے محنت کی اور اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تو میں آپ کو ایک ہزار فوج کا افسر بنا دُوں گا۔" ۲

سیّد صاحب نے الہام کی ہدایات کے مطابق خُوب اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تاکہ نواب کا اعتماد حاصل کر لیا جائے۔ ساتھ ہی نواب موصوف کی خیر خواہی کا پوری طرح دم بھرتے رہے۔ آخر کار منزلِ مقصود ہاتھ آگئی۔ یعنی:

"جب پے در پے یہ باتیں سیّد احمد صاحب سے ظہور پذیر ہُوئیں، پھر تو امیر خاں نے اپنا مشیر مقرر کر لیا اور کوئی کام بغیر آپ کے مشورہ نہ کرتا تھا۔ ساتھ ہی ان کامیابیوں کے جو سیّد صاحب کو حاصل ہُوئیں، یہ خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے اس ترقی پر بھی اپنے فرائض کے انجام دینے سے (جو الہام کے ذریعے تفویض ہُوئے تھے) پہلو تہی نہ کی۔" ۳

سیّد صاحب نے نواب کے پاس کس قسم کے اکلِ حلال سے ولایتِ انبیاء کی منازل طے کی تھیں۔ اس حقیقت کے چہرے سے مرزا حیرت دہلوی نے یُوں نقاب اٹھا کر حقیقت کو واضح کیا ہُوا ہے:

"امیر خاں کے لشکر کی کوئی باقاعدہ تنخواہ نہ تھی۔ کسی ریاست پر چھاپہ مارا ۔۔

---

۱ غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۹۳

۲ مرزا حیرت دہلوی: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۲ء، ص ۳۵۹

۳ ایضاً: ص ۳۵۹

اگر وہاں سے کچھ ہاتھ لگ گیا تو باہم تقسیم ہو گیا نہ ہاتھ لگا لشکر میں فاقہ کشی ہو رہی ہے۔ لٹیروں کی سی کیفیت تھی۔ کبھی جے پور پر حملہ کر کے یہاں زلزلہ ڈال دیا اور کبھی جودھ پور پر جا دوڑا وہاں ایک حشر مچا دیا۔۔۔۔ امیر خاں کے سپاہیوں کی زندگی جس قدر خطرناک تھی اُسی قدر چاق و چست اور شمشیر زنی میں بسر ہوتی تھی، جو سپاہیانہ قالب کی یہی رُوح ہے۔"[1]

"سید احمد صاحب تقریباً سات برس تک امیر خاں کی ملازمت میں رہے۔ اس عرصہ میں آپ کو بارہا مختلف جنگوں میں جانے اور توپ و بندوق و تلوار سے کام لینے کا موقع پڑا ہوگا۔ کہیں کسی کے ساتھ آپ نے حملہ کیا ہوگا تو کہیں سرکش گاؤں کو لوٹا کھسوٹا ہوگا۔ غرض ساری ہی باتیں جن سے جنگ و غارت تعبیر ہو سکتی ہے عمل میں آئی ہوں گی۔"[2]

سید احمد صاحب کو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور اُس کی فوج میں بھرتی ہونے کا الہام کیونکر ہوا تھا اور کس کی طرف سے ہوا تھا؟ اِس سوال کا جواب موصوف کی کارگزاری میں ہی مل سکتا ہے کہ اُن کا مشن کیا تھا؟ اور کب انھوں نے اپنے فرضِ منصبی کو پورا کر کے نواب کو خیرباد کہا۔ مولوی محمد جعفر اِس سلسلے میں یوں لکھتے ہیں:

"ایک روز کا ذکر ہے کہ لشکرِ نواب امیر خاں مرحوم انگریزوں کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ دونوں طرف سے توپ اور بندوقیں چل رہی تھیں۔ اُس وقت سید صاحب اپنے خیمے میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے اپنا گھوڑا تیار کروایا اور اُس پر سوار ہو کر شل ہوا کے دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں انگریزی فوج کا سپہ سالار مع اپنے مصاحبوں کے کھڑا تھا۔ پس وہاں سے اُس سپہ سالار کو ساتھ لے کر پھر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے

---

[1] سیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۰۲ء، ص ۳۵۸، ۳۵۹

[2] ایضاً، ص ۳۶۲

اپنے خیمے تک چلے آئے۔ یہاں آکر تھوڑی سی بات چیت کے بعد سپہ سالار مذکور نے عہد کر لیا کہ میں اسی دم اپنے لشکر کو مقابلۂ نواب امیر خاں سے واپس لے جاؤں گا اور پھر مقابلہ کو نہ آؤں گا، بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا اپنی سرکار کو اس بات پر مجبور کروں گا کہ نواب امیر خاں سے صلح کر لے۔ اس واقعہ کے بعد پھر سرکار انگریزی اور نواب امیر خاں میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ صلح کی بات چیت اور رسل و رسائل شروع ہو گئے اور لارڈ ہیسٹنگ صاحب بہادر والیٔ ہند کے عہد میں ٹونک کا ملک نواب صاحب کو دے کر صلح کی گئی" [۱]

یہ تھا سید احمد صاحب کا مشن کہ نواب امیر خاں کا اعتماد پورے طور پر حاصل کر کے انگریزوں کے حق میں فضا ہموار کرتے اور نواب کی جڑیں کاٹتے رہے۔ عین مقابلہ کے وقت ظاہر ہو سکے کہ انگریزی فوج تک بھی محض خاطر کی طرح دندناتے پھر رہے تھے اور کسی نے روکنے ٹوکنے کی ضرورت تک نہ سمجھی۔ امیر خاں کی آنکھیں کھلیں لیکن اس وقت جب چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔ مجبوراً صلح پر آمادہ ہونا پڑا۔ تھانیسری صاحب آگے یوں تصریح کرتے ہیں:

"ابھی صلح کی بات چیت طے نہیں ہوئی تھی کہ سید صاحبؒ سات برس کے قیام کے بعد پھر لشکر نواب امیر خاں سے جدا ہو کر دوبارہ ۱۸۱۶ء میں دہلی تشریف لے گئے۔۔۔۔۔ اپنے چلنے کے وقت آپ نے یہ پیشین گوئی کی تھی، جس کو نواب وزیر الدولہ مرحوم (ابن نواب امیر خاں) اپنے وصایا وزیری میں اس طرح لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ نے مولوی نذر محمد صاحب سے کہ وہ بھی لشکر میں موجود تھے اپنے رخصت ہونے کے وقت فرمایا تھا کہ "اب جلد صلح ہو جائے گی اور فلاں فلاں شہر اور فلاں فلاں علاقہ سرکار انگریزی نواب صاحب کو دے دے گی اور ایک زمانۂ دراز گزرنے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ تم بھی ایک لشکر مجاہدین کا ساتھ لے کر نشانوں کے پھریرے اڑاتا ہوا پہنچ

---

[۱] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۱

"امیر خاں صاحب کے ملک سے گزروں گا" اس پیشین گوئی کے ذکر کرنے کے
بعد نواب وزیر الدولہ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ "موافق اس پیشین گوئی کے
بیلہ جو شہر اور ممالک آپ نے بتلائے تھے، ٹھیک وہی سرکار انگریزی سے ہم کو
ملے اور صلح ہو گئی" [1]

موصوف کا بیان چونکہ نواب وزیر الدولہ ابن نواب امیر خاں کی کتاب "وصایا وزیری" کے حوالے
سے ماخوذ اور مدلل ہے لہذا قابلِ تقسیم ہونے میں کیا شک وشبہ رہا۔ مذکورہ اقتباس کی روشنی
میں نتیجہ سامنے آتا ہے کہ سید احمد صاحب جو پیشگوئیاں کر رہے تھے اور موصوف پر جو الہامات کی بارش
ہو رہی تھی اس کا معدن و مصدر برٹش گورنمنٹ ہی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ حوالوں کی روشنی
میں ہر منصف مزاج نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ مزید تسلی کے لیے مرزا حیرت دہلوی کی تصدیق بھی قابلِ غور ہے
موصوف لکھتے ہیں:

"آخر کار ایک بڑے مشورہ کے بعد سید احمد صاحب کی کارگزاری سے ہر
ریاست میں سے کچھ کچھ حصہ دے کر امیر خاں سے معاہدہ کر لیا، جیسے ٹونک پورے
ٹونک دلوایا اور بھوپال سے سرونج، اسی طرح مختلف پرگنے مختلف ریاستوں سے
بڑی قیل وقال کے بعد انگریزوں نے دلوا کے بپھرے ہوئے شیر کو اس
حکمت سے پنجرہ میں بند کر دیا" [2]

اس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی نے بھی گی لپٹی رکھے بغیر صورت حال بیان کی۔ مذکورہ حوالہ میں بعض
امور چونکہ اجمال سے کام لیا گیا ہے لہذا ان باتوں کی تفصیل کے لیے موصوف کا مندرجہ ذیل بیان
کافی ہوگا:

"۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے، مگر ایک نامور
کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرا دی اور آپ ہی کے ذریعہ
سے جو شہر بعد ازاں دے گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے
دینے طے پائے تھے۔ لارڈ ہیسٹنگ سر سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگزاری سے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۱، ۲۰۱۔

[2] حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۱، ۳۶۲۔

بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا، امیر خاں، لارڈ ہیسٹنگ اور سید احمد صاحب۔ سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اُتارا تھا۔ آپ نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھِڑنا اگر تمھارے لیے بُرا نہیں ہے تو تمھاری اولاد کے لیے سمِ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ انگریزوں کی قوت دن بدن ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں پے در پے تنزل کرتی جاتی ہیں۔ تمھارے بعد فوج کو کون سنبھالے گا اور عظیم الشان لشکرِ انگلشیہ کے مقابلے میں کون میدانِ جنگ میں لاکے جائے گا؟ یہ باتیں امیر خاں کی سمجھ میں آ گئی تھیں اور اب وہ اس بات پر رضامند تھا کہ گزارہ کے لیے کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تو میں آرام سے بیٹھوں۔"[۱]

سید صاحب کو جو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور وہاں اپنی کارگزاری دکھانے کا الہام ہوا تھا، موصوف نے اُس پر عمل کرنے کی غرض سے لوٹ مار، قتل و قتال اور فساد و دہشت گردی وغیرہ کسی چیز کو بھی وہاں قابلِ نفرت نہ سمجھا اور نیز لوٹ مار اور جبر و استبداد سے حاصل کیے مال کو اکلِ حلال کے درجے سے ذرا بھی گرا ہوا نہ گردانا کیونکہ اُن دنوں سید صاحب اُن کے معتقدوں اور سوانح نگاروں کے مقدر سے ولایتِ انبیاء کی منازل کو تیز رفتاری سے طے کر رہے تھے۔ جب سات سالہ محنتِ شاقہ اور سعیِ پیہم کے باعث سید صاحب منزلِ مقصود پر پہنچ گئے، نواب امیر خاں کو شیشہ میں اُتار لیا، اس بپھرے ہوئے شیر کو انگریزوں کے پنجہ میں بند کروا دیا اور اس طرح اپنے ملہم (لارڈ ہیسٹنگ) کو اپنی اس بے نظیر کارگزاری سے خوب خوش کر لیا تو موصوف انتہائی احترام کے مستحق قرار پا گئے۔ چنانچہ خاندانِ سید صاحب کے چشم و چراغ، مولوی سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ:

"قلعۂ الٰہ آباد میں جو مسلمان سپاہی مختلف خدمات پر متعین تھے اور تین سو کی تعداد میں تھے اُنھوں نے انگریز قلعہ دار کی اجازت سے حضرت (سید صاحب) کو

---

۱ حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۹۱

قلعہ میں تشریف لانے کی زحمت دی۔ شہ نشین پر جو سلاطینِ سابق کی تخت گاہ تھی،
آپ کو بٹھایا اور بڑے خلوص و اعتقاد کے ساتھ بیعت کی۔"[1]

چونکہ سید صاحب سکھوں سے لڑنے کی تیاریاں کرنے والے تھے۔ اس لیے بطور تشکر یہ انگریزوں نے بھی موصوف کے راستوں میں دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔ سید صاحب بھی انگریزوں کی اس عقیدت کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور حتی الامکان کسی عام انگریز کو بھی مایوس نہیں کرتے تھے مثلاً:

"جہان آباد سے آگے ایک مقام اوجھنی میں ہوا۔ وہاں کے زمیندار شیخ لعل محمد نے دعوت کی اور سینکڑوں آدمی مرید ہوئے۔ آگے بڑھے تو راستے میں ایک انگریز کی مسلمان بیوی نے دعوت کی غرض سے روکا۔ سید صاحب نے اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انگریز خود آیا اور عرض کی کہ اس کی دعوت نہ مانیے لیکن میری دعوت قبول کرنے میں تو تکلف نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے انگریز کی دعوت قبول کر لی۔"[2]

انگریزوں کے اسی ہدیۂ تشکر کی کہانی جناب غلام رسول مہر کی زبانی مزید پیشِ خدمت ہے:

"صبح کو ڈگڈگی سے روانہ ہوئے۔ شام ہو گئی تو ملاحوں نے ایسی جگہ کشتیاں باندھیں، جہاں آس پاس کوئی بستی نظر نہیں آتی تھی۔ دریا کے کنارے کی زمین دُور دُور تک اس درجہ خراب تھی کہ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس اثنا میں کالی گھٹا اٹھی، تیز ہوا چلنے لگی اور قطرہ افشانی شروع ہو گئی۔ سب نے سمجھ لیا کہ رات کھائے بغیر گزارنی ہو گی۔ اچانک دُور مشعلیں نظر آئیں۔ سمجھا گیا کہ کچھ لوگ کشتیوں کی طرف آ رہے ہیں۔ پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ نیل کے انگریز تاجر نے اپنے مسلمان کارکنوں کے پاس خاطر سے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر بھیجی ہیں اور خود گھوڑے پر ساتھ آیا ہے۔"[3]

---

[1] ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ۱۹۶

[2] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۰ — [3] ایضاً: ۱۸۹

جب دعوتوں کا تذکرہ ہی شروع ہو گیا تو مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی بھی ایک عقیدت مندی اِس سے بھی عظیم الشان دعوت کا بیان سُن لیا جائے۔ چنانچہ موصوف یوں وضاحت فرماتے ہیں:

"جب وہ مشعلیں کنارے کے نزدیک پہنچیں تو دیکھا کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار مختلف قسم کا بہت سا کھانا ساتھ لیے چلا آتا ہے۔ اُس نے کشتی کے نزدیک آ کر پوچھا، پادری صاحب کہاں ہیں؟ جب حضرت نے کشتی میں سے جواب دیا تو وہ گھوڑے سے اتر کر اور اپنی ٹوپی سر سے اتار کر بہت ادب سے حضرت کے سامنے کشتی میں آیا۔ بعد سلام و مزاج پرسی کے عرض کیا کہ تین روز سے میں نے حضور کی تشریف آوری کی خبر لانے کے لیے نوکر اس طرف متعین کر رکھے تھے، سو آج اُنھوں نے مجھ کو خبر دی، لہٰذا یہ ماحضر، حضور اور کل قافلے کے لیے تیار کر کے لایا ہوں، براہِ بندہ نوازی اِس کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ فوراً وہ کھانا اپنے برتنوں میں لے کر قافلے میں تقسیم کر دو۔ تقریباً دو گھڑی تک وہ انگریز حضور میں حاضر رہا، پھر رخصت لے کر مع اپنے آدمیوں کے واپس چلا گیا۔"[1]

دعوتوں کے یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ سید احمد صاحب اِس تیاریٔ جنگ کے سلسلے میں جب تک ہندوستان میں رہے تو انگریز وقتاً فوقتاً اِس قسم کی ناز برداری کرتے رہے اور جب اپنی ہجرت کر کے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں خبر گیری کا بھی حکومت نے انتظام کیا ہوا تھا۔ اِس قافلے کی مذکورہ ضیافت کے واقعے کو سید ابوالحسن علی ندوی نے اِن لفظوں میں بیان کیا ہے:

"اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ انگریز گھوڑے پر سوار چند پالکیوں میں کھانا رکھے کشتی کے قریب آیا اور پوچھا کہ پادری صاحب کہاں ہیں؟ حضرت نے کشتی پر سے جواب دیا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ انگریز گھوڑے پر سے اُترا اور ٹوپی ہاتھ میں

---

1. محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء، ص ۱۳۱

لیے کشتی پر پہنچا اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ تین روز سے میں نے اپنے ملازم یہاں
مقرر کر دیئے تھے کہ آپ کی اطلاع کریں۔ آج اُنھوں نے اطلاع کی کہ اغلب
یہ ہے کہ حضرت قافلہ کے ساتھ تمھارے مکان کے سامنے پہنچیں۔ یہ اطلاع
پا کر غروب آفتاب تک میں کھانے کی تیاری میں مشغول رہا۔ تیار کرانے کے بعد
لایا ہوں۔ سید صاحب نے حکم دیا کہ کھانا اپنے برتنوں میں منتقل کر لیا جائے کھانا
سارے قافلہ میں تقسیم کر دیا گیا اور انگریز دو تین گھنٹہ ٹھیر کر چلا گیا۔[1]

جب انفرادی دعوت سے کھانے کی بھری ہوئی چند پالکیوں اور پلاؤ زردے تک بات آگئی تو
اب پورے قافلے کی اُن عظیم الشان دعوتوں کا تذکرہ بھی کیوں نہ کر ہی دیا جائے جن کی نظیر
چشم فلک کہن نے اس وقت سے پہلے یا اس وقت سے لے کر اب تک، برصغیر پاک و ہند
کی زمین پر شاید ہی دیکھی ہوگی۔ ضیافت اور دعوت پر ہی کیا منحصر، معلوم یہی ہوتا ہے کہ ہاتھی کے
دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور بظاہر تو منتظم فلاں ابن فلاں نظر آرہے تھے لیکن
اندرون خانہ حکومت ہی سب کچھ کر رہی تھی۔ خوب کھلا پلا کر، ہر طرح آراستہ و پیراستہ کر کے،
قربانی کے بکرے بنا کر، اپنے اقتدار کی بلائیں اتارنے کے لیے بالاکوٹ میں بھینٹ چڑھانے
کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ یہ حضرات ان ناز برداریوں میں ایسے مست ہوئے کہ جاموں میں پھولے
نہ سماتے۔ ؎

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

سید صاحب کے اس قافلے کی الہ آباد میں کس طرح ضیافتیں ہوئیں، کس قدر سامان امداد کے
طور پر دیا گیا، یہ موصوف کے نامور سوانح نگار جناب غلام رسول مہر کی زبانی پیش خدمت ہے:
"شیخ غلام علی نے ہر ایک سے کہہ دیا تھا کہ دوران قیام الہ آباد میں کوئی صاحب
سید صاحب کو کھانے کی تکلیف نہ دیں۔ یہ احسان صرف میرے ذمے رہنے دیا جائے۔

[1] ابو الحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ١٩٠

ان اپنے مکان پر لے جا کر پان کھلائیں، عطر لگائیں، نذریں پیش کریں، کھانا نہ کھلائیں۔ چنانچہ سید صاحب جب تک الٰہ آباد میں ٹھہرے رہے پورے قافلے کی مہمانداری شیخ غلام علی نے فرمائی اور کس شان و اہتمام کے ساتھ! آج اس کی تفصیلات سن کر شاید اکثر لوگ سمجھیں گے کہ خیالی افسانہ بیان ہو رہا ہے حالانکہ شیخ صاحب نے تواضع اور مدارات کا جو نمونہ پیش کیا اس کی محض سرسری کیفیت ہم تک پہنچ سکی ہے۔

شیخ صاحب مہاراجہ اودت نرائن والیٔ بنارس کے مختار تھے۔ انہوں نے سید صاحب کو ایک کوٹھی میں ٹھہرایا۔ باقی قافلے کے لیے مہاراجہ کی بارہ دری خالی کرائی۔ پورے قافلے کے لیے دونوں وقت کا کھانا قیام گاہ پر پہنچ جاتا تھا اور کیسا کھانا! ایک ایک وقت میں کئی کئی چیزیں تیار ہو کر آتیں مثلاً قورمہ، پلاؤ، زردہ، شیرمال، تازہ مٹھائی، خمیری روٹیاں۔ اس وقت تک ساتھیوں کی تعداد ساڑھے سات سو ہو چکی تھی لیکن شیخ صاحب کے تکلف میں کوئی کمی نہ آئی۔ اندازہ کیا گیا کہ کم از کم ایک ہزار روپے روزانہ کھانے پر صرف ہوتے تھے اور یہ اس زمانے کا خرچ ہے جب جنسیں بے حد ارزاں تھیں۔

شیخ صاحب دن میں دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لیے آتے، ایک مرتبہ بعد نماز ظہر، دوسری مرتبہ بعد نماز مغرب۔ دونوں مرتبہ بیش بہا نذریں ساتھ لاتے مثلاً نہایت قیمتی پارچے، عمدہ بندوقیں، پستول اور تلواریں، بعض اوقات نقد روپیہ لے آتے۔ واقف کار اصحاب کا اندازہ ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام میں شیخ صاحب نے اس طریق پر جو نذریں پیش کیں، وہ بحیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہوں گی......

اسی دوران میں شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے نئے تیار کرا کے پیش کیے کہ سفر میں کام آئیں گے۔ قافلے کے ہر فرد کو ایک ایک

جوڑی جوتے، مردوں کو دو دو پاجامے، دو دو انگرکھے، دو دو ٹوپیاں اور ایک ایک چادر۔ مستورات کو دو دو پاجامے، دو دو کرتے اور دو دو دوپٹے دیئے۔ سب کو سرِ عام ایک ایک روپیہ دیا۔ سید صاحب کے اقرباء کی خدمت میں دس دس روپیہ فی کس پیش کیے۔ علماء کی خدمت میں اُن کی حیثیت و مرتبہ کے مطابق نذریں گزرانیں۔

سید صاحب کے لیے روزانہ پانچ سو روپے یا کسی وقت کم یا زیادہ لے کر آتے۔ دونوں وقت کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے بھجواتے۔ ایک روز سید صاحب کی دونوں بیبیوں کو اسّی اسّی روپے دیئے گئے۔ لطف یہ کہ جب نذریں پیش کرتے تو بڑے ہی انکسار سے تہی دستی کا اظہار فرماتے۔

رخصت کے وقت سید صاحب کی خدمت میں جو سامان لائے وہ بیس پچیس کشتیوں میں لگا ہوا تھا۔ اُس میں مشروع، کمخواب، پشمینے، نینو، ڈھاکے کی ململ، محمودی، بنارسی اطلس وغیرہ کے تھان بھی تھے اور کشمیری شال بھی۔ ان کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد تھے۔ دو نہایت خوبصورت مُطلّا و مذہب قرآن مجید نذر کیے۔ ایک مکہ معظمہ کے لیے اور دوسرا مدینہ منورہ کے لیے۔ تمام اہلِ قافلہ کے لیے نو نو دس دس ہاتھ لمبے جامہ ہائے احرام تھے جن میں ایک سو بیس تھان صرف ہوئے۔ دو سو چالیس تھان گاڑھے کے ان کے علاوہ تھے، تاکہ متفرق ضروریات میں کام آئیں۔[1]

[اس] کے بعد قیامِ کلکتہ کے دوران منشی امین الدین نے اس قافلے کی جو خاطر مدارات کی یا اُن کے [ذریع]ے کسی نے کروائی اُس کا تذکرہ پہلے مولوی محمد جعفر تھانیسری کے لفظوں میں ملاحظہ فرما لیا جائے۔ [ہو]تے ہیں:

---

[1] [غل]ام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۰ – ۱۹۲

"اس وقت منشی امین الدین صاحب وکیل سرکار جو کلکتہ کے مسلم رؤسا میں تھے مع بہت سے عمائد ساکنان کلکتہ کے خدمت شریف میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کلکتہ میں قیام تک اس خاکسار کے غریب خانہ میں مقیم رہیں اور جو نان و نمک میسر ہوں قبول فرمائیں۔ حضرت نے اُن کی درخواست کو قبول کر لیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اَور بہت سے شریف و نجیب کلکتہ کے وہاں پہنچے اور حضرت کو اپنے اپنے مکانات کو لے جانا چاہا۔ مگر چونکہ حضرت نے منشی امین الدین سے وعدہ کر لیا تھا، اس واسطے اُن کی درخواست کو منظور نہ فرمایا۔ نماز مغرب کے بعد اوّل حضرت بہ سواری پالکی منشی امین الدین کے مکان کو تشریف لے گئے اور پھر منشی صاحب نے ہر قسم کی سواریاں بھیج کر آدھی رات تک سارے قافلے کو اپنے مکان میں پہنچا دیا۔

ایک عمدہ باغ میں قافلے کا ڈیرہ کرایا گیا۔ رات کو نہایت عمدہ اور پُر تکلف کھانا منشی صاحب کے یہاں سے آیا اور بافراغت سارے قافلے نے سیر ہو کر کھایا۔ صبح کو منشی صاحب نے سارے قافلے کے واسطے جوتے خرید کر ہر ایک کو تقسیم کر دئے۔ جس کے پاس کپڑا نہ رہا تھا اُس کو کپڑا بنوا دیا۔ لیکن اس تاریخ سے سید صاحب کو اس مکان میں اُتار کر جو منشی امین الدین صاحب رخصت ہوئے پھر آ کر انھوں نے کبھی مُنہ نہ دکھایا، اگرچہ دونوں وقت اُن کے یہاں سے سارے قافلے کو کھانا آتا تھا اور اُن کے آدمی ہر وقت خدمت کے واسطے موجود رہتے تھے، مگر وہ خود کبھی نہ آتے۔ اسی طرح تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔" [1]

برٹش گورنمنٹ کے اس سرکاری وکیل یعنی منشی امین الدین نے سید احمد صاحب اور اُن قافلے کی جس طرح خاطر مدارات کی اس کا نقشہ جناب غلام رسول مہر نے اپنی مؤثر خامہ سے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۹

کے ساتھ یوں کھینچا ہے :

"منشی صاحب نے دریا کے کنارے بہت بڑی دری بچھوا دی تھی اور ہر قسم کی سواریاں بکثرت منگالی تھیں مثلاً پینس، ڈولیاں، بگھیاں، کرانچیاں، ہوادار وغیرہ۔ بار برداری کے لیے چھکڑے موجود تھے۔ مزدور بھی خاصی تعداد میں جمع تھے۔ پہلے مستورات کو پردہ کر کے اتارا گیا اور قیام گاہ پر بھیج دیا۔ پھر مرد سوار ہوئے۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ بہت سی خالی واپس کرنی پڑیں۔ منشی صاحب سید صاحب کو پینس میں سوار کرا کے پہلے اپنے مکان پر لے گئے، پھر قیام گاہ پر پہنچایا، جہاں تمام کمرے سفید فرش سے آراستہ تھے اور ہر کمرے میں ضرورت کے مطابق پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ متعدد اکابر نے بھی اپنے اپنے ہاں ٹھیرنے کی درخواست کی، لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ منشی امین الدین احمد کے ساتھ اقرار ہو چکا ہے اس لیے معذور ہوں، البتہ دعوت قبول کرونگا۔

تین روز تک منشی صاحب کے ہاں سے نہایت پُر تکلف کھانے آتے رہے، مثلاً قورمہ، شیرمال، باقرخانیاں، ماہی پلاؤ، بکرے کا پلاؤ، کئی قسم کے مربے اور اچار، کئی قسم کے میٹھے، سید صاحب کے لیے جو کھانا آتا اس میں اور بھی کئی قسمیں ہوتیں۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا کہ ہمارے لیے صرف ایک قسم کا کھانا آتے، انواع و اقسام کے کھانے کو اہلِ قافلہ میں تقسیم کرنا بھی مشکل ہے اور ہم لوگ تکلفات کو اچھا بھی نہیں سمجھتے۔ منشی صاحب نے سمجھا کہ شاید کھانا اچھا نہیں ہوتا اس لیے تکلفات میں مزید اہتمام و اضافہ کر دیا۔" [له]

موصوف نے منشی امین الدین صاحب کی فیاضی یا اُن کے حاکموں کی ذرہ نوازی کو مزید یوں بیان کیا ہے :

له غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۷۰ء، ۲۰۶

"منشی صاحب نے پورا باغ سید صاحب کی نذر کر دیا تھا۔ اس میں نارنگی، چکوترے، سنگترے، کیلے، انجیر، انار، امرود، ناریل، آم وغیرہ کے درخت تھے۔ انگور کی بیلیں بھی تھیں، اناناس بھی تھے۔ سید صاحب کے رفیقوں کی تقویٰ شعاری کا یہ عالم تھا کہ خود پھل توڑنا ایک طرف، جو پھل درختوں سے خود بخود گر جاتے انھیں بھی کوئی نہ اٹھاتا تا۔ ایسے تمام پھل سید صاحب کے پاس جمع ہو جاتے؛ آپ پورے قافلے میں تقسیم فرما دیتے۔ قافلے کے بعض افراد کے جوتے ٹوٹ گئے تھے" مخزن احمدی سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی امین الدین احمد نے پہلے ہی دن ضرورت مندوں کو تین سَو روپے کے جوتے اور ایک ہزار سے زیادہ کے کپڑے خرید دیے[1]۔

یہ منشی امین الدین کون تھے اور ان کا کاروبار کیا تھا؟ ان کا انگریزوں سے کوئی تعلق دور یا نزدیک کا تھا یا نہیں؟ ان مجملات کی وضاحت سید احمد صاحب کے عاشق زار اور وہابیوں کے مورخ نامدار عالی جناب غلام رسول مہر نے یوں دادِ تحقیق دیتے ہوئے فرمائی ہے:

اُسی مقام پر کلکتے سے ایک تیز رفتار کشتی میں جسے پینس کہتے تھے ایک صاحب آئے اور سید صاحب سے ملے۔ نام پوچھا تو بتایا، امین الدین۔ یہ منشی امین الدین احمد تھے جو بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے اور کلکتہ کے ممتاز امیروں میں گنے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی میں انھیں وکالت کا عہدہ حاصل تھا اور کمپنی کے پورے ہندوستانی علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے، سب منشی صاحب ہی کی وساطت سے پیش ہوتے تھے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ مقرر نہ تھی، لیکن حق وکالت کی رقم اتنی بن جاتی تھی کہ صاحب "مخزن احمدی" کے بیان کے مطابق ہر مہینے کے اختتام پر تیس چالیس ہزار روپے کی تھیلیاں ہاتھی پر

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۸

مذکور ان کے گھر پہنچی تھیں۔[1]

کیا یہ امر قابلِ غور ہے یا نہیں کہ سید احمد صاحب کی صحبت سے منشی امین الدین احمد ابھی فیضیاب بھی نہیں ہوئے بلکہ زیارت کا شرف تک نصیب نہیں ہوا۔ اِس کے باوجود سید صاحب ابھی کلکتہ پہنچے بھی نہیں کہ انھیں جنھیں میں لے جانے کے لیے منشی امین الدین کس طرح اور کیوں آئے؟ کیا اُنھیں الہام ہو گیا تھا کہ فلاں صاحب آ رہے ہیں، اُنھیں اپنے پاس لے آؤ۔ بغیر کچھ دیکھے جب ملے، اُنھیں سید صاحب سے عقیدت کس طرح ہو گئی؟ کیا یہ راز داری کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کارنامہ تو نہ تھا؟ شاید پورے ہندوستان میں سید صاحب کی اتنی آؤ بھگت اور عقیدت کا اہتمام نہ ہوا ہو جیسا انگریزوں کی راجدھانی یعنی شہر کلکتہ میں ہوا، حالانکہ کلکتہ اُن دنوں انگریزوں کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ آخر اُن لوگوں کو انگریزوں کے علاوہ اِس ڈرامے کے پارٹ ادا کرنے پر اور کس نے مائل کیا تھا؟ قبل ازیں خود منشی امین الدین احمد بھی ایسی عقیدت سے نا آشنا اور بقول غلام رسول مہر، ہدایت سے محروم تھے۔ موصوف نے وضاحت کی ہے:

جن لوگوں نے سید صاحب کی وجہ سے ہدایت پائی اُن میں خود منشی امین الدین احمد کا ذکر بھی ضروری ہے۔[2]

اگر منشی امین الدین احمد نے سید صاحب سے ہدایت پائی تھی تو جب سید صاحب کے قدم بھی کلکتہ میں نہیں پہنچے تھے اور وہ ابھی راستے میں ہی تھے اُس وقت قبل از ہدایت یہی منشی امین الدین احمد کیوں سید صاحب کو لینے کے لیے پہنچ گئے تھے؟ کیا یہ اِس قافلے کے لیے راز داری کے ساتھ خود برٹش گورنمنٹ کا انتظام نہیں تھا؟ انگریزوں کی اِس بستی میں، انگریزوں کی حوصلہ افزائی کے سہارے اِتنی اونچی پرواز اُڑنے لگے کہ پیشگوئی کے مژدے دیتے رہے اور انگریزوں کے خفیہ انتظامات کو اپنی کرامت سمجھتے تھے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"سید صاحب نے کلکتہ پہنچ کر مولانا عبد الحی سے فرمایا تھا کہ اگرچہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں لیکن خدا کے فضل سے امید ہے (کمپنی کی مہربانی سے)" کہتا

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۵
[2] ایضاً ص ۲۰۹

زیادہ موزوں ہوتا) اس شہر میں بابِ ہدایت اس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور اس کی تصدیق بعض انگریزوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کہ ۱۸۲۲ء میں سیّد صاحب کلکتہ آئے اور مسلم آبادی بہت بڑی تعداد میں ان کی پیرو بن گئی۔ شاہ اسحاق نے بیان فرمایا کہ سیّد صاحب کلکتہ پہنچے تو بہت سے مسلمانوں نے آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھایا اور آپ کے ارشادات کی برکت سے اس سرزمین میں خاص دینی رونق پیدا ہوگئی۔

حاجی حمزہ علی خاں کہتے ہیں، آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ سیّد صاحب کو آرام کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ سب لوگ شیرینی لاتے اور زیادہ تر بتاشے ہوتے۔ لوگوں کے پاس خاطر سے سیّد صاحب کم از کم ایک دانہ ضرور چکھتے، اس طرح زبانِ مبارک پر آبلے پڑ گئے تھے۔ بیعت کا سلسلہ دو اڑھائی پہر دن چڑھے سے شروع ہو جاتا اور رات تک جاری رہتا۔ عورتیں بھی بکثرت آتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوٹھا بھر جاتا۔ بہت سے غیر مسلم سیّد صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ کلکتہ اصلاً انگریزی بستی تھی، وہاں کی زندگی انگریزی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ عورتیں بے پردہ ہوتیں، شراب بکثرت پی جاتی۔ سیّد صاحب کی وجہ سے مسلمانوں میں پردے کا رواج ہوا اور شراب کی دکانیں بے رونق ہوگئیں۔"[1]

انگریزوں کی اس آبادی یعنی کلکتہ میں سیّد صاحب کی جتنی آمدنی ہوئی اس کے بارے میں مہر صاحب یوں لکھتے ہیں:

"کلکتے والوں کے تحائف و ہدایا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا اس کی سرسری کیفیت یہ ہے:

---

[1] غلام رسول مہر، سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۹

۱۔ منشی امین الدین احمد، پانچ ہزار نقد، تین سو جوڑے بوتے، چار گٹھڑی کپڑے، ایک میں سفید تھان یعنی لٹھا، ململ وغیرہ۔ دوسری میں سوسی اور چھینٹ کے تھان، باقی گٹھڑیوں میں موٹا کپڑا۔ دو نہایت خوبصورت گھڑیاں۔ پانچ ہزار روپیہ اس غرض سے (مزید) پیش کیے کہ ممکن ہے بعض اوقات سید صاحب کے رفقا کو مزاج کے مطابق کھانا نہ ملا ہو اور انھوں نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔ پانچ سو احرام دیے۔

۲۔ امام بخش سوداگر، تین سو روپے، بیس اشرفیاں، پندرہ تھان سفید اور چھینٹ کے۔ دو شیشیاں عطر کی، جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا۔ ایک بنگلہ جسے سید صاحب نے باصرار واپس کر دیا۔

۳۔ غلام حسین تاجر، چار جہاز پورے نذر کیے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ چونکہ انتظام ہو چکا تھا، اس لیے سید صاحب نے یہ نذر بشکریہ واپس کر دی۔ غلام حسین نے اپنے لڑکے کو ساتھ کر دیا۔ یقیناً بڑی رقم بھی دی ہو گی، اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ ایک کوٹھی نذر کی جو سید صاحب نے اسے واپس دے دی۔ مراجعت پر سید صاحب اسی کے ہاں ٹھہرے تھے۔

۴۔ شیخ رمضانی، سعد الدین ناخدا، منشی حسن علی اور امام بخش تاجر نے چار سو احرام پیش کیے اور عرض کیا کہ جو احرام پہلے پیش ہو چکے ہیں عمرہ کے لیے باندھے جائیں، ہمارے احرام حج کے لیے استعمال کیے جائیں۔

۵۔ جس پیرزادے نے بیرونی دروازے سے مکان کے اندر تک سید صاحب کے لیے پگڑیاں بچھائی تھیں، اس نے سو روپے پیش کیے۔ اس درجے کی دوسری نذروں کا حساب پیش کرنا مشکل ہے۔

"سید صاحب نے سوار ہونے سے پیشتر حکم دے دیا تھا کہ ساتھیوں میں سے جس جس کے پاس ایک جوڑا ہو، اسے تین جوڑے نئے بنوا دیے جائیں۔ باقی لوگوں کے لیے کم از کم دو دو نئے جوڑوں کا انتظام کر دیا جائے چنانچہ ایک سو کے لیے دو دو جوڑے سلوا دیے گئے۔" [۱]

سید صاحب نے اس دورۂ حج کے سلسلے میں کتنے ہی شہروں کا دورہ کیا، ان کے ساتھ تقریباً ساڑھے سات سو آدمی جمع ہو گئے تھے جنہیں حج کے لیے ساتھ لے جانا منظور ہو گیا تھا۔ خود تو وہ بیچارے خالی ہاتھ تھے لیکن اس دورے میں کمپنی بہادر کی نظرِ عنایت سے مسلمان رئیسوں کا نام رکھ کر نوازشوں کی وہ بارش ہوئی کہ جس کا اندازہ بھی کرنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے الہ آباد اور کلکتہ کے دو رئیسوں یعنی شیخ غلام علی اور منشی امین الدین احمد کی امداد کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی آپ کے ساتھ یہی سلوک رہا۔ بھولے بھالے مسلمان تو اپنے پاس سے نذریں پیش کرتے کیونکہ حج کے لیے ایسا جلوس انھوں نے نہ کبھی دیکھا ہوگا اور نہ کانوں سے سنا ہوگا۔ لیکن بڑے بڑے رئیسوں نے جو بعض مقامات پر امداد کی اس میں برٹش گورنمنٹ کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ جن وجوہات کی بنا پر ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں ان کا ذکر ضرور لقیے کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ حاشا و کلا ہمیں کسی سے خواہ مخواہ کی عداوت نہیں اور نہ ہم کسی پر الزام تراشی ہی کرنا چاہتے ہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ حقیقت کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا جائے۔

سید صاحب جب اس قافلے سمیت حج سے فارغ ہو کر ہندوستان وارد ہوئے تو غلام رسول صاحب کی تحقیق کے مطابق ۶ صفر ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۲ء کو کلکتہ پہنچ گئے مختلف شہروں میں آپ کو مدعو کیا گیا، کافی کافی عرصہ وہاں قیام رہا۔ باقی ماندہ قافلے کے ساتھ ضیافتیں ہوتی رہیں۔ تحفے تحائف اور نذرانے وصول کرتے ہوئے بریلی پہنچ گئے۔ یہ ۱۲۳۸-۳۹ھ / ۱۸۲۲ - ۲۲ء کی فتوحات کا ذکر ہے۔

اب قارئین کی توجہ سید احمد صاحب کی تحریکِ جہاد کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ معتقدین کا موقف یہ ہے کہ سکھوں کے مظالم کی بنا پر سید صاحب نے ان سے جنگ کرنے کی ٹھانی تھی۔

---

[۱] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۵

ہندوستان کے مختلف شہروں میں آپ نے گشت کی۔ آپ کے رفقاء یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی (المتوفی ۱۲۴۳ھ) نے جگہ جگہ ترغیبِ جہاد پر وعظ ہوئے۔ کتنے ہی مسلمان جان اور مال سے آپ کے ساتھی بن گئے۔ یہ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء میں دورہ کیا گیا۔ جب سید صاحب پوری طرح مطمئن ہو گئے، ساتھیوں کی بھیڑ لگ گئی تو عازمِ پنجاب ہوئے لیکن اس روانگی سے پہلے اور دورے کے شروع ہی سے اس الہام کا سنا دینا ضروری خیال کیا جاتا تھا، جو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دوسرا اہم الہام بار بار کیا جا رہا تھا۔ وہ الہام یہ تھا:

"آپ کے سفرِ جہاد سے پہلے، بارہا آپ کو یہ الہامِ ربانی ہوا تھا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر پشاور سے تا دریائے ستلج (یعنی سکھوں کا علاقہ) مثل ہندوستان کے رشکِ افزائے چمن ہو جائے گا۔ چنانچہ ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر مرید واقف تھا۔"[1]

سید صاحب کی نظر میں جتنے ہندوستان پر انگریزی تسلط تھا، وہ رشکِ افزائے چمن تھا اور ستلج سے پشاور تک کے علاقے کو بھی، جو سکھوں کے قبضے میں تھا، آپ انگریزی عملداری میں شامل کر کے، رشکِ افزائے چمن بنانے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگانے پر تل گئے تھے، کیونکہ دوسری طرف سے بار بار الہام ہو رہا تھا۔ موصوف نے اس الہام اور متواتر وعدہ ہائے فتح کے نام سے خوب جمعیت اکٹھی کی۔ بے شمار امداد ہوئی حتیٰ کہ ۱۲۴۳ھ سے ۱۲۴۶ھ تک کے خطوط میں بھی آپ اس الہام اور ان وعدہ ہائے فتح کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ کاش! اُن کا ضمیر بیدار ہو جاتا اور قوم کو ایسے عجیب چکر میں پھنسا کر نہ جاتے، کیونکہ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

سید احمد صاحب نے یار محمد خان حاکمِ یاغستان کو خط لکھتے ہوئے اپنے دوسرے الہام کا خود یوں اظہار فرمایا:

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۱۷۲

"فقیر دریں باب باشارات غیبی مامور است و بر بشارات لاریبی جسترا ہرگز ہرگز شبہہ و سوسۂ شیطانی و شائبہ ہوائے نفسانی باین الہام رحمانی ممتزج نیست، بالجملہ فقیر امتثالِ حکمِ الٰہی از تہِ دل منظور است و اعتماد بر وعدہ الٰہیہ بکلی حاصل، و اما این کہ بوعدۂ الٰہیہ بچہ طریق ظاہر گردد، پس بندۂ عبودیت شعار را چہ یارا کہ از مالک خود بپرسد کہ وعدۂ خود را بچہ طور ایفا خواہی کرد، کہ این سوال خارج از قانونِ آدابِ عبودیت است، بالجملہ از گفتگو و چون و چرا بیزارم و از ماندۂ اطاعتِ محض ذلہ بردار۔"[1]

فقیر اس خصوص میں غیبی اشارہ کی بنا پر مامور ہے اور اس جسٹر کی اس بشارت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی وسوسہ اور نفسانی خواہش کا شائبہ اس الہام رحمانی میں شامل نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ کہ فقیر کو حکمِ الٰہی کی تعمیل تہِ دل سے منظور ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر کامل اعتماد ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ کس طرح ظہور پذیر ہوگا؟ اس بندے کو جس کا شعار بندگی ہے کیا طاقت ہے کہ وہ اپنے مالک سے یہ پوچھے کہ تو اپنا وعدہ کس طرح پورا کرے گا؟ ایسا سوال آداب اور قانونِ عبودیت کے خلاف ہے۔ غرض میں ایسی چنان وچنین کی باتوں سے بیزار ہوں اور محض اس کی بندگی کے دسترخوان کا ریزہ چین ہوں۔

قیم محمد خاں کے نام خط لکھتے ہوئے سید احمد صاحب نے یہ مژدہ انھیں ان لفظوں میں سنایا تم

"اما بیانِ الہام، پس فقیر از پردۂ غیب بہ بشاراتِ ربانی باستیصالِ کفار و رازمویان (یعنی قوم سکھ) مامور است و از کمن لاریب بشارا

اب رہا الہام، وہ یہ ہے کہ اس فقیر کو پردۂ غیب سے کفار یعنی لانبے بال والے سکھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا ہے اور ایسے مقام سے جس میں شک وشبہ کی گنجائش

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی، مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۶

روحانی بغلبہ مجاہدین ابرار بشر ۱؎ — نہیں۔ روحانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار مجاہدین کو اُن پر غلبہ پانے کی بشارت دینے والا مقرر کیا گیا ہے۔ ۲؎

شاہ بخارا کے نام سید احمد صاحب نے جو طویل خط لکھا اُس کی دو عبارتیں متعلقہ الہام حسبِ ذیل ہیں

در عقدۂ اقامتِ جہاد و ازالۂ کفر و فساد بطریقِ الہام ربانی و کلام روحانی یا اشاراتِ غیبی در باب اقامت مشرف ساختند و بہ بشارات لاریبی در باب فتح و ظفر مبشر... ہرگز ہرگز شبہ وسوسۂ شیطانی و شائبہ ہوائے نفسانی باین الہامیہ روحانی و الہام ربانی مخلوط نہ گردید۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلٌ۔ ۳؎

قیامِ جہاد کے معاملے اور کفر و فساد کے رفع و قمع کرنے کے لیے الہام اور روحانی مکالمہ کے ذریعہ غیبی امامت سے اِس فقیر کو مشرف فرمایا۔ اور ہم کو فتح و نصرت کے متعلق ایسی بشارتوں کا مژدہ بلند فرمایا ہے ہرگز ہرگز کوئی شیطانی وسوسہ اور نفسانی خواہشات کا کوئی شائبہ بھی اِس غیبی دعوت اور الہامِ ربانی میں داخل نہیں ہے وَاللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلٌ۔

سید صاحب کے مذکورہ بالا بیانات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ سید صاحب کو اللہ تعالٰی کی طرف سے الہام ہوتا، بار بار الہام ہوا کہ پنجاب تمہارے ہاتھ پر فتح ہوگا۔

۲۔ سید صاحب کو بذریعہ الہام بتایا گیا کہ تمہیں سکھوں کے استیصال کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

۳۔ پنجاب کی فتح و نصرت کا مژدہ سنانے پر سید صاحب کو من جانب اللہ مامور کیا گیا تھا۔

۴۔ موصوف کو صرف بذریعہ الہام بلکہ روحانی مکالمے کے ذریعے درجۂ امامت پر فائز کیا گیا تھا۔

۱؎ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۲

۲؎ مکتوبات کی عبارتوں کا ترجمہ اسی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے جو سخاوت مرزا نے کیا تھا۔

۳؎ محمد جعفر تھانیسری، مولوی، مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۸۰،۸۱

۵۔ پنجاب کی فتح اور سکھوں کے استیصال کا جو سہرا بذریعہ الہام سید احمد صاحب کے سر پر باندھا گیا تھا۔ اِس الہام کی صداقت میں موصوف کے نزدیک شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

۶۔ اِن دونوں مژدوں کو بشارتِ رحمانی اور الہامِ ربانی کے ذریعے پہنچایا گیا تھا۔

۷۔ اِس ربانی الہام اور رحمانی بشارت کا ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہوگا کیونکہ ان میں شیطانی وسوسہ یا نفسانی خواہشات کا شائبہ تھوڑا ہی تھا، جو ان کا خلاف واقع ہو جائے۔

۸۔ سید صاحب اپنے الہام کی صداقت پر خدا کو گواہ رکھتے تھے۔

۹۔ موصوف خدا سے یہ پوچھ تو سکتے تھے کہ پنجاب کیسے فتح ہوگا اور سکھوں کا استیصال کن طریقوں اور کتنی تیاری سے کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سوال ان کے نزدیک شعارِ بندگی و قانونِ عبودیت کے خلاف تھا۔

۱۰۔ موصوف کو قیامِ جہاد اور دفعِ فساد پر بذریعہ الہام مامور کیا گیا تھا۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

اِس موضوع پر ہمیں کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سید صاحب کے بیانات کی روشنی میں ان کے معتقدین سوچیں اور فیصلہ کریں کہ یہ الہام رحمانی تھا یا شیطانی؟ بشارتِ رحمانی یا خواہشِ نفسانی؟ کیا سید صاحب نے واقعی الہام کے مطابق پنجاب کو فتح کر لیا تھا اور سکھوں کا استیصال کر دیا تھا؟ اگر اِس سوال کا جواب نفی میں ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اس کے علاوہ چارۂ کار ہی کوئی نہیں، تو فیصلہ کرنے میں دشواری کیا باقی رہ گئی؟ خدا کرے کسی کی اندھی عقیدت راستے میں حائل نہ ہو جائے ورنہ معاملہ تو صاف ہے۔ اگر آج فیصلہ نہیں کر سکتے تو نہ سہی، کل خود ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ آخر دنیا کے دن کا یہ اندھیرا چھٹے گا، صبحِ قیامت نمودار ہوگی، أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ۝ کیا صبحِ قیامت قریب نہیں ہے؟ کہو گے تو سہی [illegible]

یہ عذر امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

اگر اب بھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو سید صاحب کا اس سے بھی کہیں گنا الہامی خروج ملاحظہ فرمایئے اور اس کی روشنی میں ہی فیصلہ کر کے خار کو خار اور گل کو گل کا مقام و درجہ دینا۔

م بفضلہ تعالیٰ سمجھا دیتا ہے ، دلوں کا پھیرنا اور ہدایت دینا باری تعالیٰ شانہ کے قبضہ وقدرت
میں ہے۔ وہ الہامی بیان پیش خدمت ہے :

"سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ بوقت روانگی خراسان
آپ اپنی ہمشیرہ والدۂ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے اُن
سے فرمایا کہ" اے میری بہن ! میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور یہ بات یاد
رکھنا کہ جب تک ہند کا شرک اور ایران کا رفض اور چین کا کفر اور افغانستان کا
نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مردہ سنت زندہ ہو جائے گی ، اللہ رب العزت
مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اگر قبل از ظہور ان واقعات کے کوئی میری موت کی
خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا یا
مارا گیا تو تم اس کے قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب نے مجھ سے
وعدہ واثق کیا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کر کے مارے گا۔"[1]

اچھا ہوتا کہ سید صاحب اتنی سی وضاحت اور فرما دیتے کہ اُن کے رب یا ارباب نے یہ
وعدہ اُن سے کہاں بیٹھ کر کیا تھا ؛ بہر حال سید صاحب کے اس بیان کی روشنی میں کہ جب تک
مذکورہ چاروں ملکوں کو میں پاک صاف نہ کر دوں اس سے پہلے اگر کوئی حلفیہ بھی میری موت کی
خبر دے تو وہ جھوٹا ہے۔ ہم صرف اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ موصوف سے ہند کا شرک ، ایران کا رفض ،
چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق آج تک نہیں مٹایا جا سکا ، لہٰذا موصوف اپنے بیان کی
روشنی میں کہیں جیتے جاگتے ہی پھر رہے ہوں گے۔ اُن کے رب نے تو ان کاموں سے پہلے
نہ اٹھانے کا وعدہ کر ہی لیا تھا ، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ موصوف پہلے ان چاروں ملکوں میں مُردہ
سنتوں کو زندہ کرتے پھر رہے ہوں گے۔ ویسے اس کا فیصلہ تو سید صاحب کے معتقدین ہی
کر سکتے ہیں کہ سید صاحب اب زندہ ہیں یا نہیں ؛ اگر وہ آنجہانی ہو چکے تو اپنے اس بیان کی
روشنی میں انہیں سچا سمجھا جائے گا یا جھوٹا ؛ کوئی کچھ بھی فیصلہ کرے یہ اُس کی اپنی مرضی ہے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری ، مولوی ، حیات سید احمد شہید ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء ، ص ۱۶۷

ہاں قارئین کی معلومات کے لیے اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ خود سید صاحب کے اولیں سوانح نگار یعنی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وعدۂ فتح پنجاب یہ کہ الہام غلط واقع ہوا۔ موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

"وعدۂ فتح پنجاب کا آپ (سید صاحب) کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اس کو سراسر صادق اور ہونہار سمجھ کر بارہا فرماتے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اس الہام میں وسوسۂ شیطانی اور شائبۂ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اس فتح سے پہلے مجھ کو موت نہ ہوگی۔ لیکن معاملۂ بالاکوٹ، خواہ شہادت ہو یا غیبوبت بظاہر سراسر اس یقینی الہام کے خلاف ہوا۔" [1]

تھانیسری صاحب نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ سید صاحب کے الہام کے خلاف ہوا، الہام کے دامن کو جھٹک دیا کیونکہ آگے صاف کہنا پڑتا کہ اگر الہام کے خلاف واقع ہوا تو وہ رحمانی نہیں بلکہ شیطانی الہام تھا جسے وسوسۂ شیطانی کہتے ہیں۔ اس صورت میں سید صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے الہاموں میں شرعی لحاظ سے فرق بتانا مشکل ہو جاتا، لہٰذا اُنھوں نے فیصلہ کی اس شاہراہ کو چھوڑ کر یوں تاویل کی پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا:

"اس واقعہ (معرکۂ بالاکوٹ) کے پندرہ برس کے بعد سلطنت پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور لامذہب قوم کے ہاتھ میں آگئی جس کو ہم مسلمان (وہابی صاحبان) اپنے ہاتھ پر فتح ہونا تصور کر سکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی جو ظہور میں آئی۔" [2]

تھانیسری صاحب تو خیر اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایں جہانی مورخین کی بتادیں کہ سید صاحب کا

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۹۱

[2] ایضاً، ص ۲۹۱

بارہ الہام ربانی تھا یا شیطانی ؟ اگر وہ بھی اس فیصلے سے کترا کر تھانیسری صاحب کی تاویل کا
دامن تھامتے ہیں تو ہم اُن کی خدمت میں یہ مودبانہ التماس پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اسے انصاف کا
خون کرنے والو! اس تاویل کا مفاد یہی تو ہے کہ برٹش گورنمنٹ یا سید احمد صاحب، ایک ہی
منصوبہ کے دو رُخ تھے "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ تھا۔ سید صاحب فتح کر لیتے یا
انگریزوں نے پنجاب فتح کر لیا۔ انگریز خود سکھوں سے لڑتے یا سید صاحب کو بھڑا دیا، ایک ہی
بات ہے یہ سمانا کہ قالب دو تھے لیکن جان تو دونوں طرف ایک تھی۔ بظاہر دونوں کے راستے الگ الگ
نظر آتے تھے لیکن منزلِ مقصود دونوں کی ایک تھی۔ یعنی انگریزی عملداری کی حدود کو اور وسیع کرنا
جسے سید صاحب اپنی ہی عملداری سمجھا کرتے تھے، نیز اس عملداری کے راستوں کی رکاوٹوں کو
دور کرکے اسے مضبوط و مستحکم کرتے تھے۔ یہی تھی اُن کی منزلِ مقصود اور یہی ہے اُن کے جہاد کی
غرض و غایت۔ لہٰذا، ؎

ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

بہرحال سید احمد صاحب اپنے جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے، جمعیت کو لے کر گاؤں گاؤں
قصبہ قصبہ اور شہر شہر پھرے، جہاد کے نام سے بھولے بھالے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملایا، کتنے
ہی مسلمانوں نے جہاد کے نام سے دھوکا کھا کر ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی پیش کی۔ انگریز اس
تیاری پر مانع نہیں ہوئے اور مانع کیوں ہوتے جبکہ یہ سارا منصوبہ ہی انگریزوں کا اپنا تھا۔
سکھوں سے نہ لڑنے کا انگریز معاہدہ کر چکے تھے، دریائے ستلج کو سرحد قرار دیا جا چکا تھا۔ لیکن
انگریزوں نے جب قلب ہند کے اپنے طاقتور دشمن کو بڑی حکمتِ عملی سے پنجرے میں بند کر لیا تو
اب سکھ جیسی جنگ آزما قوم کو زیر کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اس مقصد کے لیے برٹش گورنمنٹ کو
سید احمد صاحب سے موزوں اور کون مل سکتا تھا، جنھوں نے جعفر بنگال اور صادق دکن کی سنت
ملعونہ کو تازہ کرنے کی غرض سے ایک مسلمان فرمانروا یعنی نواب امیر خاں مرحوم کو انگریزوں کے
پنجے میں پھنسا کر بے دست و پا کروا دیا تھا۔ سکھوں اور سرحد کے مسلمانوں کو زیر کرنے کا کام
بھی سید احمد صاحب کے ہی سپرد کیا گیا۔ اندرونِ خانہ انگریز ہر طرح امدادی تھے، فریقین میں

مکمل اتحاد و اتفاق تھا، لیکن پردہ رکھنے کی غرض سے جہاد کرنے کی برٹش گورنمنٹ سے اجازت حاصل کی جاتی ہے:

"اس وقت ہر شہر، قصبہ و گاؤں، برٹش انڈیا میں علانیہ سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ ہوتا تھا مگر براہِ دُور اندیشی معرفت شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الہ آباد کے نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی و مغربی کو بھی سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی اطلاع دی گئی تھی۔ جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں۔" ۱؎

اسی اجازت کے واقعے کو مرزا حیرت دہلوی نے ذرا اور کھل کر یوں بیان کیا ہے:

"سید احمد صاحب نے مولانا شہید (مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی) کے مشورہ سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کی تیاری کرنے کو ہیں، سرکار کو تو اس میں کچھ اعتراض نہیں ہے؟ لیفٹیننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عملداری کے امن میں خلل نہ پڑے، ہمیں کچھ سروکار نہیں، نہ ہم ایسی تیاری کے مانع ہیں۔ یہ تمام بین ثبوت صاف صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جہاد صرف سکھوں ہی کے لیے مخصوص تھا، سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز ہرگز مخاصمت نہ تھی۔" ۲؎

انگریز حکام نے اس وقت اپنے ماتحت افسروں کو مطلع کر دیا تھا کہ سید صاحب اپنا کچھ سے سے مزاحمت نہ کرنا، یہ ہمارے مخالف نہیں ہیں۔ اس امر کی واضح تصریح مرزا حیرت دہلوی کے واشگاف لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

۱؎ محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۸

۲؎ حیرت دہلوی، مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۲۶۰

"جب سید تحریک پھیلی تو ضلع کے حکام اس سے چوکنے ہوئے اور انھیں
خوف معلوم ہوا کہیں ہماری سلطنت میں تو رخنہ نہ پڑے گا اور موجودہ امن میں
تو کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا۔ اس نظر سے ضلع کے حکام نے حکامِ اعلیٰ کو
لکھا۔ وہاں سے صاف جواب آگیا۔ ان سے ہرگز مزاحمت نہ کرو۔ ان مسلمانوں
کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے، یہ سکھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اور
حقیقت میں بات بھی یہی تھی۔ بھلا مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلشیہ سے کیوں بگاڑ
ہونے لگا تھا، جہاں وہ اپنے دین کے ارکان بخوبی ادا کر سکتے تھے اور کرتے تھے
انھیں ٹولریشن (مذہبی آزادی) بخوبی حاصل تھی۔ وہ صرف دشمنِ دین و ایمان
سکھوں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور ان کا ارادہ صرف سکھوں ہی سے اپنے
مظلوم بھائیوں کا انتقام لینا تھا، جن کے قابلِ رحم مظالم کا بیان ہم
مولانا شہید کی سوانح عمری میں بیان کر چکے ہیں۔" [1]

اصل میں یہ ہے کہ حکامِ اعلیٰ سید احمد صاحب کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھے کیونکہ وہ
سے انگریزوں کی مخالفت کیا کرتے جبکہ ساری زندگی ہی صرف انگریزی مفادات کے حصول
ظ میں گزار دی تھی۔ جن حضرات کو موصوف کی برٹش نوازی بلکہ ایجنٹ ہونے کا پتہ نہیں تھا
ون نے اس تیاری اور چہل پہل کے وقت عظیم آباد اور کلکتہ میں حکامِ اعلیٰ سے اس تیاری کی
یت کی، بعض امن کا خطرہ سمجھایا، لیکن حکام کے سامنے چونکہ اصل حقیقت موجود تھی وہ شکایت پہ
ن دھرتے اور بے خبر ہمدردوں کو کیوں منہ لگاتے؟ مہر صاحب یوں رقمطراز ہیں:

"بعض شیعہ حضرات نے (قیامِ عظیم آباد کے دوران) انگریز حاکم کے پاس
شکایت کی کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں
اور ہم لوگ از روئے خیر خواہی یہ حقیقت آپ تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن حاکم نے
اس شکایت کو فرقہ وارانہ رقابت کا نتیجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔" [2]

رت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۹۹، ۴۰۰

غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بارِ سوم ۱۹۷۰ء، ص ۲۰۲

"بعض حاسدوں نے (قیامِ کلکتہ کے دوران) انگریزوں کے پاس شکایت کی کہ سید احمد پہلے نواب امیر خاں کے لشکر میں نشان بردار تھا، نواب کمپنی سے مل گیا تو سید احمد نے پیری مریدی کا ڈول ڈالا اور اب انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے۔ یہ محض بے علم ہے۔ اس شکایت پر کسی نے توجہ نہ کی۔"[1]

نواب امیر خاں کو انگریزوں کے پنجرے میں بند کروانا اور سکھوں سے لڑا کر پنجاب کو انگریزی عملداری میں شامل کرنے کی کوشش کرنا، یہ سید احمد صاحب کے وہ کارنامے ہیں جو بڑی رازداری سے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ اپنے منہ سے آج تک کون سے غدار نے اعتراف کیا ہے کہ میں اپنے دین اور اپنی ملت کے خلاف بدخواہ کا آلۂ کار ہوں؟ اس طرح تو میر جعفر اور میر صادق وغیرہ نے بھی تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ وہ بھی اپنے ان سیاہ کارناموں پر پردہ ڈالا کرتے تھے۔ غداروں کا اندازہ بعض حالات وقرائن سے ہی لگایا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا ثبوت مل جائے کہ کسی ایجنٹ نے دشمن سے اپنی دوستی کا دم بھرا ہو یا اس کی تعریف کی ہو، تو خیال ہے کہ اس سے زیادہ قابلِ اعتماد ثبوت کسی کی ایجنٹی کا آج تک تحریری طور پر نہ مل سکا۔ آیئے اب ہم سید احمد صاحب کے بارے میں اُن کی گھریلو تصانیف سے ایسے بیانات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں سے جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہیں؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم اور دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک و مددگار ہو جائیں گے، کیونکہ سیکڑوں کوس سفر کر کے، سکھوں کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا، یہ ایک ایسا امرِ محال ہے جس کو ہم لوگ نہیں کر سکتے۔"

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۴۴

سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں
کرنا چاہتے اور نہ ہی انگریزوں اور سکھوں کا ملک لینا ہی ہمارا مقصد ہے
بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام
پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائضِ مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر
سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکاتِ مستوجبِ جہاد سے باز آ جائیں
تو ہم کو اُن سے لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اور انگریزی سرکار گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم و تعدی نہیں کرتی
اور نہ اُن کو فرائضِ مذہبی اور عباداتِ لازمی سے روکتی ہے۔ ہم اُن کے ملک میں
اعلانیہ وعظ کہتے اور ترویجِ مذہب کرتے ہیں، وہ کبھی مانع و مزاحم نہیں ہوتی، بلکہ
اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اُس کو سزا دینے کو تیار ہیں۔ ہمارا اصل کام
اشاعتِ توحیدِ الٰہی اور احیائے سننِ سید المرسلین ہے، سو ہم بلا روک ٹوک
اس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکارِ انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور
اصولِ مذہب کے خلاف بلا وجہ طرفین کا خون گرا دیں۔"[1]

جعفر تھانیسری صاحب اس بارے میں سید احمد صاحب کے مکتوبات اور حالاتِ زندگی کو
پیشِ نظر رکھ کر سب کی روشنی میں اپنے امیر المومنین کی انگریز دوستی کو واضح کرنے کی غرض سے
یوں رقمطراز ہیں:

"اس سوانح اور مکتوبات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب
کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہ تھا، وہ اس آزاد عملداری کو
اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر انگریزی سرکار اُس وقت
سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی مگر سرکار انگریزی
اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو جائے۔"[2]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۱

[2] ایضاً، ص ۲۹۳

دیوبندیوں کے نامور مناظر مولوی محمد منظور نعمانی بھی سید صاحب کی انگریز دوستی کو غلط ثابت کرنے سے عاجز ہو کر اُن کی اصلی پوزیشن کو تسلیم کرتے ہیں مگر کس طرح پہلو بدل کر۔ چنانچہ اُن کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"مشہور یہ ہے کہ آپ (سید صاحب اینڈ کمپنی) نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں اُن کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔"[1]

چونکہ مولوی محمد منظور دیوبندی نے اِس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ انگریزوں نے بعض مواقع پر سید احمد صاحب کی امداد بھی کی تھی، لہٰذا ہم اِس امداد کے واقعات کو مدلل طور پر تھوڑی وضاحت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جب سید احمد صاحب لڑائیوں میں مصروف تھے۔ معتقدین کی نظر میں جہاد کر رہے تھے اور حقیقت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ تو انگریزوں نے موصوف کے لیے باقاعدہ وہاں بھی امداد بھیجنا جاری رکھا۔ دہلی اور دُوسرے مراکز کی معرفت بھیجتے رہے اور بعض نوابوں کو بھی ترغیب دی۔ مثلاً:

"نواب ٹونک نے بھی دس بیس ہزار روپے شاہ اسحاق کی معرفت بھیجے۔" ملخصاً

مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ) کی معرفت بھی رقم جایا کرتی تھی اور حکومت اُس کی نگران و محافظ تھی۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"اِس (لیفٹیننٹ گورنر سے اجازت) کے بعد سید صاحبؒ ملک یاغستان میں پہنچ کر سکھوں سے جہاد میں مصروف تھے۔ اُس وقت ایک ہنڈی سات ہزار روپے کی بذریعہ ساہوکاران دہلی مرسلہ مولوی محمد اسحاق صاحبؒ بنام سید صاحبؒ روانہ ہوئی تھی۔ ملک پنجاب میں وصول نہ ہونے پر اِس سات ہزار روپے کی واپسی کا دعویٰ عدالت دیوانی میں دائر ہو کر ڈگری ہوئی اور پھر بحکام اپیل عدالت

---

[1] ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، شہید نمبر، ۱۳۵۵ھ، ص ۷۶

[2] حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۰۷

"عالیہ دیوانی (دیوانی کورٹ) آگرہ میں بھی حکم ڈگری بحق مدعی بحال رہا" لہ

مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے :

"جب سید صاحب یاغستان میں تھے تو مولانا محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی نے کچھ اوپر سات ہزار روپیہ سید احمد صاحب کو بذریعہ ہنڈی روانہ کیا تھا۔ وہ کسی باعث سے نہیں پہنچا تھا۔ اس پر نالش کی گئی تھی اور پھر روپیہ وصول کر کے دوبارہ سید صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا۔" لہ

قارئین کرام! یہ تھے سید احمد صاحب کے بارے میں اُن کے سوانح نگاروں اور معتقدوں کے بیانات جن کے پیش نظر ہم نے ان سوانح نگاروں، سید صاحب کے اکثر معتقدوں اور دیگر غیر جانب دار مورخوں کے ساتھ ہمنوائی کی اور سید صاحب کو ان جملہ حضرات کی طرح برٹش نواز کہا اور لکھا۔ ہمارے علمائے اہلسنت موصوف کی اس روش پر گرفت بھی کرتے آئے ہیں۔ مبتدعین حضرات کے پاس کوئی دلیل حقیقت میں ایسی نہیں تھی جس سے وہ ذرا بھی صفائی پیش کر سکیں۔ دوسری مشکل انہیں یہ تھی کہ جملہ وہابی مورخ ہمارے دعویٰ کی اپنی اپنی تصانیف میں تائید کر گئے تھے اور انھوں نے سید صاحب کو خود فخریہ طور پر برٹش گورنمنٹ کا خیر خواہ بتایا ہے۔ ان جملہ حالات کے برخلاف جناب غلام رسول مہر اور پروفیسر محمد ایوب قادری نے اپنا موقف ترک کر کے صرف کیا اور بڑی شد و مد سے سید صاحب کو انگریزوں کا دشمن منوانے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اور اپنے اکابر یعنی سید صاحب کے سابقہ سوانح نگاروں پر بھی الزام تراشی میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ مہر صاحب مولوی محمد جعفر تھانیسری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

"اس کتاب (تواریخ عجیبہ) نے سید صاحب کے متعلق دو نہایت افسوسناک

لہ محمد جعفر تھانیسری : حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۰

لہ حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۳۰۲

لہ تواریخ عجیبہ مصنفہ محمد جعفر تھانیسری کے دوسرے ایڈیشن کا نام "سوانح احمدی" رکھا گیا۔ موجودہ ایڈیشن جو کراچی سے "نفیس اکیڈمی" والوں نے شائع کیا ہے اُنھوں نے پہلے حصے کا نام "حیات سید احمد شہید" اور دوسرے کا "مکتوبات سید احمد شہید" رکھا ہے۔

غلط بیانیوں کو عام کیا۔ اوّل یہ کہ سید صاحب انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے، صرف سکھوں سے لڑائی پر آمادہ ہوئے تھے۔ اِس غلط بیانی کو مستند بنانے کے لیے سید صاحب کے مکاتیب کی عبارتوں میں تحریف کی گئی۔" [1]

اِس سلسلے میں دادِ تحقیق دیتے ہوئے موصوف اپنے دعوے کو یُوں مؤکد کرتے ہیں:

"جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، سب سے پہلے سر سید احمد خاں مرحوم نے صاحب کے جہاد کا رُخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" چھپی تھی تو سر سید نے اُس کی تہمت طرازیوں کے جواب میں ایک سلسلۂ مضامین "پاینیر" میں چھپوا دیا تھا۔ جو بعد میں الگ بھی چھپ گیا تھا۔ اُن جوابی مضامین میں یہ بھی کہا گیا کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے اور انگریزوں کے ساتھ جنگ سے اظہارِ برأت کر دیا تھا۔ سر سید کا یہ بیان بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا ہو گا۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے اُسے پھیلا کر پیش کیا۔" [2]

یہی غلام رسول مہر اپنے موقف کو مضبوط کرنے کی غرض سے یُوں انتہائی اقدام کر کے حقائق پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کرتے اور سید صاحب کو انگریزوں کا مخالف دکھانے کے لیے راستہ صاف کرتے ہیں:

"سید صاحب کے متعلق قلمی ذخیروں تک چند افراد کے سوا کسی کو دسترس حاصل نہ تھی۔ "تواریخِ عجیبہ" (سوانح احمدی) چھپی تو اُس میں سید صاحب کے مقاصدِ جہاد کا حلیہ بالکل بگاڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ عام اصحاب نے اُسے مستند شے سمجھ کر قبول کر لیا۔ اِس طرح اُس پاک نفس مجاہدِ کبیر کے مقاصد ایک نہایت افسوسناک غلط فہمی کا ہدف بنے۔ میں مانتا ہوں کہ جس زمانے میں "تواریخِ عجیبہ"

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بارِ سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۷
[2] ایضاً، ص ۲۶۱

لکھی گئی، سید صاحب کی تحریک انگریزوں کے حساب کا مورد بنی ہوئی تھی۔ لیکن مولوی محمد جعفر صاحب مکاتیب کو چھوڑ سکتے تھے، انھیں تحریف شدہ شکل میں شائع کرنے کی کون سی مجبوری پیش آگئی تھی؟ اور یہ حرکت اُن لوگوں سے سرزد ہوئی جو سید صاحب کے عقیدت مند تھے۔" [1]

جناب غلام رسول مہر کی اس بارے میں "ہاں میں ہاں ملانے" کا شرف اگر کسی صاحب کو علمی انداز میں آج کل حاصل ہے تو وہ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔اے ہیں۔ مورخانہ انداز میں موصوف نے اس میدان میں کافی کام کیا ہے۔ سید احمد صاحب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت اور اُن کے مخالفین کو غلط ثابت کرنے میں آپ نے اپنی صلاحیتیں وقف کی ہوئی ہیں۔ اپنے محبوب ہیرو، جناب سید احمد صاحب کی تحریک جہاد کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ یہ شوشہ بھی خود اپنوں ہی کی طرف سے حکومت برطانیہ کی وفاداری کی غرض سے چھوڑا گیا۔ سب سے پہلے سر سید احمد خان (ف ۱۸۹۸ء) نے "آور انڈین مسلمانس" پر تبصرہ کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جہاد سکھوں کے خلاف تھا۔ پھر اس تحریک کے خاص رکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اصل مواد میں ترمیم کر کے انگریزوں کی بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور اس کو مشتہر کیا۔ بعض کوتاہ فہم یا پست ذہنیت رکھنے والے اشخاص تحریک مجاہدین کی اہمیت کم کرنے کے لیے اس قسم کے غیر معیاری رسالے کبھی کبھی چھاپتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس گوشے ہی سے نابلد ہیں، وہ تحریک مجاہدین کو کیا سمجھیں؟" [2]

پروفیسر صاحب موصوف نے بھی جناب غلام رسول مہر کی تقلید میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کو مورد الزام ٹھہرانے اور اسی تحریک جہاد کے رازدار و سرگرم کارکن کو بدنام کرنے میں کسی قسم

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۰
[2] محمد ایوب قادری، پروفیسر، مقدمہ حیات سید احمد، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۹

جبکہ محسوس نہیں کی۔ ان کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس خانوادے کا کوئی بڑے سے بڑا مرد دین و دیانت سے گر رہا مانتا پڑے تو مان لیں گے لیکن سید احمد صاحب کی پگڑی کو بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے۔ چنانچہ موصوف مزید کہتے ہیں:

> "اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ مولف (محمد جعفر تھانیسری) نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاد کی تحریک از اول تا آخر سکھوں کے خلاف تھی۔ انگریزوں سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا اور سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے سرگرم کارکن انگریزوں سے کوئی دشمنی یا پرخاش نہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد جعفر تھانیسری جماعت کے خاص رازدار تھے۔ جس کے نتیجہ میں انھوں نے دردناک تکلیفیں اٹھائیں، گھربار لٹایا، ہزاروں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سے محروم ہوتے، بیوی بچے چھوٹے، عزت و دولت سے محروم ہوتے، زندگی کے بہترین اٹھارہ سال جنگلوں اور پہاڑوں (جزائر انڈمان) میں قیدی کی حیثیت سے گزارے۔ جب کالے پانی سے رہا ہو کر آتے تو پولیس کی پابندیوں اور نگرانیوں سے بھی واسطہ پڑا۔ ان حالات و مصائب و آلام کا یہ ردِعمل ہوا کہ انھوں نے اس مرقع میں مصلحت کے قلم سے نقش و نگار کرنے کی کوشش کی ہے، ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔"؎

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں موصوف نے اپنا تاریخی بھرم رکھنے کی غرض سے غلام رسول مہر صاحب کی ہاں میں ہاں ملانے کا فرض ہی ادا کیا ہے۔ چنانچہ اس امر کا ثبوت پیش کرنے کی غرض سے پروفیسر صاحب یوں رقمطراز ہیں:

> "حیرت کی بات یہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے سید احمد شہیدؒ کے بعض مکاتیب کی عبارتیں تک بدل دی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "سید احمد شہید" میں اس کا انکشاف کیا ہے۔ (ص ۱۹۲ تا ۱۰۹)۔

؎ محمد ایوب قادری، تعارف مصنف حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۴۵

لاہور ۱۹۵۲ء) ، ص

سید احمد صاحب کو انگریزوں کا مخالف منوانے کی خاطر وہابیوں کے نامور مورخ یعنی
لام رسول مہر اور ان کے اتباع میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا اپنی سوا سو سالہ تاریخ کو
لنے کی جرأت وجسارت کرنا، ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین وقت کی کوئی اہم
ت یا سعادتِ دارین کا ذریعہ ہو، لیکن انصاف پسند اہلِ علم حضرات کے نزدیک، اِس
ح تحقیق کے پردے میں تحریف کرنا دیانت داری سے بعید ہی شمار ہوتا ہے، کیونکہ یہ ملت پر
ادہ تاریخ سے مذاق ہے۔

جب مصنفِ "تواریخِ عجیبہ" مولوی محمد جعفر تھانیسری کو سید احمد صاحب کی تحریک کا سرگرم
رکن اور رازدار مان لیا، نیز یہ تسلیم کر لیا کہ اُنھوں نے اعانتِ تحریک کی پاداش میں کالے پانی
سزا پائی، اٹھارہ سال جزیرہ انڈیمان میں مقید رہے، جائداد ضبط ہوئی اور خوفناک تکلیفیں اٹھائیں
یں حالات، سید صاحب کے ایسے صبر آزما پیروکار پر خود سید صاحب ہی کی تاریخ کو بدلنے
ور ان کے مکتوبات میں تحریف کرنے کا الزام لگانا کیسی خوفناک جسارت ہے۔

جناب غلام رسول مہر تو ۱۹۷۱ء میں آنجہانی ہو چکے، حقیقتِ حال اُن کی نگاہوں کے سامنے
ی ہوگی۔ علاوہ بریں اُن کا معاملہ چونکہ خود ہی سپردِ خدا ہے، اِس لیے اُن کی طرف رُخِ سخن کرنا
سب ہی نہیں۔ راقم الحروف بصد ادب، جناب پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے اور
وفیسر فیروز الدین روحی سے مخاطب ہو کر مندرجہ ذیل امور کی وضاحت کا طلبگار ہے:

کیا نواب امیر خاں کے پاس جانے کے وقت (۱۸۱۰ء) سے معرکۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء)
ک سید صاحب نے اکیس سال کے اندر کوئی ایسا بیان بنفسِ نفیس دیا، جس میں
ضاحت صریح طور پر فرمایا ہو کہ ہم انگریزوں سے بھی جہاد کریں گے؟ ایسا بیان مطبوعہ
ہونا چاہیے۔

۲۔ اگر سید احمد صاحب کا کوئی ایسا بیان نہ ہو تو کم از کم اُن کے دستِ راست مولوی
محمد اسمٰعیل دہلوی ہی کا کوئی ایسا مطبوعہ بیان آنجناب کے پیشِ نظر ہے؟

محمد ایوب قادری، تعارف مصنفِ حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۵

۳۔ یہ بھی نہ سہی، وہ کون کون سے مورخ ہیں جنھوں نے سید احمد صاحب کے بعد یعنی ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۹ء تک کے ایک ۱۸ سولہ سالہ عرصے میں وضاحت کی ہو کہ سید صاحب کا ارادہ انگریزوں سے لڑنے کا تھا؟

۴۔ آپ حضرات ماشاءاللہ تاریخ دان بلکہ اسکالر کہلاتے ہیں، ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۱ء کے بعد سید صاحب کے بعض خلفاء جو انگریزوں سے لڑے تھے ان واقعات کو اصل تحریک کے نظریات کا جزو قرار نہ دے لینا۔ ۱۸۴۹ء میں سکھ نہیں بلکہ انگریز پنجاب کے حکمراں بن گئے تھے۔ اس وقت انگریزوں نے اپنے ان خانہ زادوں کی گوشمالی ضروری سمجھی ہوگی کیونکہ اب سرحد میں ان کا وجود انگریزی مفادات کے خلاف ہو کر رہ گیا تھا۔ سکھوں کے عہد حکومت میں تو برٹش گورنمنٹ نے دلی خواہش کے ساتھ سکھوں اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے اپنے ان جاں نثاروں کو بھیجا تھا۔ اب انگریزوں کا مقصد پورا ہو چکا تھا، لہٰذا جو سلوک جعفر و صادق کے ساتھ کیا تھا وہ بھلا ان کے ساتھ کیوں نہ کرتے۔

راقم الحروف نے یہاں جو کچھ کہا ہے کہ سکھوں اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے انھیں بھیجا تھا، اس جملے میں مسلمانوں کا لفظ شاید آپ حضرات کے جذبۂ عقیدت کو ٹھیس پہنچاتا اور اس وجہ سے طبع نازک پر گراں گزر رہا ہو تو گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد کسی کا دل دکھانا نہیں۔ ہاں مجبوراً ایسا لکھنا پڑا ہے کیونکہ سید احمد صاحب کے جملہ سوانح نگاروں نے ان بانکے مجاہدوں کا سب سے بڑا کارنامہ جو رنگ برنگی تاویلوں کے سہارے فخریہ انداز میں پیش کیا ہے، وہ مسلم کشی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

۵۔ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں سے خوفناک اذیتیں اٹھانے کے بعد مولوی محمد جعفر تھانیسری سہم گئے ہوں، انھوں نے قلم پر احتیاط کے پہرے بٹھا لیے ہوں۔ ان حالات میں یہی ہوتا کہ وہ منہ سے کچھ نہ کہتے، ڈر کے مارے خاموش رہتے، قلم کو بھی حرکت میں نہ لاتے اور باقی زندگی خاموشی میں گزار کر راہیِ ملکِ عدم ہو جاتے۔ لیکن موجودہ مورخین حضرات جس مصلحت کا تھانیسری صاحب پر بھوت سوار کر رہے ہیں، انھوں نے اس کے برعکس اسی تحریک کے بانی کی سوانح حیات لکھ ڈالی، جس کے سرگرم کارکن ہونے کی

رہا پر وہ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ حجاب رہے تھے۔ ایسا کیوں کیا؟

۶۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سید احمد صاحب کی سوانح حیات لکھنے کے سلسلے میں انھیں انگریزوں سے کسی قسم کے خطرے یا نقصان کا اندیشہ نہیں تھا، اسی لیے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ اگر سید صاحب انگریزوں کے مخالف ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ تھانیسری صاحب اُن کی سوانح حیات لکھنے کا خیال تک بھی نہ لاتے۔ بصورتِ دیگر اگر پھر بھی لکھنے پر آمادہ ہوتے تو سید صاحب کو ۱۲۹۵ھ میں انگریزوں کا مخالف لکھ دینے سے انھیں اندیشہ کس بات کا تھا، جبکہ ۱۲۴۶ھ میں وہ معاملہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ دریں حالات مولوی محمد جعفر تھانیسری کو تحریکِ جہاد کا رُخ موڑنے اور مکتوبات میں تحریف کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟

۷۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کو اگر خطرہ لاحق ہو سکتا تھا تو صرف اسی صورت میں کہ وہ خود کو انگریزوں کا دشمن لکھتے یا ظاہر کرتے۔ کسی پچاس سال پیشتر کی ہستی یا تحریک کو انگریز دشمن لکھنے سے مصنف پر کون سی دفعہ عائد ہو سکتی تھی؟ دریں حالات اپنے بزرگ سید صاحب کے اوّلین سوانح نگار کی قبر پہ حُبِّ علی میں نہیں بلکہ بغضِ معاویہ میں، دعائے خیر کے پھولوں کے بجائے بہتانات کے کانٹوں کی چادر کس جرم کی پاداش میں چڑھائی جا رہی ہے؟

۸۔ آپ حضرات کو یہ شکایت ہے کہ جہاد کا رُخ انگریزوں کی طرف نہ پھیر کر تھانیسری صاحب نے تحریک کا حلیہ بگاڑ دیا۔ گویا "تواریخ عجیبہ" کی ایک یہ حرکت اور دوسرا مسئلہ غیبوبت آپ کو کھٹکتا ہے اور ان کے علاوہ باقی سب خیریت ہے۔ حالانکہ اسی "تواریخ عجیبہ" نے سید صاحب کے معجزات و کرامات کا ڈھیر اور الہاموں کا اندھیرا اپنے اندر اس طرح محفوظ کیا ہے کہ سید صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مراتب میں ماسوا اس کے اور کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ انھیں اپنے لیے نبی کہنے اور کہلوانے کی قدرت نے مہلت ہی نہیں دی اور ان کے اس خلا کو مرزا صاحب کے ذریعے پورا کیا گیا۔ موجودہ مورخین حضرات نے اس جانب سے کیوں منہ پھیرا ہوا ہے؟ آخر اس وضاحت بھی تو کرنی چاہیے تھی؟

۹۔ سر سید احمد خاں اور محمد جعفر تھانیسری نے جس وقت علی الاعلان اس تحریکِ جہا

صرف سکھوں کے ساتھ مخصوص کرنا شروع کیا تھا تو سید احمد صاحب کے معتقدین جو
ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے پڑے تھے ، اُن میں سے کتنے حضرات نے
اس ادّعا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی ؟

۱۰ - صدائے احتجاج بلند کرنا یا اِس دعوے کو افتری ٹھہرانا تو دُور کی بات ہے ، ہم تو یہی
دیکھتے ہیں ، کہ اُن کے اکثر معتقدین نے سر سید احمد خاں اور محمد جعفر تھانیسری کے اُن
بیانات پر مُہرِ تصدیق ہی ثبت کی تھی ۔ یہ درست ہے یا نہیں ؟

۱۱ - اگر ان دونوں حضرات نے تحریک کا حلیہ بگاڑا تھا تو اُن اہلِ علم اور صورتِ حال سے
واقف حضرات نے اِس بداندیشی کا سدِّباب کیوں نہ کیا جو اِس تحریک سے خود
منسلک تھے اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کی طرح اس کے سرگرم کارکن اور رازدار تھے ؟

۱۲ - سید صاحب کے اُن معتقدین کے ناموں کی فہرست پیش کرنے کے لیے ہم تیار ہیں
جنھوں نے موصوف کا انگریز دشمن ہونا ہرگز تسلیم نہیں کیا ۔ کیا ایسے جملہ حضرات کو آپ
سید صاحب کے بدخواہ اور تحریف پسند کہنے اور ماننے کے لیے تیار ہیں ؟ اگر نہیں تو
کیوں ؟

۱۳ - اگر بقول مہر صاحب ، مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سید صاحب کے مکتوبات تک میں
تحریف کر دی تھی تو ، ۱۹۱۰ سے پہلے وہابیوں کے علماء اور مورّخ کہاں سوئے پڑے
تھے ؟ اُنھوں نے اصل اور نقل کے فرق کو واضح کر کے ، اِس تحریف کے سلسلے میں
اپنا فرض کیوں ادا نہیں کیا تھا ؟

۱۴ - نہ سہی ، جن حضرات کے قبضے میں وُہ مکتوبات تھے کم از کم اُنھیں تو اپنے دِلی محبت
والے اور خدا سے مصافحہ و ملاقات کرنے والے ، بلکہ باری تعالیٰ شانہٗ سے ہمکلامی کے
شرف سے مشرف ہونے والے داداپیر کی حمایت میں اغماض سے کام لے کر بدخواہوں
کی فہرست میں اپنا نام نہیں لکھوانا چاہیے تھا ، آخر وُہ سب کے سب کیوں چُپ سادھے
پڑے رہے ؟

۱۵ - غلام رسول مہر کی تازہ تحقیق پر تو جناب قادری صاحب ایمان لے آئے کہ مکتوبات کی

اصل عبارتیں یُوں نہیں بلکہ یُوں ہیں۔ لیکن موصوف نے اِس طائفہ کی تاریخ کو سٹایہ وہابیت کی عینک اُتار کر دیکھنے کا شرف کبھی حاصل ہی نہیں کیا ورنہ اُنھیں صاف نظر آجاتا کہ اِس جماعت کے اُونچی چوٹی کے علماء بھی اِتنے جری اور بیباک ہیں کہ خود باری تعالیٰ شانہٗ اور اُس کے سب سے برگزیدہ رسول پر بہتانات باندھتے ہُوئے بھی کبھی نہیں ڈرے، عظمتِ خداوندی اور شانِ مصطفوی کی ناپ تول کرتے رہنا ان حضرات کا دائمی مشغلہ ہے، قرآنِ کریم کی کتنی ہی آیات کے چودہ سو سالہ متوارث معانی و مطالب سے انحراف کر کے اُنھیں اپنے پسندیدہ اور خود ساختہ معانی کا لباس پہناتے رہنا، احادیث میں جہاں چاہا متن یا شرح میں ہاتھ کی صفائی دکھانا ورنہ فنِ رجال کی بحث چھیڑ کر شعبدہ بازی کا کمال پیش کرنا، ایمان اور کفر، توحید اور شرک کی حدود میں ایسی دھاندلی مچانا کہ عوام کو عجیب پریشانی میں مبتلا کر دینا اور ایک ایسے چکر میں پھنسا دینا جس سے نکلنے کا بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

تصانیفِ اکابر سے و کُتبِ ائمہ سے عبارتیں نقل کرتے وقت من مانی عبارتیں بنا دینا، اوّل یا آخر کا جملہ اُڑا دینا، عبارت کے درمیان سے اپنے خلاف الفاظ کو ایسے اطمینان سے ہضم کر جانا گویا یہاں کوئی لفظ تھا ہی نہیں، اپنی طرف سے الفاظ گھڑ کر کسی بزرگ کی عبارت سے ملا کر سب کچھ اُن کے سر تھوپ دینا، طرّہ یہ کہ اپنے ذہن سے کتابیں گھڑ کر اُن کے مطابع، صفحے اور عبارتیں تک اپنے ہی ذہن کی مشین سے ایجاد کر کے علماء اہلسنت کو چیلنج کرتے رہنا کہ دیکھو جناب! تم ایسا کہتے ہو حالانکہ تمھارے فلاں فلاں بزرگ نے اپنی فلاں فلاں تصنیف کے فلاں فلاں صفحے پر تمھارے خلاف یُوں لکھا ہوا ہے حالانکہ اُن کتابوں کا دنیا کے پردے پر کہیں نام و نشان نہیں ہوتا، کسی کتاب میں کوئی ذکر تک نہیں، ذکر کہاں سے ہو جبکہ یہ مصنوعات ہی گھڑنت ساز فیکٹری کی ہیں۔ ان حضرات نے اپنی انتہائی ہنرمندی اور کرشمہ سازی سے روافض کے کان بھی کاٹ رکھے ہیں۔

اُسی طائفہ سے ایک ایسی آواز اُٹھے جو اُس کی پُوری تاریخ کے علماء و مورخین کی تصریحات کے خلاف ہو، کیا ایسی آواز انصاف کی رُو سے قابلِ سماعت ہے!

"میٹھا میٹھا ہپ، کڑوا کڑوا تھو" والی بات دوسری ہے ورنہ اس طرح کسی فرقہ و
جماعت کی تاریخ کو نہیں بدلا جاسکتا۔ کون سے ولی کو شیطان اور کون سے شیطان کو
ولی ثابت کرنے کی جسارت نہیں ہو سکتی۔ لیکن سوال تو یہی ہے کہ ایسا کرنے سے
حقیقت بھی بدل جایا کرتی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد
ہزیمت اٹھانے، اپنوں کو ملعون کرنے اور اپنی ہی تاریخ کو بدلنے کا آخر فائدہ کیا؟ ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

۲۶۔ جامع مسجد دہلی والا تاریخی مباحثہ تو پیشِ نظر ہوگا جو ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ میں ہوا تھا۔
غور نہیں کیا کہ ایک طرف ولی اللّٰہی خاندان، تیرھویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز محدث
دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خوشہ چین علمائے کرام اور اکثر علمائے دہلی ہیں تو دوسری طرف
مذہب اہلسنت وجماعت سے بغاوت کرنے والے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور
مولوی عبدالحی صاحب ہیں۔ اول الذکر جو متحدہ ہندوستان میں خارجیت و وہابیت کے
بانی قرار پاتے تھے، ان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اپنا مسلمان ہونا ثابت کر دیجیے، اگر
جناب کا ساختہ مذہب ہی اسلام کی صحیح تصویر ہے تو اپنے خاندانی اکابر مثلاً شاہ عبدالقادر،
شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کو کس طرح بزرگ بلکہ
مسلمان بھی مانا جاسکتا ہے؟ کیونکہ آپ کے نزدیک ان کا مذہب کفر و شرک بلکہ بت پرستی
تک کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ موصوف نے جواب کی گنجائش نہ پا کر راہِ فرار
اختیار کرنے میں ہی خیریت سمجھی۔ مولوی عبدالحی صاحب نے مجبور ہو کر گفتگو ترک کی لیکن
ہر مسئلے میں معمولی سی قیل و قال کے بعد اہلسنت کا موقف تسلیم کرتے چلے گئے حتی کہ دستخط
و مہر سے بھی گریز نہ کیا۔ یہ محض دفع الوقتی تھی ورنہ خارجیت سے ان حضرات نے سرِمو کنارا
نہیں کیا تھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے مسلکِ اہلسنت اور اپنے خاندانی مذہب سے
روگردانی کرنے کے باعث اپنے خاندانی علماء یعنی شاہ مخصوص اللہ و شاہ محمد موسیٰ
پسران شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کو بھی منہ دکھانا بند کر دیا، اس طرح

دینی حلقوں کے اس مرکز (خاندانِ عزیزی) سے موصوف کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ یہ سب کچھ منظور لیکن مذہب اہلسنت اختیار کرنا ساری عمر نامنظور ہی رہا۔ معلوم نہیں سید صاحب کے اس نامدار مرید نے جو اندرونِ خانہ سید صاحب کے رہبر اور اس سارے ڈرامے کو سٹیج کرنے والے تھے، انھوں نے یہ ساری کارگزاری انگریز دشمنی میں ہی کمائی تھی؟ اگر سید صاحب انگریزوں کے خلاف ہوتے تو انھیں مسلمانوں سے کٹ کر، اپنے اکابر کے مسلک کو چھوڑ کر، مذہب اہلسنت وجماعت سے منہ موڑ کر علیحدہ اپنا محمدی گروہ بنانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ اگر یہ اقدام حکومت کی شہ پر نہیں تھا تو اور کس ضرورت کے تحت تھا؟ اس طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرکز سے رشتہ ٹوٹا، مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کا ساتھ چھوٹا، جامع مسجد دہلی کے سب سے پہلے حنفی وہابی مباحثہ ومناظرہ کے ذریعے بھی راہِ راست پر نہ آسکے، پنجاب میں صدہا علماء ومشائخ نے انھیں بدمذہب ثابت کر کے مذہب اہلسنت قبول کرنے کی دعوت دی لیکن نامنظور ہوئی، جس کے باعث سرحد وپنجاب کے اکثر مسلمانوں نے جو حسنِ ظن کے تحت ساتھی ہو گئے تھے، ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انھوں نے سرحدی مسلمانوں کو کلاب النار اور ملعون بھی اشرار ٹھہرا کر مستحق القتل قرار دے کر اُن کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کی، اُن کے اموال کو غنیمت سمجھ کر ہضم کرنا شروع کیا، اُن کے ننگ وناموس پر ڈاکے ڈالے اور ان غیور مسلمانوں کے ہاتھوں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہونا قبول کر لیا لیکن اپنی سیاہ کاریوں اور بدمذہبی سے باز آنا کسی بھی مرحلے پر قبول نہ کیا۔ کیا سید صاحب اینڈ کمپنی کی یہ البیلی ادائیں، بانکی جفائیں، انگریز دشمنی کا کرشمہ تھیں؟

؎ کرم کوشیاں ہیں، ستم کاریاں ہیں
بس اک دل کی خاطر یہ تیاریاں ہیں

سید احمد صاحب کے مذہبی رہنما یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے کمال اطاعت شعاری سے انگریزی منصوبے کے مطابق پیارے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں تحریف کرنے اور تخریبِ اسلام میں توحید کی آڑ لے کر غیر اسلامی عقائد ونظریات

کی نقلیں لگاتے وقت خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کا قطعاً خیال نہیں رکھا تھا۔ کیا آج
برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کا خیال تک بھی سید صاحب اینڈ کمپنی کے قریب پھٹک سکتا

۱۹۔ انصاف پسند حضرات سے التجا ہے کہ وہ سید صاحب کے ملفوظات جنہیں مولوی محمد اسمٰعیل
دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی نے "صراطِ مستقیم" کے نام سے کتابی صورت میں مرتب
کیا تھا، اس کی روشنی میں سید صاحب کی تصویر دیکھیں۔ بھلا جب کہ مرزا غلام احمد
قادیانی نے صریحاً دعویٰ نبوت نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے متعلق مجدد، مصلح، مہدی
مسیح موعود وغیرہ ہونے کے دعوے کر رہا تھا اور پے در پے الہامات شائع کر رہا تھا
مرزائے قادیان کے اس دور اور سید احمد صاحب کے سارے کارنامے دیکھیں تو کیا
فرق کیا ہے؟ دعویٰ نبوت کی مہلت ہی نہیں ملی تھی ورنہ وحی و عصمت تک کون سی صفت
نبوت ہے جو سید صاحب نے اپنی ذات میں نہیں بتائی یا اس قمیص پر شاشیہ چڑھانے
والوں نے اُن کے گلے میں نہ لٹکائی؟ باری تعالیٰ شانہ تک صعود، دیدارِ الٰہی، شرفِ
مکالمہ، لین دین، عہد معاہدے، کلامِ حقیقی وغیرہ تک کے دعاوی سب موجود ہیں بلکہ
ان میں سے بعض چیزیں کتنے ہی انبیاء کو بھی حاصل نہیں تھیں لہٰذا دعویٰ کر دیا کہ سید
سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مشابہت پر پیدا ہو گئے ہیں۔ اے انگریز
کے شیدائیو! اے کلمہ طیبہ کے ہرا ہیو! کیا یہ سارے مراحل انگریز دشمنی میں سے
کیے جا رہے تھے؟

؎ بھلا دیتی ہیں سب رنج و الم حیرانیاں میری
تری تمکینِ بے حد کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہے

۲۰۔ پروفیسر صاحبانو! خدا کو حاضر و ناظر جان کر ایک صاحب صراطِ مستقیم کتاب پکڑ لیں
اور دوسرے صاحب تقویۃ الایمان کو سنبھال کر بالمقابل بیٹھ جائیں۔ مضامین کا موازنہ
کر کے دیکھ لیں، جو بات ایک میں جزوِ ایمان دوسری میں وہی بات کفر و شرک کا سامان
جو شخص اس کے نزدیک ولی دوسری کے نزدیک شیطان۔ اسی طرح اگر ایک کتاب
دوسری کا رد نہ کر دے تو ہمارا ذمہ۔ کیے! اس سے زیادہ وضوحِ حق اور اتمامِ حجت

اور کیا ہو سکتی ہے؟ حقیقت تو واقعی عیاں ہے لیکن اُن نازک مزاج مہربانوں کا کیا علاج؟
جو حقیقت کو مان لینے سے پہلے ہی نہ ماننے کی قسم کھائے بیٹھے ہوں، سوچیے تو سہی یہ
کفر و ایمان کو شیر و شکر کرنے کی کارگزاری کیا انگریزوں سے ٹکرانے کی خاطر سرانجام
دی جا رہی تھی؟ کہیں حکومت ہی کی شہ پر اپنا اور مسلمانوں کا دین و ایمان تباہ و برباد
کرنے کے لیے تو ایسا نہیں کیا جا رہا تھا؟

قادری دین میں کہہ جا لگ خدا لگتی کچھ
مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

اچھا جانے دیجیے ہر قسم کے بیانات کو، جائے غور ہے کہ انگریز جیسی دُور اندیش،
باریک بین اور عیار قوم جس نے اپنے روزِ اوّل سے ہی مسلمانانِ ہند کو خاص طور پر اپنے
شکنجے میں کس رکھا تھا اور گرفت کو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر کیا جاتا تھا، اگر اُسے
سید صاحب اینڈ کمپنی سے ایک فیصد بھی اپنی مخالفت یا اپنے نقصان کا اندیشہ ہوتا تو
انگریز اپنی مملکت میں انھیں کھُلے بندوں ہر قسم کی قوت جمع کرنے کی کیا ایک منٹ کے لیے
بھی مُہلت یا اجازت دینے کے روادار ہو سکتے تھے؟ کیا انگریز اتنے بیوقوف تھے
کہ خود اپنی آستین میں بصد شوق سانپ پال لیتے یا سید صاحب کے پاس اتنی طاقت
کہیں سے اچانک آ گئی تھی کہ انگریزوں میں اُنھیں روکنے ٹوکنے کی طاقت و جُراُت
ہی نہ تھی؟

زیادہ لکھنا لمبے چوڑے دلائل پیش کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔ بات صرف اتنی سی ہے
کہ خود اِن حضرات کے نزدیک، اِن کے جملہ مورخوں کے نزدیک، یہ سارا خانوادہ،
اِس کی تمام ذیلی شاخیں، سب کا وجود تک انگریز کی ہنرمندی کا مرہونِ منت ہے۔
اِس لیے سید صاحب ہوں یا اُن کا سارا محمدی گروہ، بعد میں اِسی ڈگر پر چلائے جانے والے
شمس العلماء قسم کے حضرات ہوں یا مصلح و ریفارمر وغیرہ، یہ سب اور اِن کی ساری
جماعتیں، سب کے سب برٹش گورنمنٹ کے وفادار، اطاعت شعار بلکہ آلۂ کار بن کر
رہے اور اِسی روش پر نازاں تھے، فخریہ اِس کا چرچا کرتے اور گورنمنٹ کی مزید عنایات

سکے حقدار بنتے رہتے، مخالفین پر زبانِ طعن دراز کرتے، ان کی زبان بندی کرواتے تھے ا
سیاں بجے کوتوال اب ڈر کاہے کا" کے مصداق خوب مزے لوٹتے تھے۔ ماسو
ان حضرات کے جو تحریکِ خلافت کے زمانے سے گاندھی کو اپنا امام اور پیشوا بنا بیٹھے تھے
باقی حضرات کی ۱۹۴۷ء تک یہی کیفیت رہی۔ اس وقت اس دوستی کا صلہ پرمٹ یا
عنایات تھا لیکن جب انگریز دوڑ گئے، وہ چشمِ کرم ہی نہ رہی جس سے عنایتوں کی بار
ہوا کرتی تھی، بلکہ اب انگریز دوستی کے اظہار میں محض رسوائی کے سوا اور کچھ نہ تھ
اسی لیے یار لوگوں نے انگریزوں کے دوڑ جانے کے بعد الٹی گنگا بہانی شروع
کر دی کہ صاحب! کیسی دوستی اور کہاں کی دوستی؟ انگریز سے ہمیں محبت نہیں تھی،
بعض بزرگوں کا جو انگریزوں کی بارگاہ میں آنا جانا اور فیضیاب ہوتے رہنا تھا وہ
آلۂ کار بننے کے لیے تھوڑا ہی تھا بلکہ صرف تفریحِ طبع کے لیے ایسا کیا جاتا تھا۔ رہا
ڈیڑھ سو سال سے ہمارے علماء اور مورخین لکھتے آرہے ہیں کہ ہماری اور ہمارے
چھوٹے بڑوں کی انگریز دوستی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے تو اس قلم کی
وہی لوگ یقین کرتے ہیں جنہیں انگریزوں سے کچھ بھی سیکھنے کا موقع نہیں ملا، ورنہ جب
نہ ہے تو ہماری انگریز دوستی ہی کہاں رہ گئی، دریں حالات جب ہم انگریزوں سے
نہ ہے تو اپنے بزرگوں کے ماتھے پر یہ کلنگ کا ٹیکہ کیوں باقی رہنے دیں۔ یقین جا
اگر ہمارے وہ علماء اور مورخین زندہ ہوتے جو انگریز دوستی کے بیانات دیتے آ
تھے تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی پاکستان کی تاریخ کے پہلے ہی روز وہ حضرات بھی
کہہ اٹھتے جو آج ہم کہہ رہے ہیں اور فوراً اپنی اپنی تصانیف کے شروع میں اغلاط
کی ایک ایک چٹ شامل کر دیتے، جس میں لکھا ہوا ہوتا کہ اس کتاب کے فلاں
صفحہ پر کاتب کی غلطی سے جو انگریز دوستی لکھ گیا ہے، قارئین کرام اسے انگریز دشمنی
پڑھیں، ہم اپنی کوتاہی پر معذرت خواہ ہیں، اگلے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے
انشاء اللہ۔ لیکن دوست

جھٹلانے پہ بھی حقیقت رابطہ ماضی
جھٹلایا نہ جائے گا، ہم سے نہ تم سے

۲۳- اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ اپنی ساری تاریخ کو بدلنے کا ٹھیکہ لینے والے جناب غلام رسول مہر کی مندرجہ ذیل شہادت، خود اُن کے اپنے لفظوں میں کافی رہے گی :

"اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سید صاحب کس کے خلاف جہاد کی
دعوت دے رہے تھے؟ آیا وہ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے،
جیسا کہ سوا سو سال سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے اور وہ بھی محض اس
بنا پر کہ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کر رہی تھی؟"[1]

موصوف اپنی سوا سو سالہ تاریخ کو بدلنے کی سعادت حاصل کرنے والے ہیں کیونکہ یہ حقیقت موصوف کے جذبۂ عقیدت پر گراں گزرتی تھی۔ ثبوت میں اس خط کے دو اقتباس پیش کیے ہیں جو سید احمد صاحب نے شاہ بخارا کو بھیجا تھا نیز والی ہرات کے نام لکھے گئے خط کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ ان میں سید صاحب نے ہندوستان پر انگریزی تسلط کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہماری نظر میں یہ موصوف کے لکھے مغالطے ہیں کیونکہ صوبہ سرحد میں سید صاحب پیدا ہی کو جو وہابی اور انگریزوں کا ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ وہ اگر دو چار لفظ انگریزوں کے خلاف نہ لکھتے تو اور کیا یوں لکھ دیتے کہ "واقعی بدولت برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار ہیں"۔ بدنامی کا داغ مٹانے اور مسلمانوں کو ساتھ ملانے کی غرض سے انگریزوں کے خلاف دو لفظ معلق کہنے کا تکلف فرمایا گیا تھا ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔

۲- مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) اور سید احمد صاحب ایک ہی گاڑی کے دو پہیے، ایک جان اور دو قالب یا بمنزلۂ روح اور جسم تھے، اسی لیے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ دوسرے حالات گزشتہ سطور میں جو کچھ سید صاحب کے بارے میں کہا گیا ہے اُسے ان دونوں حضرات کے بارے میں سمجھا جائے کیونکہ اگرچہ بظاہر سید صاحب کا مرشد یا امیر المومنین کی پوزیشن میں جماعت کے سرگروہ نظر آتے ہیں، لیکن اندرونی خانہ

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۹

اس سارے ڈرامے کو ترتیب دے کر پیش کرنے والے اور اس نوزائیدہ محمدی گروہ کے قافلہ سالار اور روحِ رواں ، یہی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی تھے۔

موصوف نے جب جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر وعظ کہنا شروع کیا اور اپنے بعض غیر اسلامی اور خلافِ مذہب عقائد و نظریات کی تبلیغ شروع کی تو دہلی کے عوام و خواص میں اور بخصوص شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی کہ یہ کیا ہونے لگا ؛ جس گلشن کی آبیاری یہ خاندان بڑھ چڑھ کر کرتا آیا ہے اُسی خاندان کا ایک عالم اپنے آباء و اجداد کے مذہب کو ، عالمِ اسلام کے مذہب کو ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی آنکھیں بند ہوتے ہی ، قربانی کا بکرا بنا کر خارجیت کے بُت کی نذر کر رہا ہے۔ عوام و خواص نے دنگا فساد کی بجائے قانونی راستہ اختیار کیا - پندرہ سو مسلمانوں کے دستخطوں کے ساتھ ریذیڈنٹ کی خدمت میں اس وعظ کے خلاف درخواست پیش کی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ ریذیڈنٹ کو حکامِ اعلیٰ نے اُس وقت تک موصوف کے بارے میں کوئی خصوصی ہدایت نہ بھیجی ہو ، یہی وجہ ہے کہ لاعلمی میں پندرہ سو مسلمانوں کا پاس لحاظ کرتے ہوئے نیز امن و امان بحال رکھنے کی خاطر موصوف کا وعظ ممنوع قرار دے دیا اور بذریعہ کوتوال تحریری حکم بھیج دیا گیا۔

موصوف نے اعلیٰ حکام کو اِس پابندی سے مطلع کیا ہوگا ، اعلیٰ حکام نے ریذیڈنٹ کو صورتِ حال بتائی ہوگی اور خصوصی ہدایات سے نوازا ہوگا ، جس کی اطلاع موصوف کو مل گئی ہوگی ، لہٰذا انھوں نے اپنے معاونین یعنی ہمارانِ دینی و یقینی کو ساتھ لے کر ریذیڈنٹ سے ملاقات کی۔ ملاقات کے تیور ملاحظہ ہوں :

"آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ فلاں وقت ملنے ملانے اور فرصت کا ہوتا ہے ، سیدھے کوٹھی پر پہنچے ، ساتھ میں صرف مولوی عبدالصمد بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا منشی ہیرالال تھا اور ایک خدمتگار تھا پہلے آپ نے جا کر اطلاع کرائی ، جوں ہی ریذیڈنٹ نے سُنا کہ شاہ اسمٰعیل آئے ہیں فوراً باہر نکل آیا اور باہر برانڈے سے آ کر لے گیا - عدہ سے [illegible] عزت کی اور بار بار یہ کہا کہ آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا (یہ عقیدت !) معمولی مزاج پُرسی

اس کے بعد ریذیڈنٹ نے خود یہ الفاظ کہے، مولوی صاحب، ہمارے سررشتہ دار (علامہ فضل حق خیرآبادی) کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا میں نے حکم جاری کر دیا تھا لیکن جب آپ نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو میں نے اُسی وقت حکم ثانی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو۔[1]

جائے غور ہے، جہاں عوام کا احتجاج بے کار ہو کر رہ جائے، سررشتہ دار کی رپورٹ بے کار ثابت ہو جائے جس ریذیڈنٹ نے بجا وعظ بند کیا تھا وہ اُلٹا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جائے اور فوراً وعظ جاری کرنے کا حکم نافذ کرے کیا مسلمانوں نے صورت حال کو سمجھ نہ لیا ہوگا؟ کیا کمپنی کی اس سازش کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ گئے ہوں گے؟ لیکن جہاں مغل بادشاہ (اکبر شاہ) بھی بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہا ہو وہاں عوام الناس کیا کر سکتے تھے؟ بیچارے صبر و خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے اور بامر مجبوری دین کی بیخ کنی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس صورت حال کے پیش نظر بعد حسرت و یاس جو ریمارک دیا وہ پورے حالات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے:

> عجیب یہ لوگ (مسلمانانِ دہلی) مولوی منطقی صاحب (علامہ فضل حق خیرآبادی) کے پاس پہنچے اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ اسمٰعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا۔ یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا جو اُنھوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا۔[2]

موصوف کے بارے میں اس سلسلے کی ضروری معلومات کا تذکرہ ہم گزشتہ ابواب میں تفصیل سے پیش کر چکے ہیں اعادے کی ضرورت نہیں۔ اب اُن کے بیانات اپنی تحریک جہاد کے متعلق ملاحظہ ہوں:

> یہ بھی صحیح روایت ہے کہ اثنائے قیام کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسمٰعیل صاحب

---

[1] حیرت دہلوی، مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۹۳

[2] ایضاً، ص ۹۰

وعظ فرما رہے تھے، ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پوچھا کہ سرکار انگریزی پر جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ایسی بے رُو ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے۔[۱]

مرزا حیرت دہلوی نے اِس واقعے کو اپنے لفظوں میں یُوں بیان کیا ہے:

"کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل صاحب نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے تو ایک شخص نے دریافت کیا، آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا، اُن پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے، ایک تو اُن کی رعیت ہیں، دُوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وُہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں اُن کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے، بلکہ اگر اُن پر کوئی (مسلم یا غیر مسلم) حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وُہ اُس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔"[۲]

نیچری فرقے کے بانی جناب سرسیّد احمد خاں نے اپنے لفظوں میں یہ قصّہ یُوں سپردِ قلم کیا تھا:

"ایک مرتبہ وہ (مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی) کلکتہ میں سکھوں پر جہاد کا وعظ فرما رہے تھے۔ اثنائے وعظ میں کسی شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے، وُہ بھی تو کافر ہیں۔ اِس کے جواب میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رُو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔"[۳]

---

[۱] محمد جعفر تھانیسری، سوانح احمدی، ص ۴۰۔

[۲] حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۳۶۴

[۳] سر سیّد احمد خاں، ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۴۹

اپنے اکابر کی انگریز دوستی کا داغ مٹانے سے اپنے کو مجبور دیکھ کر اپنے امام مذہب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے عاشق زار یعنی مولوی محمد منظور نعمانی سنبھلی کو ان الفاظ میں اعتراف کیے بغیر کوئی راستہ نظر نہ آیا۔

"مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا، بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی ہے۔" [۱]

مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ فیصلہ کن بیان دیا ہے۔

"سرسید نے اس مضمون میں یہ بات بار بار لکھی ہے کہ حضرت سید احمد صاحب بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید، انگریزی حکومت کے ہرگز ہرگز مخالف نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ سرسید کے اس بیان کی تائید بعد کے متعدد مورخوں نے بھی کی ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن نے ترجمان وہابیہ مطبوعہ امرتسر کے صفحہ ۲۱، ۲۰ پر، نیز سوانح احمدی مولفہ محمد جعفر تھانیسری میں بیس مقامات پر، اسی طرح حضرت شاہ اسمٰعیل کی سوانح موسوم حیات طیبہ کے صفحہ ۲۹۶، ۲۹۲، ۱۸۹ پر اس خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر حال میں بعض اصحاب نے ان حقائق کے برخلاف یہ لکھنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت سید احمد رائے بریلوی اور حضرت شاہ اسمٰعیل کا اصل مقصد انگریزوں کے خلاف جہاد تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے حضرات کا یہ بیان واقعات کے مطابق نہیں اور نہ اس دعوے کا کوئی واضح ثبوت موجود ہے۔" [۲]

---

[۱] ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ، شہید نمبر ۱۳۵۵ھ، ص ۷۶

[۲] محمد اسمٰعیل پانی پتی، مولوی، مقالات سرسید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۷

۳- مولوی محمد اسحاق دہلوی

آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے اور جانشین تھے۔ چونکہ مولوی محمد اسمٰعیل جو حضرت کے بھتیجے اور مولوی عبدالحی بڈھانوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) جو شاہ صاحب کے داماد تھے یہ خاندان عزیزی کے مسلک سے بغاوت کر چکے تھے، اس لیے آپ نے اپنے وصال سے قبل ہی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء میں شاہ محمد اسحاق دہلوی کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ یہ کیوں بدلے؟ پس منظر ملاحظہ ہو۔

حالات کے بدلتے ہوئے دیر نہیں لگی سید احمد صاحب کے نامور خلیفہ اور ان کی تحریک جہاد کے سرگرم کارکن مولوی محبوب علی صاحب کسی زمانے میں مسلمانانِ سرحد کے بارے میں یہ فتویٰ صادر کر رہے تھے:

"سکھوں سے زیادہ ان کلمہ گو کافروں پر جہاد فرض ہے۔" [۱]

جب انھوں نے دیکھا کہ ہمارے مجاہدین سکھوں کا نام لے کر مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں۔ ان کی جانوں اور اموال کو اپنے لیے حلال ٹھہرایا ہوا ہے اور ان کے ننگ و ناموس سے کھیل رہے ہیں۔ تو ان کا ضمیر کچھ بیدار ہوا یا اسلامی غیرت نے کچھ رنگ دکھایا یا کلمہ گوئی کا کچھ پاس لحاظ سامنے آیا، کہ برملا اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے:

"تمہارے اوپر زوجہ، بچوں اور والدین کے حقوق ہیں، تم ان سب حقداروں کے حقوق تلف کر کے یہاں بیٹھے ہو۔ جب لوگوں نے کہا جہاد کے واسطے بیٹھے ہیں، تو مولوی صاحب نے کہا کہ جہاد کہاں ہے اور کس دن تم نے کون سے کافر کو قتل کیا ہے اور کون سے ملک میں تمہارا عمل دخل ہے؟ صبح سے شام تک کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو، جہاد کا نام لینا ایک دیوانہ پن ہے۔ بعض لوگ اس حیلے سے یہاں عیاشی کرتے ہیں اور تمہاری دنیا و آخرت دونوں خراب ہیں۔" [۲]

---

۱ حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۰۲ء، ص ۲۲۳

۲ محمد جعفر تھانیسری، منشی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۳۵

مولوی محبوب علی نے جب ساتھیوں کو یوں لاجواب کیا حتی کہ سید صاحب پر بھی اعتراضات کیے اور وطن واپس لوٹ آئے تو اِس تحریک کو بہت نقصان پہنچا، کیونکہ چندے کی فراہمی اور دہلی وغیرہ مراکز سے چندہ پہنچانے میں آپ نمایاں سرگرمی دکھا رہے تھے۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی اِس موقع پر ظاہر ہو گئے کہ اِس تحریک سے موصوف بھی کسی قدر وابستہ ہو چکے ہیں۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اِس امر کی یوں تصریح کی ہے:

> مولوی محبوب علی کے اغواء سے جو کاروبارِ جہاد کو صدمہ پہنچا، ویسا صدمہ اُس لشکر کو آج تک کسی سکھ یا درانی کے ہاتھ سے نہ پہنچا تھا۔ مولوی محبوب علی کے فتنہ کے بعد مدت تک ہندوستان سے قافلوں کا آنا بند ہو گیا، اکثر معاونینِ جہاد سست ہو گئے۔ جب بہت سے خطوط مولوی محبوب علی کی تکذیب میں لشکرِ مجاہدین سے ہندوستان میں آئے تب مدتوں کے بعد مولوی محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب معاونینِ جہاد کی سعی سے یہ فتنۂ محبوبی رفع ہو کر خرچ اور قافلوں کی روانگی دوبارہ شروع ہوئی۔[1]

موصوف اِس دوران میں چونکہ تقویۃ الایمانی خیالات کے زیرِ اثر آ چکے تھے اور دوسری طرف تیرھویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی کا شرف بھی حاصل تھا، اِن حالات میں فریقین کو خوش رکھنے کے لیے گول مول فتوے دیا کرتے تھے۔ جو باتیں تقویۃ الایمان میں کفر و شرک بتائی گئی ہیں، اُن میں سے بعض کو ناجائز، بعض کو مکروہ وغیرہ کہہ دیا کرتے تھے۔ لیکن موصوف اپنی اِس روش سے کسی فریق کو بھی خوش نہ کر سکے۔ مبتدعین نے تو اُن کی اِس روش کو بھی غنیمت سمجھا لیکن اہلسنت کے زمرے میں جب موصوف کی ساکھ زیادہ گرنے لگی، اکثر اہلِ علم اُن کی اِس روش سے آگاہ ہونے لگے تو آپ نے اپنی پوزیشن کو مزید خراب ہونے سے بچانے کی غرض سے ہجرت کو مناسب سمجھا، چنانچہ موصوف معرکۂ بالاکوٹ کے دس سال بعد یعنی ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں مقدس سرزمینِ حجاز کو ہجرت کر گئے اور باقی وقت وہیں

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، منشی: حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۲۸

۱۔ چونکہ اس اہلسنت سے علیحدہ ہونے والوں کے گروہ کی قیادت آپ کے سپرد تھی لہٰذا
ے وقت مختلف حضرات پر مشتمل ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے جو اس نوزائیدہ محمدی گروہ کا سرپرست
گیا۔

۴۔ مولوی محبوب علی

یہ سید احمد صاحب کے مرید و خلیفہ اور ان کی تحریک جہاد کے سرگرم کارکن تھے۔ آخر عمر میں
نے پیر کے جہاد کو فراڈ یا فساد سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے تھے، جیسا کہ پیچھے مذکور ہوا۔ انگریز دو
سلسلے میں اپنے مرشد اور اپنی جماعت کی طرح ثابت قدم رہے۔ موصوف کے بارے میں سر سید
د خاں نے یوں لکھا ہے:

"شاید اس مضمون کے پڑھنے والے اس عجیب بات کے سننے سے بھی خوش ہوں
کہ مولوی محبوب علی صاحب وہی شخص تھے جن کو ۱۸۵۷ء میں باغیوں کے سرغنہ
بخت خاں نے عین ہنگامۂ غدر میں طلب کیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ
آپ اس زمانے میں انگریزوں پر جہاد کرنے کی نسبت ایک فتویٰ پر دستخط
کریں۔ مگر مولوی محبوب علی نے صاف انکار کیا اور بخت خاں سے کہا کہ ہم
مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں، ہم اپنے مذہب کی رو سے اپنے حاکموں
سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور علاوہ بریں یہ ہوا کہ جو ایذا بخت خاں اور اس کے رفیقوں
نے انگریزوں کی میموں اور بچوں کو دی تھی اس کی بابت بخت خاں کو سخت لعنت
ملامت کی۔"[1]

۵۔ مولوی کرامت علی جون پوری

تذکرہ علمائے ہند کے مرتب پروفیسر محمد ایوب قادری نے موصوف کے بارے میں یوں

---

[1] سر سید احمد خاں: ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، بار اول ۱۹۴۹ء، ص ۳۲

تصریح کی ہے:

"جون پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ احمد علی چریاکوٹی، مولانا احمد اللہ انامی اور مولانا قدرت اللہ رودولوی سے تحصیلِ علم کی۔ علمِ قرأت و تجوید سید ابراہیم مدنی سے حاصل کیا۔ سید احمد شہید کے مرید ہوئے۔ بنگال میں اسلام کی اشاعت کی۔ مولوی شریعت اللہ کی تحریک کا شدت سے رد کیا۔ انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔" [1]

انگریز مورخ مسٹر ولیم ہنٹر نے ان کی انگریز نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"یہ بڑا ہی مبارک واقعہ ہے کہ جس ضلع (جون پور) سے ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان بادشاہ (اکبر) کے خلاف بغاوت کا فتویٰ شائع ہوا تھا، اسی سے ایک ایسا عالم بھی پیدا کر دیا جس کا فتویٰ انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنے سے منع کرتا ہے۔" [2]

مولوی کرامت علی جون پوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء) کی انگریز دوستی کے بارے میں مولوی مسعود عالم ندوی یوں تصریح کرتے ہیں:

"مجاہدین اور اتباعِ سید احمد شہید کے سب سے بڑے واقف کار، مسٹر ٹیلر نے کلی شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے مؤید اور وفاداریوں کے پکے حامی تھے۔ یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۱۸۷۱ء اکتوبر کو دیا گیا، جسے خود ان کے پوتوں نے قریب ۱۹۱۲ء میں درج کرایا تھا۔ (یہ خوبصورت اور نظر زیب پمفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں ان کے صاحبزادے، مشہور ادیب، مولوی عبد الاول صاحب جون پوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے۔ اس کے علاوہ راقم

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر، حاشیہ تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ کراچی بار اول ۱۹۶۱ء، ص ۳۹۲

[2] ولیم ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۶۳

بھی یہ اچھی طرح جاتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحاب خاص کی روش سے بالکل الگ تھے۔" [1]

۶- مولوی مملوک العلی نانوتوی اینڈ کمپنی

مولوی مملوک العلی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) ہی کو مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) نے سرزمین حجاز کی طرف ہجرت کرتے وقت تشکیل کردہ بورڈ کا سرپرست بنایا تھا۔ موصوف نے انتہائی خاموشی سے انگریزی مقاصد و مفادات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دہلی کالج سے اینگلو انڈین علماء کی ایک ایسی کھیپ پیدا کی کہ اُن کے ذریعہ مسلمانوں کا تعلیمی نظام کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا اور دوسری طرف ان تیار کردہ علماء نے انگریز کی موافقت میں فضا کو ہموار کرنے کا کام بڑی رازداری سے جاری رکھا۔ مولوی مملوک العلی کے بارے میں انگریزوں کی رائے کیا تھی، ملاحظہ فرمائیے:

"دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتمد تھے۔ کالج کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ انگریز پرنسپل مولانا مملوک العلی پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ہر سالانہ رپورٹ میں اُن کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ ایک موقع پر گورنر جنرل بہادر نے مولانا مملوک العلی کو انعام سے بھی نوازا۔ صورت یہ ہوئی کہ ۱۸۴۲ء، ۱۰ نومبر ۱۸۴۲ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار کیا۔ ۱۸ نومبر کے دربار میں ۴۲ حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مولانا مملوک العلی مدرس اوّل کو خلعت پنجپارچہ مرحمت ہوا۔" [2]

مولوی مملوک العلی کے شاگردوں میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مدرسہ دیوبند کے بانیوں اور چلانے والوں میں تھے، جیسے مولوی محمود الحسن دیوبندی کے والد مولوی ذوالفقار علی صاحب اور مولوی شبیر

---

[1] مسعود عالم ندوی، مولانا، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی ۱۹۶۹ء، ص

[2] محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۶ء، ص ۲۹

حقانی کے والد فضل الرحمٰن دیوبندی وغیرہ اس کیمپ کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں وضاحت کی ہے:

"مولانا مملوک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقیناً آگے بڑھیں اور مسلمانوں کی ایک ایسی کیمپ تیار ہوتی جس نے نئے نظامِ تعلیم میں منسلک ہو کر خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس) مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس) تو خاص ان (مولوی مملوک العلی) کے اعزہ و اقارب ہیں۔

ان کے علاوہ شمس العلماء ڈپٹی شیخ ضیاء الدین ایل۔ایل۔ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء)، شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء)، پیرزادہ محمد حسین (سیشن جج)، خواجہ محمد شفیع (جج)، خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء)، مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء)، مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں جو اسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں خدمات انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور تحسین صلہ سے نوازا۔"[۱]

۷۔ مولوی سمیع اللہ دہلوی

مولوی سمیع اللہ دہلوی کے بارے میں مولوی عبدالخالق قدوسی نے یوں تصریح کی ہے:

"آپ (مولوی مملوک العلی نانوتوی) کے تلامذہ میں سے مولوی سمیع اللہ (دہلوی)

---

[۱] محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۶

بڑی شہرت کے مالک اور گورنمنٹ کے معتمد علیہ آدمی تھے۔[1]

مولوی مملوک العلی صاحب کے دوسرے شاگرد مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے موصوف کی سوانح عمری لکھی اور ۱۹۰۹ء میں مطبع دار الاسلام حیدر آباد دکن سے شائع کروائی۔ اس کا ایک اقتباس پروفیسر محمد ایوب قادری نے نقل کر کے نہ صرف موصوف کی انگریز دوستی کا، بلکہ برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار ہونے کا راز یوں فاش کیا ہے:

"۱۴ دسمبر ۱۸۸۴ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے ساتھ استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹیکل مشن پر مصر گئے اور وہاں انھوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک (جو برطانوی استعمار کے خلاف تھی) کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلہ میں اُن کو سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا۔"[2]

۸۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

موصوف بھی دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد تھے برٹش گورنمنٹ نے ان کے کارناموں کے پیش نظر شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا تھا برٹش گورنمنٹ کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے ساری عمر قلم سے کام لیتے رہے اور مرنے سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ انگریزی عنایات سے خوب فیضیاب ہوتے۔ قرآن کریم کا ترجمہ بھی کیا، مقصد یہی تھا کہ کلامِ الٰہی کی تعلیمات کو اپنے مخصوص نظریات کے مطابق ثابت کر کے دکھائیں، جیسا کہ سر سید احمد خاں، مرزا حیرت دہلوی اور کئی دوسرے حضرات نے بھی اُس دور میں کیا۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ اور انگریزوں کا حکمران ہو کر ہندوستان کے باشندوں کو جبراً غلام بنا لینا موصوف کی نگاہ میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مہربانی تھی اور اِس انعامِ خداوندی کا شکریہ ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں:

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۹

[2] محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۰۴

"خدا کی بے انتہا مہربانی اِس کی مقتضی ہوئی کہ انگریز بادشاہ ہوئے" [1]

"ہم نے خدا کے فضل سے انگریزی عملداری میں آنکھ کھولی ہے، خدا اِس کو ابد الآباد تک سلامت رکھے" [2]

موصوف کو مسلمانوں کے حکمران رہنے سے بھی وُہ آرام نہیں پہنچ سکتا تھا جتنا انگریزوں نے پہنچایا۔ ڈپٹی صاحب کا یہ بیان اُن کے سوانح نگار نے اِن لفظوں میں نقل کیا ہے،

"شکر ہے کہ ہم رعایا بھی بنے تو ایسوں کی کہ جن کی عملداری میں ہم کو اپنی (مسلمانوں کی) سلطنت سے زیادہ آرام و آسائش ہے" [3]

۹۔ مولوی محمد احسن نانوتوی

مولوی محمد احسن نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء)، مولوی محمد مظہر نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی کے حقیقی بھائی تھے۔ یہ جملہ حضرات دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک علی کے شاگرد اور قریبی عزیز تھے۔ ۱۸۵۷ء میں موصوف بریلی کالج میں مدرس تھے۔ جنگِ آزادی کے وقت یوں اپنا رنگ دکھایا،

"۲۲ رمئی ۱۸۵۷ء کو نمازِ جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اِس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ قانون ہے۔ نواب بہادر خان کمشنر بریلی مسٹر الیگزینڈر کے بڑا مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کو پورا اعتقاد تھا۔ اِس سلسلہ میں ایک انگریز مورخ رقمطراز ہے" پچھلی صدی کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محافظ (حافظ رحمت خاں) کے پوتے خان بہادر نے کمشنر (بریلی) کی کوششوں کی پوری پوری تائید کی اور کالج (بریلی کالج) سے منسلک ایک مولوی (محمد احسن نانوتوی) نے

---

[1] افتخار عالم بلگرامی، حیاتِ نذیر، مطبوعہ قاسمی پریس دہلی، ص ۱۲۷،

[2] ایضاً، ص ۱۲۷

[3] ایضاً، ص ۱۲۷

مسجد میں تقریر کی اور اُس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ شرع ہے بلکہ موصوف نے انگریزوں کا حقِ نمک ادا کرتے ہوئے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو خلافِ شرع دیا تھا۔ اُن کی یہ تقریر گویا مسلمانانِ بریلی کی ایمانی غیرت اور جذبۂ حریت کے لیے ایک چیلنج تھی۔ اب سارے شہر میں ان کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور جان کا خطرہ محسوس پیدا ہو گیا۔ تو موصوف نے بریلی کو چھوڑنا گوارا کر لیا لیکن انگریز دوستی کو اپنے اکابر کی طرح چھوڑنا نامنظور ہوا۔ قارئینِ کرام درجِ ذیل اقتباس پر غور فرمائیں:

"اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگا دی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہو گئے۔ اگر کوتوالِ شہر شیخ بدر الدین کی فہمائش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو اُن کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔"[1]

۱۰ - مولوی عبد الاحد

موصوف کون تھے؟ اس کا جواب پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے۔

"مولانا محمد احسن (نانوتوی) کے دو بیویاں تھیں ۔۔۔۔ دوسری بیوی بنارس والی تھیں، ان کو والدۂ عبد الاحد کہتے تھے ۔۔۔۔۔۔ مولانا محمد احسن اپنی سوتیلی اولاد مولوی عبد الاحد اور زینب بی کی ضروریات کا بہت خیال رکھا کرتے تھے۔"[2]

اب موصوف کے لفظوں میں ہی مولوی عبد الاحد کا تفصیلی تعارف کروایا جاتا ہے۔

"مولوی صاحب مرحوم، مولانا محمد احسن نانوتوی کے ربیب تھے اور ۱۸۵۸ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبد الاحد کی تمام تر تعلیم و تربیت مولانا محمد احسن نے

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۵

[2] ایضاً، ص ۵۱

[3] ایضاً، ص ۱۱۸، ۱۱۹

سنے کی ۔ ۔ ۔ ۔ مولوی عبدالاحد چودہ سال کی عمر میں حفظِ قرآن کریم سے فارغ ہو گئے۔ مولانا محمد احسن سے درسِ نظامی کی تکمیل کی اور ۱۸۶۹ء میں بریلی کالج سے انٹرنس پاس کیا۔ ۔ ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ اسکول بدایوں میں تھرڈ ماسٹر مقرر ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۸۷۵ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا، اسی سال انبالہ میں " رسالہ نمبر ۱۰ بنگال " کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں ملازمت کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میرٹھ میں وکالت کرنے لگے۔

۱۸۸۶ء میں مولوی عبدالاحد نے منشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی سے مطبع مجتبائی دہلی پانچسو روپے میں خریدا کیونکہ منشی ممتاز علی حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے مولوی عبدالاحد مرحوم نے مطبع مجتبائی کو بہت ترقی دی اور دراصل یہی مطبع ان کی شہرت و نیک نامی اور دولت و امارت کا سبب بنا۔ پہلے یہ ایک معمولی سا مطبع تھا، مولوی صاحب مرحوم نے اس کو بہت ترقی دی اور جلد ہی یہ مطبع برِ صغیر پاک و ہند کے مشہور مطابع میں شمار ہونے لگا اور ایسا شہرت پذیر ہوا کہ آج تک اس کی ساکھ قائم ہے۔" ۱؎

موصوف نے مولوی بشیرالدین احمد (المتوفی ۱۹۲۷ء) کی تصنیف " واقعاتِ دارالحکومت دہلی" جلد دوم، مطبوعہ شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء کے صفحہ ۱۹۱ سے مولوی عبدالاحد کے بارے میں ایک اقتباس یوں نقل کیا ہے :

" دلی کے نہایت سربرآوردہ اشخاص میں آپ کا شمار ہے۔ قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ اسی سال (۱۸۹۱ء) میں آپ کو خان بہادر کا خطاب ملا ہے۔ دہلی میں ایسا کوئی قومی جلسہ یا اہم کام نہ ہوگا جس میں آپ سب سے آگے نہ ہوں۔ دل کھول کر قومی کاموں میں جان و مال سے شرکت کرتے ہیں۔ جامع مسجد، مسجد فتحپوری، عربک اسکول،

۱؎ محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۰، ۱۹۲

یتیم خانوں وغیرہ کے ممبر ہیں۔" [۱]

وقت کی اِسی دریادلی کے بارے میں یوسف بخاری کی کتاب "یہ دِلّی ہے" کے صفحہ ۱۹۴ سے جامع مسجد دہلی کے امام شمس العلماء سید احمد صاحب کا ایک بیان پروفیسر محمد ایوب قادری نے نقل کیا ہے جو موصوف نے ۳ ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ / ۱۹ ستمبر ۱۹۲۸ء کو دیا تھا۔ یہ بیان مختصراً ہدیۂ قارئین ہے:

"قوم کے کاموں اور تعلیمی اداروں میں اُنھوں نے بڑی فراخدلی سے چندے دیئے۔ علی گڑھ کالج، اینگلو عربک دہلی کالج اور انجمن مؤیدالاسلام کے بے حد دلدادہ تھے اور ہمیشہ ان کی مالی امداد کرتے رہے۔ حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج میں شاندار خدمات اِن سے انجام پائیں۔ حکیم صاحب اُن کا عمر بھر اعتراف کرتے رہے۔" [۲]

اِن مجموعی مشاغل کے ساتھ موصوف کا برٹش گورنمنٹ کے ساتھ کیا رویّہ تھا؟ انگریزی حکومت اور عام مسلمانوں نے آپ کو کس نظر سے دیکھا؟ اِن تینوں سوالوں کا جواب مندرجہ ذیل اقتباس میں تلاش کیجیے:

"پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴-۱۵ء میں مولوی عبدالاحد نے حکومتِ برطانیہ کی بے مثال خدمت انجام دی۔ اِنھوں نے وار فنڈ میں دِل کھول کر چندہ دیا اور تقریباً تین لاکھ روپیہ قرضہ جنگ میں دیا۔ اِنھوں نے سٹی ریکروٹنگ کمیٹی اور پبلسٹی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اِن خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ برطانیہ نے مولوی عبدالاحد مرحوم کو خلعت، سند اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو مولوی عبدالاحد کا انتقال ہُوا۔ اُس زمانے میں

---

[۱] محمد ایوب قادری پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۴۳، ۱۴۴

[۲] ایضاً، ص ۱۴۴، ۱۴۵

خلافت کی تحریک زوروں پر تھی ۔ حکام رس اور خطاب یافتہ حضرات کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے ۔ لہٰذا بعض لوگوں نے مولوی عبد الاحد مرحوم کی توفیق میں سخت رکاوٹیں ڈالیں ۔[۱]

۱۱۔ میاں نذیر حسین دہلوی

میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) موضع بلتھوا مضافات سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں بقول مصنفِ "الحیاۃ بعد المماۃ" ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ موضع بلتھوا سیدوں کی بستی تھی لیکن جس طرح مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی متحدہ ہندوستان کے شہرۂ آفاق علمی و روحانی خاندان یعنی خاندان عزیزی کو لے ڈوبے اور ایک بھی قابلِ ذکر فرد کا نشان باقی نہ رہا ۔ اسی طرح میاں صاحب کی بستی میں سیدوں کا ایک بھی گھر باقی نہ رہا بلکہ موصوف کے سوانح نگار کی تصریح کے مطابق وہاں صرف جولاہے آباد ہیں ۔ موصوف کا ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا ۔ شاہ اسحاق دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی، جس کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں :

"مولوی نذیر حسین ولد جواد علی سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے ۔ ۱۶ سال کے بعد علم کی طرف میلان ہوا ۔ ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء میں وطن سے پوشیدہ طور پر صادق پور پہنچے وہاں کچھ درسی کتابیں پڑھیں ۔ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۹ء میں دہلی میں پہنچے ۔ پنجابی کٹڑے کی مسجد اورنگ آبادی میں ٹھہرے ۔ مولوی عبد الخالق دہلوی ، اخوند شیر محمد قندھاری ، مولوی جلال الدین ہروی ، مولوی کرامت علی بنی اسرائیلی ، مولوی محمد بخش ، مولوی عبد القادر رامپوری (المتوفی ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء) تلمیذ مفتی شرف الدین رامپوری سے جملہ علوم حاصل کیے ۔ حدیث کی اجازت شاہ محمد اسحاق

---

[۱] محمد ایوب قادری پروفیسر : مولانا محمد احسن نانوتوی ، مطبوعہ کراچی ، ص ۱۶۵

دہلوی (مت ۱۲۶۲ھ/۴۶-۱۸۴۵ء) سے حاصل کی۔ نواب مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی، عبدالرحمن محدث پانی پتی کا بیان لکھتے ہیں کہ:۔ "جس روز شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت کرکے جہاز روانہ ہوئے تو اُس روز نذیر حسین اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اولیت کی ایک ایک حدیث پڑھی اور کُل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ شاہ صاحب نے ایک چھوٹے کاغذ پر یہی واقعہ لکھ دیا۔ اِس سے پہلے مدرسہ میں کبھی پڑھنے کو نہیں آتے تھے"[1]

سند حاصل کرنے کے اِس واقعے کو میاں صاحب کے سوانح نگار، مولوی فضل حسین بہاری نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور واقعے کو غلط ملط کرتے ہوتے اصلیت کا صرف اتنا اعتراف کیا ہے:

"مولانا محمد اسحاقؒ نے ۱۲۵۸ ہجری میں ہجرت کی اور اُسی سنہ میں بوقت رخصت میاں صاحب کو اُن سے سند و اجازت تحریری حاصل ہوئی۔"[2]

موصوف کی سند پر اکثر علماء معترض ہوا کرتے تھے کہ پتے ہلدی کی ذراسی گانٹھ ہے لیکن پنساری بنے بیٹھے ہیں۔ کہاں باقاعدہ سند و تدریس سے محروم اور کہاں شیخ الکل ہونے کا پروپیگنڈا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک واقعے کا تذکرہ میاں صاحب کے سوانح نگار نے یوں کیا ہے:

"ایک روز مولوی احمد علی صاحب مرحوم سہارن پوری کو میاں صاحب نے خفا کرکے فرمایا: میں چپڑاس نہیں دکھاتا ہوں۔ تم بیٹھو میں صحاح پڑھاتا ہوں۔ دیکھو روش محدثانہ رکھتا ہوں یا نہیں؟ اکثر ایسے موقع پر شوخیِ طبع سے سند کو چپڑاس کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔"[3]

---

[1] محمد ایوب قادری، تذکرہ رجال حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۳۰۳

[2] فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، مطبوعہ ضیا پریس کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۵۹

[3] ایضاً، ص ۴۸

میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت ایک انگریز عورت کی جان بچائی تھی ساڑھے تین مہینے اُسے اپنے مکان پر رکھنے کے بعد انگریزوں کے کیمپ میں پہنچا دیا تھا۔ خصوصاً اس واقعے کے بعد اُن کی نگاہوں میں برٹش گورنمنٹ اور حکومت کی نظر میں میاں صاحب کیا تھے ؟

پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایئے:

"۱۸۵۷ء میں ایک انگریز خاتون کو پناہ دی۔ ساڑھے تین مہینے تک رکھا، جس کے بدلے میں ایک ہزار تین سو روپیہ انعام اور خوشنودی سرکار کا سرٹیفکیٹ ملا جس زمانہ میں (۱۸۶۴-۶۵ء) وہابیوں (غیر مقلد وہابیوں) پر مقدمے چل رہے تھے میاں نذیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہ وہابیاں احتیاطاً ایک برس تک راولپنڈی کی جیل میں نظر بند رکھا گیا تھا مگر بقول مولفِ الحیوۃ بعد المماۃ وفادار گورنمنٹ ثابت ہوتے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا جب میاں نذیر حسین حج کو گئے تو کمشنر دہلی کا خط ساتھ لے گئے۔ گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔" [1]

خطاب ملنے کے واقعے کو موصوف کے سوانح نگار نے بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء مطابق ۲۱ محرم ۱۳۱۵ھ روز سہ شنبہ کو ملا۔ جن لوگوں کو شیخ کے دیکھنے اور کچھ دنوں بھی ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہے وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ عموماً خطاب پانے والے خطاب کے لیے جو کچھ کرتے ہیں آپ کی طبیعت میں بالفطرۃ اُس کا مادہ ہی نہ تھا۔ وہ تدیّن، زہد، تقویٰ اور درویشی میں جس طرح ثابت قدم اور مستقیم الحال تھے ویسے ہی ان امور کی جانب سے نہایت ہی لاابالی اور بے پروا تھے۔ معلوم ہوا کہ جس وقت کمشنر دہلی نے بحکم لیفٹننٹ گورنر پنجاب، گورنمنٹ کی طرف سے اس خطاب کی خبر آپ کو دی۔ اس سے ایک منٹ آگے میاں صاحب کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ

---

[1] محمد ایوب قادری: تکملہ تذکرہ علماء ہند اُردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۹۵

بات نہیں آئی تھی کہ میں اِس عام لقب سے ملقب ہوں گا اور جب لوگ خلعت و خطاب کے ساتھ میاں صاحب سے ملے اور آپ کو اس سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم غریب آدمی خلعت و خطاب لے کر کیا کریں گے؟ خلعت خطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیے۔ ہم کو دنیا لاحاصل ہے۔ بعد اس گفت و شنود کے آپ نے اسی قدر فرمایا "اچھا آپ حاکم ہو، جو چاہو کہو"۔ [1]

جب میاں نذیر حسین صاحب کے وفادارِ حکومت ثابت ہونے کی بات چل نکلی ہے تو کیوں نہ اِسی سلسلے میں موصوف کے سوانح نگار ہی سے پوچھا جائے؛ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ میاں صاحب بھی گورنمنٹ انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے۔ زمانۂ غدر ۱۸۵۷ء میں جب کہ دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریز پر جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے اس پر دستخط کیا نہ مہر۔ وہ خود فرماتے تھے کہ: میاں وہ ہلڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی۔ وہ بیچارہ بوڑھا بادشاہ کیا کرتا؟ حشرات الارض خانہ برانداز وں نے تمام دہلی کو خراب، ویران، تباہ اور برباد کر دیا۔ شرائط امارت و جہاد بالکل مفقود تھے۔ ہم نے تو اُس فتوے پر دستخط نہیں کیا، پھر کیا کرتے اور کیا کہتے؟ مفتی صدرالدین خاں صاحب چکر میں آگئے۔ بہادر شاہ کو بھی سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں ہے مگر وہ باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو رہے تھے، کرتے تو کیا کرتے؟" [2]

مولوی محمد اسمٰعیل نے جس داؤد ظاہری والے فتنے کا سنگِ بنیاد رکھا تھا، اُسی ترکِ تقلید کی میاں نذیر حسین دہلوی نے موصوف کے بعد کھل کر سرپرستی کی اور اس طرح غیر مقلدین کا ایک علیحدہ فرقہ سرِ عرش وجود میں آگیا۔ علمائے اسلام نے سمجھانے بجھانے اور ردّ و تردید کے

---

[1] فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، ص ۱۰۰، ۱۸۱

[2] ایضاً: ص ۱۲۵

…ب اپنا فریضہ ادا کیا لیکن موصوف پر کوئی اثر نہ ہوا اور حکومت کی سرپرستی میں بے مہار ہی
…نے بھاگتے رہے۔ ۱۳۰۰ھ میں میاں صاحب نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ جانے سے
موصوف نے اپنے خداوند نعمت، کمشنر دہلی سے چٹھی حاصل کی جو الحیات بعد الممات کے صفحہ ۱۳۹
…پنڈی میں درج ہے۔ وہاں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقتدر عالم ہیں، جنھوں نے نازک وقتوں میں اپنی وفاداری گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ ثابت کی ہے۔ وہ اپنے فرض زیارت کعبہ کے ادا کرنے کو مکہ جاتے ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جس کسی برٹش گورنمنٹ افسر کی وہ مدد چاہیں گے وہ ان کو مدد دے گا کیونکہ وہ کامل طور سے اس مدد کے مستحق ہیں۔

دستخط جے۔ ڈی۔ ٹریملٹ بنگال
سرول کمشنر دہلی و سپرنٹنڈنٹ
۱۰ر اگست ۱۸۸۳ء"[1]

…موصوف نے دوسری چٹھی اس انگریز افسر سے حاصل کی تھی، جس کی بیوی کو میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ساڑھے تین ماہ اپنے گھر میں رکھا اور اس کی جان بچائی تھی چنانچہ واقعہ نگار نے لکھا ہے:

"دوسری چٹھی مسٹر لیسنس نے بنام کونسل مقیم جدہ کے دی، جس میں آپ کی خیر خواہی زمانۂ غدر کا مفصل بیان تھا۔ اُنھوں نے یہ بھی جتا دیا تھا کہ ان کے مخالفین بھی بہت ہیں اور اُن میں سے بعض مکہ معظمہ میں یہاں سے بھاگ کر مقیم ہو گئے ہیں۔ مسٹر لیسنس نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ برٹش گورنمنٹ کانسل کا فرض ہے کہ ان کو ان کے مخالفین کے شر و فساد سے بچاتے۔ یہ چٹھی برٹش کانسل مقیم جدہ (مکتوب الیہ) نے اپنے پاس رکھ لی۔"[2]

---

[1] فضل حسین بہاری، مولوی، الحیات بعد الممات، ص ۱۴۰

[2] ایضاً، ص ۱۴۰، ۱۴۱

میاں صاحب سے ۱۸۶۸ء میں بازپرس ہوئی، تو حاکم محکمہ متعلقہ کے سامنے حسب ذیل بیان دیا:

"ہندوستان میں اس وقت انگریزی حکومت ہے۔ وہاں ہر مذہب والا آزادی کے ساتھ اپنے شعار مذہب کے ادا کرنے کا مجاز ہے۔ کوئی مسلمان مذہب سے روکا جاتا ہے نہ جماعت سے اور یہاں اسلامی سرزمین اور مسلمانوں کی حکومت میں ہم لوگ طواف کعبہ اور جمعہ وجماعت سے مجبور ہیں۔ اس کے بعد ہم یہ کہنے سے معذور سمجھے جائیں کہ انگریزی گورنمنٹ ہندوستان میں ہم مسلمانوں (وہابیوں) کے لیے خدا کی رحمت ہے۔"[1]

میاں صاحب اپنے غیر مقلد گروہ کے سرپرست اور شیخ الکل تھے۔ موصوف کے دست راست اور فعال کارکن مولوی محمد حسین بٹالوی تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے:

"مولوی محمد حسین بٹالوی کی پوری پالیسی میں شمس العلماء، شیخ الکل میاں نذیر حسین مددومعاون بلکہ سرپرست و سرخیل رہے اور صادق پور کے بجائے مرکز قیادت دہلی اور لاہور منتقل ہو گیا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ (بہار) آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس وجود میں آئی، جس کے سب سے فعال کارکن مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری تھے۔ اہلحدیث کانفرنس کی پالیسی بھی کم و بیش مولوی محمد حسین بٹالوی کے انداز پر رہی۔"[2]

ضروری ہوا کہ مولوی محمد حسین بٹالوی کا انداز معلوم کیا جا سکے تاکہ اس جماعت کے سرپرست میاں نذیر حسین دہلوی کا حکومت کے بارے میں اور بھی واضح نظریہ سامنے آجائے۔

۱؎ فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، ص ۱۹۱، ۱۹۲

۲؎ محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۰

۱۲۔ مولوی محمد حسین بٹالوی

مولوی محمد حسین بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) حقیقت میں اس جماعت کی پالیسی کے علمبردار ہیں جس کا سنگِ بنیاد مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے رکھا تھا۔ وہابیت کی اپنے روزِ اوّل سے ۱۹۲۰ء تک وہی پالیسی رہی جو مولوی محمد حسین بٹالوی نے اختیار کی۔ چنانچہ غیر مقلد حضرات کے سر گروہ، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"۱۸۸۵ء میں مولوی محمد حسین سرگروہ موحدین لاہور، بجواب و سوال و مسئلہ اور اس فتوے کے کہ آیا بمقابلہ گورنمنٹ ہند، مسلمانانِ ہند کو جہاد کرنا اور اپنی مذہبی تقلید میں ہتھیار اٹھانا چاہیے یا نہیں؟ یہ جواب دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ جہاد جنگِ مذہبی بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا بمقابلہ اُس حاکم کے کہ جس نے آزادی مذہبی دے رکھی ہے اور از روئے شریعتِ اسلام عموماً خلاف و ممنوع ہے اور وہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا کسی اُس بادشاہ کے کہ جس نے آزادیِ مذہب دی ہے، ہتھیار اُٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں، کل ایسے لوگ باغی ہیں اور مستحق سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔

پھر مولوی محمد حسین نے اپنے اس دعوٰی اور جواب کی تصدیق میں کل علماء ملک پنجاب و اطرافِ ہند کے پاس اپنے فتوٰی جوابی کو بھیج دیا اور اچھی طرح سے مشتہر کیا اور کل علماء ہند و ملک پنجاب سے اس بات کی تصدیق میں اقرار مُہری اور دستخطی کرا لیا کہ عموماً مسلمانانِ ہند کو ہتھیار اٹھانا اور جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کرنا خلاف مسئلہ سنت و ایمانِ موحدین ہے۔

اور نیز کل علمائے ملک پنجاب و ہند نے تائید قول مولوی محمد حسین کی، کی اور اپنے اپنے دستخط و مہر کر کے مولوی محمد حسین کو اس فتوٰی میں بہت سچا اور پکا کہا ہے اور سب نے اپنی اپنی رائے اسلامی و ایمانی سے اس فتوے کو قبول کیا ہے اور جانا اور مانا ہے کہ بمقابلہ گورنمنٹ ہند فرقہ موحدین کو ہتھیار اٹھانا"

خلاف اسلام و ایمان کے ہے۔

پھر مولوی محمد حسین نے اس بات کی استدعا کی تھی کہ وہ بیان ملکہ معظمہ کے نزدیک ایک عام ایلچی بذریعہ مسلمانان ہند کے بھیجا جائے اور وہ پہنچ اس فتوی کے جا کر اس ناسمجھ کو مطلع کر دے کہ جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کے ممنوع ہے اور نیز ان کو آگاہ کر دے کہ ان کی اس نافہمی کے تو خونریزی و قتال و جہاد پر سخت گناہ ثابت ہے اور سب کا گناہ ان کے سر پر وارد شرعی ہے اور چونکہ از روئے شریعت اسلام، برٹش گورنمنٹ ہند سے جہاد کرنا، خلاف طریقہ اسلام و شریعت حقہ کے ہے۔ اس لیے ان کو خیر خواہی گورنمنٹ ہند میں برابر مستعد رہنا چاہیے۔"[1]

مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے فتوے میں انگریز کے خلاف جہاد کرنے کو ایمان اور کے خلاف قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے نہ صرف موصوف کے نزدیک بلکہ مولوی محمد حسین اور میاں نذیر حسین دہلوی کی تصدیق و تائید کرنے والے علمائے اہلحدیث کے نزدیک باغی مستوجب سزا ہیں۔ برسبیل تذکرہ یہاں جناب غلام رسول مہر کی تحقیق پر ایمان لانے والوں کی خدمت میں ایک گزارش ہی پیش کر دی جاتی ہے۔ وہ گزارش یہ ہے کہ تمام غیر مقلدین علماء کے متفقہ فتوی کی روشنی میں سوچیے تو سہی! اگر آپ مہر صاحب کی پیروی میں سید احمد صاحب کی تحریک کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف بھی کرنا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے لیکن اس صورت میں جملہ وہابی علماء کے نزدیک وہ حضرات باغی اور مستحق سزا بنتے ہیں اور ان کا یہ اقدام اسلام اور ایمان کے خلاف قرار پاتا ہے۔ اگر اس فتوے کو ناقابل اعتبار سمجھا جاتا ہے تو ایسا کرنا ان حضرات کی ساری کوشش کو ناقابل اعتبار ٹھہرانے کے مترادف ہوگا۔

اب قارئین کرام، مہر صاحب کی تحقیق پر ایمان لا کر سید احمد صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف کرنے والے حضرات اور علمائے اہلحدیث، یہ سارے حضرات اس

---

[1] صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی، نواب، ترجمان وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۱۰

فیصلہ فرمالیں کہ :

۱۔ غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے جہاد کا رُخ حقیقتاً انگریزوں کی طرف تھا۔

۲۔ علمائے اہلحدیث فرماتے ہیں کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا اسلام اور ایمان کے خلاف ہے اور ایسا کرنے والا سزا کا حقدار اور باغی ہے۔

تینوں قسم کے حضرات خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ ان فریقین میں سے کون سا فریق قابلِ اعتبار نظر آتا ہے اور کون سا ناقابلِ اعتماد؟ ہماری اِس سلسلے میں عاجزانہ التماس بس اتنی سی ہے کہ جس فریق کو بھی ناقابلِ اعتبار ٹھہرایا جائے اُس سے از راہِ کرم ہمیں بھی مطلع کر دینا، تاکہ ہم اُن سے محتاط رہیں۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کے مذکورہ فتوے کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کی تحقیق یہ ہے :

"مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکارِ برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر ایک مستقل رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" ۱۲۹۲ھ میں لکھا۔ انگریزی اور عربی زبانوں میں اُس کے ترجمے ہوئے۔ یہ رسالہ سر چارلس ایچی سن اور سر جیمبل لل گورزانِ پنجاب کے نام معنون کیا گیا۔ مولوی محمد حسین نے اپنی جماعت کے علماء سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اشاعۃ السنہ کی جلد دوم شمارہ گیارہ میں بطور ضمیمہ شائع کیا، پھر مزید مشورہ اور تحقیق کے بعد ۱۳۰۲ھ میں باضابطہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔"[1]

موصوف کے مذکورہ فتوے کے متعلق جناب مسعود عالم ندوی کی رائے کچھ اِس طرح ہے :

"معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اِس کے معاوضے میں سرکارِ انگریزی سے انہیں جاگیر بھی ملی تھی۔ اِس رسالے کا پہلا حصہ پیشِ نظر ہے۔ پوری کتاب تحریف

[1] محمد ایوب قادری، مقدمہ حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵

تدلیس کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔[1]

مولوی محمد حسین بٹالوی اپنے اِس فتوے پر بے حد نازاں تھے اور اِس کے ذریعے وہ اپنی ذات کو اپنی جماعت کو برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہوں میں سب سے ممتاز دکھانے اور ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ موصوف کے رسالہ "اشاعۃ السنۃ" لاہور، جلد ۹ کے صفحہ ۲۴۱، ۲۴۲ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے اُن کا اسی فتوے کے سلسلے میں ایک بیان یُوں نقل کیا ہے:

"اگرچہ اِس مضمون (منسوخی جہاد) کے رسائل گورنمنٹ اور ملک کے خیر خواہوں نے بھی لکھے ہیں لیکن جو ایک خصوصیت اِس رسالے میں ہے وہ آج تک کسی تالیف میں پائی نہیں جاتی۔ وہ یہ ہے کہ یہ رسالہ صرف مؤلف کا خیال نہیں رہا، اِس گروہ کے عوام و خواص نے ۔۔۔۔ اِس کو پسند کیا اور اِس سے اپنے آراء کا توافق ظاہر کیا۔ اِس توافقِ رائے کو حاصل کرنے کے لیے مؤلف (محمد حسین بٹالوی) نے عظیم آباد پٹنہ تک ایک سفر کیا تھا، جس میں لوگوں کو یہ رسالہ سُنا کر اتفاق حاصل کیا اور جہاں خود نہیں پہنچا وہاں اِس رسالے کی متعدد کاپیاں ارسال کر کے توافق حاصل کیا۔"[2]

یُوں تو کتنے ہی علماء برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار بن کر خفیہ یا اعلانیہ حمایت کا دم بھرتے اور انگریزوں کے تخریبی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی پوری پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے تھے لیکن انگریز کی علی الاعلان، ڈنکے کی چوٹ موافقت کرنے، جہاد کو منسوخ قرار دینے، انگریز کے مخالفوں سے ٹکر لینے میں مولوی محمد حسین بٹالوی، مرزا غلام احمد قادیانی اور سر سید احمد خاں علی گڑھی سب سے ممتاز ہیں۔ یہ تینوں حضرات آپس میں تو ایک دُوسرے کے خلاف ہیں لیکن کسی بھی چوتھی ہستی کو، اِس میدان میں، اِن حضرات کا مدِ مقابل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ثبوت کے طور پر موصوف کا ایک بیان ملاحظہ ہو، جسے پروفیسر محمد ایوب قادری نے "اشاعۃ السنۃ" لاہور

---

[1] مسعود عالم ندوی؛ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی، ۱۳۹۸ھ، ص ۲۹

[2] محمد ایوب قادری؛ مقدمہ حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵

جلد ۸ شمارہ ۹ کے صفحہ ۲۳۹ سے نقل کیا ہے :

"اِس گروہ اہلحدیث کے خیرخواہ و وفادار رعایا برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی روشن اور قوی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ حمایت رہنے کو اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں اور اِس امر کو اپنے قومی وکیل اشاعۃ السنہ کے ذریعہ سے جس کے نمبر ۱۰ ، جلد ۶ میں اِس امر کا بیان ہُوا ہے (اور وُہ نمبر ہر ایک لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے) گورنمنٹ پر بخوبی ظاہر اور مدلل کر چکے ہیں ، جو آج تک کسی اسلامی فرقہ رعایا گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا اور نہ آئندہ کسی سے اِس کے ظاہر ہونے کی اُمید ہوسکتی ہے ۔"[1]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت (غیر مقلد وہابی) اپنے روزِ اوّل ہی سے برٹش گورنمنٹ کی خیرخواہ اور وفادار تھی لیکن انگریزوں کے پنجاب پر قابض ہو جانے کے بعد سید صاحب کے بعض کاروباری قسم کے مجاہد خلفاء کا انگریزوں سے ٹکراؤ ہُوا ، اُن کی تحریک کو مٹایا گیا ، مقدمے چلے ، سزائیں ہوئیں - ان حالات میں حکومت سے ناراضگی قدرتی امر تھا لیکن ایک طرف گورنمنٹ کا آہنی پنجہ تھا تو دُوسری طرف مولوی محمد حسین بٹالوی کی پھانس - نتیجہ یہ نکلا کہ پُوری جماعت برٹش گورنمنٹ کی وفادار و خیرخواہ بن کر اُس کے استحکام و قیام کو اپنے لیے نعمتِ غیر مترقبہ گرداننے لگے - اِس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی یُوں نغمہ سنج ہیں :

"گورنمنٹ خود جانتی ہے کہ اس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہل حدیث نے کس قدر تسلیم کیا ہے اور اُس کے کیسے فرمانبردار ، مطیع اس گروہ کے لوگ ہیں - ان پر کیا ، ہندوستان کے کل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی ان کارروائیوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف سمجھی جاتی ہیں ۔"[2]

---

[1] محمد ایوب قادری : مقدمہ حیات سید احمد شہید ، مطبوعہ کراچی ، ص ۲۷

[2] حیرت دہلوی مرزا : حیات طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ۱۹۸۲ء ، ص ۲۲۷

مولوی محمد حسین بٹالوی نے ملکہ وکٹوریہ کے جشن جوبلی پر برٹش گورنمنٹ کی بارگاہ میں اپنا ہدیۂ عقیدت نچھاور کرنے کی غرض سے جو ایڈریس پیش کیا تھا اس کا ایک اقتباس "اشاعۃ السنۃ" لاہور، جلد ۹، شمارہ ۷، کے صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں نقل کیا ہے:

"یہ مذہبی آزادی اس گروہ کو خاص کر اس سلطنت میں حاصل ہے بخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے کہ ان کو اور اسلامی سلطنتوں میں بھی یہ آزادی حاصل ہے۔ اس خصوصیت سے یقین ہو سکتا ہے کہ اس گروہ کو اس سلطنت کے قیام و استحکام سے زیادہ مسرت ہے اور ان کے دل سے مبارک باد کی صدائیں زیادہ زور کے ساتھ نعرہ زن ہیں۔"[۱]

اسی سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے:

"اسی طرح لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی سبکدوشی پر جماعت اہل حدیث نے ایک خوشامدانہ ایڈریس دیا، جس پر سب سے پہلے شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط ہیں۔ اس کے بعد ابو سعید محمد حسین وکیل اہل حدیث، مولوی احمد اللہ واعظ میونسپل کمشنر امرتسر، مولوی قطب الدین پیشوائے اہل حدیث روپڑ، مولوی حافظ عبد اللہ غازی پوری، مولوی محمد سعید بنارسی، مولوی محمد ابراہیم آرہ اور مولوی نظام الدین پیشوائے اہلحدیث مدراس کے دستخط ہیں۔"[۲]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد صاحب نے اپنی اس نوزائیدہ جماعت کا نام "محمدی گروہ" رکھا تھا۔ خلفاء کا دور آیا تو اپنے لیے "موحدین" اور مسلمانوں کو مشرکین بتانے لگے لیکن محمد بن عبد الوہاب کے نقش قدم پر چلنے کی بنا پر متحدہ ہندوستان کے مسلمان بھی انھیں اہل عرب کی طرح "وہابی" ہی کہا کرتے تھے۔ جب مقدمۂ انبالہ کے تحت انگریزوں نے اپنے خانہ زادوں کی گوشمالی شروع کی، جو اب انگریزوں کو بھی آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ اس پکڑ دھکڑ سے وہابی

۱۔ محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷

۲۔ ایضاً: ص ۲۷

حضرات گھبرا اُٹھے۔ اِس موقع پر مولوی محمد حسین بٹالوی کام آئے۔ ایک طرف اُنھوں نے حکومت کے غصے کی آگ اپنی خوشامدانہ روش اور کاسہ لیسی کے پانی سے سرسید احمد خاں کی طرح بجھانی شروع کی اور دُوسری طرف اپنی پُوری جماعت کو حکومت کا وفادار بنا دیا۔ اِس جماعت کے ماتھے پر جو مسلمانوں نے وہابیت کی چٹ لگا رکھی تھی، اُسے اہلِ حدیث حضرات کے وکیل مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے سرپرستوں کے ذریعے قانونی طور پر ہٹانے کی کوشش کی اور اپنی جماعت کا نام جس طرح منکرینِ حدیث نے "اہلِ قرآن" تجویز کیا ہے، اِسی طرح اِن منکرینِ فقہ و تقلیدِ ائمہ نے اپنی جماعت کو "اہلِ حدیث" کا نام دیا۔ مثلاً،

> "اِنھوں نے ارکانِ جماعتِ اہلِ حدیث کی ایک دستخطی درخواست لیفٹننٹ گورنر پنجاب کے ذریعے وائسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کی، اُس درخواست پر سرِ فہرست شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وُہ درخواست اپنی تائیدی تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف اِنڈیا کو بھیج دی۔ وہاں سے حسبِ ضابطہ منظوری آگئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے "اہلِ حدیث" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے اِس کی باقاعدہ اطلاع مولوی محمد حسین کو دی۔ اِسی طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۵ راگست ۱۸۸۶ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲۷، گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴ مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۵، اور گورنمنٹ یو۔پی کی طرف سے ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶، گورنمنٹ سی۔پی کی طرف ۱۴ رجولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰۷، اور گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۱۴ راگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۷۳۲، اِس امر کی اطلاع مولوی محمد حسین بٹالوی کو ملی۔" [1]

موصوف کے مذکورہ بالا بیان کا ماخذ رسالہ "اشاعۃ السنۃ" لاہور ہے۔ اِس کی تائید میں سیرتِ ثنائی مطبوعہ گوجرانوالہ ۱۹۵۲ء کے صفحہ ۳۷۲ سے مولوی عبدالمجید خادم سوہدری کا ایک بیان یُوں نقل کیا ہے:

---

[1] محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۴۶

"(مولوی محمد حسین بٹالوی) نے اشاعۃ السنہ کے ذریعہ اہلِ حدیث کی بہت خدمت
کی۔ لفظ "وہابی" آپ ہی کی کوشش سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ
ہوا اور جماعت کو اہلِ حدیث کے نام سے موسوم کیا گیا۔۔۔۔ (آپ نے)
حکومت کی خدمت بھی کی اور انعام میں جاگیر پائی۔"[1]

۱۳۔ مولوی نواب صدیق حسن خاں قنوجی

آپ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ/ ۱۴ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو اپنی ننھیال بانس بریلی میں
پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی والدہ محترمہ قنوج چلی گئیں جو موصوف کا آبائی وطن تھا۔ درسی
علوم مفتی صدر الدین دہلوی سے حاصل کیے، تفسیر و حدیث وغیرہ علوم قاضی حسین انصاری،
شیخ عبدالحق ہندی اور مولوی محمد یعقوب دہلوی سے حاصل کیے۔ پہلے بھوپال میں ملازمت کی
بعدہٗ ۱۲۸۸ھ/ ۲-۱۸۷۱ء میں رئیسۂ بھوپال کی شوہری و نیابت کا شرف بھی مل گیا۔ نوابی
اور خانِ بہادری کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ میاں نذیر حسین دہلوی اور مولوی محمد حسین
بٹالوی کے ہم مسلک و ہم مشرب تھے۔ تصنیف و تالیف کے ذریعے اور شانِ نوابیت کے بل بوتے
پر اپنی جماعت کی جڑیں مضبوط کرتے رہے۔ انگریز دوستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ دار رہے۔ ۱۸۵۷ء
کی جنگِ آزادی کو نواب صاحب شرعی نقطۂ نظر سے کیا درجہ دیتے تھے، خود موصوف کے لفظوں
میں ہی ملاحظہ فرمایئے:

"چنانچہ غدر (یعنی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) میں جو چند لوگ نادان عوام الناس،
فتنہ و فساد پر آمادہ ہو کر جہاد کا جھوٹ موٹ نام لینے لگے اور عورتوں اور بچوں کو
ظلم و تعدی سے مارنے لگے اور لوٹ مار پر ہاتھ دراز کیا اور جو اہلِ رعایا بلاد پر تھا
پر غصباً قابض و متصرف ہوئے انھوں نے خطائے فاحش کی اور قصور تمھی ہوا
اس لیے کہ قرآن و حدیث کے موافق کہیں شرطیں جہاد کی موجود نہ تھیں۔ سوائے

---

[1] محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۶

سودائے خام اور خیالی پلاؤ حکومت رانی اور ملک ستانی کے اُن کے دلوں میں اور
سروں میں سمائے ہوئے تھے۔ ہم نہیں جانتے کہ اُن میں سے کسی جماعت اور
لشکر میں خلوصِ نیت اور پاکی طینت اور انصاف واجبی اور تعمیل مذہب
اسلام ہو۔" [1]

موصوف کی نظر میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سراسر ایک فتنہ و فساد تھا۔ چنانچہ تصریح کرتے ہیں کہ:

"آج کل عام مسلمان جن کو علم و فہم سے بہرہ نہیں بلکہ اکثر اربابِ دُول و حکومت جنہیں
اسلام کی خوبیوں سے اور ایمان کی باتوں سے بالکل واقفیت نہیں، جس کو
جہاد سمجھ رہے ہیں، وہ حقیقت میں فتنہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔" [2]

اسی سلسلے میں موصوف یوں اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہیں:

"جس کا جی چاہا اور اُس کو وسوسۂ سرداری نے گھیرا، وہی سرکار سے باغی
ہو کر لڑنے کو کھڑا ہو گیا اور اس لڑائی کو جہاد ٹھہرا دیا، حالانکہ وہ جہاد نہ تھا،
سراسر فتنہ تھا۔" [3]

اسی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بارے میں موصوف نے یوں فتویٰ فیصلہ صادر فرمایا ہے:

"بغاوت جو ہندوستان میں بزمانۂ غدر ہوئی، اُس کا نام جہاد رکھنا اُن لوگوں کا
کام ہے جو اصل دینِ اسلام سے آگاہ نہیں اور ملک میں فساد ڈالنا اور امن اٹھانا
چاہتے ہیں۔" [4]

جن مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا، جو انگریز کی غلامی کا جُوا اپنے کندھوں
سے اُتار کر پھینک دینا چاہتے تھے اور جو اپنے ملک کو غاصب انگریزوں کے پنجے سے چھڑا کر
آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے تھے، وہ تھے کون؟ اس سوال کا جواب نواب صدیق حسن خان

---

[1] صدیق حسن خان قنوجی، نواب: ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۲۱
[2] ایضاً، ص ۲۸
[3] ایضاً، ص ۳۰
[4] ایضاً، ص ۱۰۷

صاحب نے یوں دیا ہے :

"جتنے لوگوں نے غدر میں شر و فساد کیا اور حکامِ انگلشیہ سے برسرِ عناد ہوئے وہ سب کے سب مقلدانِ مذہبِ حنفی تھے ، نہ متبعانِ حدیث نبوی ۔ مگر مکر اور زور کی راہ سے فتنہ پردازی کی تہمت دوسروں پر باندھ دی اور اہلِ غدر کو وہابی ٹھہرا دیا۔" [1]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے مسلمانوں کا نواب صاحب کی نظر میں جرم کیا تھا ؟ کیا اُن پر کوئی دفعہ عائد ہوتی تھی ؟ اِس سلسلے میں شریعتِ محمدی کے ٹھیکیدار بننے والے نواب صاحب کا فیصلہ ملاحظہ ہو :

"وہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا کسی اُس بادشاہ کے کہ جس نے آزادگی مذہب دی ہے ہتھیار اُٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں ، کُل ایسے لوگ باغی ہیں اور مستحق سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔" [2]

اب آخر میں ملاحظہ ہو کہ غیر مقلدانِ ہند کی نظر میں انگریز جیسی عیار ، ظالم اور اسلام دشمن قوم کیسی تھی پچھلے باب کے اندر جس کے عیارانہ قبضے ، ظالمانہ رویئے اور اسلام دشمن منصوبے کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے اُس کی روشنی میں نواب صاحب کی قصیدہ خوانی ہو سکتا ہے نمک حلالی کا ثبوت لیکن مسلمانوں کی ایمانی غیرت کے لیے چیلنج ہے۔

"غرض اِن (قاضی شوکانی) کی گواہی سے بخوبی معلوم ہُوا کہ درستی ملک اور صفائیِ راہ اور رفاہِ عوام اور امنِ خلائق اور امانِ مخلوق اور راحت رسانیِ رعیت اور آرام دہی بریت میں حکامِ فرنگ کا مثل اور نظیر اِس وقت میں بلکہ اکثر اوقات میں ہرگز نہیں ۔ اگرچہ ہر وقت کے مُلا اور مفتی خوشامد کی راہ سے باتیں بناتے ہیں اور ہر کسی کو اچھا بتاتے ہیں مگر میری نظر میں جو راجح اور صحیح

---

[1] صدیق حسن خان قنوجی ، نواب : ترجمان وہابیہ ، مطبوعہ امرتسر ، ص ۴۰

[2] ایضاً : ص ۱۲۰

معلوم ہوا، وُہ لکھ دیا۔ قبول و ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے۔"[1]

گرچہ ہے دلکشا بہت حُسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند بال، دانہ و دام سے گزر

۱۴۔ سرسیّد احمد خاں

سرسیّد احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کی لیکن بے توجہی سے اور بہت کم۔ ابتدائی زندگی رنگارنگ قسم کی ہے۔ حالی پانی پتی نے اُس کی یوں تصویر کشی کی ہے:

"سرسیّد کا عنفوانِ شباب نہایت زندہ دلی اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔ وُہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دِلّی میں بسنت کے میلے جو موسمِ بہار کے آغاز میں درگاہوں میں ہوتے تھے، وہاں جاتے تھے۔ خود اُن کے نانا فرید کی قبر پر چونسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا اُس میں وُہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے۔"[2]

سرسیّد احمد خاں اپنی سوانح حیات خود یُوں بیان کرتے تھے:

"اوّل اوّل تو جب کبھی سرسیّد کے سامنے اور اُن کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا، تو وُہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ "میری لائف میں بجز اِس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اُڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا

---

[1] صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی: ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۴۴
[2] الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص ۱۰۴

ہی کیا ہے"۔[1]

مولوی عبدالحق حقانی دہلوی نے سر سید احمد خاں کا تعارف یوں کرایا ہے:

"اِس گنبد میں ایک شخص سید احمد خاں صاحب بہادر بھی پیدا ہوئے۔ یہ شخص ابتدا میں مولوی مخصوص اللہ صاحب نبیرۂ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمت میں آ کر کسی قدر صرف و نحو سے آشنا ہوتے اور تعویذ گنڈے بھی سیکھے لیکن جب یہ نسخہ نہ چلا تو گورنمنٹ برٹش کی طرف رجوع کیا اور اپنی لیاقتِ خداداد سے کوئی اچھا عہدہ بھی پایا، پھر تو پکے وہابی تبیع مولوی اسمٰعیل صاحب ہو گئے ..... اِس عرصہ میں غدر ہو گیا اور سید صاحب اپنی خیر خواہی اور حکام رسی سے بڑی ترقی کر گئے اور اپنی خوش بیانی اور عالی دماغی سے انگریزوں میں بڑے فاضل یا فلاسفر یا مدار مانے گئے اور سی۔ ایس۔ آئی کا لقب حاصل کیا اور کچھ عجب نہیں کہ گورنمنٹ برٹش ۱۸۵۷ء کے فساد سے پُر حذر ہو اور سید صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کو نہ صرف اطمینان دلایا بلکہ خیالات مذہبیہ کے گرانے کا بھی بیڑہ اٹھایا ہو"۔[2]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سر سید احمد خاں صاحب نے اپنی قوم کے خلاف اور اپنے ملکی مفادات کے خلاف دل کھول کر انگریزوں کی مدد کی۔ موصوف کے اس کارنامے کو انگریزوں نے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اُنھیں خوب مالا مال کیا۔ سر سید احمد خاں صاحب کی ان کارگزاریوں کے لیے دفتر چاہییں۔ تفصیلی حالات کے لیے اُن کی تصنیف "تاریخ سرکشی بجنور" بھی کافی ہے یہاں محض ایک جھلک دکھانے کی غرض سے اُن کے سوانح نگار یعنی خواجہ الطاف حسین حالی کا ایک بیان ہدیۂ ناظرین ہے:

"جو شخص سر سید کی طبیعت اور جبلت سے واقف ہوگا، وہ اِس بات کو

---

[1] الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص ۱۰۷

[2] عبدالحق حقانی، مولوی، تفسیر حقانی، جلد اوّل، ص ۱۱۲

بآسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانہ میں گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری اُن سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اس نازک وقت میں اِن سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا۔ مگر گورنمنٹ نے خود ان کی خدمات کی قدر کی اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپے کا اور دو سو روپے ماہوار کی پولٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔"[1]

موصوف کی نظر میں برٹش گورنمنٹ کیا اور کیسی تھی ؛ خواجہ الطاف حسین حالی نے اُن کا ایک بیان یوں نقل کیا ہے :

"الٰہی تیرا بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سَو برس تک تُو نے اپنے اِن بندوں کو، جن کو تُو نے خطۂ ہندوستان میں جگہ دی ہے۔ اِسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں میں جو بسبب نہ ہونے اِن حاکموں کے ہماری شامتِ اعمال ہمارے پیش آئی، اب تُو نے اُس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم ہم پر مسلّط کیے۔ تیرے اِس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں، تُو اپنے فضل سے اِس کو قبول کر۔"[2]

سید احمد خاں آخر برٹش گورنمنٹ کے اِتنے خیر خواہ کیوں بنے تھے ؟ اِس کی وجہ خود موصوف کی زبانی سُنیے :

"اُنھوں (سر سید احمد) نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا کہ میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور اُن کی ہوا خواہی کی نظر سے

---

[1] الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید، ص ۱۳۰

[2] ایضاً : ص ۱۸۱

نہیں چاہتا بلکہ صرف اِس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اِس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ (مسلمان) اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔" [1]

موصوف کے نزدیک انگریز مسلمانوں کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے، اِس خوش فہمی میں وہ خود بھی مبتلا ہونے پر مجبور تھے اور پوری قوم کو بھی اِس خوش فہمی کا شکار کرنا چاہتے تھے۔ اِس دعوے کی دلیل سر سید کے پاس وہ چند قوم فروش بلکہ دین فروش تھے جنہیں حکومت نے فکرِ دنیا سے آزاد کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کو موصوف جس قسم کی تلقین کیا کرتے تھے وہ خود سر سید احمد خاں صاحب کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

"ہم (سر سید احمد خاں) جو یہ کہتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے، اِس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدر دان گورنمنٹ نے خیر خواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت و آبرو کی، انعام و اکرام اور پنشن جاگیر سے نہال کر دیا ہے۔ ترقیِ عہدہ اور افزونیِ مراتب سے سرفراز کیا ہے۔ پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور اپنی گورنمنٹ کے شکر گزار اور ثناخواں رہیں۔" [2]

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے، لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

کاسہ لیسی کا اوّلین ریکارڈ دیکھنا ہو تو انگلش گورنمنٹ کی قصیدہ خوانی سر سید احمد خاں کی زبانی سنیے اور مسٹر غلام احمد پرویز کو بھی سنائیے کیونکہ موصوف کی نظروں میں پاکستان کا حقیقی بانی سر سید تھا۔ انگریز کی چمچہ گیری پر مسلمانوں کو مجبور کرنے والا، مسلمانوں کا دینی وجود ختم کر کے انہیں زبانی مسلمان اور انگریزوں کا سائیس، کلرک اور دربان بنا رہا تھا یا پاکستان

۱؎ الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید ، ص ۶۸۳

۲؎ ایضاً ، ص ۱۵۷

خیرا ب منطقی تعصیدہ ملاحظہ ہو :

"اُن (سرسید) کی نہایت پختہ رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گوکہ اس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وُہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ اُنھوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکر و فریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اصلی معنوں میں ضرورت تھی، سو اسی ضرورت نے ہندوستان کو اُن کا محکوم بنا دیا۔"[1]

کشتیِ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

میں حیران ہوں کہ برٹش گورنمنٹ کی چاپلوسی اور ملت فروشی میں سرسید احمد خاں کو اوّل نمبر قرار دوں یا مولوی محمد حسین بٹالوی کو؟ لیکن میں فیصلہ کرنے والا کون؟ اس امر کا فیصلہ تو خود قارئینِ کرام نے کرنا ہے۔ اس سلسلے میں کیوں نہ موصوف کا ایک "سستی" فتویٰ بھی پیش کر دیا جائے :

"مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور مستامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں۔ وُہ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں، نہ بغاوت، نہ کسی قسم کا فساد۔"[2]

چونکہ متحدہ ہندوستان میں وہابیت کو نجد سے درآمد کرنا، خود انگریزی حکومت کا کارنامہ تھا اور وہی اس کی سرپرست تھی۔ سرسید احمد خاں صاحب اِس نوازش کا شکریہ یوں ادا کرتے ہیں :

---

[1] الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید، ص ۲۸۲

[2] ایضاً : ص ۲۲۳

"وہابی جس آزادیٔ مذہب سے انگلش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں رہتے ہیں دوسری جگہ ان کو میسر نہیں ہے۔ ہندوستان ان وہابیوں کے لیے دار الامن ہے۔" [1]

اسی سلسلے میں موصوف کا اس سے بھی واضح ایک بیان اور ملاحظہ فرمایا جائے:

"انگلش گورنمنٹ ہندوستان میں خود اس فرقہ کے لیے جو وہابی کہلاتا ہے، ایک رحمت ہے (جو ۱۸۵۷ء میں وہابیوں کو روتا ہوا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ناقل) جس طرح ہندوستان میں کل مذہب کے لوگوں کو کامل آزادی ہے، جو سلطنتیں اسلامی کہلاتی ہیں، اُن میں بھی وہابیوں کو ایسی آزادیٔ مذہب ملنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ سلطان کی عملداری میں وہابی کا رہنا مشکل ہے۔" [2]

کیوں صاحبو! اگر وہ طبق روشن ہوئے یا نہیں؟ مسلمان بادشاہ کی حکومت میں آخر وہابی کا رہنا مشکل کیوں ہے اور یہ حضرات انگریزی عملداری کو اپنے لیے رحمت اور دار الامن سمجھنے اور لکھنے پر کیوں مجبور ہیں؟ کہیں یہ سب کچھ برٹش گورنمنٹ ہی کے دم قدم کی بہار تو نہیں ہے؟ اس کے باوجود اسلام کے ٹھیکیدار بننا، اپنے لیے موحد ہونے کا دعویٰ کرنا اور سچے مسلمانوں کو مشرک، بدعتی اور بریلوی فرقہ گننا، یہ کیا ستم ہے؟

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زُہد کی
میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

موصوف نے وہابیانِ ہند کا برٹش گورنمنٹ کے متعلق نظریہ اور اُن کی انگریز دوستی کو واضح لفظوں میں بیان کرتے ہوئے اس امر کی کوشش کی ہے کہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لینے کی وہابیوں پر جو تہمت لگائی گئی ہے وہ نری الزام تراشی ہے۔ موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

---

[1] محمد اسمٰعیل پانی پتی، مقالاتِ سرسید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۲

[2] ایضاً، ص ۲۱۲

"وہابی وُہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو اور اُس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو۔ اُس کو یہ کہنا کہ در پردہ تخریب سلطنت کی فکر میں چپکے چپکے منصوبہ باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے، محض تہمت ہے اور ہم اِس وقت بہت سے ایسے آدمی نشان دے سکتے ہیں، جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ اُن سے زیادہ سرکار کا خیرخواہ اور معتمد کوئی نہیں، بایں ہمہ وُہ اپنے تئیں علی الاعلان اور بے تامل فخریہ طور پر وہابی کہتے ہیں۔ سرکار نے بے سوچے سمجھے اُن کو معتمد نہیں گردانا۔ بلکہ غدر کے زمانے میں جبکہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی، اُن کی وفاداری کا سونا اچھی طرح تایا گیا اور وُہ خیرخواہی سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر وُہ جہاد کا وعظ کہتے ہوتے اور بغاوت وہابیت کی اصل ہوتی تو جو کچھ اُن سے ظہور میں آیا، یہ کیونکر ظہور میں آتا؟"[۱]

شاید اکبر الٰہ آبادی نے اسی روش کو دیکھ کر یہ شعر رقم کیا تھا:

شاتے ہیں جو وُہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو اُن پر ہے، جو اِس مٹنے پہ مرتے ہیں

سرسید احمد خاں صاحب پر حکومت کو بڑا اعتماد تھا، بڑے سے بڑا انگریز اُنھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا، کسی وقت بھی اُن کی جعفر بنگال اور صادق دکن سے کم عزت نہیں کی جاتی تھی۔ سرسید کی کامیابی اور اثر و رسوخ کو کس طرح حاصل کیا گیا تھا؟ موصوف کے سوانح نگار خواجہ الطاف حسین حالی کی زبانی سنیئے:

"لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا، تو بھی اصل سبب اُن کی راست بازی اور سچائی ٹھیرے گی، کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک نیٹو (NATIVE) کا اِس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا جب تک اُس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر

---

[۱] الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۲۴۳

تا یاد گیا ہو، ہرگز ممکن نہیں۔"[1]

سرسید احمد خاں صاحب لندن گئے۔ کس کس سے ملے اور کون کون سی ہستیاں اُن سے آکر ملیں، ملاحظہ فرمائیے:

"الغرض سرسید بمبئی سے چوبیس دن میں لندن پہنچے اور میکلن برگ اسکوائر میں ایک مکان کرایہ پہ لے کر ٹھہرے اور اپنے دوستوں اور آشناؤں سے ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی، مروت اور خلق سے اُن کے ساتھ پیش آئے۔ وُہ ہندوستان میں سرسید اور اُن کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور اُن کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وُہ (لارڈ لارنس) اکثر اُن (سرسید) کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ اُن سے ملنے کو آتے تھے۔ انھوں نے ہی سرسید کو لندن کے اکثر امراء و مشاہیر سے ملوایا تھا۔ لارڈ اسٹینلی آف ایلڈرلی جو قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے وُہ بھی جب لندن میں آتے تھے تو سرسید سے ملتے رہتے تھے۔ سر جان ولیم کے انڈر سیکرٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سرسید کو خصوصیت ہو گئی تھی بلکہ معظم کے سوا ڈیوک آف آرگائل جو اُس وقت وزیر ہند تھے اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے پیٹرن بھی تھے، وُہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپاک سے ملتے رہتے اور اپنے بیٹے مارکوئس آف لارن سے بھی، جو ملکہ معظمہ کے داماد ہیں، اُن کو ملایا۔"[2]

اسی دورۂ لندن کے مزید حالات و کمالات ملاحظہ ہوں:

"سرسید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز اُن کاموں میں، جن کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا، مصروف رہے۔ ہاں ہم اُن کو اکثر خاص خاص تقریبوں میں بلایا جاتا تھا اور اُن کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ ۲۲ جون ۱۸۶۹ء کو

---

[1] الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ص ۲۶۳ [2] ایضاً، ص ۲۰۲

۱۵ جولائی کو لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈنر پر بلائے گئے اور ۲۰ جولائی کو سمتھ فیلڈ میں
اسسائٹی آف سِول انجینئرس کے ایک عظیم الشان جلسے میں اور اس کے بعد
اسی کے متعلق گرینچ میں ڈنر ہوا ، اُس میں شریک ہوئے۔

اس جلسے کی کیفیت ڈیلی نیوز (DAILY NEWS) مورخہ ۲۱ جولائی میں
مفصل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر پن نے جو سوسائٹی مذکور کے پریسیڈنٹ
تھے سرسید کو اس جلسے میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ
ویسٹ منسٹر پیئر پر میرے اسٹیمر میں، جو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے موجود ہوگا، آئیں
مگر خود لارڈ لارنس سرسید کے مکان پر آئے اور اُن کو اپنے ساتھ سوار کرا کے
لے گئے۔ سید حامد اور سید محمود بھی ساتھ تھے۔ اسٹیمر میں جاکر حاضری کھائی اور
اسٹیمر کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے، پھر خاص اجازت سے
ایک جنگی جہاز اور اس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے
گرینچ میں جاکر ڈنر کھایا۔ اس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور
بڑے بڑے انجینئر شریک ہوئے۔ کھانے میں طرفہ بات کہ ڈنر مذکور کی مینیو میں
مندرج ہے، یہ تھی کہ تمیں طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی
جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے (وہ دریائی جانور حلال ہیں یا حرام ؟) خشکی
کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہ تھی۔ تمام انجینئروں نے جو اس جلسے میں شریک
تھے، کھانے کے بعد اسپیچیں دیں، اور سال گزشتہ کی مختلف ترقیات کا جو
انجینئرنگ میں ہوئیں ذکر کیا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے اسپیچ دی اور آخر
میں لارڈ لارنس اور سرسید کا ذکر کر کے اُن کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا۔[۱]

گردن رفتار مرگ کی ہر اک سمت تن گئی
بگڑی ہے قوم و ملک کی، اِن کی تو بن گئی

---

[۱] الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۲۰۴

سرسید انگریزوں کی نظر میں کیا تھے۔ یہ قارئین نے ملاحظہ فرما لیا کہ صرف برٹش گورنمنٹ ہند کے اراکین و عمائدین ہی انھیں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ حکومتِ برطانیہ کی عظیم ہستیاں بھی انھیں سرآنکھوں پر بٹھاتی تھیں، آخر کیوں ؟ اس سوال کا جواب خود تلاش کریں۔

اس ضمن میں، حقیر اتنا عرض ضرور کرے گا کہ غلام ہزار و غیرہ کہے کہ میں اپنے آقا کا دل وجان سے خیر خواہ اور وفادار ہوں اور اپنے قول کی عملاً ساری عمر تصدیق بھی کرتا رہے، یہ اس کی انتہائی فرماں برداری اور نمک حلال غلام ہونے کی دلیل ضرور ہے لیکن اگر آقا اپنے غلام کی اطاعت شعاری، فرماں برداری و جاں نثاری کا اعتراف کرے، خود اس غلام کی تنخواہ کرنے لگ جائے تو یہ اس کی سب سے بڑی اطاعت شعاری کی دلیل ہی نہیں بلکہ فرمانبرداری کے نام پر پرستش کی حدود تک یہ جذبۂ عقیدت و وابستگی، اُسے لے گیا ہوتا ہے۔ موصوف کے بارے میں ایک بیان ایسا بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ سپیشل کمشنر اور جج، مسٹر کر کرافٹ نے سر سید احمد خاں صاحب کے کارناموں کے پیشِ نظر شہر میرٹھ (یو۔پی) میں موصوف کو مخاطب کر کے واشگاف الفاظ میں علیٰ رؤس الاشہاد کہا تھا:

"تم (سرسید) ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت (۱۸۵۷ء) میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا ...... سرکار نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع بجنور کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح نمک حلال اور وفادار سرکار کے رہے۔ اس کے صلے میں اگر تمھاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمھاری اولاد کی عزت اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم ہے۔" [1]

؎ بوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارک باد دوں

---

[1] حالی پانی پتی، حیاتِ جاوید، ص ۱۳۳

۱۵- علامہ شبلی نعمانی

شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) سولہ سال علی گڑھ کالج میں رہے۔ ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں موصوف کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ان کے متعلق شیخ محمد اکرام کی یہ تصریح موصوف کو سمجھنے میں کافی حد تک مددگار ثابت ہوگی:

"شبلی قریباً سولہ سال علی گڑھ میں ملازم رہے۔ یہیں انھوں نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور مستشرقین کی کتابوں تک رسائی حاصل کی اور یہیں سرسید کی باا‌ثر شخصیت نے ان کی قلب ماہیت کی۔ بقول مولانا مہدی حسن' شبلی نے مولویت علی گڑھ میں پہنچ کر چھوڑی۔ ان کے خیالات کی کایا پلٹ' مذاق تصنیف اور وسیع النظری غرض یہ جو کچھ ہوئے سرسید کے دامن تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا، وہ آج بھی ان کی ادبی شرافت کا پتہ دیتا ہے۔"[۱]

انگریز گورنمنٹ کے بارے میں شبلی نعمانی کے نظریات کیا تھے، موصوف کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

"میں (شبلی) مدت العمر کبھی انگریز گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے (یعنی ہندوستان کے رہنے والوں اور انگریزوں کی طرف سے) جو غلط فہمیاں مدت دراز سے چلی آتی ہیں، دور ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں، میں نے "الندوہ" میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً

---

[۱] اکرام شیخ، موج کوثر، مطبوعہ لاہور، بار ہشتم ۱۹۶۸ء، ص ۲۲۱، ۲۲۲

فرض ہے۔ [1]

شبلی نعمانی نے اپنی وفات سے پہلے ایک طویل عرضداشت، عبدالماجد دریابادی سے لکھوا کر حکومت صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ (یو۔پی) کے چیف سیکرٹری کی خدمت میں پیش کی تھی مذکورہ بالا عبارت اُسی عرضداشت کا ایک اقتباس ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے شبلی نامہ کے علاوہ اپنی مشہور و معروف تصنیف "موجِ کوثر" میں بھی یہ اقتباس نقل کیا ہے، بلکہ موجِ کوثر میں اس عبارت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"اور اُسی سال (۱۹۰۸ء) ندوہ کے سالانہ جلسے میں وفاداری کا (برٹش گورنمنٹ کے وفادار رہنے کا) ایک ریزولیشن بھی پاس کروایا، پھر معاملہ مولوی عبدالکریم میں، محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ (برٹش گورنمنٹ کے خلاف) مضمون کی اشاعت بند کی، اخبارات میں گالیاں سننا پڑیں۔" [2]

۱۶۔ الطاف حسین حالی

موصوف ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے محلہ انصاریاں میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازمت مل گئی لیکن ۱۸۵۷ء میں ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کو پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر کے میر منشی یعنی پیارے لال آشوب کی سفارش پر "گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو" لاہور میں مترجمہ کتابوں کی اردو عبارت درست کرنے کے لیے ملازم رکھ لیے گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ "اینگلو عربک سکول دہلی" میں بھی ملازمت کی۔ ۱۸۸۷ء سے سر سید احمد خاں کی سفارش پر پچھتر روپے ماہوار وظیفہ ملنا شروع ہو گیا، جو بعد میں سو روپے ماہوار کر دیا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں

---

[1] محمد اکرام شیخ: شبلی نامہ، ص ۲۲۵

[2] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۲۲۲

ور نمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب بخش دیا۔ ۱۹۱۴ء میں موصوف کا انتقال ہُوا۔

موصوف بھی نیچریت کے حامی اور سر سید احمد خاں کی برطانوی گاڑی کو ہانکنے میں مدد گار تھے۔
پنی شاعری کے ذریعے نیچری مذہب کو پھیلانے، مسلمانانِ ہند کو گورنمنٹ برطانیہ کا وفادار اور
مۂ بند دام و ثناخواں بنانے میں پورا زور لگاتے رہے۔ انگریز قوم اور مغربی تعلیم و تہذیب کی صفت
ثنا بیان کرتے ہوئے موصوف کی عمرِ دراز بھی انتہائی مختصر ثابت ہوئی ورنہ شاید معاملہ کہاں سے
ہاں جا پہنچتا۔ سر سید احمد خاں کے حکم سے آپ نے ایک معرکے کی نظم لکھی جو " مسدس حالی " کے
م سے مشہور اور ان کے مرشد جسے سرمایۂ افتخار شمار کیا کرتے تھے۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے اِس مسدس میں انگریزوں کو نوعِ انسان سے نرالی مخلوق، دیوتا،
معجز نما ہستیاں، مالکِ خزائن، غیب دان اور بہت کچھ مانا، اور دوسروں کو ویسا ہی ماننے کی
ترغیب دی ہے؛

جنھوں نے بنایا اِسے اپنا یاور | ہر اک رہ میں اِس کو ٹھہرایا رہبر
یہ قول آجکل صادق آتا ہے اُن پر | کہ اک نوع ہے نوعِ انساں سے بہتر

الگ سب سے کام اُن کے اور طور ہیں کچھ
اگر سب ہیں انساں، تو وُہ اور ہیں کچھ

بہت اُن کو معجز نما جانتے ہیں | بہت دیوتا اُن کو گردانتے ہیں
پہ جو ٹھیک ٹھیک اُن کو پہچانتے ہیں | وُہ اتنا مقرر نہیں مانتے ہیں

کہ دنیا نے جو کی تھی اب تک کمائی
وُہ سب جزو و کُل اُن کے حصہ میں آئی

کیا علم نے اُن کو ہر فن میں یکتا | نہ ہمسر رہا کوئی اُن کا نہ ہمتا
ہر اک چیز اُن کی، ہر اک کام اُن کا | سمجھ بوجھ سے ہے زمانہ کی بالا

صنائع کو سب اُن کی تکتے ہیں ایسے
عجائب میں قدرت کے حیراں ہوں جیسے

دیئے علم نے کھول اُن پر خزانے | چھپے اور ظاہر، نئے اور پُرانے

دکھائے اُنھیں غیب کے کُل خزانے　　بتائے فتوحات کے سب ٹھکانے

ہُوا جیسے چھائی ہے سب بحر و بر پر

وہ یُوں چھا گئے خیبر و باختر پر

انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی، اُن کے دین میں تخریب کاری کی، اُن کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا، دولت و عزت سب کچھ اُن سے چھین لیا اور ہزار مکر و زور اور جبر و استبداد سے اُنھیں اپنا غلام بنا لیا۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کسی طرح ان غیروں کی غلامی کا جُوا اُتار کر پھینک دیں، آزادی کی فضا میں سانس لیں اور جلد از جلد غلامی کی لعنت سے نجات حاصل کر لیں۔ لیکن انگریزوں کے زر خرید حضرات مسلمانوں کو یہی تبلیغ کیا کرتے تھے کہ یہ عملداری تو ہماری اپنی عملداری ہے، ہم غلام کہاں ہیں، ہمیں تو ہر قسم کی آزادی ملی ہے، ہمیں ہر طرح کا آرام نصیب ہے اور ہمیں ترقی کرنے کے حکومت نے پورے پورے مواقع فراہم کیے ہوئے ہیں۔ لہٰذا خاموشی اور شکر گزاری کے ساتھ اُن مراعات سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور گورنمنٹ کی بدخواہی کا دل میں خیال بھی نہیں لانا چاہیے۔ حالی نے بھی یُوں تلقین کی ہے:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں　　ترقی کی راہیں سراسر کھُلی ہیں

صدائیں یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں　　کہ راجا سے پرجا تلک سب سُکھی ہیں

تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا

نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

نہ بدخواہ ہے دین و ایماں کا کوئی　　نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی

نہ ناقص ہے ملت کے ارکاں کا کوئی　　نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی

نمازیں پڑھو بے خطر مسجدوں میں

اذانیں دھڑا کے سے دو مسجدوں میں

ﻪ الطاف حسین حالی، مسدس حالی، مطبوعہ لاہور، ص ۸۹، ۹۰

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں　　نہیں بند صنعت کی اور حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیلِ حکمت کی راہیں　　تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں

نہ گھر میں غنیم اور نہ دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق و رہزن کا کھٹکا

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں　　گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں　　شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں

سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر کا
وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر کا

پہنچتی ہیں ملکوں میں دم دم کی خبریں　　چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں
عیاں ہیں ہر اک بحرِ اعظم کی خبریں　　کھلی ہیں زمانہ پہ عالم کی خبریں

نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا

کرو قدر اس امن و آزادگی کی　　کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی
ہر اک راہ رو کا زمانہ ہے ساتھی　　یہ ہر سو سے آواز پیہم ہے آتی

کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے[1]

مسلمانوں کو از روئے احادیث کفار کے تشبہ سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اسلامی غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے روش پر پکے رہیں اور خدا کے دشمنوں سے کسی طرح بھی مشابہ ہونے کی کوشش نہ کریں۔ انگریز دوستی میں اس ممانعت کا شاعرِ نیچریت اور قوم کی غمخواری کا دم بھرنے والے نے یوں مذاق اڑایا ہے:

ہمیں واعظوں نے یہ تعلیم دی ہے　　کہ جو کام دینی ہے یا دنیوی ہے

---

[1] الطاف حسین حالی: مسدس، مطبوعہ لاہور، ص ۴۲، ۴۷

مخالف کی دلیلیں اس میں کرنی بُری ہے   نشاں غیرتِ دینِ حق کا یہی ہے

نہ ٹھیک اُن کی ہرگز کوئی بات سمجھو

وُہ دن کو کہے دن تو تم رات سمجھو

قدم گر رہِ راست پر اُن کا پاؤ   تو تم سیدھے رستہ سے کترا کے جاؤ

پڑیں اُس میں جو دقتیں وُہ اُٹھاؤ   لگیں ٹھوکریں جس قدر اُس میں کھاؤ

جو نکلے جہاز اُن کا بچ کر بھنور سے

تو تم ڈال دو ناؤ اندر بھنور کے

اگر مسخ ہو جائے صورت تمھاری   بہائم میں مل جائے ہیئت تمھاری

بدل جائے بالکل طبیعت تمھاری   سراسر بگڑ جائے حالت تمھاری

تو سمجھو کہ ہے حق کی اِک شان یہ بھی

ہے اِک جلوۂ نورِ ایمان یہ بھی

نہ اوضاع میں تم سے نسبت کسی کو   نہ اخلاق میں تم سے سبقت کسی کو

نہ حاصل یہ کھانوں میں لذت کسی کو   نہ پیدا یہ پوشش نہ زینت کسی کو

تمھیں فضل ہر علم میں برملا ہے

تمھاری جہالت میں بھی اِک ادا ہے

کوئی چیز سمجھو نہ اپنی بُری تم   رہو بات کو اپنی کرتے بڑی تم

حمایت میں ہو جبکہ اسلام کی تم   تو ہو ہر بدی اور گنہ سے بری تم

بدی سے نہیں مومنوں کو مضرت

تمھارے گناہ اور اَوروں کی طاعت

مخالف کا اپنے اگر نام لیجے   تو ذکر اُس کا ذلت سے خواری سے کیجے

کبھی بھول کر طرح اُس کو نہ دیجے   قیامت کو دیکھو گے اِس کے نتیجے

گناہوں سے ہوتے ہو گویا مُبرّا

مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرّا[ک]

[ک] الطاف حسین حالی، مسدس، مطبوعہ لاہور، ص ۵۱، ۵۲

سائنس کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن حقیقی علم اِسی کو ٹھہرانا اور اِسے سرمایۂ فخرِ انساں بتانا، ان حضرات کا کام تو ہو سکتا ہے جنھیں آخرت پر یقین ہی نہ ہو یا جو آخرت کی حقیقی زندگی پر اِس چند روزہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دینا ہی بہتر سمجھتے ہوں۔ سائنس کے بارے میں موصوف کے نظریات ملاحظہ ہوں:

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سب یاں — کہ ہے علم سرمایۂ فخرِ انساں
عرب اور عجم، ہند اور مصر و یوناں — رہا اتفاق اِس پہ قوموں کا یکساں
یہ دعویٰ تھا اک جس پہ حجت نہ تھی کچھ
کھلی اِس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ

جواہر تھے اک سب کی نظروں میں بھاری — پرکھنے کی جن کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری — نہ تھیں طاقتیں اس کی معلوم ساری
یہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ تھا علم میں زورِ دستِ الٰہی

کیا کوہساروں کو مسمار اِس نے — بنایا سمندر کو بازار اِس نے
زمینوں کو منوایا دوّار اِس نے — ثوابت کو ٹھہرایا سیّار اِس نے
لیا بھاپ سے کام لشکر کشی کا
دیا پتلیوں کو سکت آدمی کا

یہ پتھر کا ایندھن ہے جلوانے والا — جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا
صداؤں کو سانچے میں ڈھلوانے والا — زمیں کے خزانے اگلوانے والا
یہی برق کو نامہ بر ہے بناتا
یہی آدمی کو ہے سبے پہ اُڑاتا

تمدن کے ایواں کا معمار ہے یہ — ترقی کے لشکر کا سالار ہے یہ
کہیں دستکاروں کا اوزار ہے یہ — کہیں جنگجوؤں کا ہتھیار ہے یہ
دکھایا ہے نیچا دلیروں کو اِس نے
بنایا ہے روباہ شیروں کو اِس نے

اسی کی ہے اب چار سُو حکمرانی — کیے اِس نے زیر ارمنی اور یونانی
ہُوئے رام دیوان مازندرانی — گئے زابلی بھول سب پہلوانی

ہُوا اِس کی طاقت سے تسخیرِ عالم
پڑے سامنے اِس کے چرکس و دیلم [1]

حالی صاحب انگریزوں پر ایسے ایمان لائے تھے کہ اُن کی ہر چیز سے پیار اور والہانہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ موصوف کے نزدیک مغربی علوم و فنون ہی حق کا جلوہ ہیں، گویا دُوسرے باطل کا اندھیرا ہُوئے، چنانچہ فرماتے ہیں :

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے — وُہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے — کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے

جمی ہیں دِلوں میں ارسطو کی رائیں
جواب وحی اُترے تو ایماں نہ لائیں [2]

۱۷۔ مولوی رشید احمد گنگوہی

آپ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں پیدا ہُوئے۔ آپ مدرسہ دیوبند کے سرپرستوں اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں سے تھے۔ وہابیوں کی جماعت میں سے جب شاہ محمد اسحاق دہلوی خلیفۂ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے گول مول اور مخصوص خیالات سے اتفاق رکھنے والوں کی جماعت بنی اور دیوبندی مکتبِ فکر کے نام سے روشناس ہُوئی، تو اُس قافلے کے مولوی رشید احمد گنگوہی ہی قافلہ سالار قرار پائے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دیگر نامور خلفاء نے گنگوہی صاحب اور اُن کے ہم خیال علمائے دیوبند کا تعاقب کیا کہ یہ حضرات اپنے اکابر اور پیر و مرشد کے طریقے کے خلاف جا رہے تھے۔

[1] الطاف حسین حالی، مسدس، مطبوعہ لاہور، ص ۸۸، ۸۹

[2] ایضاً، ص ۷۵

جب اس قضیہ کی خبر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو ملی تو اپنے متعلقین کو سمجھانے کی غرض سے جن مسائل میں ان حضرات کا نزاع تھا، ان کے بارے میں اپنے نظریات و معمولات لکھ کر "فیصلہ ہفت مسئلہ" کے نام سے موصوف کے پاس اس کی کاپیاں بھیج دیں۔ گنگوہی صاحب نے اپنے پیر کے فیصلے کی یہ قدر کی کہ اپنے ایک شاگرد (خواجہ حسن نظامی دہلوی) کو ان تمام کاپیوں کو جلانے کا حکم صادر فرمایا۔

فقہ حنفی کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود موصوف نے اپنے قلم سے اس میں ایسی تراش خراش فرمائی اور خوارج زمانہ کے نظریات داخل کیے کہ ابنائے زمانہ کو ایک پریشان کن مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تقدیس باری تعالیٰ شانہٗ کو داغدار بنانے کی غرض سے امکان کذب کے ناپاک عقیدے کو وقوع کذب تک بڑھا دیا۔ شیطان لعین کو فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی اعلم واوسع علماً ٹھہرا دیا اور علم بزرخاریت، امام الوہابیہ مولوی اسمٰعیل دہلوی کے تمام غیر اسلامی عقائد و نظریات کی کھل کر تصدیق و تائید کرتے رہے۔ ان کا وصال ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں ہوا۔

موصوف نے اپنے اکابر سے رشتہ توڑا، اپنے پیر و مرشد سے تعلق چھوڑا، آخر ایسا کیوں کیا؟ کہیں یہ حکومت کی سطر پر توڑ ادرتہ کھیلا گیا ہو جس کی تخریب کاری کی مشین اندرون خانہ بڑی عیاری اور رازداری سے چل رہی تھی، کہیں مولوی ہدایت احمد گنگوہی کے فرزند اور حاجی امداد اللہ تھانوی علیہ الرحمہ کے مرید، مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب برطانیہ کے جادو کا شکار تو نہیں ہو گئے تھے۔ آئیے واقعات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہو چکی ہے۔ موصوف کے ہم خیال علماء نے اپنا ایک جتھا منظم کر لیا ہے۔ ہتھیار لگا کر باہر پھرتے ہیں۔ کس سے لڑنے کے لیے پھرتے تھے؟ ہمیں کیا معلوم جبکہ تقریباً سوا سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ آئیے موصوف کے سوانح نگار، ان کے عاشق زار، مولوی عاشق الٰہی میرٹھی سے پوچھتے ہیں:

"ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (مولوی محمد قاسم نانوتوی) اور طبیب روحانی

اعلیٰحضرت حاجی صاحب وغیرہ حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے اور بندوقچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے والا یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اِس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ (گنگوہی صاحب) پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیرِ ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔[1]

اب معلوم ہو گیا۔ مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے راز بتا دیا کہ گنگوہی صاحب نے اپنے اکابر اور اپنے پیر سے قلبی رشتہ کیوں توڑ لیا تھا؟ اِس لیے کہ برٹش گورنمنٹ سے جاں نثاری و وفاداری کا عہد و پیمان جوڑا گیا تھا۔ یہ بات بالکل صاف اور سیدھی سادی ہے، جس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں، ادھوری عبارت یا سیاق و سباق سے توڑنے مروڑنے کی تہمت نہیں، خود گنگوہی صاحب کے سوانح نگار اور نامور دیوبندی عالم کی شہادت ہے، مخالفانہ بیان بھی اِسے نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ یہ بیان دینے والا عالم اہلسنّت نہیں۔ یہ ناچیز اِس امر کے فیصلے کا حق قارئین کے سپرد کرتا ہے کہ مذکورہ حوالے کی روشنی میں مولوی رشید احمد گنگوہی انگریزوں کے مخالف ثابت ہوتے ہیں یا برٹش گورنمنٹ کے دل و جان سے وفادار بلکہ جاں نثار نظر آ رہے ہیں؟

پروفیسر محمد ایوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند اردو مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۵۰ پر بلکہ متعدد کتب و رسائل میں اور اُن کی دیکھا دیکھی موجودہ علمائے دیوبند نے یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ نے ۱۸۵۷ء میں شاملی کے مقام پر انگریزوں سے لڑائی لڑی تھی، لہٰذا اکابرِ علمائے دیوبند مجاہدینِ جنگِ آزادی

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۷۴،

اور انگریزوں کے مخالف ہیں یعنی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تو علمائے دیوبند ماسوائے گاندھوی علماء کے باقی سب انگریزوں کے نہ صرف خیرخواہ و وفادار بن کر رہے بلکہ برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار بن کر ملت اسلامیہ سے کٹ کر ایک نئے فرقے کا اضافہ اور کر بیٹھے نیز اسلامی عقائد میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی پیوندکاری کرتے رہے۔ اگر یہ حضرات انگریزوں کے آلۂ کار نہ بن گئے ہوتے تو پھر سوادِ اعظم اہلسنت وجماعت سے کٹ کر اپنا فرقہ الگ کیوں بناتے نیز اہلسنت وجماعت کے متوارث مذہب کا اپریشن کیوں کرتے ؟ لیکن اُدھر انگریز بستر گول کر کے راہی برطانیہ ہوئے اِدھر تو تئے سال بعد ان حضرات نے اپنے اکابر کی تاریخ کو بدلتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ ہمارے رشید احمد گنگوہی اور محمد قاسم نانوتوی وغیرہ بزرگ تو انگریزوں کے مخالف اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو تھے۔ تاریخ کا اِس طرح مذاق اڑا کر اُسے بازیچۂ اطفال بناتے اور حقیقت کا منہ چڑاتے وقت اگر دیوبندی علماء و مورخین کو خوفِ خدا یاد نہیں رہتا تو ایسا کرتے وقت کیا ان حضرات کو بندگانِ خدا سے بھی کوئی شرم و عار محسوس نہیں ہوتی ؟ کیا ان حضرات کی غلط بیانی سے حقیقت بدل جائے گی ؟ کیا اِس قسم کی حرکتیں بھی ان حضرات کا طرۂ امتیاز ہیں ؟

تذکرۃ الرشید کے مذکورہ بالا حوالے کو موجودہ دیوبندی عالم مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری نے یُوں بیان کیا ہے ؛

"جب پلٹن (انگریزی فوج) مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے یک دم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں، جو یہاں چھپے ہوئے ہیں، توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لاکر ڈال دیا۔ اِس سے ان حضرات کی ...... ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ شاملی اُس زمانہ میں مرکزی مقام تھا ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اِس پر حملہ کیا جائے، چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی، مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اِسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا

شہید ہوتا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔" ۱؎

گویا واقعہ سب کے نزدیک وہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۴ء تک
ے سال تک یہ لڑائی حکومت کے مخالفین یعنی حریت پسندوں کے ساتھ بتائی جاتی رہی اور
ہیں چلے گئے تو یہی لڑائی انگریزوں کے خلاف بتائی شروع کر دی۔ اگر ہم موجودہ حضرات کے
عت کو درست تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی یہ فیصلہ غلط ہی رہے گا، کیونکہ بعد کے واقعات اِس
ت کی تائید کرنے سے یکسر مجبور ہیں۔ جب لڑائی کی آگ ٹھنڈی ہوئی، انگریز دوبارہ قابض و مسلط
گئے تو داروگیر کا دور شروع ہو گیا۔

اِس دور میں، خصوصاً مسلمانوں پر کیا قیامت ڈھائی گئی، اِس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے۔
کتاب کے پہلے باب میں اِس قیامت خیز منظر کی جھلک قارئین کرام دیکھ چکے ہیں۔ ذرا سا
یہ معمولی پر لٹکانے کے لیے کافی تھا، کسی انگریز کی اگر مدد نہ کرنے کا الزام عائد ہوا تب بھی دار
مینچ دینے کا حکم سزا نہ تھی، کسی انگریز کی تعظیم نہ بجا لائے یا کھڑے ہو کر عاجزانہ سلام نہ کیا
ی کا نشانہ بنائے گئے۔ جن بستیوں کے چند افراد نے بھی انگریزوں سے لڑائی کی، اِس
ی وعدہ میں اُن بستیوں کو سرے سے صاف ہی کر دیا گیا۔ اگر واقعی یہ علمائے دیوبند انگریزوں سے
ے تھے تو سولی یا سزائے موت سے کم کے بغیر تو نہیں رہ سکتے تھے، لیکن بعد کے واقعات تو
ا سکتے ہیں کہ ان حضرات میں سے کسی ایک کے پیر میں کانٹا تک بھی نہیں چبھویا گیا۔ اگر انگریزوں
ے تھے تو انھیں کیوں چھوڑ دیا گیا تھا؟ آیئے موصوف کے سوانح نگار مولوی عاشق الٰہی
ی سے مزید معلومات حاصل کرتے ہیں:

"شروع ۱۲۷۶ھ نبوی/۱۸۵۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولوی
رشید احمد گنگوہی) قدس سرہٗ پر اپنی سرکار (برٹش گورنمنٹ) سے باغی ہونے کا
الزام لگایا گیا۔" ۲؎

۱؎ ...یز الرحمٰن بجنوری، تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۸۰
۲؎ عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی، تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۷۴

اسی بات کو دوسری جگہ ذرا تفصیل سے موصوف نے یوں بیان کیا ہے :

"جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیرخواہ اپنے کو ظاہر کریں، انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات (گنگوہی و نانوتوی صاحبان) پر بغاوت کا الزام لگایا۔"[1]

مولوی رشید احمد گنگوہی کے رفیق جانی اور مدرسہ دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں مندرجہ ذیل پُر تکلف حکایت کا پیش کرنا، شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ ہر عقلمند کو دعوتِ غور و فکر دے رہی ہے :

"جب مجاہد علماء کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو آپ (مولوی محمد قاسم نانوتوی) کی گرفتاری کے بھی وارنٹ جاری ہوتے۔ خدام اور متوسلین کے بہت زیادہ اصرار پر آپ ایک مکان میں رُوپوش ہوگئے اور تین دن کے بعد پھر کھلے بندوں چلنے پھرنے لگے۔ لوگوں نے پھر رُوپوشی کے لیے منت عرض کیا تو آپ نے انکار کردیا اور فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنّت سے ثابت نہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین دن ہی روپوش رہے ہیں۔"[2]

اتباعِ سنّت کی حقیقت تو خانقاہِ گنگوہ سے لے کر انکارِ خاتمیت زمانی تک معلوم ہے اُمتِ محمدیہ کے مسلّم عقیدہ ختمِ نبوت کا انکار کرکے ایک ایسی خاتمیت گھڑنے والے بھی تو یہی نانوتوی صاحب ہیں، جس کا نام سُننے سے بھی تیرہ سو سال کے مسلمانوں کے کان نا آشنا رہے۔ کیا یہ کارنامہ بھی اتباعِ سنّت میں دکھایا تھا؟ بہرحال اس سے قطع نظر، مولوی محمد قاسم

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی، تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۷۶

[2] مناظر احسن گیلانی، مولوی، سوانح قاسمی، جلد دوم، ص ۱۰۳

نوتوی کی جوانمردی و دلیری ہے کہ تین دن روپوش رہنے کے بعد وندناتے پھرنے لگے اور اس
سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز یہ ہوا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مولوی رشید احمد گنگوہی پر اپنی گورنمنٹ سرکار
سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا دیو بندی علماء و مورخین تو ان حضرات کو مجاہد بنا کر، الزام
رو تا رو کر، پھر قید و بند سے چھڑا کر مطمئن ہو گئے ہوں گے اور ان بانکے مجاہدوں کے معرکوں پہ
پینگیں مارنے لگے ہوں گے لیکن ہم ان حضرات سے اتنا ضرور دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جناب عالی
آپ کے ان مجاہدوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف شاملی کی لڑائی لڑی، انگریزی پلٹن سے
توپ خانہ بھی چھین لیا، چلیے یونہی سہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان حضرات پر بدخواہوں نے ۱۸۵۷ء میں
بغاوت کی تہمت لگا کر گرفتار کروا دیا، بھلا اب مجاہد ہونے اور انگریز دشمن کہلانے میں، کون ہے
جو ان حضرات کے متعلق شک کر سکے گا، لیکن اتنا تو از راہ کرم بتا دیجیے کہ آپ کے یہ ۱۸۵۷ء کے
مجاہد، حریت پسند، جنگ آزادی کے ہیرو، ۱۸۵۷ء سے آخر وقت تک انگریزوں کی نگاہ میں
کیا بن کر رہے تھے، دوست سمجھے گئے یا دشمن، مخالف گردانا گیا یا آلۂ کار، سالہا سال تک
انگریزوں نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ اے شاملی کے مقام پر ہم سے لڑنے والو! اے ہمارا توپ خانہ
ہم سے چھین لینے والو! ہم سے لڑے کیوں تھے؟ ہمارا توپ خانہ کیوں چھینا تھا؟ کیا برٹش گورنمنٹ
ان چند علمائے دیوبند سے اتنی خائف و ہراساں اور لرزاں و ترساں تھی کہ سزا دینا تو بہت بڑی
بات ہے، ان سے اپنا توپ خانہ واپس لینے کی اپیل یا عرض بھی ان کی خدمت میں نہ کر سکی؟
آخر رکاوٹ کیا تھی؟

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرز ادا سے ہم

ہزار چکر پھیریوں سے اپنے اکابر کو مجاہد اور انگریز دشمن ثابت کرنے کی کوششیں کرتے ہیں
لیکن تیلی کے بیل کی طرح جہاں سے چلتے ہیں پھر وہیں آ پہنچتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھ بیٹھتے ہیں
کہ ساری کاوشوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ مولوی عزیز الرحمٰن بجنوری کی تحقیق ملاحظہ فرمایئے:

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی)
اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے....

آپ (گنگوہی صاحب) اپنی دادھیال رام پور تشریف لے گئے لیکن مخبر کی خبر رسانی سے آپ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کر لیے گئے۔ یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا تھا۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارن پور جیل کی کال کوٹھری میں رکھا گیا اور حالات اور واقعات کی تفتیش ہوتی رہی، مقدمہ چلتا رہا۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ آپ نے تسبیح دکھلا کر فرمایا: "ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے"۔ سہارن پور جیل سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کیا گیا۔ بالآخر جب گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا رہا کر دیا۔"[1]

باقی باتوں سے قطع نظر جب برٹش گورنمنٹ کو سعیِ بسیار کے باوجود اس امر کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ثبوت بھی نہ مل سکا کہ مولوی رشید احمد گنگوہی حکومت کے بدخواہ ہیں یا ۱۸۵۷ء میں انھوں نے انگریزوں کے مفادات کے خلاف کوئی ادنیٰ سی حرکت بھی کی تھی، تو موجودہ حضرات کو کون سے دلائل یا حقائق و شواہد کا کھوج مل گیا ہے جن کی بنا پر بلند بانگ دعاوی کر کے اپنی سابقہ تاریخ کو بدلنے کی جسارت کرتے اور اسی کو حقیقت منوانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کم از کم ان حضرات کو اپنے بزرگوں کا ادب کرنا چاہیے اور اپنے اکابر کو اپنی رحم دل گورنمنٹ کے باغیوں اور مفسدوں کی فہرست میں تو شامل نہ کرنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو برٹش گورنمنٹ کیا تھی:

"جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انھوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا۔"[2]

اپنے اکابر مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ کی موصوف نے یوں صفائی پیش کی ہے:

"جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے۔ تازیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔"[3]

---

[1] عزیز الرحمٰن بجنوری، مولوی: تذکرہ مشائخ دیو بند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۰

[2] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۷۳

[3] ایضاً، ص ۷۹

موصوف برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ تھے یا مفسدوں اور باغیوں میں شریک سمجھے گئے
اس امر کا فیصلہ تو قارئین کرام خود کریں گے۔ راقم الحروف تو اس سے آگے عرض یہی کر سکتا ہے کہ جملہ
متبعین کے بیانات سے قطع نظر کر کے، خود صاحب مسئلہ اصحاب، مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی
(المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کا ایک ذاتی بیان نقل کر دیتا ہے کہ موصوف کا خود اپنے بارے میں
اپنا فیصلہ کیا ہے؟:

"جب (مولوی رشید احمد گنگوہی) حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہوں تو
جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے۔
اُسے اختیار ہے، جو چاہے کرے"۔ [1]

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

ہو سکتا ہے کسی صاحب کو یہ شبہ لاحق ہو جائے کہ "تذکرۃ الرشید" کتاب تاریخی لحاظ سے
ناقابل اعتبار ہو یعنی دیوبندی حضرات کے نزدیک اس کے مندرجات مستند نہ ہوں یا اُسے تاریخی
لحاظ سے کوئی اہمیت حاصل نہ ہو، لہذا ہم اس کتاب پر ان حضرات کے مایۂ ناز مورخوں کی
مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں، عبدالرشید ارشد فرماتے ہیں:

"میرے کانوں میں مولانا غلام رسول مہر کے بار بار کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے
ہیں کہ "تذکرۃ الرشید بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر بڑا دل خوش ہوتا ہے
میں (غلام رسول مہر) نے سالک صاحب (عبدالمجید سالک) اور اپنے کئی دوسرے
احباب کو یہ کتاب پڑھائی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر مولانا رشید احمد گنگوہی کی
عظمت دلوں میں پیدا ہوتی ہے"۔ [2]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اوّل، ص ۸۰

[2] عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۲ (حاشیہ)

١٨۔ مولوی اشرف علی تھانوی

موصوف کی پیدائش ١٢٨٠ھ/١٨٦٣ء کو تھانہ بھون میں ہوئی۔ مولوی محمود الحسن دیوبندی کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ مدرسہ دیوبند کی سرپرستی بھی کرتے رہے۔ اپنی جماعت کی گاندھیت نوازی کرنے سے الگ رہے۔ دیوبندی حضرات انھیں حکیم الامت اور مجدد ملت کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ موصوف نے اپنی مشہور تصنیف "بہشتی زیور" کے پہلے حصے میں ان امور کی ایک فہرست پیش کی ہے جو ان کے نزدیک کفر و شرک ہیں۔ اگر موصوف کی اس فہرست کو سامنے رکھا جائے تو کسی متنفس کو بھی مسلمان ثابت نہ کیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ تھانوی صاحب نے بعض تصانیف میں چند عبارتیں ایسی بھی درج کی ہیں جن کی ایک مسلمان کہلانے والا ہرگز ہرگز جسارت نہیں کر سکتا۔ سرور کون و مکاں، فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں گندے الفاظ لکھنے کی تو اس سرکار کے بدترین دشمنوں اور کعبے کا فروں کو بھی جرأت نہ ہوئی تھی (اس کتاب میں ان عبارتوں کا تفصیلی ذکر اپنے موقع و محل پر آئے گا (انشاء اللہ تعالیٰ)۔

موصوف نے ١٣٦٢ھ/١٩٤٣ء میں وفات پائی۔

یکم محرم ١٣٦٥ھ مطابق ٦ دسمبر ١٩٤٥ء کو علامہ شبیر احمد عثمانی کے مکان پر سیاسی اختلافات کو رفع کرنے موصوف کو اپنا ہم خیال بنانے کی غرض سے سات گاندھوی علماء تشریف فرما

١۔ مولوی حسین احمد ٹانڈوی صدر جمعیۃ العلمائے ہند

٢۔ مفتی کفایت اللہ دہلوی سابق صدر جمعیۃ العلمائے ہند

٣۔ مولوی احمد حسین سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند

٤۔ مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند

٥۔ مولوی عبد الحلیم صدیقی

٦۔ مولوی عبد الحنان

٧۔ مفتی عتیق الرحمٰن

تین گھنٹے تک ان حضرات کی حالاتِ حاضرہ پر گفتگو رہی۔ اپنا اپنا موقف واضح کیا۔ بعض [illegible]

گوشے بھی سامنے آئے، جو مولوی طاہر احمد قاسمی کے قلم سے مولوی شبیر احمد عثمانی کی تصدیق کے ساتھ پیشِ خدمت ہیں۔ عثمانی صاحب نے فرمایا:

"دیکھیے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اور آپ کے مسلّم بزرگ و پیشوا تھے، اُن کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا گیا کہ اُن کو چھ سو روپیہ ماہوار حکومت کی جانب سے دیئے جاتے تھے۔ اِسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ گو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اِس کا علم نہ تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ اُن کو اِس کا شُبہ بھی نہ گزرتا تھا۔ اب اِسی طرح اگر حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرے مگر اس کو یہ علم نہ ہو کہ اُسے استعمال کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شرعاً اِس میں ماخوذ نہیں ہو سکتا۔"[1]

نتیجہ ہے کہ مولوی اشرف علی تھانوی کے متعلق یہ بیان دینے والے مشہور دیوبندی عالم ہیں اور دوسری طرف سُننے والے ایسے ساٹھ دیوبندی علماء ہیں، جنھیں اِس جماعت کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے لیکن وہ اِس بیان کی تردید میں ایک لفظ بھی اپنی زبانوں پر نہ لا سکے۔

مولوی حسین احمد ٹانڈوی ایک دفعہ حکومت کے زیرِ عتاب آئے، جیل خانے میں رہے بعض لوگوں نے اِس واقعے میں تھانوی صاحب کا ہاتھ بتانے کی کوشش کی اور مسلسل کان بھرتے رہے تھے۔ بعد ازاں بعد موصوف نے اپنے ایک خط میں لکھا:

"مولانا مرحوم (مولوی اشرف علی تھانوی) کے بھائی محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی میں بڑے عہدیدار اخیر تک رہے۔ اُن کا نام مظہر علی ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا ہو مستبعد نہیں۔"[2]

یہ بیانات اگرچہ اپنی جگہ پر بالکل واضح ہیں لیکن ہم یہاں مولوی اشرف علی تھانوی کا ذاتی بیان، خود اُن کے اپنوں کی مرتبہ کتاب سے پیش کر کے اِس سلسلے میں اتمامِ حجت کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] طاہر احمد قاسمی، مولوی، مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶

[2] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، مکتوبات شیخ، جلد دوم، ص ۲۹۷

بیان ملاحظہ ہو:

"ایک شخص نے مجھ (مولوی اشرف علی تھانوی) سے دریافت کیا تھا کہ اگر تمہاری حکومت ہو جائے تو انگریزوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرو گے؟ میں نے کہا محکوم بنا کر رکھیں گے کیونکہ جب خدا نے حکومت دی تو محکوم بنا کر ہی رکھیں گے، مگر ساتھ ہی اس کے نہایت راحت و آرام سے رکھا جائے گا، اس لیے کہ اُنھوں نے ہمیں آرام پہنچایا ہے۔" [1]

شعر — دل لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

۱۹- مولوی شبیر احمد عثمانی و مولوی آزاد سبحانی

مولوی شبیر احمد عثمانی دیو بندی بن مولوی فضل الرحمٰن دیو بندی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ موصوف کے والد ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ خود موصوف نے مدرسہ دیو بند میں تعلیم پائی اور کچھ عرصہ اس کے صدر بھی رہے۔ جمعیۃ العلمائے ہند کے آپ بھی ایک رُکن تھے لیکن کسی وجہ سے آپ اپنے اکابر اور رفقا سے کانگریسی گاندھوی روش کو برداشت نہ کر سکے، اس لیے جمعیۃ العلمائے اسلام کے نام سے اپنی علیحدہ جماعت بنالی، جو دیو بندی طبقے میں بھی نسبتاً اقلیت میں ہی رہی۔ اکثریت میں وہی حضرات تھے جنھوں نے گاندھی کو اپنا بے تاج بادشاہ اور امام و پیشوا بنایا ہوا تھا۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء میں آپ نے وفات پائی۔

چونکہ آپ مطالبۂ پاکستان کے حامی اور مسلم لیگ کے ہمنوا تھے، اس لیے جملہ علمائے دیو بند ماسوائے چند کے، آپ سے ناخوش تھے۔ مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کے گزشتہ بیان میں علمائے دیو بند کے جس مذاکرے کا ابھی ذکر کیا تھا، اُس میں جمعیۃ العلمائے ہند کے ناظمِ اعلیٰ، مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنے وفد کی طرف سے علامہ عثمانی کی جمعیۃ العلمائے

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: افاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۶۶۷

قیام کے قیام اور اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کلکتہ میں جمعیۃ العلمائے اسلام حکومت کی مالی امداد اور اُس کے ایما سے قائم ہوئی ہے۔ مولانا آزاد سبحانی جمعیۃ العلمائے اسلام کے سلسلہ میں دہلی آئے اور حکیم دلبر حسن صاحب کے یہاں قیام کیا، جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ سرکاری آدمی ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب اسی قیام کے دوران میں پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک مسلمان اعلیٰ عہدیدار سے ملے، جن کا نام بھی قدرے شبہ کے ساتھ بتلایا گیا اور مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم جمعیۃ العلمائے ہند کے اقتدار کو توڑنے کے لیے ایک علماء کی جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے بعد طے ہوا کہ گورنمنٹ اِن کو کافی امداد اِس مقصد کے لیے دے گی۔ چنانچہ ایک بیش قرار رقم اِس کے لیے منظور کر لی گئی اور اُس کی ایک قسط مولانا آزاد سبحانی صاحب کے حوالے بھی کر دی گئی۔ اِس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع کیا گیا۔ مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ یہ اِس قدر یقینی روایت ہے کہ اگر آپ اطمینان فرمانا چاہیں تو ہم اطمینان کرا سکتے ہیں"۔[۱]

مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی اِس تقریر کے جواب میں مولوی شبیر احمد عثمانی کا بیان بھی قابلِ غور و فکر ہے:

"پہلے میں (شبیر احمد عثمانی) اُس معاملہ کی نسبت گفتگو شروع کرتا ہوں، جو آپ نے مولانا آزاد سبحانی کے متعلق بیان فرمایا ہے۔ جو روایت آپ نے بیان کی، میں نہ اُس کی تصدیق کرتا ہوں نہ تکذیب۔ ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے ہوں۔ مجھے اِس سے پہلے بھی بذریعہ ایک گمنام خط کے (جو دہلی سے ڈالا گیا تھا) یہی بتلایا گیا تھا اور مجھے بھی اُس خط میں دھمکی دی گئی تھی۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط،

۱۔ سعید احمد قاسمی، مولوی، مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۱-۱۳

بہرحال میرے علم میں آچکی ہے۔ لیکن اِس روایت سے مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور میری رائے کیا متاثر ہو سکتی ہے؟

میں نے جو رائے پاکستان وغیرہ کے متعلق قائم کی ہے، وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے، جمعیۃ العلمائے اسلام میں آزاد سبحانی رہیں یا نہ رہیں، جمعیۃ العلمائے اسلام خود قائم رہے یا نہ رہے، میری رائے جب بھی یہی رہے گی کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان مفید ہے۔

اگر مَیں تھوڑی دیر کے لیے اِس روایت کو تسلیم بھی کر لوں کہ جمعیۃ العلمائے اسلام گورنمنٹ کے ایما سے قائم ہُوئی ہے، تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ کانگرس کی ابتدا کس نے کی تھی اور کس طرح ہُوئی تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ ابتداءً اس کا قیام ایک وائسرلئے کے اشارے پر ہُوا تھا۔"[۱]

حقیقت کا حال تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اُن کے جواب کی روشنی میں موصوف کو انگریز دوستی سے براءت کا سرٹیفکیٹ نہیں مل سکے، لیکن برٹش گورنمنٹ کا آلۂ کار ثابت کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ رہا مولوی آزاد سبحانی، رکن جمعیۃ العلمائے اسلام کا معاملہ تو فریقین (عمائد علمائے دیوبند) کے بیانات کی روشنی میں صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ موصوف کی انگریز دوستی بلکہ ایجنٹی و آلۂ کاری شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۰۔ مولوی محمد الیاس کاندھلوی

موصوف ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں پیدا ہُوئے۔ دس سال کی عمر میں مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کی خدمت میں تحصیل علم و فیض کے لیے حاضر ہو کر آپ کے ہاتھ پر بیعت ہُوئے اور اُن کی وفات تک اپنے پیر گنگوہی صاحب کی خدمت میں حاضر رہے، اُس وقت آپ سلوک کی بیشتر منزلیں طے کر چکے تھے۔ دیوبندی حضرات کی تبلیغی جماعتیں

---

[۱] طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴، ۱۵

جو آج کل بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، اس تحریک کے بانی یہی مولوی محمد الیاس صاحب ہیں۔
تبلیغی نظام کب اور کیوں قائم ہوا، اس کا تاریخی تذکرہ باب دوم میں اپنی جگہ پر ہو چکا ہے
علمائے دیوبند کی جس میٹنگ کا گزشتہ سطور میں تین دفعہ ذکر آچکا ہے، اسی میں مولوی حفظ الرحمٰن
سیوہاروی نے یہ بھی کہا تھا:

"اسی ضمن میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ
علیہ کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداءً حکومت کی طرف سے بذریعہ حاجی رشید احمد
صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا پھر بند ہو گیا۔"[1]

حکومت نے امداد دینے کا وعدہ کر کے شردھانند کے مقابلے پر تبلیغ شروع کروا تو دی لیکن
جیسا کہ مذکور ہوا، کچھ عرصہ گزرنے پر وظیفہ دینا بند کر دیا۔ کاندھلوی صاحب (المتوفی ۱۳ رجب
۱۳۶۳ھ) اس وقت شاید یہ شعر پڑھا کرتے ہوں گے۔

صبر اس پر اس ہماری حسرتِ دیدار کا
بند جس نے کر دیا روزن تری دیوار کا

۲۱۔ مرزا غلام احمد قادیانی

دورِ حاضر کا مسیلمہ، اُمت کے تیس دجالوں میں سے ایک دجال، مرزا غلام احمد
قادیانی بھی ہے۔ موصوف نے مجدد اور مصلح کے دعاوی سے سلسلہ شروع کیا۔ دعوئ نبوت کو
تو عام مشہور ہے لیکن اس خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو فراموش کر دینے والے اس شخص نے
اپنے متعلق خدا ہونے تک کے متعدد دعاوی کیے ہوئے ہیں۔ موت سے پیشتر اپنے کئی مخالفوں
چیلنج کیا تھا کہ فریقین سے جو جھوٹا اور کذاب ہے اُسے خدائے بزرگ و برتر دوسرے کی زندگی میں
یا طاعون وغیرہ متعدی مرض کے ساتھ ذلیل کر کے مارے۔ مخالفین تو سارے ہی زندہ رہے
لیکن اُن کی زندگی میں مرزا صاحب ہی بعارضۂ ہیضہ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء بروز منگل ساڑھے دس بجے

---

[1] طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲

ان کے راہی ملک عدم ہو گئے اور اپنے جھوٹا ہونے کا سب کے سامنے بیّن ثبوت پیش کر گئے۔

برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار وں میں مرزا غلام احمد قادیانی کا مدِمقابل سرزمین پاک و ہند میں کوئی نہیں ہوا۔ مرزا غلام احمد کو یہ صفت ورثے میں ملی تھی۔ چنانچہ اپنے والد کے بارے میں خود یُوں تصریح کی ہے:

"میرے والد مرحوم کی سوانح میں سے وُہ خدمات کسی طرح الگ ہو نہیں سکتیں جو وُہ خلوص دل سے اِس گورنمنٹ کی خیرخواہی میں بجالائے۔ اُنھوں نے اپنی حیثیت اور مقدرت کے موافق ہمیشہ گورنمنٹ کی خدمت گزاری میں اُس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے وقت وہ صدق اور وفاداری دکھلائی کہ جب تک انسان سچے دل اور تہِ دل سے کسی کا خیرخواہ نہ ہو ہرگز دکھلا نہیں سکتا۔"[1]

اپنے والد کے بارے میں دُوسری کتاب کے اندر یُوں لکھا ہے:

"والد صاحب مرحوم اِس ملک کے رئیس زمینداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ گورنری دربار میں اُن کو کرسی ملتی تھی اور گورنمنٹ برطانیہ کے سچے شکرگزار اور خیرخواہ تھے۔"[2]

اُن کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے فخریہ انداز میں ایک جگہ یُوں بھی رقمطراز ہیں:

"سن ستاون (یعنی ۱۸۵۷ء) کے مفسدہ میں جبکہ بے تمیز لوگوں نے اپنی محسن گورنمنٹ کا مقابلہ کر کے ملک میں شور ڈال دیا، تب میرے والد بزرگوار نے پچاس گھوڑے اپنی گرہ سے خرید کر کے اور پچاس سوار بہم پہنچا کر گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیے اور پھر ایک دفعہ چودہ سواروں سے خدمت گزاری کی اور اِنہی مخلصانہ خدمات کی وجہ سے وہ اِس گورنمنٹ میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ چنانچہ جناب گورنر جنرل کے دربار میں عزت کے ساتھ اُن کو کرسی ملتی تھی اور ہر ایک درجہ کے حکام انگریزی

---

[1] غلام احمد قادیانی، مرزا: شہادت القرآن، ص ۴۴

[2] غلام احمد قادیانی، مرزا: ازالۂ اوہام، ص ۵۰

بڑی عزت اور دلجوئی سے پیش آتے تھے۔"[1]

اپنے بڑے بھائی، مرزا غلام قادر کی انگریز دوستی کے بارے میں موصوف نے یوں تصریح کی ہے:

"اس عاجز کا بڑا بھائی، مرزا غلام قادر جس قدر مدت تک زندہ رہا، اس نے بھی اپنے والد مرحوم کے قدم پر قدم مارا اور گورنمنٹ کی مخلصانہ خدمت میں بدل و جان مصروف رہا۔"[2]

خود مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) جہاد کے سخت مخالف اور برٹش گورنمنٹ کے نمبر ایک آلۂ کار تھے۔ اس امر کا اعتراف موصوف نے اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے:

"میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں جو ان کو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔"[3]

دوسری جگہ انگریزوں کی حمایت میں جہاد کی مخالفت کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

"میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت (برٹش گورنمنٹ) کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی (امام مہدی علیہ السلام) اور مسیح خونی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی بے اصل روایتیں (جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں) اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل (جو حکم خدا اور حکم و ارشادِ مصطفیٰ ہے) جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔"[4]

---

[1] غلام احمد قادیانی، مرزا، شہادت القرآن، ص ۳۴

[2] ایضاً، ص ۳۳

[3] غلام احمد قادیانی مرزا، تبلیغ رسالت، جلد ۷، ص ۱۰

[4] غلام احمد قادیانی، مرزا، تریاق القلوب، ص ۲۵

موصوف نے انگریزی حکومت کے استحکام کی خاطر اس کی حمایت میں جہاد کے خلاف بے شمار کتابیں لکھیں اور اشتہار شائع کرائے اور اپنے اس اسلام دشمنی کے کارنامے پر آپ یوں فخر کیا کرتے ہیں:

"میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں اُن سے بھر سکتی ہیں۔"[1]

شاید پنجاب کے مشہور شاعر ظفر علی خاں نے یہ شعر اسی لیے کہا تھا:

طوقِ استعمارِ مغرب خود کیا زیبِ گلو
اور گواہ اس پر ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

انگریزی حکومت کی اطاعت و فرماں برداری کی ترغیب دینے اور مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو برٹش گورنمنٹ کے مفاد کی خاطر ٹھنڈا کرنے کی غرض سے مرزا غلام احمد قادیانی نے تحریری طور پر جو کچھ کیا، اس کی تفصیل یوں بیان کی:

"مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور نیز دوسرے بلادِ اسلام میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے، لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعاگو رہے اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں اور یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور بلادِ شام اور مصر اور کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا

---

[1] غلام احمد قادیانی، مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۵

اشاعت کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلط خیالات
چھوڑ دئیے جو نافہم مُلّاؤں کی تعلیم سے اُن کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی
خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے
تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکتا۔" [1]

جس طرح اپنے دَور میں جعفر بنگال اور صادق دکن ممتاز تھے اور اپنے سیاہ کارناموں کو سرمایۂ افتخار سمجھا کرتے تھے اس طرح اپنے پیش رو حضرات سے مرزا صاحب ملت فروشی یا دین فروشی میں کم تھوڑے ہی رہ گئے تھے جو یہ فخر نہ کرتے بلکہ معلوم تو یوں ہوتا ہے کہ موصوف اپنے میدان کے سارے کھلاڑیوں کو مات دے کر سب سے ممتاز ہو گئے تھے۔ اسی اسلام دشمنی اور ملت فروشی کے باعث انھیں خود احساس تھا کہ کسی بھی اسلامی ملک میں، کوئی مسلمان حکمران، ان کے وجود کو برداشت نہ کر سکے گا اور برٹش گورنمنٹ کے ماتحت اور اس کی سرپرستی میں جو یہ عظیم فتنہ پرورش پا رہا ہے، اسلامی حکومت اسے بڑے اکھاڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس حقیقت کا سر سید احمد خاں علی گڑھی اور مولوی محمد حسین بٹالوی کی طرح خود مرزا صاحب نے علی الاعلان اور بغیر کسی ہیر پھیر کے یوں اعتراف کیا ہے:

"خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اور میری جماعت کی پناہ اس
سلطنت (برٹش گورنمنٹ) کو بنا دیا ہے۔ یہ امن جو اس سلطنت کے زیر سایہ
ہمیں حاصل ہے، نہ یہ امن مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے اور نہ مدینہ میں اور نہ
سلطانِ روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں۔" [2]

دوسری جگہ موصوف نے اور وضاحت سے اسی امر کا واشگاف اعتراف یوں کیا ہے:

"اگرچہ اس محسن گورنمنٹ کا ہر ایک پر رعایا میں سے شکر واجب ہے، مگر میں
خیال کرتا ہوں کہ مجھ پر سب سے زیادہ واجب ہے، کیونکہ یہ میرے اعلیٰ

---

[1] غلام احمد قادیانی مرزا: ستارۂ قیصرہ، ص،
[2] غلام احمد قادیانی مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۸

مقاصد جو جناب قیصرۂ ہند کی حکومت کے سایہ کے نیچے انجام پذیر ہو رہے ہیں، ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہ کسی اور گورنمنٹ کے زیرِ سایہ انجام پذیر ہو سکتے، اگرچہ وہ اسلامی گورنمنٹ ہی ہوتی۔"[1]

مرزا صاحب اِس امر کے بھی معترف ہیں کہ انھیں ملکہ وکٹوریہ کے حکم سے نبی بنایا گیا تھا۔ نبی بنانے والے گورنر جنرل یا وائسرائے کا نام چونکہ انھوں نے تحریر نہیں کیا، لہٰذا اس کے ذکر کو چھوڑ کر ملکۂ برطانیہ کے متعلق بیان ملاحظہ ہو:

"اے بابرکت قیصرۂ ہند! تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں۔ خدا کی رحمت کا سایہ اس رعایا پر ہے جس پر تیرا ہاتھ ہے۔ تیری ہی پاک نیتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔"[2]

مرزا غلام احمد قادیانی کو ملکہ وکٹوریہ کے جس ماتحت حاکم نے نبی بنایا تھا، اس سے اُس کا مقصود کیا تھا اور مرزا صاحب کو کس ڈیوٹی پر مامور کیا گیا تھا؟ موصوف نے اس سوال کا جواب خود یوں دیا ہے:

"اُس نے اپنے قدیم وعدہ کے موافق، جو مسیح موعود کے آنے کی نسبت تھا، آسمان سے مجھے بھیجا، تا میں اس مردِ خدا کے رنگ میں ہو کر جو بیت اللحم میں پیدا ہوا اور ناصرہ میں پرورش پائی، حضور ملکۂ معظمہ کے نیک اور بابرکت مقاصد کی اعانت میں مشغول رہوں۔"[3]

موصوف کو اعتراف تھا کہ وہ انگریزی حکومت کا خود کاشتہ پودا ہیں، اسی لیے اپنے نبی بنانے والوں کی خدمت میں اپنی خدمات یاد دلا کر، یوں دست بستہ عرض پرداز ہوئے تھے:

"التماس ہے کہ سرکار دولت مدار، ایسے خاندان کی نسبت، جس کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار، جانثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی

---

[1] غلام احمد قادیانی مرزا: تحفۂ قیصریہ، ص ۲۷

[2] غلام احمد قادیانی مرزا: ستارۂ قیصرہ، ص ۱۵

[3] ایضاً، ص ۱۰

نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کا خیر خواہ اور خدمت گزار رہے ہیں۔ اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط سے اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت و مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔" لہ

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

شیعہ حضرات

متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں بسنے والے مسلمانوں کا مذہب ، اہلسنت وجماعت تو جن کو آجکل بریلوی مکتب فکر کے نام سے موسوم کیا جانے لگا ہے اور جملہ جماعتیں جو آج کل نظر آرہی ہیں وہ انگریزی دور حکومت میں اسی جماعت سے ، برٹش گورنمنٹ کے تخریبی منصوبے کے تحت ، جدا ہو کر بنی تھیں ، ماسوائے شیعہ حضرات کے جو سرزمین پاک وہند میں مغلوں کے دور سے موجود تھے لیکن انتہائی اقلیت میں ، یعنی آٹے میں نمک کے برابر۔ ان حضرات نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا کہ برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ بن کر رہیں ، اسی لیے انگریزوں کے خلاف انھوں نے کبھی کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ شیعہ صاحبان کی اس وفاداری کا تذکرہ ولیم ہنٹر نے یوں اعتراف کیا ہے :

"بغاوت کے غیر ضروری ہونے پر ان کا اعلان بغیر کسی دباؤ کے واقع ہوا اور یہ بات نہایت ہی خوب ہے کہ ایسا اعلان باضابطہ طور پر تحریر میں آگیا۔ اس دستاویز پر مستند اور قابل اعتماد شیعہ علماء کی مہریں ثبت ہیں اور یہ پورا فرقہ

لہ غلام احمد قادیانی مرزا ، تبلیغ رسالت ، جلد ۷ ، ص ۱۹

اس پر ہمیشہ عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اس قسم کے باقاعدہ وعدوں کے بغیر بھی وہ قدرتاً وفادار ہیں۔"[1]

ڈاکٹر ولیم ہنٹر کے بیان کے متعلق سرسید احمد خاں صاحب کے اپنے تاثرات یہ ہیں:

"اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے شیعہ لوگوں کا کچھ ذکر لکھا ہے اور جو تعریف اُن لوگوں کی کی ہے گو وہ بھی مشروط بہ شرائط ہیں، لیکن میں اس طرح سے بھی خوش ہوں کیونکہ میری دانست میں یہی غنیمت ہے کہ اس عالم ڈاکٹر نے مسلمانوں کے ایک فرقہ کی تو تعریف کی۔ چنانچہ میں اُن کی اس قدر مہربانی اور رحم کا شکر گزار ہوں۔"[2]

قارئین کرام! جن حضرات کو برٹش گورنمنٹ نے سرزمین پاک و ہند سے اپنا آلۂ کار بنا کر ان سے تخریبِ دین کا کام لیا، اُن سے مسلمانوں کی ملّی وحدت کو پارہ پارہ کروایا، ایک اسلام کے متعدد جعلی اسلام بنوائے اور اس طرح یہاں کے مسلمانوں کو ایک پریشان کن مصیبت میں مبتلا کر کے اُن کی طاقت کو منتشر اور دین و ایمان کو تباہ و برباد کروایا، ایسی سیکڑوں ہستیوں میں سے چند نامور حضرات کی اس باب میں نشان دہی کی گئی ہے اور اُن کے بارے میں جو بیانات پیش کیے ہیں، وہاں بھی مقصود ایسے جملہ بیانات کا حصر ہرگز نہیں تھا، بلکہ نمونے کے طور پر چند واضح اور غیر مبہم عبارتیں پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے کیونکہ پرکھنے والے تو ان کی روشنی میں بھی کھرے اور کھوٹے سکوں کو پہچان سکیں گے پھر طوالت کی کیا ضرورت؟

غیر مسلموں سے دوستی کا شرعی حکم کیا ہے؟ اس بارے میں آگے مستقل عنوان کے تحت بقدرِ کفایت جواب موجود ہے۔ لیکن یہ تو نرالا ہی ستم ہے کہ یہاں معاملہ دوستی پر بھی ختم نہ ہوا بلکہ ایجنٹ اور آلۂ کار تک بن گئے۔ اگر کلامِ الٰہی کو سامنے رکھتے، اُس پر یقین ہوتا، اپنے پیدا کرنے والے کی بات سنتے تو ہرگز بھی اُن دشمنانِ دین کے پھندے میں نہ پھنستے جبکہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں بھی کلامِ الٰہی یوں خبردار کر رہا تھا:

---

[1] ولیم ہنٹر ڈاکٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۰۹

[2] سرسید احمد خاں: ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، ص ۷۶

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ	وہ جو کافر ہیں، کتابی یا مشرک، وہ نہیں
الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ	چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی اترے تمہارے
عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ [1]	رب کے پاس سے۔

کیا اُن حضرات نے اِس حقیقت کو مدِ نظر رکھا؟ باری تعالیٰ شانہٗ فرماتے کہ اہلِ کتاب کبھی تمہاری بھلائی نہیں چاہتے۔ لیکن اُن حضرات نے باری تعالیٰ شانہٗ کی نعمتوں کے خزانوں کی کنجیاں ہی شاید برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں میں سمجھ رکھی تھیں کہ خدا سے منہ موڑ لیا اور حکومت سے رشتہ جوڑ لیا۔ کاش! وہ قرآن کریم سے یہ پوچھ لیتے کہ اہلِ کتاب بھی اگر ہماری بھلائی میں خوش نہیں تو آخر کس بات میں خوش ہیں؟ اگر وہ اتنا پوچھنے کی زحمت برداشت کرتے تو اللہ تعالیٰ کا کلام معجز نظام اُنھیں واضح طور پر یہ بتاتا کہ:

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ	بہت کتابیوں نے چاہا، کاش تمہیں
مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ	ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں اپنے
عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ	دلوں کی جلن سے، بعد اس کے کہ حق اُن
الْحَقُّ ۚ [2]	پر خوب ظاہر ہو چکا ہے۔

مسلمانو! کلامِ الٰہی کی سنو کہ اکثر اہلِ کتاب کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جلن اُٹھتی رہتی ہے اور اُسے بجھانے کی خاطر وہ یہی حربہ استعمال کرتے ہیں کہ مسلمان سے کافر بنا دیں۔ جاتے غور ہے کہ جو حضرات اُن حاسدوں کی جھولی میں جا گرے تھے کیا انگریزی ڈھنڈورچیوں کے مطابق واقعی امیر المؤمنین، مصلح، ریفارمر، نبی اور شمس العلماء بنایا تھا؟ قرآن کو سچا سمجھ کر جہاں اُن کا بس چلے وہ مسلمان کو کفر کی طرف پھیرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اب بھی کوئی شک باقی رہ گیا ہے اور ارشادِ ربانی اور سُن لو کہ اہلِ کتاب کبھی مسلمان سے کس صورت میں اور کب راضی ہو سکتے ہیں؟ یہ کسی مولوی کا فتویٰ نہیں کلامِ الٰہی کی ایک روشن آیت کا حصہ ہے:

---

[1] البقرہ: آیت ۱۰۵

[2] البقرہ: آیت ۱۰۹

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ [1]	اور ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم اُن کے دین کی پیروی نہ کرو۔

اب تو واضح ہو گیا کہ مسلمان کو مسلمان ہی دیکھتے ہوئے یہود اور نصاریٰ کبھی راضی نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر خوش ہوں گے تو اسلام سے ہٹا کر اور اپنی ملت کا تابع بنا کر خوش ہوں گے۔ سوچیے ذرا، جن حضرات نے برٹش گورنمنٹ کو راضی کرنا ہی اپنی زندگیوں کا مقصد اور اپنا اوّلین نصب العین بنا رکھا تھا، قرآنِ کریم کے آئینے میں دیکھیے کہ انگریزوں نے انھیں کیا بنایا ہوگا اور اُن سے کب جا کر راضی ہوئے ہوں گے؟ اور دیکھیے کلامِ الٰہی یوں بھی خبردار کر رہا تھا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ [2]	اے ایمان والو! اگر تم کچھ کتابیوں کے کہے پر چلے تو وُہ تمھارے ایمان کے بعد تمھیں کافر کر چھوڑیں گے۔

یہاں بھی صاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ اہلِ کتاب تمھیں مصلح یا ریفارمر وغیرہ کچھ بھی نہیں بنائیں گے اگرچہ دھوکے میں رکھنے کے لیے لیبل تمھاری پیشانیوں پر ایسے ہی لگائیں گے، ورنہ حقیقت میں وُہ تمھیں مسلمان نما کافر بنائیں گے۔ مصلح وغیرہ تو جب بنائیں کہ انھیں اسلام کی خیرخواہی منظور ہو، ابھی ارشادِ ربانی سُنا کہ اُن کے دِلوں میں تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حسد کی آگ بھڑکتی رہتی ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ اس آگ کو اسی طرح بجھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں کہ اسلام سے پھر جائیں یا اُن کی ملت کا ایک جزو بن جائیں۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُمْ۔

قارئینِ کرام! آپ نے انگریز دوستوں کے اپنے یا اُن کے متعلق ایک دُوسرے کے بیانات ملاحظہ فرمائیے اور اب آخر میں ارشاداتِ خداوندی سُنیے۔ اِن کی روشنی میں مذکورہ حضرات دین کے خیرخواہ تھے یا بدخواہ، خدا ترس تھے یا خوفِ خدا سے عاری، ملت کے غمخوار تھے یا زر پرست،

---

[1] البقرہ، آیت ۱۲۰

[2] آلِ عمران، آیت ۱۰۰

مصلح اور رہنما سمجھتے یا افتراق بین المسلمین کے ٹھیکیدار ؟ اس امر کا فیصلہ کرنا اور اسی فیصلے کو عملی جامہ پہنانا یہ آپ حضرات کی ذمہ داری ہے۔

مذکورہ صورت حال کے برعکس، راقم الحروف کو علی الاعلان یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کی حقیقی اور قدیمی جماعت، سواد اعظم اہلسنت و جماعت کے کسی ذمہ دار عالم کے متعلق اس قسم کا ایک بیان بھی نہیں دکھایا جا سکتا کہ انہوں نے برٹش گورنمنٹ کی حمایت کی ہو، یا انگریزوں کے اشارے پر یا کسی بھی وجہ سے اسلامی عقائد و نظریات میں اپنی طرف سے معمولی رد و بدل بھی کی ہو۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء - احقر یہ بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہے کہ ہماری جماعت (جسے بدمذہبوں نے بریلوی فرقہ کہنا شروع کیا ہوا ہے) وہی چودہ سو سال سے چلی آنے والی قدیمی جماعت ہے اور ہمارے عقاید و نظریات وہی ہیں جو شروع سے لے کر اب تک متوارث چلے آ رہے ہیں۔ باری تعالیٰ شانہٗ ہمیں اسی جماعت میں رکھے جملہ مدعیان اسلام کو بھی ہدایت نصیب فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو - آمین یا اللہ العظیم بحق سید المرسلین - ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب ٥ وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ محمد وعلیٰ آلہ و صحبہ اجمعین۔

باب پنجم

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن ست — چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ست

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

(اقبال)

وہابیہ کی زنّار دوستی

قارئین کرام! یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمان اپنی مرضی کا مالک اور مطلق العنان نہیں بلکہ احکامِ الٰہی کا پابند ہے۔ اس کے تعلقات رضائے الٰہی اور منشائے ایزدی کے تابع ہوتے ہیں۔ مسلمان کسی سے محبت کرے تو خدا کے لیے کرتا ہے اور کسی سے عداوت رکھے تو خدا کے لیے رکھتا ہے۔ اپنی مرضی سے یہ کسی سے بنانے اور بگاڑنے کا مجاز نہیں۔ باری تعالیٰ شانہٗ نے اس بارے میں جو حد بندی فرمائی ہے اُس سے تجاوز کرنا، گویا اسلام سے منحرف ہونا ہے۔

حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیے کہ ان حضرات نے سرزمین پاک و ہند میں تیرھویں صدی کے اوائل سے سچے اور پکے مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کا ناپاک مشغلہ اپنے ساختہ دین کا اوّلین رکن، ضابطۂ حیات کا اہم ترین باب اور بہترین توشۂ آخرت و زادِ راہ قرار دے کر اپنا اوڑھنا بچھونا یا دائمی وظیفہ یا تکیۂ کلام بنایا ہوا ہے اور سیکڑوں کتابیں بھی اسی منصوبے کے تحت بڑی آب و تاب سے شائع کروا چکے ہیں جن میں آیاتِ الٰہیہ و فرامینِ مصطفویہ کے معانی و مطالب میں تحریف کرتے وقت قطعاً خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا اور اس طرح ساری اُمتِ محمدیہ کو شرک کے سمندر میں دھکیل رہے ہیں گویا یہ اُمتِ مرحومہ ان کے نزدیک ایک اُمتِ ملعونہ ہے۔ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ سے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گیارہ سو سال سے یہ امت توحید جیسے بنیادی اور اہم ترین عقیدے سے دستبردار ہو کر اس سے ناآشنا ہو گئی تھی اور گیارہ سو سال تک مسلمانانِ عالم اس عقیدۂ توحید سے ناواقف رہے تھے جس پر اہلِ اسلام کو بجا طور پر ناز ہے۔

گویا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو توحید کا جو درس دیا تھا اور اس سرکار کے جاں نثار یعنی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جس توحید کے علمبردار اور مبلغ بنائے گئے تھے، ان کرم فرماؤں کے نزدیک اسی مایۂ ناز عقیدۂ توحید کو اہلسنت وجماعت کے علمائے کرام اور اولیائے عظام نے گیارہ سو سال سے شرک کی گمنامی میں ملائے رکھا اور

اہل جنت عین زمانہ کے نزدیک اصل عقیدۂ توحید اب وہی ہے جو محمد بن عبدالوہاب نجدی نے خار
کے مردہ جسم میں جان ڈال کر بارھویں صدی کے آخر میں پیش کیا اور "کتاب التوحید" کے ذ
پوری دنیا میں اس کی تبلیغ واشاعت کا انتظام کیا گیا۔

پاک و ہند میں موصوف کی "کتاب التوحید" کے اسباق کو اردو کا لباس پہنا کر مولوی محمد
دہلوی نے "تقویۃ الایمان" کے نام سے پیش کر کے مسلمانوں پر شرک و کفر کی گولہ باری کا فریضہ
انجام دیا۔

عقیدہ توحید کو غتر بود کرنے کی جسارت اور مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کا مآل "
ملاحظہ ہو کہ قدرت نے ان لوگوں کو اقوام عالم کے سامنے کس انداز میں سزا دی ؟ کیا مسلم
جیسی غیور قوم کے لیے یہ باعث ننگ و عار نہیں کہ وہ کافروں اور مشرکوں کا آلۂ کار بن کر
جیتے ؟ مسلمانوں کو مشرک بتانے والوں کو قدرت نے یہ سزا دی کہ وہ برضا و رغبت مشرکین ہند
کے نہ صرف غلام بنے بلکہ بت پرستوں کے بندۂ بے دام بنے۔ باری تعالیٰ شانہٗ سب کو ا
ہدایت نصیب فرمائے ۔ آمین۔

اب میں ان حضرت کی نازدہ ہستی کے چند واقعات و بیانات پیش کرتا ہوں۔ آئیے
سب سے پہلے بڑی دکان پر چلتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے
سیکرٹری کون صاحب تھے ؟ :

"ہمیں افسوس ہے کہ ہم شاہ صاحب (مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی) کا خط بلفظہٖ
نقل نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ جو کاغذات منشی ہیرا لال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے
ہمیں ملے ہیں، وہ علاوہ پارہ پارہ ہونے کے ایسے بدخط لکھے ہوئے ہیں کہ
ہم بلفظہٖ نقل کرنے کا فخر حاصل نہ کر سکے" لہ

سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے ساتھیوں نے صوبہ سرحد میں جو جنگیں
لڑیں جنھیں جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔ ان بانکے مجاہدین میں سے ایک نامور مجاہد سے ملے

لہ مرزا حیرت دہلوی : حیات طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ۱۹۷۶ء ، ص ۴۰

رئینِ کرام کو مطلع کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

"اِدھر اپنے مورچے سے بوقتِ شب سید صاحب نے اپنی فوج براہِ جبلالہ واپس کرنی شروع کر دی۔ ایک راجپوت ہندو، جو مولوی احمد اللہ کے ساتھ بیسواڑہ سے جا کر شریکِ لشکرِ اسلام تھا مورچے میں باقی رہ گیا، جو صبح تک تنہا دونوں توپوں کو چلاتا رہا۔ بوقتِ صبح راجہ رام بھی بمقابلہ جبلالہ اپنے لشکر سے آ ملا۔ اُدھر دُرّانی مارے خوفِ شبخون کے اپنے مورچے چھوڑ کر رات کو بھاگ گئے اور دوپہر تک واپس نہ آئے۔" [1]

جب سید احمد صاحب کی فوج دُرّانیوں کے خون سے ہولی کھیل رہی تھی تو سید صاحب کے جب مجاہد اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے چہیتے اور منظورِ نظر توپچی یعنی راجہ رام صاحب کس بے جگری سے خدا کی راہ میں جہاد کر رہے تھے:

"مولانا نے تلوار کا پھرتی سے وار کر کے اُس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا توپچی بھی یُوں مارا گیا۔ مولانا شہید نے فوراً وہ دونوں توپیں دُرّانیوں کی طرف پھیر کے فیر کرنے شروع کیے۔ ایک وفادار ہندو جو مولانا شہید پر فریفتہ تھا (راجہ رام قوم راجپوت باشندۂ بیسواڑہ) گولہ اندازی پر مقرر ہوا۔ اُس نے اِس قدر پھرتی سے گولہ اندازی کی کہ دُرّانیوں کے پیر اُکھڑ گئے۔" [2]

جناب غلام رسول مہر کی زبانی بھی راجہ رام کے اِس جہاد کی مختصر سی کہانی ہدیۂ قارئین ہے:

"یہ آٹھ دس آدمی تھے، جن میں سے شیخ امجد علی غازی پوری، حافظ رحیم بخش الٰہ آبادی، اور حافظ عبد اللطیف نیوتنوی (برادر مولوی عبد الحق) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ہندو راجا رام نامی بھی تھا، جو بیسواڑہ (تنزدسلون) کا باشندہ تھا۔ اُس نے اپنا قصہ یُوں بیان کیا کہ میں مورچے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۰

[2] مرزا حیرت دہلوی: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۷

میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کسی کو نہ پایا۔ بستی میں جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ تمام غازی اُس فوج پر شبخون مارنے کے لیے گئے ہیں، جو دوآبہ کی طرف سے کمک کے طور پر آ رہی تھی۔ میں یہ سُن کر توپوں کے پاس پہنچا۔ اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا دشمن (دُرّانی) توپیں لے جائیں، اُن میں گولے بھر بھر کر چلانے لگا۔"[1]

راجہ رام کے ایسے ہی کارناموں پر سیّد صاحب نے اُسے قبولیت کی سند جن لفظوں میں فرمائی وہ بھی ملاحظہ ہوں، تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے:

"سیّد صاحب نے راجہ رام کی بہادری اور حُسنِ تدبیر کی ستائش فرمائی۔"[2]

حادثۂ بالاکوٹ کے بعد شیر سنگھ نے سیّد احمد صاحب کی لاش کے ساتھ کیا سلوک ملاحظہ ہو:

"یہ بھی ایک روایت ہے کہ آپ کی شہادت کے بعد راجہ شیر سنگھ خلف مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جو سکھوں کی فوج کا جرنیل تھا، آپ کی لاش پر دو شالہ ڈال کر بہت عزّت سے آپ کو دفن کرا دیا۔"[3]

بعض لوگوں نے اس روایت کو مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی پر چسپاں کیا ہے (واللہ اعلم) اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کا خیال بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن دیگر وہابی مورخین اس اعزاز کو سیّد صاحب کے ساتھ ہی مخصوص کرتے ہیں، جناب غلام رسول مہر کی وضاحت ملاحظہ فرمالی جائے، وہ یوں رقمطراز ہیں:

"شیر سنگھ نے اُن گرفتاروں سے کہا کہ لاشوں میں سے ہم کو بتاؤ، خلیفہ صاحب (یعنی سیّد احمد صاحب) کی لاش کون سی ہے؟ اگر تم سچ سچ بتا دو گے تو تم کو چھوڑ دیں گے۔ پھر انھوں نے کھیت میں جا بجا پھر کر لاشوں کو دیکھا،

---

[1] غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۵۵، ۲۵۶

[2] ایضاً: ص ۲۵۶

[3] محمد جعفر تھانیسری: حیات سیّد احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۳۱۶

ایک لاش بے سر کی تھی، اُنھوں نے کہا کہ یہ لاش خلیفہ صاحب کی معلوم ہوتی ہے مگر اِس کا سر بھی ہو تو ہم بتادیں، پھر شیر سنگھ نے اُس کا سر تلاش کروا کر منگایا اور اُس لاش میں ملوایا، تب اُنھوں نے کہا، ہاں خلیفہ صاحب کی لاش یہی ہے۔ پھر شیر سنگھ نے ایک دوشالا اُس لاش پر ڈلوایا، ڈھاکہ کی خاصے کے اور پچیس روپے نقد دیے اور کہا: جس طرح تم مسلمانوں کا دستور ہے کفن دے کر اِس کو دفن کر دو۔ پھر اِدھر اُدھر سے ملکی مسلمان بھی آکر جمع ہوئے اور کفن دے کر اُس لاش کو دفن کیا اور وہ روپے نقد خیرات کیے گئے۔" [۱]

مہر صاحب نے ویران امرتا تھ کے ظفر نامے سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ شیر سنگھ نے سید صاحب کی تصویر بھی بنوائی تھی، یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ کیوں بنوائی، بہر حال بنوائی گئی۔ چنانچہ موصوف یوں لکھتے ہیں:

"شیر سنگھ سید صاحب کی نعش کی طرف متوجہ ہوا اور ایک ماہر کار مصور کو مقرر کیا تاکہ اُن کی تصویر ہو بہو کھینچے۔ جب اُس علاقے کے نظم و نسق سے فارغ ہو کر دربار میں پہنچا، رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا۔ شیر سنگھ کو کلغی اور خلعت کے علاوہ بہت انعام دیے اور زیادہ سے زیادہ مہربانیاں کیں۔ خلیفہ صاحب کی تصویر سے جوانمردی کی بُو سونگھ کر کہا: "آفرین"۔ اور منصفانہ تعریف کی۔ میں نے بھی وہ تصویر دیکھی، لیکن اِس بات پر حیران ہوا کہ صورت کے درویش ہونے کے باوجود سلطانی و حکمرانی کی خواہش نفسانیت نے پیدا کی اور اگر مذہبی اختلاف کی بنا پر یہ سب کچھ عمل میں آیا تو سمجھنا چاہیے کہ خلیفہ صاحب صفوت و صفا سے بے خبر تھے۔" [۲]

سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی اِن مجاہدانہ جنگی سرگرمیوں کے بارے میں خود وہابی

---

[۱] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۲، ۲۰۳

[۲] ایضاً: ص ۲۰۸، ۲۰۹

حضرات کی زبانی یہ اقرار ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں بھی ہندو مسلم اتحاد کار فرما تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ حضرت سید احمد شہید کی تحریک ۱۸۲۴ء اور جہادِ حریت ۱۸۵۷ء میں بھی ہندو مسلم اتحاد کام کر رہا تھا۔"[۱]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام الوہابیہ کی اس تحریک جہاد کے بارے میں دیوبندی نقطۂ نظر کی پوری طرح وضاحت کر دی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مولوی حسین احمد ٹانڈوی نے یوں تصریح کی ہے:

"ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمانانِ پنجاب کی حد درجہ پامالی و زبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالمقابل صف آرا ہونا اور آخر معرکۂ بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا، ورنہ اصل یہ ہے کہ سید صاحب کا مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط و اقتدار سے نجات دلانا تھا۔ انگریز خود اسے محسوس کرتے تھے اور اس تحریک سے بڑے خوفزدہ تھے، اسی بنا پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔"[۲]

ٹانڈوی صاحب کا نظریہ معلوم ہو گیا کہ ان کے نزدیک سید صاحب نے انگریزوں سے وطن آزاد کرانا تھا۔ سکھوں سے معرکہ آرائی مقصود نہ تھی، یہ ضمناً ہوئی جس سے انگریز خوش تھے اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہے تھے بلکہ ٹانڈوی صاحب نے یہ کھل کر اعتراف کر لیا کہ برٹش گورنمنٹ نے جنگی ضروریات کے سلسلے میں سید صاحب کی مدد کی تھی۔ اب یہ ملاحظہ فرمایا جائے کہ سکھوں سے سید صاحب کو کیوں لڑنا پڑا تھا:

"اس زمانہ میں مغربی پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی جو کہ انگریزوں کے

---

[۱] عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم، ۱۹۷۰ء، ص ۲۸۵

[۲] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: نقشِ حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی، ص ۱۲

حلیف تھے اور آپس میں (انگریزوں اور راجہ رنجیت سنگھ میں) زور دار معاہدے ہوچکے ہوئے تھے مگر حقیقت میں سکھوں سے لڑنے کا مقصد اصل ان بدیشیوں (انگریز) اور اُن کے معاونین سے لڑکر ملک کو اس مصیبت سے بچانا تھا اور رعایا پرست اُن کے وحشیانہ مظالم کو اُٹھا دینا اور بس" [1]

سید صاحب سکھوں سے کیوں لڑے؟ اِس کی ٹانڈوی صاحب نے وضاحت کردی۔ اب رہی یہ بات کہ انگریزوں کو تحدہ ہندوستان سے کیوں نکالنا چاہتے تھے؟ اس کا موصوف نے یُوں جواب دیا ہے :

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا، جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اسی بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اُن سے صاف صاف اُنھیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کردینا ہے۔ اِس کے بعد حکومت کس کی ہوگی؟ اِس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وُہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اِس سلسلے میں سرحد سے گوالیار کے مدار المہام اور مہاراجہ دولت راؤ سیندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وُہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اِس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت کے متعلق آپ کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔" [2]

ٹانڈوی صاحب نے اپنے اِسی بیان کو آگے چل کر یُوں مزید وضاحت کرتے ہُوئے تحریر کیا ہے :

"کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان میں ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا؟ اِس کا

---

[1] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، نقشِ حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی، ص ۵

[2] ایضاً، ص ۱۳

فیصد آپ عالیجناب صاحب ریاست و سیاست پر چھوڑتے ہیں، مگر ہندوؤں کو
یہ اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی
بنیاد کے مستحکم ہونے کا باعث سمجھیں اور پھر سید صاحب کا ہندو ریاستوں کو
مدد اور شرکت جنگ کی دعوت دینا اور اپنے توپ خانہ کا افسر راجہ رام راجپوت
کو مقرر کرنا خود اِس کی دلیل ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں بلکہ
شریکِ حکومت بنانا چاہتے تھے۔ بیشک سید صاحب جگہ جگہ اعلاءِ کلمۃ اللہ
اور دینِ رب العالمین کی خدمت کا ذکر کرتے اور اِسی کو اپنی مساعی کا محرک
بتاتے ہیں لیکن آپ یہ خوب سمجھتے تھے کہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہ ہی نہیں ہے
کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کی جائے اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ
وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے بلکہ اِس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ
برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں ہمنا شریک کرکے اسلامی فضائلِ اخلاق سے
اُن کے دلوں کو فتح کیا جائے۔ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی
آپ کے ذہن میں نہیں تھی، کیونکہ آپ کے نزدیک یہ دونوں بے حقیقت چیزیں
تھیں۔ جو اپنے عمل میں سب سے زیادہ پُرجوش، فداکار، سرگرم اور مخلص و
دیانت دار ہوگا، امامت اور لیڈرشپ اُسی کے ہاتھ میں رہے گی، خواہ اقلیت
کے فرقہ سے تعلق رکھے یا اکثریت کے فرقہ سے۔"[1]

سید احمد اینڈ کمپنی کی تحریکِ جہاد کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر محترم
دیوبندی حضرات کے عالیجناب شیخ الاسلام صاحب کا نظریہ قارئینِ کرام نے ملاحظہ
لیا۔ اگر صرف کو سچا مان لیا جائے تو یقیناً ہر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن
حالات میں سید احمد صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو شہید کس بنا پر کہا جاتا ہے! اِس
بجے یہ ایک ملک گیری کی جنگ تو کہلا سکتی ہے لیکن جہاد کیسا، ملکی جنگ بھی ایسی کہ اگر کامیابی

---

[1] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۱۵، ۱۶

نصیب ہو جائے تو انگریز ورکے ساتھ ہنود کی حکمرانی بھی بسر و چشم قبول، مشرکین ہند کو برابر کا شریک رکھا اُن سے وعدے کر بیٹے۔ خود وہابی حضرات دو بات کہے بغیر نہیں رہ سکتے جو ہم مذکورہ سطور میں عرض کر چکے، چنانچہ مولوی عامر عثمانی (المتوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) ٹانڈوی صاحب کی ان تصریحات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کوئی شک نہیں، اگر استاد محترم حضرت مدنی کے ارشادِ گرامی کو درست مان لیا جائے تو حضرت اسمٰعیل کی شہادت محض فسانہ بن جاتی ہے۔ مادّی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی کوشش کرنا ذرا بھی مقدس نصب العین نہیں۔ اس نصب العین میں کافر و مومن سب یکساں ہیں۔ اس طرح کی کوشش کے دوران مارا جانا اُس شہادت سے بھلا کیا تعلق رکھے گا جو اسلام کی ایک معزز ترین اور مخصوص اصطلاح ہے اور اس طرح کی کوششوں کے نتیجہ میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھانا اجرِ آخرت کا موجب کیوں ہو گا؟" [1]

خیر اس بات کا فیصلہ تو وہابی حضرات خود کر لیں کیونکہ ٹانڈوی صاحب کو اگر سچا سمجھا جائے گا تو مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد صاحب وغیرہ کو شہید کہنے والوں کو جھوٹا ماننا لازم آئے گا اور سید احمد صاحب وغیرہ کو اگر شہید ہی قرار دینا ہے تو صدرِ دیوبند مولوی حسین احمد صاحب کو جھوٹا ماننا پڑے گا:

ہمیں اب اس موضوع پر روشنی ڈالنی ہے کہ انگریزی حکومت میں کانگرس اور مسلم لیگ دو ایسی سیاسی جماعتیں ملک کے اندر موجود تھیں جو متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی رہنمائی کا دم بھرتی تھیں۔ کانگرس کو ہندو اور مسلمان وغیرہ جملہ اقوام کی رہنمائی اور اُن کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ تھا لیکن حقیقت میں وہ صرف ہنود کے مفادات کا تحفظ کرتی رہی اور خصوصاً مسلمانوں کو جانسا دبا ہوا تھا۔ ہندو لیڈروں نے اپنی قوم کو ہر لحاظ سے ترقی

---

[1] ماہنامہ تجلّی دیوبند، ڈاک نمبر، بابت مئی ۱۹۵۷ء

پہ گامزن کر دیا تھا جب ہندو ہر لحاظ سے مضبوط اور حکومت کی مشینری کے کل پرزے بن گئے
ہتھوں نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے اور مسلمانوں کو کچلنے کی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیا۔
انچہ کانگرس مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد پر آمادہ کرتی اور آزادیٔ ہند کی خاطر اس کی اہمیت کو
ن نشین کراتی۔ مہا سبھا اور جن سنگھ پارٹیوں کے ذریعے مسلم کشی کی مہم جاری رکھواتی اور
بنے زر خرید مسلمان لیڈروں اور علماء کے باعث مسلمانوں کو کانگرس سے دور بھی نہ ہونے دیتی
ندو مسلم اتحاد کا آزادی کی خاطر واسطہ دے کر راضی رکھ لیتے بلکہ وہ تحریروں کی جھنکار پر
ری مسحور و مسرور رہا کرتے تھے۔

اُن دنوں مسلمانوں کی سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ کے صدر حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب
ی تھے۔ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اس جماعت کا دعویٰ تھا لیکن اُن دنوں موصوف
ن گاندھی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلامیانِ ہند کی قسمت کا سودا کر چکے تھے۔ دوسری جانب
لانا محمد علی جوہر نے تحریکِ خلافت شروع کی۔ مسلمانوں نے اس میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ
۔ خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں نے اپنی بساط سے بھی زیادہ چندہ
حتیٰ کہ عورتوں نے زیور تک اتار کر دے دیے۔ موصوف کے ساتھ مسلمانوں کا ایک سیلاب
اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے ہندوستان میں دن گنے گئے ہیں اور
یزی اقتدار اب چند روز کا مہمان ہے۔ مسلمان بے حد خوش تھے اور ہندو حیران و ششدر
ت تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا تو صاف نظر آ گیا کہ
یکت سے مراد گاندھی کی امامتِ مطلقہ تھی اور مقاماتِ مقدسہ کی بازیابی کا مقصد سوراج
م راج (اکھنڈ بھارت) کا حصول تھا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تیسری جماعت بعض انگریز کے پروردہ علماء نے بنائی اور اس کا نام جمیعۃ العلمائے ہند
۔ ان دین فروش علماء کا کام صرف یہی تھا کہ گاندھی کی اسلام دشمن تجاویز پر شریعتِ مطہرہ
مُہر لگاتے رہا کریں اور بس۔ بد قسمتی سے یہ رہنمائی کے دعویدار قوم کا سب سے گمراہ ترین
قہ نکلا کیونکہ مسلمان ان کے جُبّہ و دستار پر اعتماد کر کے ان کے فتووں کو شریعت کے
ابق گردانتے ہوئے گاندھویت کے چکر میں پھنس جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی احرار پارٹی

بھی پنجاب میں یہی کردار ادا کر رہی تھی۔ فریقین کی اور بھی کئی جماعتیں تھیں لیکن وہ مذکورہ جماعتوں کی ذیلی شاخ ہی تھیں لہٰذا ان کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں۔ اب مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء اور احرار پارٹی کی گاندھویت کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کس طرح ہندو مفادات کا تحفظ کیا اور رہنمائی کے بھیس میں کس طرح مسلمانوں کے مفادات پر کاری ضربیں لگائی گئیں۔

گائے کی قربانی اور گاندھوی ٹولہ

ایک وقت تھا کہ متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی نمائندگی کانگرس کر رہی تھی۔ مسلم لیگ کا وجود اُن دنوں قومی مفادات کے لحاظ سے برائے نام تھا۔ کانگرس میں ہندو لیڈروں کی اکثریت تھی۔ اس میں بھی جتنے مسلمان لیڈر شامل تھے وہ بھی کسی مرحلے پر اپنی قوم کو بحیثیت ایک رہنما کے فائدہ پہنچانے سے مجبور ہی بنے رہے یا ایسی صلاحیت ہی سے عاری تھے۔ غلامی کے اس دور میں ہندو لیڈروں نے اپنے بیدار مغز ہونے کا واضح ثبوت دیا اور اپنی قوم کو مادی لحاظ سے اُبھارنے کا جامع منصوبہ تیار کر کے اُسے عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے۔ مولانا سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء) نے اس حقیقت کا تجزیہ یوں کیا ہے:

> ہندوؤں نے جب مسلمانوں کی نہ صرف کنارہ کشی بلکہ کانگرس کے مقاصد و طرزِ عمل سے مخالفت و بیزاری دیکھی اور ان کی جانب سے انھیں مایوسی ہوئی تو انھوں نے نہایت ہی عزم و استقلال سے حکیمانہ انداز پر اپنی قومی رفتار کی حرکت تین سمتوں میں منقسم کر دی۔
>
> ایک جماعت نے اقتصادیات کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اکتسابِ دولت کے جس قدر ذرائع اور وسائل تھے انھیں اپنے ہاتھوں میں لے لینے میں ساعی و کوشاں ہوئے، خصوصیت کے ساتھ ساہوکاری کو اس سلیقہ سے انجام دیا کہ پچاس برس کے عرصہ میں مسلمانوں کی تقریباً ساری دولت سمٹ کر ہندوؤں

کی ملکیت ہو گئی اِذ ماشاء اللہ۔

دوسری جماعت نے تعلیم اور اس کے ثمرات کی طرف قدم بڑھایا اور اِس راہ میں بھی اُنھیں بے انتہا کامیابی حاصل ہوئی۔ خاص ہندوؤں کی تعلیم گاہوں کا شمار جو کیا گیا ہے اور پھر اُس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی درس گاہیں رکھی گئیں تو گویا وہی نقشہ سامنے آگیا ہے جو سال دولت کا مقابلہ کرتے ہوئے پیشِ نظر ہو چکا ہے۔ تعلیم کے بعد ملازمت اور علمی پیشہ کا میدان سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی ہندوؤں کا مقابلہ مسلمانوں سے وہی نتیجہ دیتا ہے جو سابق کے دو مقابلوں میں حاصل ہو چکا ہے۔

تیسری جماعت نے عملاً سیاسیات کی طرف اپنا قدم بڑھایا اور نہایت عزم و استقلال سے اِس حوصلہ شکن، صبر آزما راہ پر چلنے لگے۔ اِس میں شک نہیں کہ سیاست کی راہ بہت ہی پُر خطر تھی۔ اس کی سنگلاخ زمین قدم قدم پر پُر خار وادی سامنے لاتی تھی، جس پر چلنا اپنے تلووں کو زخموں سے چُور چُور اور پاؤں کو گھائل بنانا تھا۔ لیکن ہندوؤں کے عزم اور ہمتِ مردانہ کی داد دینی چاہیے جنھوں نے نہایت ذوق و شوق سے اِس پیچ در پیچ خار زار سے نہ صرف گزر جانے کا بلکہ اِس راہ کو صاف کر دینے کا عزم کر لیا تھا۔ اُن کے لیے ہر نوکِ خار لذت افزا اور ولولہ انگیز تھی۔ ہر ٹھوکرِ سنگِ راہ کی اُن کے سمندِ شوق کے لیے مہمیز تھی، قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھریاں قصر و ایوان کے راحت و فضا سے ہمسری کرتی تھیں۔ طوق و سلاسل کی جھنکار اور آہنی زنجیروں کی سیاہی مرقعِ تدبیروں کی چمک دمک اور اُن کی آواز سے زیادہ گوش نواز اور نظر افروز تھی کہ

ــــ ہندو لیڈروں نے ہر لحاظ سے اپنی قوم کو مضبوط اور منظم کر لیا حتیٰ کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ برٹش گورنمنٹ سے ٹکرا کر اُس کی چولیں ہلا دیں اور آزادی کی منزلِ مقصود تک پہنچ

ــــ سلیمان اشرف، مولانا، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ص ۴۱، ۴۲

یہ نہیں ۔ کرنے میں جانی قربانیاں پیش کی جاتی ہیں ۔ یہ وقت تھا لیڈروں کے امتحان کا کہ ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کو اپنے قومی مفاد کی خاطر قربانی کا بکرا بننے پر رضامند کر لیا لیکن مسلمانوں کے لیڈر اتنے نااہل اور بپتسری ثابت ہوئے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ہاتھوں ذبح قربان گاہ پہ سوراج کی خاطر بھینٹ چڑھانے کے لیے تحفظِ خلافت اور حصولِ آزادی وغیرہ کا جھانسہ دے کر لے جاتے تھے ۔ یہ واقعات ہمارے ایک دیدہ ور اور مردِ حق آگاہ کی زبانی سُنیے اور فراستِ مومن کی داد دیجیے :

"یہ سب کچھ تھا لیکن حکومت کی ہمکاری جس چڑھاوے اور قربانی کی خواہاں تھی اب تک ہندوؤں کے ہاتھوں نے وہ نذرانہ پیش نہیں کیا تھا ، اسی لیے سلف گورنمنٹ اور ہوم رول کا خوشنما منظر قریب تو ہوگیا تھا لیکن حجابات کے پردے ہنوز اُس پر پڑے ہوئے تھے ۔ ضرورت تھی کہ بہت سی جانیں حکومت کی دیبی پر بھینٹ چڑھا دی جائیں ۔ سیاست کے سارے منازل میں یہ منزل سخت ترین تھی ۔ قُرب شرق کی آگ بھڑکا رہا تھا اور جان کی اضاعت دامن پکڑتی تھی ۔ مُکتی اور رائیگاں جانوں کی تلاش تھی ۔ بالآخر امعانِ نظر اور تعمقِ فکر کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ تینوں جماعتیں اپنے سی سالہ کمائے ہوئے سرمایہ کی اِس طرزِ خاص سے ایک جھلک مسلمانوں کو دکھائیں کہ اُن کی نگاہیں خیرہ اور عقول حیرت زدہ ہوجائیں ۔ کچھ اپنا خیر و شر اُنھیں نہ سجھائی دے نہ سمجھ میں آئے ، ہاں اِس پراگندگی حواس میں اپنی رہی سہی ہستی کھو بیٹھیں ۔ اس عمل سے قربانی کی ضرورت بھی پُوری ہو جائے گی اور یہ پہلو کا کانٹا (وجودِ مسلم) بھی نکل جائے گا ۔" [1]

جب ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے اُن ناخداؤں کو اپنی کمائی کی جھلک دکھائی تو ہمارے لیڈر بننے والے بک گئے ، زنّار داروں پر ہزار جان سے قربان ہوگئے ، جس کی وجوہات یہ ہیں :

---

[1] سلیمان اشرف ، مولانا : النور ، ص ۳۲ ، ۳۳

اِس سحر سامری کو مسلمانوں کی آنکھوں نے جب دیکھا تو اُنھیں صاف نظر آیا کہ ہندوستان کی دولت اور سرمایۂ دولت ایک جماعت کے ہاتھوں میں ہے ماہرین علوم مغربیہ جوق در جوق ایک دُوسری جماعت کے ساتھ ساتھ ہیں۔ تیسری جماعت ایک سلطنت گورنمنٹ کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہے اور اشارہ قریب کر رہی ہے۔ وُہ ساعت دُور نہیں جبکہ یہ جماعتیں متحد ہو جائیں تو دولت، علم اور حکومت تینوں کا اجتماع قوم ہنود میں ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں نے للچائی ہُوئی نظر سے اِس جماعت کو دیکھا اور تڑپ کر رہ گئے، اِس لیے کہ اِس دَور فرصت میں جبکہ ہندو اپنی قوم میں زندگی کی رُوح پھونک رہے تھے اور حکیمانہ طرز پر اُن اسباب کی فراہمی میں مصروف تھے جن کے اجتماع کا نتیجہ قوم کا زندہ ہو جانا ہے۔ مسلمان نہایت اطمینان و سکون سے اُس راہ پر برابر قدم بڑھاتے جا رہے تھے، جس کا نتیجہ پستی اور مُردہ قوم بن کر رہنا ہے۔

یہ دولت بگاڑتے تھے، وُہ ثروت بنا رہے تھے، یہ بیچتے تھے وہ خریدتے تھے، یہ قرض سُودی لیتے تھے وُہ سُود در سُود کے پیچ میں اِن کی جائدادیں وصول کرتے تھے، وُہ پڑھ رہے تھے پڑھا رہے تھے یہ تعلیم کے نام سے کانپ کانپ اُٹھتے تھے، وُہ محنت کرتے تھے، جفاکشی اُٹھاتے تھے یہ کاہلی اور تن آسانی کی لذتیں لے رہے تھے، وُہ معاشرت میں کفایت شعاری ملحوظ رکھتے تھے یہ اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر معاشرت میں رنگینی پیدا کرتے تھے، وُہ باہمی مخالفت مذہبی کے پھر بھی ایک زبردست مرکز اتحاد رکھتے تھے یہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اختلاف کرتے تھے اور عداوت کی حد تک آگے پہنچا کر چھوڑتے تھے۔ آخر اِس کا نتیجہ یہی تھا کہ دنیا میں باقی تو رہیں لیکن مفلس، جاہل اور بداخلاق ہو کر نمونۂ عبرت و بصارت ہوں۔ نہ ان میں حمیت ہو نہ غیرت، نہ صدق و صفا پایا جائے نہ عہد و وفا۔ ایسی حالت میں حریصانہ نظر سے ہندوؤں کی طرف

دیکھنا بجز اس کے اور کیا ثمرہ دیتا کہ حسرت و ارمان دل میں خون ہو کر رہ جائیں۔
موجودہ حالت میں یہ کس مرض کی دوا رہ گئے تھے جو انھیں ہنود اپنے میں
شامل کر لیتے"۔ [1]

یہ تھی اس وقت صورتِ حالات۔ مسلم لیگ جو خالص مسلمانوں کی جماعت تھی اور مسلمان ہیئتِ مجموعی
کی خصوصیت سے واحد نمائندہ تھی اس موقع پر اس نے بھی ۱۹۱۶ء سے کانگرس کی ہنوائی
چکر زنّار دوستی اور بُت پرست نوازی کا المناک ثبوت دینا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی خلافت تو
یورپ کے نرغے میں تھی اور مسلمانانِ ہند کو ہندو نے ختم کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا، جس پر
کی مذہبی لیڈروں اور علمائے سوء کے ذریعے عمل کیا جا رہا تھا۔ اسی دوران ۱۹۱۷ء میں ہنود نے
جانے کی قربانی کے بہانے مسلمانانِ کٹار پور کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس موقع پر مسلمانوں
اور ہندوؤں کے لیڈر حضرات کا طرزِ عمل کس صورت میں سامنے آیا، یہ علامہ مرحوم کی زبانی سنیے:

"انتہائے برادر نوازی اور حقِ ہمسائگی کی تازہ ترین مثال واقعۂ کٹار پور ہے۔
ہندوؤں نے تو مسلمانوں کو بند مکان میں آگ لگا کر جلایا اور اُن کی جان و مال
اور آبرو کو نہایت بے دریغی و بے رحمی سے تباہ کیا لیکن جب مقدمہ حکومت کے
ہاتھوں میں پہنچا تو باوجود اس کے کہ معاندینِ ہنود اُن خونریز ہندوؤں کی
حمایت میں ہر طرف سے ہر طرح کی امداد پر آمادہ ہو گئے تھے، مسلمانوں کے
لیڈروں نے بجائے معاونت اور حقیقی غمگساری کے یہ تلقین شروع کی کہ مسلمانانِ
کٹار پور یہ درخواستیں دیں، عرضداشتیں بھیجیں کہ ہم اپنا دعویٰ واپس لیتے
ہیں۔ گورنمنٹ ان مجرموں کو رہا کر دے۔ پھر جبکہ فیصلہ پھانسی کا سُنا گیا،
اُس وقت بھی مسلمانانِ کٹار پور کو دبا کر عفو کی خواستگاری میں انتہائی کوشش
عمل میں لائی گئی اور آخر کار گورنمنٹ میں درخواست بھجا ہی دی گئی۔ اس بذل
وکرم کے اسباب رموز و اسرار ہیں۔ بجز لیڈروں کے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۲۳۲ ، ۲۳۳

مسلمانانِ کٹارپور کا خون رائیگاں کیوں قرار دیا گیا؟ اُن کے ورثا کو اِس سنگدلی کے فیصلہ پر راضی ہو جانے کے لیے کیوں مجبور کیا گیا؟ ہندوؤں نے کیا عوض اِس احسان کا پیش کیا؟ اِن سوالوں کا جواب حضرات لیڈر ہی دے سکتے ہیں بشرطیکہ اِن سوالوں کا قابلِ جواب ہونا خیال بھی فرمائیں۔[1]

مسلمانوں کے لیڈر بننے والوں نے مسلمانانِ کٹارپور کے ساتھ کیسی ہمدردی کا سلوک کیا یہ بھی مولانا سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے جو تاریخ کا ایک المناک واقعہ ہے۔

"ہندو نوازی میں مبالغہ و غلو اِس سے سمجھنا چاہیے کہ دورانِ مقدمہ میں مسلمانانِ کٹارپور کے پاس لیڈروں کے صحائف پہنچے کہ گائے کی قربانی موقوف کرو۔ اِن صحائف میں مستغنی عن الالقاب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیسِ دہلی کے صحیفہ کو امتیازِ خصوصی حاصل ہے۔ بعض حضرات خود تشریف لے گئے تاکہ مسلمانانِ کٹارپور کو گائے کی قربانی سے باز رکھا جائے۔"[2]

دوستی اور محبت کا ثبوت دینا طرفین کے لیے ضروری ہے لیکن اِس وقت مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے ہندوؤں کے دوست نہیں بلکہ غلام اور بندۂ بے دام تھے اور وہ ملتِ اسلامیہ کو گاندھی کے قدموں پر جھکا کر اِس ملت فروشی کے صلے کی سوراج کے وقت قیمت وصول کر لینے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ چونکہ وہ دوستی کا دم بھرتے تھے جس کے باعث ہر ذی ہوش کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ:

اگر قوم ہنود اور اُس کے فدائیانِ مسلم سے سوال کیا جائے کہ کوئی واقعہ ایسا ہی مثلِ کٹارپور کے پیش کریں جس میں مسلمانوں نے ہندوؤں پر اِس طرح وحشیانہ ظلم کیا ہو، پھر ہندو لیڈروں نے اپنے عوام کو اِس طرح درگزر کرنے پر مجبور کیا ہو کہ اِن سب مراحل کے بعد اپنی قوم سے اُسی مذہبی عمل کے ترک

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا، النور، ص ۱۰۵

[2] ایضاً، ص ۹

کرنے کی اپیل بھی کی ہو؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر اس پرپیچ لیڈری اور ترولیدہ خیر خواہیِ ملت و مذہب کے سمجھنے میں اگر کچھ اُلجھن پیدا ہو جاتے تو اِس پر عتاب و خفگی کیوں نازل کی جانے؟[1]

اس وقت صورتِ حال کیا تھی، عالمی حالات کس صورت میں رُونما ہو رہے تھے اور دولتِ عثمانیہ کے خلاف اسلام دشمن طاقتیں کیا کچھ کر چکی تھیں اور اُس کی تباہی کے لیے کیا کر رہی تھیں؟ یہ ہر پڑھے لکھے فرد پر واضح ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اُس پریشان کن دَور پر ہنود کی بے وفا قوم نے کس طرح اسلامیانِ ہند کو محبت کے جال میں پھنسا کر صفحۂ ہستی سے مٹانے کا پروگرام بنایا ہُوا تھا، اُس کی ایک ابتدائی کڑی ملاحظہ ہو:

"۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ نے بعد معاہدہ اتحاد کا آوازہ بلند کیا۔ اُس وقت مسلمانوں کی خلافتِ مقدسہ، دولِ یورپ کے نرغہ میں پھنسی ہُوئی تھی۔ اس لیے مناسب یہی تھا کہ مسلمانانِ ہند مقامی اور وطنی نزاعات کو صلح اور آشتی کے ساتھ طے کرلیں اور پوری توجہ سے خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت پر تدابیر سوچ کر عمل آرا ہوں۔ لیکن ہندو مسلمانوں کے اس عالمِ پریشانی سے بغیر فائدہ حاصل کیے کیونکر رہ سکتے تھے۔ ایک دو بڑے ہندو لیڈروں نے تو سحر آمیز افسوں خوانی لیڈرانِ مسلم کے کانوں میں بصیغۂ راز شروع کی اور مالقیہ نے مل کر ایک قیامت آرہ اور شاہ آباد میں بپا کی۔ دُوسرے سال کرتارپور میں اپنی عداوت کا نہ مٹنے والا ثبوت پیش کیا۔"[2]

ہندوؤں نے آرہ، شاہ آباد اور کرتارپور میں اپنی بہیمیت کا اظہار محض اسلام دشمنی سے مدہوش ہو کر کیا تھا۔ چوٹی کے ہندو لیڈر تو ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگاتے، مسلمان لیڈروں کو اس اتحاد کی تبلیغ کرنے پر آمادہ کرتے رہتے اور باقی لیڈر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۷

[2] ایضاً، ص ۴

ملک میں اسلامیانِ ہند کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ہندو بنیا مسلمانوں پر قیامت کرواتے اور مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے ہندوؤں کے آگے سجدہ ریز ہونے میں کوشاں رہتے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی ناز برداری پر آمادہ کرنے میں اپنی پوری صلاحیت صرف کیے ہوئے تھے۔ اس وقت اسلام کا حقیقی درد رکھنے والے اور مسلمانوں کے خیر خواہ سوچنے پر مجبور تھے کہ:

"مذہب و ملت کے سچے ہمدرد اسی وقت کھٹک گئے تھے کہ یہ حمایت اور یہ باہمی آمیزش مسلمانوں کے کسی وطنی و مذہبی حق کو سلب کیے بغیر نہ رہے گی۔ چنانچہ یہ نتیجہ آج اسی حمایت اور قران کا ہے کہ گائے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑائی جاتی ہے۔ موحدین کی پیشانی پر قشقہ جو شعارِ شرک ہے کھینچا جاتا ہے مساجد اہلِ ہنود کی تفریح گاہیں، مندر مسلمانوں کا ایک مقدس معبد ہے۔ ہولی شعارِ اسلام ہے جس میں رنگ پاشی اور وہ بھی خاص اہلِ ہنود کے ہاتھوں سے جبکہ وہ نشۂ شراب میں بدمست ہوں عجب دلکش عبادت ہے۔ بتوں پر ریوڑیاں چڑھانا، ہار پھولوں سے انہیں آراستہ کرنا، پھولوں کا تاج اصنام کے سروں پر رکھنا، خالص توحید ہے یہ سب مسائل ان صورتوں میں اس لیے ڈھل گئے کہ ہندوؤں کی دلنوازی اور استرضا سے زیادہ اہم نہ توحید ہے نہ رسالت معاذ اللہ، نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ۔"[1]

اب مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت یعنی مسلم لیگ کی کارگزاری ملاحظہ ہو کر مسٹر گاندھی اور لیڈرانِ ہنود جو کچھ چاہتے تھے، مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے کس طرح اپنی بدنصیب قوم کو فریب میں مبتلا کر کے بت پرست نواز بنانے اور گاندھی کے قدموں میں جھکانے کے لیے کیسے کیسے جتن کرتے ہیں؟ بنیاد ملاحظہ ہو:

"۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا جلسہ بھی دہلی میں ہی منعقد ہوا تھا۔ مجلسِ استقبالیہ کے

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۷

صدر نے جو اپنا خطبہ اس وقت پڑھا ہے اُس میں مسئلۂ خلافت کے مختلف پہلوؤں
سے بحث کرتے ہوئے ترکوں کی حمایت میں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔
برسوں کا بھولا ہوا سبق جو آج یاد آیا ہے، یہی عالمِ مسلمین کے تالیفِ قلوب کا پہلا
سنگِ بنیاد ہے جسے ڈاکٹر انصاری صاحب نے بحیثیت صدرِ مجلسِ استقبالیہ
مسلم لیگ اپنے ہاتھوں سے رکھا۔ اُس سال کی قومی و ملکی مجالس میں صرف
اس قدر کارروائی ہوئی کہ مدن موہن مالویہ صاحب نے مسلمانوں کو دل آزاریِ ہنود
سے منع فرمایا اور ڈاکٹر انصاری صاحب نے حمایتِ خلافت کا علم بلند فرمایا۔ علمائے
سیاسی نے بھی وقت شناسی سے کام لے کر اس موقع پر اپنے فتوے کا
اعلان ضروری سمجھا۔[1]

جس بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جانے والی تھی اُس کے مختلف اجزا کیا تھے؟ وہ کیا اغراض و
مقاصد تھے جن کو حاصل کرنے کی خاطر یہ ہندو مسلم اتحاد کا ڈھونگ رچایا جا رہا تھا؟ چنانچہ اس
سلسلے کا ابتدائی کام ملاحظہ ہو۔

"انھیں ایام میں مسٹر گاندھی اپنے دورانِ سفر میں بعض ایسے لیڈروں سے ملاقات
کرتے ہیں جو قومی اور ملکی مجالس میں اپنی معذوریوں سے شریک نہیں ہو سکے تھے۔
پھر اسی کے ساتھ ستیہ گرہ اور ہڑتالِ عام اور رفعِ امتیازِ مسجد و مندر، جس
کے محرک گاندھی ہیں، اسے بھی منضم کر لیجیے۔ جب یہ متفرق اعمال جن میں بظاہر
کوئی سلسلہ معلوم نہیں ہوتا، اپنے اپنے موقع و محل پر انجام پا چکے، تو اب
۱۹۱۹ء میں بتاریخ ۲۰ نومبر بمقام دہلی خلافت کمیٹی کا سنگِ بنیاد پڑتا ہے۔ اُس
موقع پر ہندو بھی ایک کافی تعداد میں بحیثیت نمائندہ شریک ہوئے، جن میں خصوصیت
کے ساتھ مسٹر گاندھی کا نام قابلِ ذکر ہے، جنھوں نے اس خالص مذہبی جلسے کے
ایک اجلاس میں صدارت بھی فرمائی تھی اور علمائے سیاسی نے آپ کے تشکر و

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا، النور، ص ۱۰، ۱۱

امتنان میں وہ سب کچھ ارشاد فرمایا جس کا جذبۂ عقیدت اور جوشِ اتباع و تعظیم مقتضی تھا۔

اظہارِ تشکر کے ذیل میں مولانا صاحب (مولانا عبدالباری فرنگی محلی) نے ایک کا بیان کرنا بھی ضروری سمجھا کہ مسٹر گاندھی صاحب کے اخلاق اور گفتگو سے میں یہاں تک متاثر ہو چکا ہوں کہ گائے کی قربانی میں نے ترک کر دی۔ جلسۂ خلافت کے مقاصد اور اصول عملِ اسلامی و دینی سے ترک قربانی گاؤ کا تعلق کچھ ہو یا نہ ہو لیکن یہی جملہ جو بطور حکایت بیان ہوا اور جو الفاظ سرسری طور پر اثنائے تشکر و امتنان میں آگئے فی الحقیقت یہ ایک زبردست دیباچہ اور مقدمہ تھا اس کتاب کا جو آئندہ ماہ دسمبر میں اسی سال عاشقِ مسلمین کے لیے تصنیف ہونے والی تھی۔ اسی کے ساتھ خلافت کے نام سے جو ایک ہڑتال ہوئی اسے تمہید کتاب سمجھ لیجیے۔[1]

جب دسمبر کا مہینہ آیا تو امرتسر میں تحریکِ خلافت کا جلسہ ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کے صدرِ محترم عالیجناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی صدارت فرماتے ہیں۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انہیں فرما گئے کہ ہندو کی محبت کا دم کیوں بھرا جا رہا ہے؟ تحفظِ خلافت کا ڈھونگ کس مقصد کی خاطر رچایا گاندھوی علماء اور مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں نے گائے کی قربانی پر کس طرح ہاتھ صاف کیا؟ خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کیونکر شریعتِ مطہرہ پر ظلم ڈھایا اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی مذموم جسارت کی؟

اب دسمبر کا مہینہ آتا ہے اور قومی مجالس کا انعقاد امرتسر میں ہو رہا ہے۔ مسلم لیگ کے صدر مستغنی عن الالقاب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیس دہلی اپنا خطبۂ صدارت پڑھتے ہیں جس کی بے شمار کاپیاں ملک میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ تقریباً چار صفحوں میں صدرِ مسلم لیگ نے مسئلۂ قربانی سے بحث فرمائی ہے۔ ابتدائی جملہ یہ ہے: گؤکشی کا ذکر ہم لوگ ایک عرصے سے اشاروں اور استعاروں میں کرتے رہے ہیں

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۰ تا ۱۲

لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اِس مسئلہ کے متعلق زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر کیا جائے۔"

ص۳۳ میں نہایت سوز و گداز کے ساتھ ہندوؤں کی عنایت و کرم کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ص۳۴ پر مذہبی نقطۂ نظر سے اِس مسئلہ سے بحث کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوتا ہے ——— "ہندوستان کو چھوڑ کر تمام عرب، شام، مصر، طرابلس اور ایشیائے ترکی وغیرہ کے مسلمانوں کو دیکھیے جن میں سے کروڑوں کی تعداد نے زندگی بھر اِس سنت کو بغیر گائے کی قربانی کے ادا کیا ہے ——— عوام بیچارے اِس پُرپیچ تاریخی مجلد سے یہ سمجھے کہ گائے کو قربانی کے لیے تمام بلادِ اسلامیہ کے مسلمان چھوتے بھی نہیں، لیکن خفیف سا یہ شبہ عوام کو رہ جاتا تھا کہ شاید اِس مدت سے پیشتر عہدِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں گائے قربانی ہوتی ہو۔ اِس شبہ کو مٹا دینے کے لیے حکیم صاحب نہایت شد و مد سے ایک حدیث میں کچھ اپنی طرف سے اضافہ فرماتے ہوئے یوں ارشاد فرماتے ہیں ——— "اِس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں علی العموم بکری کی قربانی کا رواج تھا۔"

مسلم لیگ میں جب یہ رزولیشن پیش ہونے لگے تو ڈاکٹر انصاری صاحب نے ترکِ قربانی گاؤ کا رزولیشن پیش فرمایا، جو تھوڑی خوش بیانیوں کے بعد منظور ہو گیا۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے قومی و ملکی مجالس سے مراجعت فرماتے ہوئے سہارن پور میں ایک تقریر فرمائی جس میں مسئلہ قربانی کے متعلق جو کارروائی مسلم لیگ نے انجام دی تھی اس کی تائید و تحسین میں کافی زوردار الفاظ ارشاد فرمائے۔

مستغنی عن الالقاب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیس دہلی کا مسلمانانِ گنگا پور کے پاس صحیفہ متعلقہ ترکِ قربانی گاؤ بھیجنا، ڈاکٹر انصاری صاحب کا خلافت کی حمایت میں ایک سال قبل صدائے احتجاج بلند فرمانا، پھر نومبر

میں جلسۂ خلافت کا انعقاد اور گاندھی صاحب کی ایک جلسہ میں صدارت اور
مولانا عبدالباری صاحب کا اثنائے تشکر و امتنان میں ترکِ قربانی گاؤ کا سرسری
تذکرہ، پھر دوسرے ہی مہینے میں چند ہفتوں بعد مسلم لیگ کا جلسہ ہوا،
اُس میں انھیں ارکانِ ثلاثہ کا یکے بعد دیگرے اِس مسئلہ کو اس طرح طے
کروانا کہ مستغنی عن الالقاب عالیجناب حکیم صاحب خطبۂ صدارت میں
ملکی، سیاسی اور مذہبی پہلو سے ترکِ قربانی گاؤ پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر
انصاری صاحب ریزولیشن کی شکل میں پیش فرماتے ہیں، جو منظور ہو جاتا ہے
مولانا عبدالباری صاحب بہار تک پہنچ کر تحسین و تائید فرماتے ہیں۔ اب
وہ نذرانہ اور گراں بہا تحفہ جو سرکار ہنود میں پیش ہونے والا تھا، جس کے لیے
سارے اہلِ دربار ہمہ تن چشم براہ تھے، جس کا ذکر مسٹر مانٹیگو کے سامنے
پیش ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے وفد نے اپنے ایڈریس میں
کیا تھا، نیز جس کے متعلق عرصہ سے اشاروں اور استعاروں میں ذکر
ہو رہا تھا، اب وہ اِس قابل ہو گیا کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا
ہاتھ اِس نذر و ہدیہ میں شامل ہو۔[1]

علامہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے گاندھوی علماء اور لیڈروں کی شرمناک روش،
اسلام دشمنی اور بُت پرست نوازی پر تاسف کا اظہار فرماتے ہوئے اِس حقیقت کے چہرے
سے نقاب کشائی کی ہے کہ مسلمان کہلاتے ہوئے اِن حضرات نے ایسی گندی روش
کیوں اختیار کی؟ وہ فرماتے ہیں:

"یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ ہندو ترکِ قربانی گاؤ کی تحریک کرتے تو عامۂ مسلمین
ہرگز اُس کو تسلیم نہ کرتے۔ لیڈر صاحبان بھی اگر اِس کی اپیل سیاسی اور
ملکی پہلو سے پیش فرماتے تو ناکامیاب رہنے کا ظن غالب تھا۔ اِس جیسے

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۲ تا ۱۴

مشن کے لیے اسی کی ضرورت تھی کہ شرعی اور مذہبی لباس میں اسے مسلمانوں
کے سامنے لایا جاتے ۔ یہ نپولین کی پالیسی تھی کہ وُہ مذہب کا نام نہایت
گرم جوشی سے لیتا اور مذہبی بننے میں کمال مبالغہ سے کام لیتا تھا۔ یہاں تک
کہ بعضوں کو اُس کے اسلام و مسلمان ہونے کا دھوکا ہے۔ وُہ جانتا تھا کہ
"تالیفِ قلوب کا یہی ایسا وحید ذریعہ ہے جسے ہمہ گیری کا حق حاصل ہے ۔
نپولین کی اُسی پالیسی کو مدِ نظر رکھ کر اس وقت لیڈروں نے بھی مقاصدِ
کانگریس کی تکمیل کے لیے جو مجلس منعقد فرمائی ہے اُسے دلکش و دلگیر بنانے
کے لیے خلافت کمیٹی کا لقب دیا ہے تاکہ نہایت سہولت سے مسلمانانِ
ہندوستان کی گردنیں ہندوؤں کی غلامی و اطاعت میں سربسجود ہو جائیں۔
برعکس نہند نام زنگی کافور۔[1]

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس خلافت کمیٹی نے جو تحفظِ خلافت و مقاماتِ مقدسہ کی خاطر وجود میں
آئی تھی آیا اس نے خلافت کی بانیابی اور حفاظت کے لیے ایک قدم بھی بڑھایا ؟ مقاماتِ
مقدسہ کی حفاظت کا دم بھرنے والوں کے پاؤں میں یہ فریضہ ادا کرتے ہوئے کیا ایک
کانٹا بھی لگا ، اگرچہ خواب میں ہی سہی ؟ مسلمانوں کو کیا خبر تھی کہ یہ حضرات سوراج یا رام راج
کو خلافت قرار دے رہے ہیں۔ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت سے ان بانکے لیڈروں
کی مراد یہ ہے کہ بتوں کا مسلمانوں سے احترام کروائیں گے اور اپنی زنّار دوستی کا زندہ
ثبوت پیش کرنے کی خاطر سب سے پہلے گائے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑانے پر ایڑی چوٹی
کا زور لگا کر دکھائیں گے۔ تحریکِ خلافت کا کارنامہ ملاحظہ ہو؛

خاص دہلی میں عشرۂ ذی الحجہ کے موقع پر اُونٹوں کا گشت ، جن پر جلی قلموں میں
اس طرح کے فقرات تختوں پر چسپاں ، جن سے ہر مومن کا دل کانپ
اُٹھتا تھا، لکھ کر خوب خوب مشتہر ہوئے۔ پھر نہایت سختی سے بعض مجبور کرنے والی

---

[1] سلیمان اشرف ، مولانا : النور ، ص ۱۴۰۔

تدابیر سے بھی انسداد کافی کیا گیا۔ بمبئی کے مسلمانوں پر بھی خلافت کمیٹی نے قربانی گاؤ پر ستم ڈھانے میں کچھ کمی نہیں کی۔ خلافت کمیٹیاں کیا ہوئیں کہ گائے کی قربانی کرنے والوں پر ایک آفت و بلا ہو گئی۔

"اب سے قبل جو حصہ ظلم کا ہندوؤں سے باقی رہ گیا تھا اُسے فدائیانِ ہنود نے اسلام کا نام لے کر مسلمانوں پر تمام کر دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے یا ارحم الراحمین! ہم مسلمانوں پر رحم فرما اور اس آتے ہوئے فتنہ کو ہمارے سروں سے دور کر بحرمۃ النبی و آلہ الامجاد۔ طرفگی یہ کہ اگر کوئی بسبیل خیر خواہی و نصیحت دینی ان لیڈروں کے طرز میں کچھ اصلاح پیش کرے یا ترمیم کا خواستگار ہو تو اُسے کافر، بے دین، قوم فروش، غدار، وغیرہ کہہ کر مجمع و محفل میں فضیحت کر ڈالیں۔ عوام کی فوج ان کے ہاتھوں میں ہے۔ انھیں جس پر چاہا چڑھا دیا، بھگا دیا۔ اہلِ حق اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے ہیں اور اپنی مظلومیت کی حق تبارک و تعالیٰ سے فریادیں کرتے ہیں۔ نجات کی دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ ظالم اپنے نشۂ ظلم میں سرشار و غافل اُمت کی تباہی میں سرگرم ہیں۔ وہ ساعت دُور نہیں جبکہ رحمتِ الٰہی مظلوموں کی فریاد پر لبیک عبدی فرمائے۔"[1]

خلافت کمیٹیاں تو مسلمانوں پر یوں ظلم و ستم ڈھا رہی تھیں۔ بُت پرستوں کی محبت بلکہ نشۂ غلامی میں سرشار ہو کر مخالفت فی الدین اور تخریب دینِ متین کی مرتکب ہو رہی تھیں اس موقع پر مسلم لیگ اور اُس کے صدرِ محترم یعنی عالیجناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی خلافت کمیٹی سے بھی سبقت لے جانا چاہتے تھے تاکہ سوراج کی صورت میں اپنے گاندھی مہاراج سے دوسروں کی نسبت زیادہ انعام و اکرام کے مستحق قرار پائیں۔ موصوف کی ایک ہولناک اور لرزہ خیز عبارت ملاحظہ ہو:

"جلسہ خلافت کی بنیاد ۱۹۱۹ء کی ۱۷ر نومبر کو بمقام دہلی جبکہ ہندو اور مسلمانوں

[1] مسلمان اشرف، مولانا، النور، ص ۷۔

نے مل کر رکھی اور پھر اس کی کارروائیاں اخبار وجرائد میں مطبوع ہوئیں۔
حیرت ہوتی تھی کہ الٰہی! یہ مسلمانوں کی عقل کو ہو کیا گیا ہے، جو اب عالم الغیب، قادرِ مطلق، سمیع و بصیر سے بھی پالیسی کرنے لگے؟ اسی حیرت میں تھا کہ لیگ کا جلسہ ہوا اور حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کا خطبۂ صدارت دیکھنے میں آیا۔ وہاں بھی وہی رنگ مغالطہ سرتاسر پایا گیا، بلکہ حکیم صاحب نے ایک قدم بڑھ کر یہ جرأت بھی فرمائی کہ حدیث شریف کا ایک جملہ نقل کرتے ہوئے ایک لفظ بڑھا دیا اور الخ لکھ کر ترجمہ اور نتیجہ بیان فرمایا۔ وہی لفظ جس کا اضافہ فرمایا گیا وارِ ومدارِ دلیل، اسی کی وجہ سے چند سطور کی تحریر الخ لکھ کر تمام چھوڑنے سے یہ فائدہ کہ ناظرین کا ذہن اس بے ربط اضافے سے متوحش نہ ہونے پائے۔
چند روز تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس طرح جعل اور تحریف سے کیا مدعا و مقصود ہے۔
آخر ایک خط لکھا، جس میں نہایت نیازمندانہ طور پر یہ سوال تھا کہ حضرت ام سلمہ سے مروی روایت کس کتاب سے آنجناب نے نقل فرمائی؟ جواب میں سکوت رہا۔ شاید خط ضائع ہوا۔ فقیر خود دہلی گیا۔ یہ رجب کی اوائل تاریخوں کا ذکر ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا وفد اس وقت دہلی گیا ہوا تھا۔ درِ دولت پر جا کر معلوم ہوا کہ طبیعت ناساز ہے، پاؤں میں کچھ شکایت ہو گئی ہے۔ دوسرے دن پھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ مدنی مولوی مالویہ صاحب سے کچھ مشورہ ہو رہا ہے۔ بعض حضرات اہلِ علم جن کی آمد و رفت جناب حکیم صاحب کے یہاں جاری ہے اُن کی خدمت میں پیام بھیجا کہ حدیث شریف میں جو غلطی ہو گئی ہے اُس کی تصحیح کی طرف حکیم صاحب کو توجہ دلا دیجیے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ کوشش بھی بے ثمر ثابت ہوئی۔

چوتھی رجب کو سرکار اجمیر آستانہ غریب نواز پر حاضر ہوا۔ ایک دن بعض علماء سیاسی سے ملاقات ہوئی۔ عرض کیا کہ یہ فتنہ عظیم ہے۔ ہنود کی خاطر مسلمانوں کا گلا نہ گھونٹیے۔ دیکھیے حدیث میں جعل و تحریف تک کی نوبت

آ گئی۔ تین مہینے گزر گئے اور کوئی اعلان نہیں کرتا ہے کہ اصل حدیث میں لفظ شاۃ نہیں ہے، غلطی سے لکھ گیا ہے۔

ہر ایک شخص جس کے پاس خطبۂ صدارتِ مسلم لیگ ہو اس مقام خاص کی تصحیح کرے نیز علماء رئیسینِ اتحادِ ہندو مسلم کا یہ فرض ہے کہ اتحاد کے حدود متعین فرمائیں۔ عوام کو قشقہ لگانے اور مندروں میں جاکر ریوڑیاں بتوں پر چڑھانے سے منع کریں اور ان افعال کی شناعت کھلے لفظوں میں بیان فرمائیں ورنہ ایمان کی بربادی کا خطرہ ہے۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ فقیر کی اس التماس کی علمائے سیاسی کی خدمت میں ذرہ برابر بھی شنوائی نہ ہوئی آج تک وہی سکوت ہے، وہی اعراض ہے، وہی چشم پوشی ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ رہے سہے اعمالِ قبیحہ مسلمانوں نے تک آنجہانی کی مصنوعی لاش کے موقع پر ادا کیے اور علمائے سیاسی نے پھر اپنے سکوت سے ان امور کے جواز و استحسان پر تازہ مہرِ ثبت فرما دی"۔ [1]

اس سلسلے میں اظہارِ حق کی خاطر ان حضرات کو خوب سمجھایا گیا۔ خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا یاد دلایا گیا لیکن جس طرح بنی اسرائیل کسی وقت بچھڑے کی محبت میں سرشار ہو گئے تھے کچھ اسی طرح اس بدنصیب قوم کے وہ گمراہ لیڈر اور گمراہ گر علمائے سوء گاندھی جیسے پُراسرار دشمنِ اسلام و مسلمین کی محبت میں ایسے بدمست ہو چکے تھے کہ کسی فہمائش کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسی سلسلے کی مزید کارگزاری ملاحظہ ہو:

"کانپور میں ماہ رجب ایک بڑے پیمانے پر علماء کا جلسہ ہوتا ہے۔ وہاں کے بعض کارکن علمائے سے یہ استدعا پیش کی گئی کہ مسلمانوں کو اعمالِ شرک و کفر میں شریک ہونے سے باز رکھیے اور قربانی گاؤ کے متعلق غلطی تسلیم کر لیجئے۔ لیکن جواب وہاں سے بھی سکوت ہی میں ملا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر

[1] سیمان اشرف، مولانا، النور، ص ۱۹-۲۰

انتہائی بے قراری میں فقیر نے رسالہ ارشاد لکھا اور مسلمانوں کو امرِ حق سے
آگاہ کیا۔ اِس رسالے کی اشاعت اول عشرۂ رمضان المبارک میں ہوئی۔
لیڈرانِ قوم کے پاس ٹکٹ چسپاں کر کے نسخے بھیجے گئے۔ تین ماہ کے عرصہ
میں تقریباً تین ہزار نسخے مختلف امصار و قصبات میں تقسیم ہوئے۔ اب آکر
جبکہ خطبۂ صدارت مسلم لیگ کو آٹھ مہینے اور ارشاد کی اشاعت کو کامل تین
مہینے گزر چکے، حکیم صاحب اپنی غلطی کا اعتراف پیچ در پیچ اعتراض و سوال
واپیل کے لپیٹ میں تحریر فرماتے ہیں۔ حالانکہ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ ایسی
خطائے فاحش تھی جس کا اعلان بلا جواز توقف حکیم صاحب کو بذریعہ تار مختلف
و متعدد اخبار و جرائد میں اب سے بہت قبل کرنا تھا۔ سہ تریں ذی الحجہ کا خبار
البشیر جو بیرونجات میں عین بقرعید کے روز پہنچا ہوگا، اُس میں اِس
طرح اعتراف کرنے سے مقصود و مطلب ہے کہ مسلمانوں کو اقرار کا علم بھی
اُس وقت ہو جبکہ سب مراحل قربانی کے طے پا جائیں۔ اِسی کے ساتھ
حق پسندی کی داد مل جائے گی۔ خیر یہ تو اپنا اپنا ذوق مذہبی ہے۔
جس کے دل میں حدیثِ مصطفوی کی عظمت ہے وہی یہ بھی جان سکتا ہے
کہ اس طرح کی خطا کا کفارہ کیونکر ادا ہوتا ہے۔ مجھے تو حکیم صاحب کے ایک
سوال کا جواب دینا ہے جسے موصوف نے اپنی غلطی کا اعتراف فرماتے ہوئے
آخر میں پیش فرمایا ہے۔ حکیم صاحب تحریر فرماتے ہیں:— "میرے
اوپر ایک یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ حدیث اذا اس اد احدکم ان یضحی
بالشاۃ میں آخری لفظ شاۃ کا کسی کتاب میں نہیں ہے۔ میں اِس
اعتراض کو قبول کرتا ہوں اور یہ بات ظاہر کرنی ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ
لفظ محض غلطی کی وجہ سے لکھا گیا، دراصل یہ کسی حدیث کا جزو نہیں ہے لیکن
میں نہیں سمجھ سکتا کہ اعتراض کرنے والے بزرگ اِس سے کیا فائدہ حاصل
کر سکتے ہیں؟"

فقیر نے حکیم صاحب پر اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ ایک حقیقی اور واقعی امر کا اظہار کیا تھا۔ رہا فائدہ، وُہ حکیم صاحب ہی بیان فرمائیں کہ کون سا مقصد حاصل کرنا تھا جس کے لیے حدیث میں اضافہ کی حاجت ہُوئی اور اب کہ غلطی کا اعتراف ہے، اُن پانچ سطروں کا خطبۂ صدارت میں کیا فائدہ ہے؟ فقیر کا اِس کشفِ حقیقت سے صرف یہی مدّعا تھا کہ عالیجناب حکیم صاحب اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائیں اور مسلمانوں کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ایک لفظ اپنی طرف سے بڑھانا اور اُسی اضافہ کو مقامِ استشہاد میں لانا، اُس خطبۂ صدارت میں صرف اسی ایک جگہ ہُوا ہے جہاں حدیثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے۔ بقیہ سارے حوالے اعیان و وزرائے انگلستان کے صحیح ہیں، کسی طرح کے شک و شبہ کو اُن میں دخل نہ دینا چاہیے۔ اِس کے سوا نہ کوئی مدّعا نہ کچھ اور فائدہ۔ اربابِ بصیرت جن کی آنکھیں نورِ ایمان سے منوّر ہیں اُنھوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ آیا اسلام اور اسلامی خلافت کی حمایت کی جا رہی ہے یا کفر و شرک کا طغیان ہے جو مسلمانانِ ہند پہ لایا جا رہا ہے۔" [1]

خواجہ حسن نظامی دہلوی کی روش زمانے بھر سے نرالی تھی۔ موصوف کبھی گنگا رام تھے تو کہیں جمنا داس۔ کسی معاملے میں اہلسنت وجماعت کے ساتھ تو کسی میں بدمذہبوں کی ہمنوائی۔ قربانی گاؤ ہی کا تذکرہ ہے تو خواجہ صاحب بھی بُت پرست نواز ثابت ہوئے۔ موصوف کے بارے میں مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

"خواجہ حسن نظامی صاحب کا ایک مضمون ۱۹؍ اگست (۱۹۲۹ء) کے اخبار حق لکھنؤ میں چھپا ہے، جس میں آپ نے مجالسِ عید میلاد کی تائید کرتے ہُوئے مسلمانوں سے تحریک کی ہے کہ وہ ۱۲؍ ربیع الاوّل کو

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۲۱-۲۲

ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے گائے کا ذبح ترک کریں۔ خواجہ صاحب کی یہ پہلی ہی ہندو نوازی نہیں ہے بلکہ اِس سے قبل وُہ ترکِ گاؤ کشی نام کا ایک رسالہ بھی لکھ چکے ہیں اور اکثر اوقات اُن کے خامۂ ناحق رقم سے اِس قسم کے مضامین نکلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوؤں کے سیلابِ تعصب طوفانِ عناد کی شدت و تیزی کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی بھی خواہِ اسلام مسلمانوں کو خوشامدی بن جانے کی اجازت دے۔

نہ ہم خواجہ صاحب کو اتنا نادان سمجھتے ہیں کہ وہ اِس حقیقت سے بھی واقف نہ ہوں کہ خوشامدی ہمیشہ ذلیل و خوار رہا کرتے ہیں اور ظالموں کی جرأت اور دلیری خوشامد سے اور بڑھتی ہے۔ نہ خواجہ صاحب اِتنے بے خبر ہیں کہ ہندوؤں نے جو مسلمانوں پر وحشیانہ مظالم کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اُس کی اُن کو خبر نہ ہو۔ یہ بھی خواجہ صاحب کو ضرور معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی پاسداری اور دلجوئی کا تصور بھی کبھی ہندو دماغوں میں نہیں ہوتا، تو وہ کس طرح مستحق ہیں کہ اُن کی دلجوئی کے لیے مسلمان اپنے خورد و نوش میں پابندیاں لازم کر لیں اور ایسی غذا جو اُنھیں مرغوب بھی ہے اور اُن کی معاشرت و اقتصادی حالت کے مناسب بھی ہے، اُس کو ترک کر دیں۔ یہ بھی خواجہ صاحب کو خوب معلوم ہوگا کہ ہندو منت شناس اور سپاس گزار قوم نہیں ہے کہ وہ کسی کا احسان مانے یا کسی کے بہتر سلوک کو یاد رکھے بلکہ وہ احسان کا لفظ بھی اپنی طرف آنے دینا گوارا نہیں کرتے۔

بلکہ کت کمیٹی (خلافت کمیٹی) کے عہد میں جب قربانی گاؤ ترک کرنے پر خواجہ صاحب جیسے لیڈر بہت زور دے رہے تھے، اُس وقت بھی ہندو لیڈروں نے صاف کہہ دیا تھا کہ مسلمان اگر قربانی گائے چھوڑ دیں گے تو اس کا ہندوؤں پر کچھ احسان نہ ہوگا۔ ان حالات میں ہم نہیں سمجھتے کہ ذبیحہ گاؤ کو روکنے کی تحریک خواجہ صاحب کے دل میں کس سبب سے پیدا ہوتی ہے؟

اِس کا سبب محرک کیا ہے؟ اور وہ اِس میں اپنا کیا نفع مدِ نظر رکھتے ہیں؟ ہمیں اُن کی ذاتیات سے کچھ بحث نہیں لیکن مسلمانوں کو اِس خطرناک مشورہ کی نامعقولیت سے مطلع کرنا ضرور تھا۔"[1]

ہندو مسلم اتحاد کی خاطر دہلی اور شملہ میں کانفرنسیں ہوئیں۔ مسلمانوں کی جانب سے وہی لیڈر اور علماء اُن مواقع پر بلائے گئے جو ہندوؤں کے ہاتھوں بک چکے تھے۔ مسلمانوں کی قیادت اور نمائندگی کا دم بھرتے لیکن تک وہ ہندو مفادات کے تحفظ میں کرتے اور ملت اسلامیہ کو خلافت کا نعرہ سناکر گاندھی کے قدموں میں ڈالتے تھے۔ ایسے حضرات کے بارے میں قاضی احسان الحق نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

"دہلی و شملہ میں جو مجلسیں ہوئیں اُن میں بیشتر وہ اصحاب شامل تھے جنھیں مسلمان ہندوؤں کا نفسِ ناطقہ سمجھتے اور جو مسلمانوں کے دینی و مذہبی حق قربانی اور ذبیحہ گاؤ کو روکنے کے لیے ماضی قریب میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہیں، ہر امر میں ہندوؤں کی خوشنودی اُن کا مطمحِ نظر اور نصب العین رہا ہے۔ ایسے اصحاب مسلمانوں کے حقوق کی کیا حفاظت کرسکیں گے؟ شملہ کی مجلس میں جھٹکے کے طریقے سے قتلِ حیوان اور اُس کے گوشت کے عام فروخت کو ناقابلِ اعتراض تسلیم کر لیا۔ اِن صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ ہندوؤں کی گوشت خور قومیں مسلمانوں کے ذبیحہ کو بے تکلف کھا سکتی ہیں اور نہ انھیں اُن کا مذہب اِس سے نہیں روکتا اور مسلمانوں کے مذہب میں جھٹکا حرام ہے۔ جب بازاروں میں جھٹکے کی دکانیں عام طور پر کھل جائیں گی تو جاہل ناخواندہ دیہاتی مسلمان اُس سے دھوکا کھائیں گے اور ایک مصیبت عام میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اِس کے ساتھ ہندوؤں کی تجویزوں میں سُور کے گوشت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اِس پر اِن صلح کے علمبرداروں کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔

---

[1] محمد عمر نعیمی، مولانا: ماہنامہ السواد الاعظم، بابت ربیع الاولی ۱۳۴۴ھ، ص ۲۴

ہندو تو یہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے رقبہ (علاقے) میں گائے ذبح نہ ہو سکے گی جہاں کائی مدت سے اُس کے ذبح کا رواج نہیں ہے۔ اِس پر بھی ان خود ساختہ مصالحین سے یہ نہ کہا گیا کہ جب رواج کی یہ پابندی ہے تو سور کے گوشت اور جھٹکے کا کیوں نام لیا جاتا ہے جس کا ذکر میں آنا بھی مسلمانوں کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ اگرچہ ان مصالحتی مجلسوں کا کچھ انجام نہ ہوا لیکن ان مصالحین کی کمزور روش نے ہندوؤں کو اور زیادہ جرأت دلا کر معاملہ کو پیچیدہ تر بنا دیا۔ مسلمان کسی ایسی قرارداد پر راضی نہیں ہو سکتے جو علمائے دین، پیشوایانِ اسلام اور ہمدردانِ ملت کے مشورہ کے بغیر تجویز کی گئی ہو۔ یہ حضرات جو قوم میں مطعون ہیں اور جنھیں مسلمان ہندو پرست جانتے ہیں، کرم کریں اور بے فائدہ تکلیف نہ اُٹھائیں۔" لہ

کاش! یہ گاندھوی تولہ یعنی مسلمانوں کے بیڈر بننے والے اور وہ علماء جن کے فتوے گاندھی کی جنبشِ لب کے ساتھ گردش کرتے رہتے تھے، کبھی خوفِ خدا کو مدِنظر رکھ کر اُس مردِ حق آگاہ کی بات بھی سُن لیتے جو دہلی کی مسجد فتحپوری میں بیٹھا ہوا مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ اُس مردِ مومن سے میری مراد حضرت مفتیٔ اعظم دہلی شاہ محمد مظہر اللہ نقشبندی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) ہیں۔ ذیل میں ہم ایک استفتاء پیش کر کے حضرت سیدی و مرشدی علیہ الرحمہ کا جواب نقل کرتے ہیں:

سوال نمبر ۲۳۵

۱۔ اسلامی اعتبار سے گائے کی قربانی شریعتِ غرّا میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟

۲۔ اگر حکومت اپنی طاقت سے گائے کی قربانی پر پابندی لگائے تو مسلمانوں پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟

۳۔ کیا مسلمان اسلامی اخلاقی اعتبار سے دیگر اقوام کی خوشنودی کے لیے گائے

کی قربانی ترک کرسکتے ہیں؟ اگر نہیں تو جو مسلمان اِس فعل کے مرتکب ہیں یا آئندہ ہوں اُن کے لیے شریعت میں کیا حکم ہے؟

مستفتی: فضل احمد دہلی

الجواب

۱۔ گائے کی قربانی دین الٰہی کی نشانیوں میں سے ہے لقولہ تعالیٰ،

والبدن جعلناها لکم من شعائر الله لکم فیها خیر۔	یعنی اونٹ اور گائے کی قربانی کو تمہارے لیے دین الٰہی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی بنایا ہے، جس میں تمہارے لیے بھلائی ہے۔

درمختار میں ہے:

بدنة هی الابل والبقر سمیت بها لضخامتها۔	بدنہ اُونٹ اور گائے ہے۔ اِن کے ڈیل ڈول ہونے کے سبب اِن کا یہ نام ہُوا۔

۲۔ ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ ہر ممکن کوشش سے اِس اسلامی نشان کی محافظت کریں

کہ اس سے غفلت جبکہ عقاب الٰہی کا موجب اور عتاب الٰہی کا خوف اِس کی محافظت کا سبب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ومن یعظم شعائر الله فانها من تقوی القلوب۔	اور جو اللہ کے دین کی محترم نشانیوں کی محافظت کرے گا، تو یہ محافظت کرنا دل کے خوف کا مقتضیٰ ہے۔

۳۔ اِس کا جواب تو بہت ظاہر ہے کہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ دین الٰہی کی نشانیوں کو مٹانا اور اُس کی بجائے کفری نشان قائم کرنا کس طرح غضب الٰہی کا موجب ہوگا۔

جس طرح گائے کا ذبیحہ اسلامی نشان ہے یونہی اس کا بند کرنا کفری نشان ہے۔ پس اس کی بندش کا اقدام تو بڑی شے ہے، اس کی جانب قلب کا میلان بھی عذاب نار کا موجب ہے۔ یہ خیال کہ اس سے ہمیں حکومتِ ہند کی حمایت وخوشنودی میسر آجائیگی محض ایک شیطانی دھوکا ہے۔ ایسی حالت میں حمایت درکنار ان لوگوں کا کوئی رفیق ہو نہیں ہوسکتا لقولہ تعالیٰ: ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون ٥

اس مقام پر حضرت عبد اللہ بن سلام اور اُن کے اصحاب کے واقعہ پر غور کیجئے کہ جب وہ یہودیت سے تائب ہوکر مشرف باسلام ہوئے تو انھیں خیال آیا کہ اونٹ کا گوشت شریعتِ موسوی میں حرام ہے اور اسلام میں محض مباح، تو کیا حرج ہے کہ ہم اونٹ کا گوشت نہ کھائیں۔ اس پر نہایت عتاب آمیز انداز میں ممانعت فرمائی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہو یایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوٰت الشیطٰن انہ لکم عدو مبین ٥ یعنی ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو (اور ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم پر نہ چلو یقیناً وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ پھر اس کے بعد بھی کہ تمھیں واضح دلیلیں پہنچ چکیں اگر لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے (اُس کے عذاب کا کوئی روکنے والا نہیں) حکمت والا ہے (کہ بمقتضائے حکمت جب اور جس قدر چاہے سزا دیتا ہے)

اس واقعہ میں اور تمنا زدفیہ واقعہ میں اصلاً فرق نہیں۔ جس طرح عبد اللہ بن سلام نے اُونٹ کے گوشت کو مباح سمجھا اور اجتہادی غلطی کی کہ شعائر اسلام نہ سمجھتے ہوئے ترک کا ارادہ کر لیا وہی تصدیہاں ہے۔ پس جس طرح وہ موردِ عتاب ہوئے جو لوگ اس کو ترک کریں گے وہ بھی یقیناً موردِ عتاب ہوں گے بلکہ مستحقِ عذاب کہ یہاں اس سے بڑی ایک شے اور بھی موجود ہے اور وہ ہندو کے عقائد باطلہ کی ترویج ہے جو اشد معاصی ہے اور عصیان میں کسی کا بھی حکم کیوں نہ ہو، اس کی پیروی موجب واستحقاقِ عذاب ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ حکم تو صرف اللہ ہی کا ہے اور تمام مخلوق اُسی کی محکوم۔ مشرکین مکہ نے بعض جانوروں کو اپنی طرف سے حرام کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ اُن کی اس تحریم کی بھی تردید فرماتا ہے

انچہ ارشاد ہے: یایہا الناس کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً (الآیۃ) یعنی لوگو!
چیزیں زمین میں حلال و پاکیزہ موجود ہیں اُن سے کھاؤ (اور اُن کی تحریم کا ارتکاب کرکے)
شیطان کی پیروی نہ کرو یقیناً وہ تمھارا صریح دشمن ہے (کہ ایسے واہیات خیالات سے
و ہر طرح کا نقصان دے رہا ہے، وہ تمھیں اُن ہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو (میرے
دیک) بُری اور بے حیائی کی ہیں اور یہ (کریگا) کہ اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جس کی
سند ہی نہیں رکھتے۔ (جیسے گائے کی حرمت کہ من جانب اللہ تمھارے پاس اس کی کوئی
سند نہیں)۔

اِس آیۂ کریمہ میں جس طرح مشرکینِ مکہ کو حکم ہے کہ تم حلال جانوروں کو حرام ٹھہرا کر
شیطان کی پیروی نہ کرو اور اللہ پر بہتان نہ باندھو۔ یونہی ہندوؤں کو بھی حکم ہے کہ گائے کے
باب میں ایسا معاملہ نہ کرو۔ پس جب خود ہندوؤں کو یہ حکم ہے تو مسلمانوں کے لیے کب جائز
ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے اُن کے اِس عقیدے کو قوت پہنچائیں اور شیطان کے
اتباع اور خدا پر بہتان بندی میں اُن کا ساتھ دیں۔ مانا کہ مسلمان اِس کو حرام جان کر ترک
نہ کریں گے لیکن اِس ترک میں قرآنی حکم کے خلاف غیر قرآنی حکم کی تقویت تو ہے اور جب پہلے
ہر آسمانی کتاب کے حکم منسوخ پر بھی عمل حرام کر دیا گیا ہے تو پھر کسی انسان کا حکم اِس کے
آگے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن سلام کے واقعہ پر پھر غور کی نظر ڈال لیجیے کہ
باوجودیکہ اُونٹ کی حرمت ایک آسمانی کتاب میں موجود تھی لیکن چونکہ اُس کی حرمت منسوخ
ہوچکی تھی اِس لیے یہ اصحاب اسلامی حکم سے اِس کو حلال ہی سمجھتے تھے۔ غلطی ہو گئی کہ
اِس کو شعائرِ اسلام نہ سمجھا اور ترک کا ارادہ کر لیا جس کو تہدیداً شیطان کا اتباع قرار دیا گیا
اور اپنے غضب کا اظہار فرمایا گیا۔ اُونٹ کچھ یہودیوں کے معبودوں سے نہ تھا۔ لیکن یہاں
عتاب تو صرف اِس پر ہے کہ حکم منسوخ پر عمل کا کیوں ارادہ کیا گیا اور گائے کا تو معاملہ ہی
جداگانہ ہے کہ اِس کی حلت تعلیم توحید اور ایک شرک جلی کے ابطال پر ہے تو اب مسلمان خود
ہی غور کرے کہ اِس کا ترک کیا معنی رکھتا ہے، یہی کہ اِس میں توحید کا ابطال اور شرک کا
اعلان ہے۔

یہ حکم تو صرف مطلقاً ذبیحہ گاؤ کے ترک کا ہے لیکن اِس پر قربانی کا ترک حکم میں اِس سے بھی اشد ہے کہ وہ عبادتِ الٰہی ہے۔ پس اِس کے ترک میں ایک مخصوص عبادت کا ترک ہے۔ تو مسلمان کو یہ پوچھتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ اِس کو میں ترک کر سکتا ہوں یا نہیں ؟ یقیناً اپنی خوشی سے جو اِس کو ترک کریں گے یا اِس میں اعانت کریں گے وہ سخت گنہگار ہوں گے۔

اور یہ خیال کہ محض ہندو کی خوشی حاصل کرنے کے لیے اِن کی قربانی کا ترک مقصود ہے اور کسی کی خوشی حاصل کرنا تو کوئی جرم نہیں۔ تو اوّل تو حق تعالیٰ کی ناراضگی کے مقابلہ میں کسی کی رضا کی طلب خود ہی حرام ہے۔ دوسرے وہ محض اتنی بات سے کہ آپ ذبیحہ گاؤ کو ترک کر دیں پوری طرح خوش بھی نہیں ہو سکتے کہ حقیقت میں اُن کو صرف گائے کی قربانی کا ترک مطلوب نہیں بلکہ ایک بہت بڑی مہتم بالشان قربانی مطلوب ہے یعنی ایمان کی قربانی بقول تعالیٰ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُوْنَ یعنی اُن کی خوشی تو اِس میں ہے کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ۔ چنانچہ آج مسلمان اِس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں تو کیا مسلمان اِس کو برداشت کر کے جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنا سکتے ہیں ؟

میرے دوستو، امورِ دنیوی میں آپ کو اُن سے مدارات سے کوئی نہیں روکتا کیجیے اور ضرور کیجیے، لیکن ایسی مدارات جس سے کوئی شعارِ اسلامی چھوٹے اور امورِ مذہبی پامال ہوں ہرگز جائز نہیں۔ آپ کو اُن کی خوشی اِسی لیے تو درکار ہے کہ اتفاق میسر آ جائے جس کی سخت ضرورت ہے، لیکن کیا وہ حاصل ہو سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں کہ یہ شے شر اور اختلاف کی بنیاد مضبوط کرنے والی ہے۔ اتفاق حاصل کرنے کی تو صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ جس طرح تم اُن کے مسلّمات میں کوئی مداخلت نہیں کرتے اِسی طرح اُن کو بھی چاہیے کہ اِسلامی احکام کے بجا لانے میں ہم سے کچھ تعرض نہ کریں۔

اُن کو بتلائیے کہ فروعات ایک طرف رہے، اصول پر نظر ڈالیے کہ شرک کیسی بدترین شے ہے، جس میں معبودِ برحق کے مقابلے کا اعلان ہے، لیکن جب مشرکین ہمسایہ ہو جاتے ہیں تو کیا کوئی مسلمان اُن سے تعرض کرتا ہے کہ اپنے بُت خانے توڑ دو، شرک چھوڑ دو، ہم سے معبودِ برحق کا مقابلہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ پس جب مسلمانوں کی طرف سے اِس قدر وہ آزاد ہیں

تو اُن کے لیے کیا گنجائش کہ ہم سے مطالبہ کریں کہ گائے کی قربانی ترک کرو، حالانکہ اسی کے نام پر قربانی کی جاتی ہے جس کو وہ بھی معبود جانتے ہیں اور خود اُن کے اکابر سے بھی یہ فعل ثابت ہے جو اپنے مقام پر بدلائل واضح ہو چکا ہے۔

الحاصل مسلمانوں کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ اپنی رضا سے گائے کی قربانی ترک کریں بلکہ ہنود کو سمجھائیں کہ وہ اس کے ترک پر اصرار کر کے ایک نیا فتنہ نہ کھڑا کریں کہ یہ ہمارے مذہب میں مداخلت ہے جو قانوناً بھی ممنوع ہے فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

محمد مظہر اللہ دہلوی غفر اللہ لہٗ

امام مسجد جامع فتح پوری

دہلی لہ

گاندھوی شیخ الہند کے کارنامے

جن سکھوں سے سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی برسرِ پیکار رہے اور پیش و پس تین چار سال تک جہاد فرماتے رہے، سید صاحب کے خلفاء بھی اُن کی سنت پر غیبوبت کا تماشا خانہ کھڑا کر کے دُنیا کماتے رہے، جن میں علمائے صادق پور سرِ فہرست ہیں اور جن سکھوں نے ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں میں انگریزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھاتے، جن کے تذکرے سے کلیجہ منہ کو آتے۔ مسجدوں میں گھوڑے باندھے، قرآن کریم پھاڑے اجلاتے اور مسلمانوں کو زندہ نذرِ آتش کرنے اور اذیت ناک سزائیں دینے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی تھی۔ اُن کے ان تمام کارناموں کو گھریلو رنجش اور معمولی چپقلش قرار دیتے ہوئے زمانۂ قریب کے شیخ الہند کہلانے والے جناب مولوی محمود الحسن دیوبندی اُن سکھوں اور اپنے ہندو بھائیوں کے بارے میں یوں فہمائش کرتے ہیں:

لہ محمد مسعود احمد، پروفیسر: فتاوٰی مظہری، مطبوعہ کراچی، ص ۱۲۲ تا ۳۲۲

"اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے مقاصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں (ہندو مسلم) کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اُس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ اِدھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بد اعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو، ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے دبا سکے گی۔" [1]

اسی پر بس نہیں، موصوف نے بڑے ناصحانہ اور درد بھرے لہجے میں دونوں اقوام کے خواص و عوام کی خدمت میں فہمائش کے پہلو بہ پہلو اپیل بھی ان غیرت مندانہ الفاظ میں کی ہے:

"اگر فرض کرو، ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیتے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لیے مہلک نہیں۔ البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں،

---

[1] محمود الحسن، مولوی: خطبۂ صدارت، مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند: ص ۱۰

[2] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص (۲۹)

اتفاق کے حق میں ہم قائل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے"۔[1]

موصوف انگریزوں کی غلامی سے تو ، فی چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے پوری طرح بیتاب تھے بلکہ جتنے اس مقصد کی خاطر جدوجہد کرتے اُتنے ہی ہندوا ور گاندھی کے قدموں سے قریب ہو جا رہے تھے۔ یہ نہ سمجھ پائے کہ ان تمام کاوشوں کا ثمرہ صرف اور صرف ہندوؤں کو ملے گا انگریز واقعی دشمنِ اسلام تھا اور ہے لیکن کیا ہنود حلقہ بگوشِ اسلام ہیں ؟ کیا یا اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں ؟ دریں حالات یہ کہاں کی دانشمندی تھی کہ ایک دشمنِ اسلام قوم کی غلامی کا پھندا اپنے گلے سے ہٹانے کی خواہش میں دوسری اُس سے بھی بڑھ کر دشمنِ اسلام قوم کی غلامی کا طوق برضا و رغبت زیب گلو کر لیا جاتے۔ موصوف نے ترکِ موالات کے سلسلے میں جو فتویٰ جاری کیا تھا وہ بھی شرعی فتویٰ ہونے کی بجائے اُن کی انگریز دشمنی اور ہندو نوازی کا آئینہ دار ہے جبکہ شرعی فتویٰ تو خدا اور رسول کے احکام کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرنا ہے ، لیکن آنجناب کے فتوے میں یوں ہے :

"(۲) تحفظِ ملت اور تحفظِ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادرانِ وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحقِ شکریہ ہیں ۔ (۳) استخلاصِ وطن کیلئے برادرانِ وطن سے اشتراکِ عمل جائز ہے ، مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو"۔[2]

ہندو لیڈر اتنے کم عقل کہاں تھے کہ ان صاحبان کے مذہبی معاملات میں دخل دیتے یا ظاہر ہمدردی کا دم نہ بھرتے۔ کیا کوئی ہندو نواز بتا سکتا ہے کہ ہندوؤں کو ملتِ اسلامیہ اور خلافت کے تحفظ سے ایک رائی کے برابر بھی دلچسپی تھی یا ہے ؟ وہی اُن کے یار اور مددگار اب تو اُن الفاظ کو جھوٹ موٹ بھی زبانوں پر نہیں لاتے۔ آخر کیوں ؟ اب تو یقین آگیا

---

[1] عبدالرشید ارشد ، مولوی : بیس بڑے مسلمان ، مطبوعہ لاہور ، ص ۲۹۱

[2] حسین احمد ٹانڈوی ، مولوی : نقشِ حیات ، جلد دوم ، ص ۲۵۹

یا نہیں کہ ہندو لیڈر مسلمانوں کو جھوٹی ہمدردی کے جال میں پھنسا کر محض اپنا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے استعمال کر رہے تھے۔ باری تعالیٰ شانہٗ نے تو فرمایا تھا کہ لَا یَأْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ۔ کہ کافر تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے لیکن مسلمانوں کے ان محسن اور لیڈر بننے والوں نے معلوم نہیں فرمانِ الٰہی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا یا اپنے ہندو بھائیوں کو کافروں میں شمار کرنا برداشت نہ کیا۔ چنانچہ مولوی محمود الحسن صاحب کا مذکورہ فتویٰ بھی شرعی ذمہ داری پوری کرنے کی بجائے اپنے برادرانِ یقینی کی رضا جوئی اور کانگرس کی تائید و حمایت میں جاری ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو :

"یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اجلاس کانگرس ہوا تھا اور اُس میں نان کوآپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی۔ اِس کے خلاف مسٹر جناح اور اُن کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی اور یہ پارٹی صد درجہ اقلیت میں آگئی تھی۔ ملک کے تمام اہلِ الرائے ہندو اور مسلمان ، برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی کی رائے قبولیتِ عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترکِ موالات کے متعلق طلبہ یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا۔ جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترکِ موالات کی تمام دفعات میں کانگرس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلبۂ مسلم یونیورسٹی کو ذمہ دار مشورہ دیا تھا کہ وُہ اِس پر عمل کریں۔" [1]

دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر ہونے کی حیثیت میں مولوی محمود الحسن صاحب کا یہی فتویٰ تمام گاندھوی علماء کی طرف سے کفایت کرتا تھا کیونکہ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں" لیکن کانگرس کی موافقت میں دو چار لفظ لکھ کر ان شہسواروں کی فہرست میں اپنا نام درج کروانے کو پروانۂ نجاتِ اُخروی یا سعادتِ دارین کا ذریعہ سمجھتے ہوئے مزید پانچ سَو علماء کے قلم بھی حرکت میں آ کر ہی رہے :

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۸۵

"اِس کے بعد یہی فتوٰی جمیعتِ علمائے ہند کے متفقہ فیصلے کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخطوں سے شائع کیا گیا۔" ؎۱

موصوف کی ریشمی رومال والی تحریک کا اُن کے حواریوں میں بڑا شہرہ ہے کہ اُنھوں نے انگریزوں کی غلامی کا جُوا اُتار پھینکنے کے لیے یہ بڑی پُراسرار اور منظم جد و جہد کی تھی۔ جہاں تک اُن کی انگریز دشمنی کا تعلق ہے وہ تسلیم لیکن کیا یہ تحریک صرف مسلمانوں کے مفاد میں اور ہندو کی دوستی بلکہ غلامی سے آزاد ہو کر چلائی گئی تھی؟ تفصیلات کے چہرے سے نقاب اُٹھا کر دیکھا تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ منصوبہ ہندو کا تھا اور یہ گاندھوی علماء یا لیڈر محض شطرنج کے مہرے تھے جنھیں مسلم ممالک اور مسلمانانِ ہند کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے آگے لگایا گیا تھا۔ اِس بارے میں رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے پیراگراف نمبر ۱۴۲ کا ایک اقتباس، اِن حضرات کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

"مولوی عبیداللہ (سندھی) اور اُس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لیے ایک تجویز تیار کی تھی۔ اِس تجویز کے مطابق مہندر پرتاپ نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا۔ یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں بدنام زمانہ ہردیال سے ملا۔ ہردیال نے اُسے جرمن قونصل سے ملایا اور وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اِس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصورسے متاثر کیا اور اُسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا کو وزیرِ ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیرِ اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان، امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔"

؎۱ عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۸۶

ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب ولہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام اسلامک فریٹرنٹی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومت جاپان نے اس کو بند کر کے اُسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدر پارٹی سے جا ملا۔

۱۹۱۶ کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومت موقتہ پروزنل گورنمنٹ نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے، جن میں اس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔

زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا۔۔۔ حکومت موقتہ کی ایک تجویز یہ بھی کہ ترکی حکومت سے روابط قایم کیے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مولانا عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ جو ۸ رمضان (۹ جولائی ۱۹۱۶) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا، ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبد الرحیم کے پاس حیدرآباد سندھ بھیج دیا گیا۔ شیخ عبد الرحیم تب سے غائب ہے۔ لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبد الرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سر انجام دیں۔

مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومت برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں، ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد، جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل قیام، بھاگے ہوئے طالب علموں کے واقعات، غالب نامہ کی اشاعت کا

ذکر تھا اور حکومت مؤقتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس ملک کی بھرتی ہندوستان سے کرنے کی تجویز ہوئی تھی اور اس کا کام، اسلامی حکومتوں کے درمیان سلسلۂ اتحاد قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود الحسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ تک پہنچا دیں۔ مولانا عبیداللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتب و مکمل نقشہ تھا۔ اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود الحسن صاحب کو اس کا سالار بننا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار عبیداللہ کو بننا تھا۔ اس فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔[۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف صریح طور پر واضح ہے کہ یہ برطانیہ کے خلاف جرمن حکومت کا ایک منصوبہ تھا۔ بعض منچلے، جہاں دیدہ اور ہر فن مولا ہندو اس تحریک کے سرغنہ بنائے گئے۔ ہندو نواز چند علماء کو اس لیے شامل کر لیا گیا تھا کہ ان کے باعث اسلامی ملکوں کا تعاون حاصل کرنا آسان ہو جائے، جبکہ سلطنت عثمانیہ خاص طور پر برطانیہ سے تازہ زخم کھائے ہوئے تھی اور عام طور پر مسلمانوں کے اکثر ملک حکومت برطانیہ سے متنفر ہو چکے تھے۔

حالات و واقعات سے ظاہر تو یہی ہوتا تھا کہ اس جرمنی منصوبے میں ہندو کی اوّلین اور مسلمانوں کی حیثیت ثانوی تھی، لیکن رولٹ کمیشن نے بھی اپنی اسی رپورٹ میں ہندوؤں کو خوش کرنے اور اپنی اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تحریک کو پان اسلامک قرار دے دیا۔ کمیٹی کا یہ فیصلہ کسی طرح بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ جن علماء نے اس تحریک میں حصہ لیا وہ خود اسے پان اسلامک تحریک تسلیم نہیں کرتے مثلاً:

"اگر فی الواقع یہ مسلمانوں کے لیے منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر پرتاپ کو صدارت کیوں دی جاتی اور حکومت موقتہ میں غیر مسلموں کے لیے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی،

---

[۱] عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۰۸

جیسا کہ آگے آئے گا۔ (۲) اگر صرف مسلمانوں کے لیے یہ منصوبہ تھا تو ہردیال کی کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی اعانتیں کیا گواہی دیتی ہیں ؟ دیکھو رولٹ رپورٹ، فصل پنجاب۔ (۳) جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیرِ اعظم بنا تھا، جیسا کہ آگے آئے گا اور وہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا، جس میں رام چندر جیسا مشہور و معروف بھی ممبر تھا، تو اِس (رولٹ رپورٹ) میں فقط مسلمانوں کی شورش کیوں ذکر کی گئی، بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی، جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے البتہ مسلم عنصر غالب تھا، جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمار میں دکھلایا ہے اور یہی امر مولانا عبیداللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔"[1]

اس تحریک کے بارے میں مزید اِس سے بھی واضح تبصرہ ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے مسلمانوں کے بڑے کاموں پر خود اُن کا بڑا واضح تبصرہ ان الفاظ میں موجود ہے :

"مولانا عبیداللہ اِس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جمائے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو۔ وہ اپنی ڈائری کے صفحہ ۸۸ میں لکھتے ہیں: میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اُس وقت سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا لیکن مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اِس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی"۔۔۔۔۔ خیال فرمائیے کہ رولٹ کمیٹی اِس تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی ہے اور تحریک چلانے والا اِس کو ہندوستانی تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لیے موثر قرار دیتا ہے۔ یہی اُس کا عقیدہ اِس سے پہلے کا ہے ۔ ۔ ۔ اور اسی کو حضرت شیخ الہند کا مشورہ قرار دیتا ہے مگر رولٹ کمیٹی افتراق پھیلانے کے لیے اِس کو پان اسلامک کہتی ہے۔"[2]

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۷۶

[2] ایضاً، ص ۲۷۷

جناب صدر دیوبند، مولوی محمود حسن صاحب کی پوزیشن کو اس سلسلے میں اگر اور واضح کر دیا جائے کہ وہ اس تحریک کو اسلامی تحریک سمجھتے تھے یا ہندوستانیوں کی جد و جہد آزادی تو میرا خیال ہے کہ یہ حوالہ بارِ خاطر نہ ہوگا بلکہ انصاف پسند قارئین کے ذہنوں کی ایک الجھن کو سلجھانے اور حقیقت کو اُس کی اصلی شکل و صورت میں واضح کر دکھانے کا باعث بنے گا۔ الفاظ یہ ہیں:

"ہم بارہا عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز نے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ وغیرہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے آزادی کی سکیم چلائی جائے۔ پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے؟ حضرت شیخ الہند نے نہ صرف اس کو قبول فرمایا تھا بلکہ پہلے سے اس پر عامل تھے۔ اُن کے مشن میں سکھ اور انقلابی ہندو شریک تھے جن کی وجہ سے ایک مستقل مکان دیوبند میں کرائے پر لے رکھا تھا۔"[1]

تحریکِ خلافت

اب ذرا تحریکِ خلافت کو بھی دیکھ لیا جائے کہ اس تحریک کو چلانے والے کون تھے قیادت کس کے ہاتھوں میں تھی؟ تحریکِ خلافت کے نام پر ہو کیا رہا تھا؟ جو کچھ اس تحریک کے نام پر کیا گیا اُس سے سلطنتِ عثمانیہ کو کہاں تک فائدہ پہنچا؟ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ تحریکِ خلافت کی رُوحِ رواں مولانا محمد علی جوہر تھے۔ موصوف کی تحریک نے اسلامیانِ ہند میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ مسلمانوں کے سینوں میں انگریزوں سے نفرت کا سیلاب اُمنڈنے لگا تھا فعّال قوم کے اس جوش و خروش کو دیکھ کر گاندھی صاحب للچائے، محبت کا ڈول ڈالا اور ہندو کے اُس بیدار مغز و عیار لیڈر نے اپنی قوم کو مولانا کی ہمنوائی پر لگا دیا۔ مولانا کوئی احسان فراموش تھوڑے ہی تھے، جب ہندو مولانا کی ہر آواز پر لبیک کہنے لگے تو شکرگزاری کے طور پر موصوف نے

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۶۸

ندھی جی کی ہر بات پر لبیک کہنا شروع کر دیا بلکہ تحریکِ خلافت میں اُن کے گھر کی لونڈی بنا دی۔

"جن دنوں کانگرس کا اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا، اُنہی دنوں خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی ہوا اور اس میں بھی ترکِ موالات کا ریزولیشن منظور کر کے مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت کے لیے گاندھی جی کو منتخب کیا۔"[1]

ولانا محمد علی جوہر کی نظر میں گاندھی جی کا کیا مقام تھا اور ایک کھلے کافر و مشرک پر تحریکِ خلافت کے نی اور مسلمانوں کے اِس بیدار مغز لیڈر کو کہاں تک اعتماد ہو گیا تھا، حقیقت تو یہی کچھ نظر رتی ہے کہ اتحاد و دوستی کا رشتہ ذہنی غلامی پر جا کر منتج ہو گیا تھا۔ یہ مشرک نوازی کی پاداش میں قدرت کی طرف سے سزا کے طور پر واقع ہوا ہو تو عجب نہیں۔ اب اس آگ اور پانی کے اجتماع ضدین کا ملاپ اور انتہائی افسوسناک ملاپ ملاحظہ ہو:

"مولانا محمد علی جوہر اُن دنوں پوری طرح مسٹر گاندھی کے ہمنوا تھے اور دونوں میں اتحاد و یکسانیت اس قدر تھی کہ دیکھ کر حیران ہوتی ہے۔ ہر ایک کو دوسرے پر پُرخلوص اعتماد تھا۔ چونکہ تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں تھی، اس لیے مولانا اپنے لیڈر پر بھرپور اعتماد رکھتے تھے۔ کراچی جیل سے مولانا بیجاپور منتقل کر دیے گئے راستے میں کسی اسٹیشن پر کسی نامہ نگار نے تحریک کے متعلق اُن سے سوال کیا۔۔۔ محمد علی نے جواب میں کہا کہ تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں جو باہر ہیں، میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ "میں اپنے لیے بعد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں۔"[2]

مولانا جوہر کے پیر و مرشد یعنی مولوی عبدالباری فرنگی محلی جو گاندھی جیسے سامریٔ وقت کے سحر سے مسحور ہو کر اُس پر ہزار جان سے قربان ہو کر، ایک جید و متبحر عالمِ دین ہونے کے باوجود ڈنکے کی چوٹ یوں کہتے تھے کہ

[1] عبدالرشید ارشد مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۰۰

[2] ایضاً، ص ۲۰۰

عمرے کہ بآیات و احادیث گذشت
رفتی و نثارِ بُت پرستے کردی

چنانچہ موصوف کے یہی پیر و مرشد اپنے مرید کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" سے بھی آگے بڑھ کر اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہیں :

"لکھنؤ سے اجمیر جاتے وقت ایک بڑے اسٹیشن پر جو انگریزی اخبار بیٹے خرید لیا اتفاق سے اُس میں یہی مکالمہ درج تھا۔ مولانا عبدالباری (مولانا جوہر کے مرشد) نے انھیں پڑھوا کر سُنا۔ اُن کے ایک رفیقِ سفر و حضر، جو اس وقت بھی اُن کے ہمراہ تھے، بول اُٹھے کہ بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا، یہ گاندھی جی کیا معنی؟ مولانا نے برجستہ جواب دیا "مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں، وہ تو رسول ہی کا نائب ہوتا ہے، جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اسی میں شامل ہو گئے، گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ و مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ نام ان ہی کا لینا مناسب تھا۔"[1]

شاید کوئی کہے کہ مولانا محمد علی جوہر تو سیاسی لیڈر تھے عالمِ دین تو نہ تھے اور اُن کے مرشد خود بھی گاندھی کے دامِ تزویر میں گرفتار تھے لہٰذا ہم ان بیانات پر دارالعلوم دیوبند سے تصدیق کی مہر لگوا دینا ضروری سمجھتے ہیں :

"اس اقتباس کو پڑھ لینے کے بعد ایک بات اصولی انداز میں سامنے آتی ہے کہ جب کسی کو تحریک کا قائد بنا لیا جائے (خواہ وہ شیطان ہو) ۔۔۔ اختر ؔ تو پھر اُس پر پُورا اعتماد کرنا چاہیے۔ مولانا محمد علی جوہر کے گاندھی جی کے متعلق اِس قسم کے نظریہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے نقد و نظر کا دروازہ کھولا ہے اور بات کو دور تک لے گئے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا جوہر کا یہ نظریہ کسی بھی نقطۂ نظر سے غلط نہیں ہے۔"[2]

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۸۰۷

[2] ایضاً: ص ۸۰۷

جب تحریکِ خلافت پورے زور شور سے جاری تھی تو اُن دنوں ہندو مسلم اتحاد بھی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ انگریزوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اگر صورتِ حالات یہی رہی تو ہندوستان سے ہمیں بوریا بستر گول کرتے ہی بنے گی۔ انگریزوں نے شردھانند کے کان میں پھونک ماری کہ ملکانہ کے راجپوتوں کو ہندو بناؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ رہا کر دیے گئے۔ دوسری طرف مولوی محمد الیاس کاندھلوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) کو پانچسو روپیہ ماہوار پر راضی کیا کہ وہ میوات کے ہندو نما مسلمانوں میں تبلیغ کر کے اُنھیں اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور کریں۔ حکومت کو نہ ہندومت سے عقیدت تھی نہ اسلام سے پیار۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد جو اُن کے اقتدار کے لیے مستقل خطرہ بنتا جا رہا تھا اُسے توڑ دیا جائے۔ شدھی پر مسلمان بھڑکیں گے اور ان کی تبلیغی مساعی سے ہندو بدکیں گے اس طرح اتحاد کے بجائے دونوں قومیں آپس میں ہی ٹکرانے لگیں گی اور ہم کرسیِ اقتدار پر بیٹھے ہوئے تماشا دیکھتے رہیں گے۔ اس انگریزی منصوبے کی کہانی، دیوبندی حضرات کی زبانی سنیئے:

"انگریز بڑی شاطر قوم ہے۔ تحریکِ خلافت پر اُس نے ہندو مسلم اتحاد کا جو نظارہ دیکھا اُس کو دیکھ کر اُسے گمان ہوا کہ اگر یہ لوگ اسی طرح متحد رہے تو ہم چند دنوں کے مہمان ہیں۔ لہٰذا حکومت نے سوامی شردھانند کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا، جنہوں نے باہر آ کر شدھی کی تحریک چلائی اور ملکانہ کے راجپوتوں کو مشرف بہ ہندو کرنا شروع کر دیا۔ یہ بیچارے نام کے تو مسلمان تھے لیکن رسم و رواج کے لحاظ سے ہندوؤں کی طرح۔ لہٰذا شردھانند کی شدھی تحریک کا اُن پر جلد اثر ہوا اور وہ ہندو مذہب میں داخل ہو گئے...... اور انہی دنوں ملابار میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ ان سب حالات کی بنا پر ہندو مسلم جو متحد ہو کر انگریز کے خلاف تھے اب ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے اور دونوں قوموں کی پوری توانائیاں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں"[۱۵]

[۱۵] عبدالرشید ارشد، مولانا: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۸۰۸

جب انگریز کا یہ منصوبہ کامیاب ہونے لگا اور جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں ٹھن گئی تو وہ بڑے بڑے ہندو لیڈر جنھیں تحریکِ خلافت کی گاڑی کو چلانے والے مسلمان لیڈر اور گاندھوی علماء نے یا رو مددگار یا اعیان انصار اور اپنی کشتی کے ناخدا اور جماعت کے امام و پیشوا بنائے بیٹھے تھے، اُنھوں نے اس موقع پر اپنا کیا رنگ دکھایا؟ ان مسلمانوں کے لیڈر اور علماء کہلانے والوں کو اُنھوں نے واقعی بھائی سمجھ کر سینے سے چمٹایا یا ان کے کسی بڑے سے بڑے کو بھی منہ نہ لگایا۔ صورتِ حال ملاحظہ ہو

"مولانا (محمد علی جوہر) جب جیل سے رہا ہوئے تو ملک کی حالت بدل چکی تھی۔ اتحاد و اتفاق کی جگہ افتراق و انتشار نے لے لی تھی اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک کے سامنے ترکِ موالات اور عدم تعاون کا جو پروگرام رکھا گیا تھا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی جگہ شدھی نے لے لی اور ادھر مسلمانوں نے مجبور ہو کر مدافعت میں تبلیغی مہم شروع کر دی۔ تقریباً تمام دینی جماعتیں اور علماء شدھی کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ علماء کا موقف یہ تھا کہ سوامی شردھانند کی تحریک کا اگر مقابلہ یا دفاع نہ کیا گیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو اس کا بہت بڑا دینی نقصان ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر کے بیشتر ساتھی بھی اسی تبلیغی مہم میں لگ گئے۔

موتی لال نہرو اور دوسرے وکلاء پریکٹس شروع کر کے اپنی اپنی وکالت و بیرسٹری کو فروغ دینے کے سامان کر رہے تھے۔ لیکن ایک مولانا محمد علی تھے جنھیں یہی دھن تھی کہ اُسی پروگرام و نصب العین کو اپنایا جائے جس کے لیے نہ صرف وہ جیل گئے بلکہ ملک کے تمام بڑے بڑے لیڈروں اور چالیس پچاس ہزار افراد نے ہنسی خوشی تمام کام چھوڑ کر جیل کو اپنا گھر بنایا تھا۔ مولانا محمد علی اگر چاہتے تو اسی رَو میں بہہ کر عوامی احساسات کا ساتھ دیتے مگر اُنھوں نے بلا خوف لومۃ لائم ان حالات میں بھی کانگرس سے پوری وفاداری کا ثبوت دیا اور کانگرس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے اور اُس کی مقبولیت بحال کرنے میں اُن تھک

ایک کر دیا۔"[۱]

شدھی کے ذریعے چونکہ ہزاروں مسلمانوں کو مرتد کیا جا چکا تھا اور کامیابی سے اُن دشمنانِ اسلام کو تحریک چل رہی تھی، اسی لیے ہندو لیڈروں نے چپ کی سادھ لی، منہ سی لیے۔ اس کے برعکس مولانا محمد علی جوہر اپنے ساتھی ہندو لیڈروں سے اپیل کرتے پھر رہے تھے کہ وہ اپنی معنی خیز چپ توڑیں، حالات پر قابو پانے میں مدد دیں حالانکہ اینٹ پتھر کے ان پجاریوں نے گرگٹ کی طرح اپنا رنگ ہی بدل لیا تھا، لیکن افسوس! یہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہوئے بھی مولانا کی وفاداری کس کے ساتھ رہی اور کس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے میں مصروف رہے، یہ قارئین نے ملاحظہ فرما ہی لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مولانا کی کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا:

"مولانا محمد علی کی انتھک کوششوں اور مساعی کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کم ہوتا گیا اور اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ اس کے لیے ایک "یونٹی کانفرنس" دہلی میں اور ایک شملہ میں منعقد ہوئی، جس میں اکثر ہندو مسلم زعما شریک ہوئے کئی کئی دن اس کے اجلاس ہوتے رہے۔ مولانا نے بیحد کوشش کی کہ کسی طرح وہ فضا پیدا ہو جائے جو تحریکِ خلافت میں تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ فسادات ہوتے رہے اور ہندو مسلم تعلقات میں تلخی و کشیدگی بڑھتی رہی۔ گاندھی جیسا آدمی بھی یہ کہہ کر کہ "اب میری بات کوئی نہیں سنتا" اپنے آشرم میں چلے گئے۔"[۲]

آئیے! اب یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا کی اس ہندو نواز پالیسی کو متبعین زمانہ اور ہندو پریس نے کس نظر سے دیکھا؟ گاندھی کے سکوت سے کیا سبق حاصل کیا؟ سبق حاصل کرنے کے باعث کیا نتائج برآمد ہوئے؟

"مولانا جوہر کا یہ کردار بلاشبہ قابلِ تعریف و تحسین تھا اور حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہندو پریس مولانا کے اس رویّے کو بنظرِ استحسان دیکھتا اور خراجِ عقیدت ادا

---

[۱] عبدالرشید ارشد، مرتب: بیس بڑے مسلمان، ص ۸۰۹

[۲] ایضاً، ص ۸۱۲

کرتا، مگر ہندو زعماء اور پریس ہمیشہ مصلحت آمیز سکوت اختیار کرتا رہا اور مسلمان یہ
کہتے رہے کہ مولانا جوہر پر گاندھی جی کا سحر ہے اور وہاں اسی سحر میں سر ہلا کر
ہندو پریس یہ ضرور کہہ دیا کرتا تھا کہ علی برادران نے گاندھی جی پر جادو کر دیا ہے لیکن
مولانا اپنے اور پرایوں کا یہ سلوک دیکھنے اور سننے کے باوجود ہمالہ کی طرح اپنے موقف
پر ڈٹے رہے اور یہ اعتراف کرنے میں بھی بخل نہیں کرنا چاہیے کہ گاندھی جی کا رویہ بھی
منصفانہ رہا۔ انھوں نے تحریک خلافت میں جو خالص اسلامی تحریک تھی بھرپور ساتھ
دیا اور مسلمانوں نے ان کی قیادت میں کام کیا ۔ ۔ ۔ ۔ بات مولانا جوہر کی استقامت
اور اپنے موقف پر پختگی کی ہو رہی تھی، جس کی بنا پر وہ ہندو اور مسلم دونوں کی نظر میں
غیر مقبول ہو رہے تھے۔"[1]

ہندو جنھیں اپنا دینی یا یقینی بھائی سمجھا جا رہا تھا، شدھی اور تبلیغ کی تحریکوں کے سامنے آتے ہی
یکسر آنکھیں بدل گئے، مولانا جوہر جنھیں اپنا قائد و امام بنائے بیٹھے تھے یا جو ہندو لیڈر یہ ظاہر
کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے کہ وہ مولانا کے ہی دست و بازو ہیں، انھوں نے مولانا کی التجاؤں
پر کان نہ دھرے، ہندو پریس بھی مخالف ہو گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ خدا نے
وحدہٗ لاشریک کو سچا نہ مانا تھا، گاندھوی علماء و لیڈر نے اس سبوح و قدوس کے اس
فرمان کا صادق ہونا نہ جانا تھا کہ لَا یَالُوْنَکُمْ خَبَالًا۔ غیر مسلم تمھیں نقصان پہنچانے میں
کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ کیا یہی کچھ ہو کر نہ رہا؟ مزید سنیے:

"شدھی کی تحریک اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی جانب سے تبلیغی مہم کی وجہ
سے ہندو مسلم اتحاد کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور حالات ایسے ہو گئے تھے کہ
گاندھی جی بھی اپنے آشرم میں معتکف ہو گئے تھے۔ مہاسبھا کے لیڈر
شدھی تحریک کی تائید و حمایت کر رہے تھے۔ کانگرس کے ہندو زعماء ان حالات
میں مہر بلب تھے لیکن ایک مولانا محمد علی اپنے مشن میں لگے ہوئے تھے اور برابر

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۸۱۰

ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دیے جا رہے تھے، یونیٹی کانفرنسیں کیں، اپنوں کی مخالفت مول لی، ہندو لیڈروں سے اپنے درجے سے گرے ہوئے الفاظ میں منت کی کہ ملک کی آزادی کے لیے اتحاد کی راہ اختیار کرو۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور دُوسرے بزرگوں کی معیت میں گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ مُہرِ سکوت کو توڑ کر مہا سبھا کے لیڈروں کو سمجھانے کی کوشش کریں، لیکن کوئی ہندو لیڈر اپنی قوم کی مخالفت کے خوف کی بنا پر یہ جراٗت نہ کر سکا کہ وہ مولانا محمد علی کی راہ اختیار کرے۔ اِن حالات میں مولانا محمد علی نے ہی یہ جراٗت کی کہ وہ ڈاکٹر مونجے، پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے ایسے لیڈروں کے نفاق کا پردہ چاک کریں چنانچہ انھوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا اور خوب انجام دیا۔ ہندو پریس جو پہلے مولانا کی اتحاد پرور کوششوں پر سکوت اختیار کیے ہوئے تھے، اب صرف اِس تصور پر کہ وہ ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مالوی کی نقاب کشائی کرنے لگے تھے۔ مولانا کے خلاف زہر چکانی کرنے کے لیے پورے ساز و سامان سے مسلح ہو کر میدان میں آگیا۔[1]

ہندو خواص و عوام کے دلوں کا کھوٹ اور افسوسناک رویّہ ظاہر ہو کر عالم آشکار ہو چکا تھا، اس کے باوجود مولانا اِن بُت پرستوں کی ہمدردی کو تمام دُکھوں کا علاج اور آزادیِ ہند کے لیے نسخۂ کیمیا بنائے بیٹھے تھے۔ حالانکہ مسلمان کی نظر میں آزادی کو نہیں بلکہ اسلام کو اوّلیت ہے۔ مسلمان آزادی پر اسلام کو قربان نہیں کیا کرتا۔ اِس مسئلے کی شرعی پوزیشن اِسی کتاب کی جلد دوم میں "کفار سے دوستی" کے تحت ملاحظہ فرمائی جائے۔ یہاں دکھانا یہ ہے کہ مولانا نے آزادیِ وطن کے اِن چلتے پھرتے بُتوں اور بُت پرستوں کی رضا جوئی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن واے آرزو کہ خاک شدہ۔ مثلاً:

"اس پر مجبور ہو کر مولانا نے خلافت کانفرنس کا سپیشل اجلاس بلایا جو حکیم اجمل خان

---

[1] عبدالرشید ارشد، مرزا: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۵۱۸

کی تحریک اور مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا شوکت علی کی تائید سے مولانا سلیمان ندوی کی صدارت میں شروع ہوا اور اس میں مسلم زعماء نے بالاتفاق، اتحاد و اتفاق کی دعوت دی اور کہا گیا کہ آزادی کی خاطر ہم ہندوستوں کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہے ہیں، اب یہ اُن کی مرضی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو دوست کا ہاتھ سمجھیں جو مصافحہ کے لیے بڑھتا ہے یا ایک پہلوان کا جو اکھاڑے میں اتر کر اپنے حریف کی طرف بڑھاتا ہے۔

اس کانفرنس کے بعد مولانا جوہر وفدِ حجاز میں شامل ہو کر دہلی سے عرب کو روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلاء و آزمائش کا زمانہ ہے، نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہلِ ہنود کو مشتعل ہونے کا موقع دیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اُوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر وہ چھری اٹھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔"[1]

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

جس گاندھی کی امامت کو مولانا نے ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی اپنے لیے دستارِ فضیلت یا طرۂ امتیاز بنائے رکھا، نہرو رپورٹ کے وقت اُسی گاندھی نے اور دوسرے ہندو کانگریسی لیڈروں نے جنھیں مولانا اپنی فوج کے سپہ سالاروں اور اپنے یاروں اور پیاروں میں گنتے تھے خود مولانا کے ساتھ کیسا سلوک کیا:

"مولانا محمد علی یورپ سے واپس آئے تو اُنھوں نے بھی اختلاف کیا اور ہندو مسلم پھر ایک دفعہ معرکۂ کارزار بن گیا۔ تمام ہندوؤں نے رپورٹ کی تائید کی مگر مسلمانوں میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ اس آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۶۵

کی حمایت میں کانگرس تھی، لبرل حضرات تھے، ہندو مہاسبھا تھی، مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ گاندھی جی جواب تک خاموش تھے اِس مرحلے پر نہرو رپورٹ کے منظور ہونے پر وہ اِس کے حامی ہو گئے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی جنھوں نے ہر مرحلے پر کانگرس کا ساتھ دیا اور اپنوں کی گالیاں سُنی تھیں، اب اُن کے اختلاف کو کانگرس نے پرکاہ کی حیثیت بھی نہ دی اور اُن کی بات سُننے سے بھی انکار کر دیا۔[1]

؎ یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

جمعیۃ العلمائے ہند

جب ہندو نواز علماء نے اپنی سیاسی جماعت "جمعیۃ العلمائے ہند" کے نام سے بنائی جو حقیقت میں کانگرس ہی کی ذیلی شاخ تھی تو مولوی محمود الحسن صاحب اُس کے صدر اور مفتی کفایت اللہ دہلوی[2] نائب صدر یا اپنے استاد کی جگہ عارضی صدر مقرر ہوئے جنھوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۸ء تک متواتر انیس سال تک اپنی اس سیاسی جماعت کی صدارت کے فرائض سر انجام دیے اور ہندو مسلم اختلافات بلکہ دونوں قوموں کی ہنگامہ آرائیوں اور کشت و خون کے دنوں میں بھی مفتی صاحب کی دلی ہمدردیاں کانگرس کے ساتھ وابستہ رہیں۔ مثلاً:

"حضرت مفتی صاحب نے اپنے ملک کی ہر سیاسی تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۱۹ء کے رولٹ ایکٹ بل کے خلاف جب ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی تھی تو آپ نے اُس میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ آپ اِس مقصد کے لیے حکمت عملی کے ساتھ پوشیدہ کام کرتے رہے۔ تحریک خلافت کے خاتمہ کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک جاری کی اور ہزاروں ملکانوں کو، جو مسلمان تھے، مرتد کر کے

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۸۱۸

[2] مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔

ہندو بنالیا تو حضرت مفتی صاحب کانگرس اور ہندوؤں سے بعض معاملات میں اتحاد رکھنے کے باوجود اپنے مذہبی فرائض سے غافل نہیں رہے۔[1]

مفتی کفایت اللہ دہلوی (المتوفی ۱۳۷۲ھ) کے علاوہ باقی سارے کانگرسی علماء، ہندوؤں کو خوش کرنے اور ہندو مسلم اتحاد برقرار رکھنے کی خاطر، اپنے ہندو بھائیوں کے مطالبے پر، خود شارع بن کر اسلام سے مرتد کی سزا اور تبلیغ کو خارج کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ دیوبندی حضرات کا اپنا بیان ہے کہ،

"شدھی اور سنگھٹن کی تحریک کی وجہ سے تمام ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے، لہذا گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ستمبر ۱۹۲۴ء کو اکیس دن کا برت شروع کیا اور ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں تمام فرقوں کی ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں صدرِ جلسہ نے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزائے مرتد اور تبلیغ کے احکام کو خارج کر دیں۔ اس موقع پر اکثر ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اس تجویز کی حمایت کی، مگر ہزاروں کے اس مجمع میں صرف مفتی صاحب کی ذات تھی جس نے اس متفقہ تجویز کی پُرزور مخالفت کی اور شریعت کے صحیح احکام کی حمایت میں آپ عظیم ترین شخصیتوں سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔"[2]

دیوبندی حضرات کے نزدیک مفتی صاحب کی زندگی کا ایک تابناک پہلو اور موصوف کے کارناموں میں سے ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے دم واپسیں تک اینٹ پتھروں کے پجاریوں سے دوستی کا رشتہ برقرار رکھا،

"اُنھوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگرس کا ساتھ دیا جائے گا۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک اُنھوں نے اس راستے سے قدم نہیں

---

[1] عبد الرشید ارشد، مولانا: بیس بڑے مسلمان، ص ۴۳۱

[2] ایضاً، ص ۴۳۶

ہتھیار۔[۱]

مولوی حسین احمد ٹانڈوی صاحب سابق صدر مدرسہ دیوبند (المتوفی ۱۳۷۷ھ) اپنے استاد مولوی محمود الحسن صاحب (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کے خلیفہ مجاز اور جانشین تھے۔ موصوف کی سیاسی سرگرمیاں بھی اسی ڈگر پر رہیں:

"چنانچہ آپ نے صحیح جانشین ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ذمہ داریوں کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح سنبھال لیا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کی راہنمائی کے فرائض سرانجام دینے لگے اور عدم تشدد کے راستے پر چل کر حکومت برطانیہ کے خلاف ملک و قوم کی سیاسی تحریکات میں جوشِ عمل کی روح پھونکنے لگے"۔[۲]

مولوی محمود الحسن صاحب کے مشن کو ان کے جانشین مولوی حسین احمد ٹانڈوی نے جو ہندو نواز لوگوں کی نظر میں شیخ الاسلام تھے، کافی آگے دھکیلا، موصوف کانگرس کے باقاعدہ ممبر بنے اور آخری دم تک ممبر ہی رہے۔ چنانچہ خود رقمطراز ہیں:

"میں اگرچہ پہلے سے کانگرس میں شامل نہ تھا، مگر مالٹا سے واپسی پر کانگرس کا ممبر باقاعدہ ہو گیا اور ہمیشہ جدوجہد آزادی میں شریک رہا اور قید و بند کے مصائب بھی اہلِ ملک کے ساتھ جھیلتا رہا"۔[۳]

کانگرس نے جب ترکِ موالات کی تحریک چلائی تو موصوف نے بھی گاندھی کے ارشاد کو آمنّا و صدّقنا کہہ کر صرف تسلیم کیا بلکہ اس پر عمل کرنے اور کروانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ جیل بھی گئے۔ مثلاً:

"ترکِ موالات کے سلسلے میں آپ نے انتھک کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

[۱] عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۴۵۴

[۲] ایضاً، ص ۴۶۶

[۳] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۶۳

زیر دفعہ ۱۲۰، ۱۳۱، ۵۰۵ آپ کو اور مولانا محمد علی صاحب مرحوم، مولانا شوکت علی صاحب، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا نثار احمد صاحب کان پوری اور جگت گرو سوامی کرشن تیرتھ (شنکر اچاریہ) پیر غلام مجدد صاحب سندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔[1]
جب کانگرس نے ستیہ گرہ کی تحریک چلائی تو موصوف نے پوری وفاداری کے ساتھ اس میں بھرپور حصہ لیا، مثلاً:

"الحاصل جب ۱۹۲۲ء میں جمعیت اور کانگرس نے ستیہ گرہ کی تحریک پاس کی تو آپ اس تحریک میں بھی پیش پیش رہے۔ چنانچہ جب آپ دہلی تقریر کرنے کے لیے جا رہے تھے تو مظفر نگر اسٹیشن پر آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔"[2]

ٹانڈوی صاحب نہ صرف خود کانگرس میں شامل ہوئے اور ساری عمر بت پرستوں کے وفادار رہے بلکہ اپنے ہم مشرب لوگوں کو بھی اسی غیر اسلامی روش پر چلنے کی ترغیب دیتے رہے اور موصوف اسی کو اپنے خلوص و للّٰہیت کی دلیل اور اسلام و مسلمین کی خیر خواہی سمجھتے رہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غلاموں کو گاندھی کا غلام بنا کر چودھویں صدی میں خود کو ابو الفضل و فیضی کا حقیقی جانشین منوانے کی سر توڑ کوششیں کرتے رہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس نازک وقت میں حضرت مدنی کی ذات گرامی قدر تھی جو آگے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی برسر اقتدار آتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک کے دوسرے باشندوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے اور مسلمانوں کو جنگ آزادی کے لیے کانگرس کی شرکت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جمعیت علماء ہند کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مراد آباد میں کیا گیا۔ جنگ آزادی کی خاطر کانگرس میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا کہ اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے کانگرس کے ساتھ اس بارے میں (حصولِ آزادی) تعاون کیا جائے۔"[3]

---

[1] عزیز الرحمٰن جامعی؟ [illegible]، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبع سعیدی کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۲۰۵

[2] ایضاً، ص ۲۰۶

[3] عبد الرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۳۰۳

موصوف کے ان نظریات کے بارے میں عالیجناب مودودی صاحب کی رائے بھی اگر ملاحظہ فرمائی جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ ہماری ذاتی رائے ہے کہ اس بارے میں مودودی صاحب کا موقف یقیناً قابلِ توجہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

"آپ کو صرف (ٹانڈوی صاحب کو) برطانوی اقتدار کا زوال مطلوب ہے، عام اس سے کہ وہ کسی صورت میں ہو، اسی لیے آپ ایسی انجمن کے معاملہ میں صرف علتِ جواز ہی ڈھونڈتے ہیں اور علتِ حرمت جو سامنے منہ کھولے کھڑی ہے آپ کو کسی طرح نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ دیکھیں اور علتِ حرمت کو رفع کیے بغیر علتِ جواز کو قبول نہ کریں۔ اس لیے کہ ہم کو برطانوی حکومت کا زوال اور اسلام کا بقا دونوں ساتھ ساتھ مطلوب ہیں، اس کا نام اگر برطانیہ پرستی رکھنا ہے تو رکھیے، ہمیں اس کے طعن کی ذرہ برابر پروا نہیں" [1]

ٹانڈوی صاحب اکبری دور کے ابو الفضل اور فیضی کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہندوستان کے باشندوں کو، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سب کو گاندھی کے قدموں میں ڈال کر، کانگرسی اور گاندھوی بنانا چاہتے تھے، جس کا نام موصوف نے ہندوستانی رکھا تھا جس طرح اکبر بھی ہندو اور مسلمان کا فرق مٹا کر سب کو ایک قوم بنانا چاہتا تھا اور دین فروش علماء میں سے ابو الفضل اور فیضی وغیرہ اُسے جواز مہیا کر رہے تھے اسی طرح دورِ حاضر میں گاندھی نے بھی اکبری منصوبہ شروع کیا، مسلمانوں کو نزدیک بلایا تاکہ ہندو مت میں مدغم کیا جائے، حتیٰ کہ اپنے قدموں میں جگہ دی خود کو محمد رسول اللہ کی شکل کہنے والوں کا غرور اگر مشرکوں اور بت پرستوں کے جوتوں میں ڈال کر نہ توڑا جاتا تو کیا پروردگارِ عالم و عالمیان اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخوں کا ان کی بدزبانیوں پر کوئی نوٹس نہ لیتا؟ گاندھی کے غلام بننے، مسلمانوں کو مشرکینِ ہند سے محبت و اتحاد کا رشتہ قائم کرنے اور ہندوؤں میں مدغم ہونے کی تجویز پر مُہرِ تصدیق ثبت فرماتے ہوئے ٹانڈوی صاحب

---

[1] ابو الاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۹۴

انڈین کمیٹی نے مُلّا مبارک کے فرزندوں کی طرح آیات و احادیث سے جواز دیا کیا۔ دین میں مداہنت سے جسارت دکھانا، قرآن و حدیث میں من و اذرے کھل کر تحریفیں کرنا اگر خدا کے عذاب اور رسول کی ناراضگی کا موجب ہوگا تو ہوتا پھرے، اپنے پیشوا گاندھی جی کو تو خوش کر لیا۔ اپنے ہندو بھائیوں کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ موصوف اپنی گاندھوی قوم کے بارے میں یہودیوں تو ہینِ رسالت کا ارتکاب کر کے غضبِ خداوندی کو جوش میں لاتے تھے:

"اس پر ملک و وطن میں بڑی بڑی بحثیں ہوئیں مگر وہ اپنی جگہ مطمئن تھا اور مطمئن رہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے یہودیوں اور مسلمانوں کو حفاظتِ وطن کے نام پر ملا کر ایک قوم بن سکتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادیٔ وطن کے لیے اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔"[1]

تھانوی صاحب کے اس خلافِ حقیقت بیان اور نظریہ پر مودودی صاحب یوں تبصرہ کرتے ہیں:

"مولانا (تھانوی صاحب) آخر فرمائیں تو کہ جس متحدہ قومیت کو وہ رسولِ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آجکل کی متحدہ قومیت کے عناصرِ ترکیبی میں سے کون سا عنصر پایا جاتا ہے؟ اگر وہ کسی ایک عنصر کا پتہ نہیں دے سکتے اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے تو کیا مولانا کو خدا کی باز پرس کا خوف نہیں؟"[2]

آگے مودودی صاحب اسی گاندھوی قومیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"مولانا (تھانوی صاحب) اس متحدہ قومیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے تشبیہ دینے کی جرأت فرما رہے ہیں حالانکہ ان بنیادی حقوق کی حیثیت ملکہ وکٹوریہ کے مشہور اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے اور مغرب کی ڈپلومیسی کی ایسی چالوں کا رشتہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جوڑ دینے

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۰۷
[2] ابو الاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۹۰

کی جسارت ہم جیسے گنہگاروں کے بس کی بات تو نہیں، ہاں جن کے پاس تقویٰ کا
زادِ راہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایسی جسارتیں کرنے پر بخشے جانے کی اُمید رکھتے ہیں
اُنھیں اختیار ہے کہ وہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں لکھیں۔" [1]

موصوف نے اِسی سلسلے میں ٹانڈوی صاحب کو فہمائش کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں
حقیقت پسندی کی دعوت دی اور دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط کرنے سے روکنے کی کوشش
کی ہے:

"کم از کم اب وہ (ٹانڈوی صاحب) اُمت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمائیں
ورنہ اندیشہ ہے کہ اُن کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی اور اُس پرانی سنت کا
اعادہ کریں گی کہ ظالم امراء اور فاسق اہلِ سیاست نے جو کچھ کیا اُس کو علماء کے
ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی
ڈھال فراہم کر دی۔" [2]

ٹانڈوی صاحب نے اپنی تجویز کردہ گاندھوی قومیت کو شریعتِ محمدیہ سے درست ثابت کرنے
اور ابوالفضل و فیضی کا حقیقی جانشین بننے کی غرض سے "متحدہ قومیت و اسلام" کے نام سے
ایک کتاب لکھی۔ اِسی کتاب کے دلائل اور صفحہ ۵ کی ایک عبارت پر مودودی صاحب تنقید
کرتے ہوئے، اُن کے غلط موقف کو یُوں سمجھاتے ہیں:

"عبارت کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ مولانا (ٹانڈوی صاحب)
نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں، نہ کانگرس کے مقصد اور مدعیٰ
کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انھوں نے غور کیا ہے، نہ اُن کو خبر ہے
کہ جن اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اِس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں
اُن کے حدود و اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت کن کن راہوں سے

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا، مسئلہ قومیت، ص ۶۰
[2] ایضاً، ص ۶۹

اس دائرے میں نفوذ کرتے ہیں، جس کو تہذیب و تمدن اور عقاید و اخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے ...... اور یہ بات بھی میں سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ مولانا حسین احمد بایں ہمہ علم و فضل، کلچر، تہذیب، پرسنل لاء وغیرہ الفاظ بھی جس طرح استعمال کر رہے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ میری یہ صاف گوئی اُن حضرات کو یقیناً بری معلوم ہوگی جو رجال کو حق سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے خوگر ہیں۔ اس کے جواب میں چند اور گالیاں سننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔"[1]

علامہ اقبال مرحوم بھی وطنیت کے اُسی معنی و مفہوم کے قائل تھے جس کا تصور اسلام دیتا ہے۔ مثلاً: ؎

دُلا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بِنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

علامہ نے یُوں تو اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اُن کے کلام سے وطنیت کے بارے میں یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

اِس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بِنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا: مسئلہ قومیت، ص ۱۴۴، ۱۴۵

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اِس بُت کو ملا دے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اِسی سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اسی سے[1]

اِس اسلامی تصورِ وطنیت کے خلاف ٹانڈوی صاحب نعرہ بلند کر رہے تھے کہ "ملتیں اوطان سے بنتی ہیں" بھلا ڈاکٹر اقبال جیسا فرد کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔ جواباً یہ اشعار سپردِ قلم کر دیے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن ست
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست[2]

ڈاکٹر اقبال کے مذکورہ اشعار کا گاندھوی حضرات تک پہنچنا کیا ہوا، گویا خس میں آگ لگ گئی، سارا ماحول بھڑک اٹھا۔ ٹانڈوی صاحب اور اُن کے معتقدین نے موصوف کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کر دیا، طول طویل بحثوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ اقبال مرحوم ان دنوں بسترِ علالت پر دراز تھے۔ آپ نے ٹانڈوی صاحب کی ایک دو تحریروں کا جواب تو دیا لیکن چاروں طرف سے ہنگامہ آرائی دیکھ کر اِس شعر پر بحث کا خاتمہ کر دیا:

"قلندر جز دو حرفِ لا اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا"

اِس موقع پر لاہور سے نکلنے والے اخبار "زمیندار" کے ایڈیٹر جناب ظفر علی خان بھی خاموش نہ رہ سکے۔ اُنھوں نے علامہ اقبال کی تائید اور ٹانڈوی صاحب کی توضیع میں مندرجہ ذیل اشعار سپردِ قلم کر دیے:

---

[1] کلیاتِ اقبال، مطبوعہ دہلی، ص ۱۶۹، ۱۷۰

[2] محمد اقبال، ڈاکٹر، ارمغانِ حجاز، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۰

حسین احمد مدنی

وطن جس کی رُو سے ہے بنیادِ ملت | میں اُس شرع کی کر رہا پیروی ہوں
آجسا کا فوارہ اُچھلا ہے جس سے | میں اُس زندگانی کی شانِ نزی ہوں
سکھاتا ہے جو ناچنا اور گانا | میں اُس مدرسہ کا بڑا مولوی ہوں
کبھی میں بھی تھا عازمِ سوئے یثرب[1] | اب اس عزم کو کر چکا ملتوی ہوں
کوئی قادری ہے کوئی سہروردی | مرا فخر یہ ہے کہ میں گاندھوی ہوں
مجھے لیگ سے اِس لیے دشمنی ہے | وہ عبدالنصاری[2] میں عبدالقوی ہوں
پرستی ہیں جس سے ترنگی بلا تیں | میں اُس عرش پر آجکل مستوی ہوں

سمجھ لوں میں جینا کو کیونکر مسلماں
کوئی میں بھی اشرف علی تھانوی ہوں

خدا اور رسول کے احکام بیان کرنے میں ٹانڈوی صاحب کس درجہ محتاط تھے اور فتویٰ نویسی کی شرعی ذمہ داریوں کو نبھاتے وقت خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو کہاں تک مدِ نظر رکھا کرتے تھے اِس کی حقیقت مودودی صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو :

"میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت کو ایک دن حرام اور دوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے۔ اِس لیے کہ ان کی تحلیل و تحریم حقیقتِ نفس الامری کے ادراک پر تو مبنی نہیں محض گاندھی جی کی جنبشِ لب کے ساتھ ان کا فتویٰ گردش کرتا ہے۔"[3]

ٹانڈوی صاحب اینڈ کمپنی کی ہندو نوازی بلکہ زنار دوستی پر تبصرہ کرتے ہوئے اِنھیں حضرات سے یک

---

[1] مدینہ منورہ کو از روئے احادیث "یثرب" کہنا منع ہے۔ یہاں طیبہ لکھا جا سکتا تھا۔ (اختر)

[2] مراد مسٹر محمد علی جناح ہے کیونکہ اُن کے مخالفین "جینا" کہا کرتے تھے۔ یہاں ٹانڈوی صاحب کی زبان میں جینا کہا ہے۔ (چمنستان ص ۱۴۴) [3] ابو الاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۴۳

...سا حکیم الامت بلکہ ان کے مجدد ملت بلکہ جامع مجدد دین صاحب کہلانے والے مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) ان حضرات کی گاندھویت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"جو بات گاندھی کے منہ سے نکل جائے فوراً اس کو قرآن و حدیث پر منطبق کرنے کی کرتے ہیں۔ اس تحریک میں کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جو کسی مسلمان لیڈر یا علماء کی ہو۔ دیکھیے ہوم رول گاندھی کی تجویز، بائیکاٹ (ترک موالات) گاندھی کی تجویز، ہجرت کا مسئلہ اس کی تجویز، غرض کہ جملہ تجویزیں اسی کی ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ جو اس نے کہا لبیک کہہ کر ساتھ ہو گئے۔" [۱]

مشہور دیو بندی عالم علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کے بھتیجے مولوی عامر عثمانی مدیر ماہنامہ 'تجلی' اپنے اکابر دیو بند کی زنار دوستی پر یوں کھل کر تبصرہ کرتے ہیں:

"پنڈت نہرو کی ہاں میں ہاں ملانے کا سعادت مندانہ فرض بڑے بڑے علماء ربانیین (علمائے دیو بند) کو بھی بتقاضائے 'دینی' ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر پنڈت نہرو کہہ دیں کہ دین اور سیاست کو ایک سمجھنے والے نرے گدھے ہیں تو علماء ربانی و حقانی کی ایک بڑی کھیپ اس پر تصدیقی دستخط کر دے گی اور جو پرانے خیال کے مولوی دستخط سے گریز کریں گے انہیں زندیق و کافر ٹھہرا کر جیل میں بھجوانے کی ترکیبیں کرے گی۔" ملخصاً [۲]

۳ جولائی ۱۹۵۷ء کو بھارت کے سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مدرسہ دیوبند کو اپنی تشریف آوری سے نوازا۔ جناب حسین احمد صاحب ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) ان دنوں دارالعلوم دیوبند کے صدر تھے۔ حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ جن حضرات کے مذہب میں اہتمام و تداعی اور دن تاریخ کا تعین قطعاً ناقابل برداشت اور سراسر بدعت سیئہ بلکہ قابل لوم و حرام و لسن ہے، وہ اپنے ان جملہ منہیات کو ایک مشرک کی خاطر کس قدر سعادت مندی کے ساتھ

---

۱ اشرف علی تھانوی، مولوی: الافاضات الیومیہ، جلد اوّل ص ۶۶، ۸۸

۲ ماہنامہ تجلی، بابت فروری و مارچ ۱۹۵۷ء ص ۳۲

نہ صرف جائز ٹھہراتے بلکہ ان سب باتوں پر عمل کر دکھاتے ہیں۔ میلاد شریف تو ان حضرات کے نظروں میں یوں ناجائز ہے کہ اس میں سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حالات و کمالات بیان کیے جاتے ہیں لیکن راجندر پرشاد کے جو علی الاعلان بُت پرست تھا، اوصاف بیان کرنا اور تعریفی دستاویز یعنی سپاس نامہ ایک منقش صندوقچی میں رکھ کر پیش کرنا معلوم نہیں ان حضرات کے دین کا پہلا رکن ہے یا دوسرا؛ نیز میلاد شریف میں قیام تعظیمی تو اس لیے ان حضرات کے نزدیک بدعت و حرام بلکہ شرک ہے کہ آقائے دوجہان، سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعظیم کیوں کی جاتی ہے؟ آخر یہ ہمارے نبی کی تعظیم کو بھی شرک نہ کہیں تو گاندھویت میں اور کس چیز کو شرک ٹھہرایا جائے؟ رہا مشرکوں کی تعظیم کا سوال، بُت پرستوں کے لیے تعظیمی قیام کرنا، نہ صرف خود تعظیمی قیام کرنا بلکہ اپنی ساری علمی ذریت سے کروانا، سادہ لباس میں نہیں بلکہ خوش پوشش ہو کر، کسی مجمع میں نہیں بلکہ سڑک پر دو رویہ کھڑے ہو کر، سائے میں نہیں بلکہ دھوپ میں، خالی ہاتھ نہیں بلکہ جھنڈیاں اور ہار لے کر۔ بھلا اس طرح کسی بُت پرست کے لیے تعظیمی قیام کیا جائے تو اس کے جواز میں دنیا کے کس مشرک یا زنّار دوست کو کلام ہو سکتا ہے؟ باری تعالیٰ شانہٗ اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گستاخوں کو دنیا میں بھی کس طرح ذلیل و خوار کر دکھاتا ہے! کذالک العذاب ولعذاب الاٰخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون ؁[1] اب اس پر بھی کوئی نہ سمجھے تو یہ اُس کی عقل کا قصور ہے۔ آئیے اب راجندر پرشاد کے اِس دورے کی کہانی خود علماء دیوبند کی زبانی سُنیے:

> ۱۳ جولائی ۱۹۵۷ء کی تاریخ دارالعلوم دیوبند میں وہ تاریخی دن تھا جب دارالعلوم میں عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب بالقابہ نے صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے قدم رنجہ فرمایا۔۔۔۔ پروگرام کے مطابق صبح کے آٹھ بجے جب صدر جمہوریہ اپنے سیلون سے برآمد ہوئے تو حضرت مولانا مدنی اور حضرت مولانا طیب صاحب جو سیلون کے دروازے کے قریب کھڑے تھے، آگے بڑھے۔

---

[1] ترجمہ: اسی طرح عذاب دیا جاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اس بات کو جانیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ان حضرات کا تعارف کرایا۔

اول مولانا مدنی سے پھر حضرت مولانا طیب صاحب مدظلہٗ سے صدر محترم نے مصافحہ کیا۔ حضرت مہتمم صاحب (یعنی قاری محمد طیب صاحب) نے صدر کو ہار پہنایا ..... آٹھ بجکر دس منٹ پر صدر محترم دارالعلوم کے لیے اپنی کار میں روانہ ہوئے۔ اسٹیشن سے لے کر دارالعلوم تک راستہ خیر مقدم کے لیے بنائے ہوئے خوشنما دروازوں اور رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ تھا.....

دیوبند اور قرب وجوار کے ہزاروں اشخاص سڑک پر دورویہ صدر کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ دارالعلوم سے تقریباً تین چار فرلانگ کے فاصلے تک طلبائے دارالعلوم کی دورویہ قطاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہند اور بیرون ہند کے طلبہ کے علیحدہ علیحدہ گروپ بنادیے گئے تھے، جو متعدد ممالک کے ہوئے تھے۔

جب طلبہ کی ان دلکش قطاروں کے درمیان سے صدر محترم کی کار گزرنی شروع ہوئی تو دیوبند کی فضا استقبالیہ نعروں سے گونج اٹھی۔ کتب خانہ کے معائنہ کے بعد صدر جمہوریہ ٹھیک نو بجے استقبالیہ جلسہ میں شرکت کے لیے پنڈال میں تشریف لے گئے.... عظیم الشان اور حسین پنڈال مختلف گیلریوں میں تقسیم تھا..... صدر محترم نے جونہی ڈائس پر قدم رکھا، پورا مجمع صدر کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔ حضرت مولانا مدنی نے صدر محترم کو سنہرا ہار پہنایا۔ دارالعلوم کی جانب سے اللہ اکبر، دارالعلوم زندہ باد، صدر جمہوریہ ہند زندہ باد اور جمہوری ہندوستان زندہ باد کے نعروں سے صدر محترم کا خیر مقدم کیا گیا اور ضلع کے حکام کی جانب سے سرکاری رسم کے مطابق قومی ترانہ پیش کیا گیا جسے انگریزی اسکول کے بچوں نے پڑھا۔ ترانہ ختم ہوتے ہی صدر محترم اور پورا مجمع بیٹھ گیا اور جلسہ کی کارروائی شروع کی گئی۔

سب سے پہلے دارالعلوم کی جانب سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے صدر محترم کی قدم رنجہ فرمائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ "آج دارالعلوم

کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے ...... صدرِ محترم ہندوستان کی صرف ایک عظیم شخصیت ہی نہیں بلکہ جنگِ آزادی کے ایک جانباز سپاہی بھی ہیں۔ آج وہ صدرِ جمہوریہ کی حیثیت سے یہاں رونق افروز ہیں۔ آپ کی قدم رنجہ فرمانی پر ہمیں مسرت ہے اور ہم اس کے لیے شکرگزار ہیں۔

اس کے بعد تلاوتِ قرآن سے جلسہ کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا......

نظموں کے بعد حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے سپاس نامہ پڑھ کر سنایا، جس میں دارالعلوم کی ...... باطنی روحانیت اور توکل وانابت وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے دارالعلوم کی چند ضرورتوں پر صدرِ محترم کی توجہ دلائی گئی۔ صدرِ جمہوریہ کو یہ سپاس نامہ ایک منقش صندوقچی میں رکھ کر پیش کیا گیا۔ جلسہ کے اختتام پر صدرِ جمہوریہ ریلوے اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔ دارالعلوم کی جانب سے دوپہر کا کھانا صدرِ محترم کو اُن کے سیلون ہی میں کھلایا گیا۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ اور دُوسرے متعدد حضرات کھانے میں شریک تھے۔[1]

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صدرِ بھارت ڈاکٹر راجندر پرشاد کے اس دورۂ دارالعلوم دیوبند کی کہانی ایک فاضل دیوبند یعنی علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کے بھتیجے عامر عثمانی صاحب کی زبانی بھی بیان کر دی جائے۔ چنانچہ موصوف اس واقعہ یا سانحہ کو اپنے الفاظ میں یُوں بیان کرتے ہیں:

"دنیا کی مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر ۱۳ جولائی کو جمہوریہ ہند کے صدر جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب تشریف لائے ... جنابِ صدر کی آمد سے قبل تقریباً دس روز تک دارالعلوم کے تمام اسٹاف نے جس ذوق و شوق، ذہن دہی اور دلچسپی سے اپنے معزز مہمان کے استقبال کی تیاریاں کیں اُن کا تفصیلی بیان ایک دفتر چاہتا ہے۔ ہمیشہ عید قرباں پر دس بارہ دن کی چھٹیاں

---

[1] ماہنامہ دارالعلوم دیوبند بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۷ء

ہوا کرتی تھیں لیکن اِس مرتبہ انھیں بھی ختم کرنا پڑا۔ آرڈر جاری ہوا کہ تمام اسٹاف استقبالی انتظام کی تکمیل میں پوری طرح مصروف رہے..... میرے اپنے کئی اقربا مدرسہ میں ملازم ہیں۔ اُن میں سے ایک کے ذوق وشوق کا عالم تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ علی الصبح مدرسہ تشریف لے جاتے اور پھر ساری رات تک اُن کا پتہ ہی نہ چلتا۔ جمعہ کے دن دوپہر کا کھانا کھانے بمشکل تین بجے گھر آسکے۔ جی چاہا کہ پوچھوں کیا نمازِ جمعہ کی بھی چھٹی نہیں لی؟ مگر چپ ہو رہا کہ کہیں اِس کے مقدس جذبات کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ آخر جمعے تو ہر ساتویں روز آتے ہیں مگر صدرِ جمہوریہ روز روز نہیں آتے۔

جلسے کی شرکت کے لیے انگریزی زبان میں نہایت نفیس دعوت نامے چھپے گئے تھے..... جلسہ اُس پنڈال میں ہوا جو ہزار سے زیادہ روپے خرچ کر کے وسیع دارالطلباء میں بنوایا گیا تھا۔ بہت شاندار، معزز مہمان کی شان کے مطابق۔ سب سے پہلے وطنی ترانہ پڑھا گیا۔ اُس وقت صدرِ جمہوریہ اور تمام اساتذہ و منتظمین اور پورا مجمع کھڑا تھا۔ ترانے کے آخر تک سب کھڑے تھے اور پھر صدرِ جمہوریہ کی تقلید کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔

اب تلاوتِ قرآن سے جلسہ شروع کیا گیا۔ تلاوتِ قرآن کے وقت کھڑے ہونے کا رواج ہمارے یہاں نہیں ہے۔ اِس لیے اِس کا مقابلہ ترانے کے آداب سے نہیں کرنا چاہیے..... تلاوت کے بعد نظمیں ہوئیں..... گلزار صاحب نے نہایت فصاحت وبلاغت کے ساتھ بتلایا کہ اگر مولانا مدنی مدظلہٗ دینِ حجازی کے مبلغ و مخزن ہیں تو صدرِ جمہوریہ دینِ غیر حجازی کے امام و شیخ۔ ایک ولی ہے تو دوسرا دھرماتما۔ دونوں ہی کے فیض و برکت سے جمہوری حکومت اپنے بیش بہا کام سرانجام دے رہی ہے۔

انور صابری صاحب قومی و ملکی خیالات کو جامۂ شعر پہنانے میں جس قدر مشاق ہیں، وہ مشاعرے سننے والے حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ گاندھی جی کی

منظوم ارمغان پیش کیا۔ آپ "شہید" کے عنوان سے جو نظم انھوں نے کہی تھی اُس کا مقابلہ اس موضوع کی شاید کوئی نظم نہیں کر سکی۔ نظموں کے بعد حضرت مہتمم صاحب دار العلوم نے سپاس نامہ پڑھا۔ سپاس نامے کے آخر میں امید ظاہر کی گئی ہے کہ جناب صدر جمہوریہ کی قدم رنجہ فرمائی دار العلوم کی تاریخ کا ایک تابناک نقش ہے جس پر دار العلوم کو ہمیشہ فخر رہے گا"۔۔۔۔ سپاس نامے کے بعد جناب صدر جمہوریہ نے تقریر فرمائی۔۔۔۔ اس کے بعد محترم علماء نے رسم شکریہ ادا فرمائی۔ شیخ نے اپنی معروف ساف گوئی کو پوری طرح قایم رکھا اور فرمایا، ہم غریب ہیں، فقیر ہیں، بے نوا ہیں۔ عالیجناب صدر جمہوریہ ۔۔۔۔۔ نے اپنی تشریف آوری سے سرفراز فرما کر ہمیں نہایت درجہ ممنون فرمایا ہے۔

صدر محترم جلسہ ختم ہونے پر دیوبند سے روانہ ہو گئے۔ میں نے دیکھا، اُن کی فراٹے بھرتی ہوئی کار کو صرف ایک نظر دیکھ لینے کے لیے سیکڑوں لوگ اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے قرنوں پہلے قیس ناقہ لیلیٰ کی طرف بھاگا ہوگا۔ کیوں نہ بھاگتے، آخر صدر جمہوریہ کی کار تھی۔ دار العلوم نے اپنے محبوب صدر کی آمد پر ہزاروں روپیہ خرچ کیا۔۔۔ جناب صدر نے اپنی جیب خاص سے نقد ایک ہزار روپیہ مدرسہ کو عنایت کیا۔ چنانچہ اگلے روز جناب مہتمم صاحب نے نہ صرف یہ کہ کامیابی کی مٹھائی تقسیم فرمائی بلکہ جلسہ عام میں جناب صدر کی خوش اخلاقی، فراخ نظری، روحانیت، شفقت، جود و سخا، انسانیت پروری، حلم و رافت اور بندہ نوازی کو بڑے وزنی ۔۔۔۔ الفاظ میں بہت مسرت اور دلی جوش کے ساتھ سراہا۔[1]

مشہور دیوبندی شاعر، اخبار نویس، ادیب، مقرر، لیڈر اور روزنامہ "زمیندار" کے ایڈیٹر جناب ظفر علی خاں نے شاید اسی قسم کے ہندو نوازی اور زنار دوستی کے واقعات سے متاثر ہو کر یہ شعر کہے تھے کہ ؎

---

[1] ماہنامہ تجلی، بابت اگست ستمبر ۱۹۵۷ء

کیا پوچھتے ہو ہند میں دینِ ہدیٰ کا حال — ویراں ہے خانقاہ تو مسجد ہے پائمال
خود عالمانِ دین بھی پھنسے اُس کے جال میں — جس کا نہیں ہے توڑ وہ ہے کانگرس کی چال
کافر بھی مومنوں کے اولوالامر بن گئے — کل تک جو تھا حرام ہوا آج ہے حلال
لذت تھی جن کے خوان کی نُعمانِ حنیفہ سے — ہے آجکل پسند انھیں کیوں کی دال
چھوڑا جہاد کو اور اہنسا کیا قبول — جو شیر تھے پہننے لگے لومڑی کی کھال
اسلام کے چمن میں صنم ہر دوار کے — پھرتے ہیں پات پات پہ دیتے ہیں ڈال ڈال
قرآں کے ترجمان ہیں کیوں گنگ ہو گئے — حالانکہ ہے مدینے کے ناموس کا سوال
کیا انقلاب ہے کہ اساطینِ شرع کو — دم مارنے کی گاندھی کے آگے نہیں مجال

کچھ جانتے بھی ہو کہ ہیں کیوں آج ہم ذلیل
ہم پر ہمارے اِن علماء کا پڑا وبال[1]

مانڈوی صاحب کے سیاسی نظریات کا اسلام سے کہاں تک تعلق تھا؟ ہنود کی محبت میں وہ کس درجہ سرشار ہو چکے تھے، یہ حکیم محمود احمد برکاتی کی زبانی سُنیے:

"مولانا حسین احمد مدنی کی قوتِ فیصلہ کے متعلق ہم اچھی رائے نہیں رکھتے۔ انھوں نے مدت العمر کسی بھی سیاسی مسئلے میں اصابتِ رائے کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ ان کا اندازِ فکر منطقی نہیں جذباتی تھا۔ انگریز کی دشمنی میں وہ حدودِ اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے اور استخلاصِ وطن کے لیے وہ ہندو قوم سے غیر مشروط اتحاد کے قائل تھے اور اس سلسلے میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ اشتراکِ وطن کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک قوم فرمانے لگے تھے۔ وطنی قومیتِ متحدہ کی تبلیغ کو انھوں نے اپنے مشن کا ایک جزو بنا لیا تھا اور شہر شہر اس کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ زبان و قلم کا پورا زور اس متحدہ قومیت کی حمایت میں صرف فرماتے تھے، یہاں تک کہ ایک بار دہلی میں انھوں نے یہ گمراہ کن اور نہایت

[1] ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۔

غلط بات نہایت زور کے ساتھ فرمائی کہ: "اقوام اوطان سے بنتی ہیں"۔ [1]

مولانا معین الدین اجمیری (المتوفی ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء) کی آزادیِ ہند کے سلسلے میں سیاسی جدوجہد کے بارے میں علامہ سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) نے یوں تصریح فرمائی:

"تحریکِ خلافت میں مذہبی فتوے کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران (مولانا شوکت علی و مولانا محمد علی جوہر) سے قدم چوم لیے۔ جس زمانۂ ابتلاء میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء قید و نظر بندی کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے، اُس وقت تحریک کی رہنمائی کے لیے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد مسائلِ حاضرہ پر تقریر فرماتے۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاسِ امروہہ کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے۔ صوبہ راجپوتانہ کی مجلسِ خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا۔ تحریکِ کشمیر کے زمانہ میں مجلسِ احرارِ اسلام کے ڈکٹیٹر رہے۔ مسلمانوں کے سوا برادرانِ وطن (ہنود) بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔" [2]

گاندھوی علماء جس زمانے میں کھل کر متحدہ قومیت کے مبلغ بنے ہوئے تھے، اُن کے نزدیک [illegible] اور کافر ایک ہی قوم کے افراد تھے اور اس طرح اسلامیانِ ہند کو ہندو اکثریت میں مدغم کرنے پر اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا رہے تھے۔ اُن دنوں مولانا معین الدین اجمیری مسلمانوں کو یوں تلقین فرما رہے تھے،

"مسلمانوں کے لیے یہی راہِ عمل ہو سکتی ہے کہ وہ آزادی کے لیے متفقہ طور پر میدان میں آئیں، مگر کانگرس میں شامل ہو کر نہیں، ہندوؤں کا ضمیمہ بن کر نہیں بلکہ جمعیۃ العلمائے ہند برطانیہ کے خلاف جنگ کا جو پروگرام تیار کرے، اس پر

۱۔ محمود احمد برکاتی، حکیم: معین الحق، مطبوعہ کراچی، ص ۹۳

۲۔ سلیمان ندوی، مولوی: معین الحق، ص ۴۷

عمل کریں۔ یعنی برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد تو نصب العین ہے، اس کا
تسلسل ٹوٹنے نہ پائے مگر یہ جدوجہد گاندھی کی قیادت میں اور کانگرس کے جھنڈے
تلے نہیں بلکہ خود اپنی تنظیم اور جمعیت کی نگرانی اور رہنمائی میں ہو۔[1]

اور مولانا اجمیری کی بنائی ہوئی اپنی تنظیم یعنی جمعیۃ العلماء ہند کا حال بھی حکیم محمود احمد برکاتی کی
زبانی سن لیجیے کہ یہ مسلمانوں کی کیسی رہنمائی کر رہی تھی اور کس قسم کی آزادی اس جمعیت کا مطمحِ نظر تھا۔
وہ لکھتے ہیں:

> علمائے دیوبند میں سے مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی کردار کو ہم
> نے اس لیے موضوعِ گفتگو بنایا کہ جمعیۃ العلماء کی صدارت سب سے طویل
> عرصہ تک مولانا ہی نے فرمائی تھی اور ۱۹۴۰ء کے بعد سے تو وہ اپنی وفات تک
> مستقلاً و بلا انقطاع صدرِ جمعیۃ رہے۔ اس لیے جمعیۃ کی پالیسی کی تبدیلی میں
> اُن کا سب سے زیادہ دخل تھا اور یہ مولانا مرحوم کا کارنامہ تھا کہ رفتہ رفتہ جمعیت
> علماء ہند مسلمانوں میں اس قدر نامقبول بلکہ بالفاظِ صحیح تر مغضوب ہو گئی تھی
> کہ ۱۹۴۶ء کے معرکہ آرا اور فیصلہ کن انتخابات میں خاص سہارن پور کی سیٹ
> سے نیشنلسٹ مسلمانوں کا نمایندہ کامیاب نہ ہو سکا اور شہیدِ ملت خان لیاقت
> علی خاں نے اپنے قوم پرست حریف کو اس کے مرکز میں عبرت ناک شکست
> دی۔ حد یہ ہے کہ تقسیم کے بعد اور مسلم لیگ کے راستے سے ہٹ جانے کے
> باوجود آج بھی جمعیۃ بھارت کے عوام و خواص کی قیادت کی اہل نہیں مانی جاتی۔[2]

اب ٹانڈوی صاحب کے دستِ راست مولوی حفظ الرحمان سیوہاروی کا حال مولوی محمد
صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"مولانا حفظ الرحمن صاحب قیامِ پاکستان کے دیانت داری سے مخالف تھے

---

[1] محمود احمد برکاتی حکیم: حسین المتلق، ص ۸۹

[2] ایضاً ص ۹۴، ۹۵

مگر ۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں، وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ان خدمات نے اُن کو اُمتِ مسلمہ کے اُن افراد کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے کہ جن کی ذات پر پوری اُمتِ مسلمہ کو فخر ہے اور وہ تاریخِ اسلام کے اکابر کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔[1]

بیان موصوف کے ان لفظوں میں اس امر کا بھی اظہار کر دیا جاتا کہ مولوی حفظ الرحمٰن نے مسلمانانِ ہند کی آبِ زر سے لکھنے کے قابل گرانقدر خدمات انجام دی تھیں، وہ کیا ہیں؟ نیز موصوف پر کونسی اُمتِ مسلمہ کو فخر ہے اور وہ کونسے اکابر کی صف میں شامل ہوئے تھے، تو بہترا ں سے کہ قارئین کرام بھی اس بارے متفق ہوں گے۔ وضاحت ملاحظہ ہو:

"مجاہدِ ملت (مولوی حفظ الرحمٰن صاحب) کا حُسنِ تدبر تھا کہ آپ نے اپنے پرانے تعلقات کو از سرِ نو تازہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کو پختہ کر کے ایسا اعتماد حاصل کر لیا کہ گاندھی جی حکومت کے سربراہ ہوں اور کانگرس کے بڑے ہندو لیڈروں پر بھی اتنا اعتماد نہ کرتے تھے جتنا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور اُن کے ساتھیوں پر۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے تو فرقہ پرستوں نے اُن کی اتنی مخالفت کی کہ اُنھیں اپنی پرارتھنا کی مجلسوں میں ترمیم کرنا پڑی۔ مجاہدِ ملت جو فرقہ پرستی کے خلاف نبرد آزما تھے، گاندھی جی کے دستِ راست بن گئے۔ مجاہدِ ملت کو سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی رفاقت و معیت حاصل تھی۔"[2]

ت اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ گاندھوی علماء کی پوری کھیپ اسلام اور کفر کے فرق کو پرستی سکتے تھے۔ ابوالفضل و فیضی کی طرح اس چودھویں صدی میں اُن حضرات کے خلاف نبرد آزما ہے جو یہ کہتے تھے کہ اسلام اسلام ہے اور کفر کفر ہے، اسلام اور کفر کا ملاپ اجتماعِ ضدین ہے۔ ان حضرات کا پیدا کردہ گاندھوی ٹولہ اکبری دینِ الٰہی ہی کا ترمیم شدہ اور جدید

---

1. عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۹۲۱
2. ایضاً، ص ۹۲۸

ڈپلس تھا، جس کو کامیاب بنا کر گاندھی کو خوشی کرنے میں ہر گاندھوی عام دوسرے سے سبقت لے جانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ ان حضرات کی ساری قابلیتیں اور توانائیاں اسی مقصد کے لیے وقف تھیں، لیکن جس طرح اکبر کے دینِ الٰہی سے ہندومت کو نقصان کی بجائے زبردست فائدہ پہنچا کر مسلمانوں کو جو کفر سے نفرت ہوتی ہے اُس کی شدت میں کمی آگئی اسی طرح گاندھویت کی نحوست نے بھی مسلمانوں کو مشرکوں اور بُت پرستوں کے قدموں میں ڈال کر اُنہیں بُت فروش بنانے کا فرض ادا کیا جنھیں کبھی اپنے بُت شکن ہونے پر ناز ہُوا کرتا تھا۔ شاید اقبال مرحوم نے اسی لیے فریاد کی تھی کہ: ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔ موصوف چونکہ گاندھویت کے ایک عظیم رُکن تھے اسی لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جو گاندھی کے فلسفہ پر خلوصِ دل سے ایمان لائے ہُوئے تھے اور اُنھیں کے اصولوں کو اپنا ضابطۂ حیات سمجھتے تھے، اُس وقت اُنھوں نے بھارت کا صدر ہونے کی حیثیت میں سیوہاروی صاحب کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے موصوف کے بارے میں یوں فرمایا تھا:

"مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی ۱۹۱۹ء سے شروع ہُوئی۔ اُنھوں نے خلافت اور سوراج (اکھنڈ بھارت) کی تحریکوں میں حصہ لیا اور متحدہ قومیت (یعنی مسلمان اور ہندو ایک ہی قوم ہیں) اور حریت و آزادی کے پیغام کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کیا اور یہ وابستگی آخردم تک برقرار رہی۔" ملخصاً [1]

ڈاکٹر راجندر پرشاد جو ڈاکٹر ذاکر حسین سے پہلے بھارت کے صدر تھے، موصوف کی وفات پر تعزیت کرتے ہُوئے ان الفاظ میں سیوہاروی صاحب کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں:

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۹۵۲

"حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم، جمعیۃ العلماء ہند کے ایک بلند پایہ رکن تھے۔ ہماری قومیت کی ایک چمکتی مثال تھے اور میرے ان عزیز دوستوں میں سے تھے جن کے ساتھ بارہا کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔" ملخصاً [1]

بھارت کے وزیر اعظم، پنڈت جواہر لال نہرو نے موصوف کو اپنے تعزیتی پیغام میں یوں خراج پیش کیا ہے:

"مولانا کے انتقال سے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے ..... ہم لوگ شروع میں دونوں یو۔پی۔کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اکثر ملا کرتے تھے۔ چھوٹی کونسل کے ممبر بھی رہے۔ ..... اہم مواقع پر ملتے جلتے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی۔ وہ بہادر سپاہی تھے۔ بہادر نیتا تھے۔ جو کہتے تھے اس میں وزن ہوتا تھا۔ اُن کی بات غور طلب ہوتی تھی۔ ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے۔" ملخصاً [2]

مسٹر لال بہادر شاستری جو پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد بھارت کے وزیر اعظم بنے اور ۹۲ میں موصوف کی وفات کے وقت ہوم منسٹر تھے۔ انھوں نے ٹاؤن ہال دہلی کے تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ابھی ابھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مولانا (حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب) گاندھی جی کے اصولوں پر چلتے تھے۔ گاندھی جی اس ملک میں آئے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ اُن کے ساتھ مل کر اُن کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر، اُن پر چل کر بہت سے لوگ لیڈر بن گئے۔ چھوٹے چھوٹے آدمی لیڈر بن گئے۔ اُن کا ڈھنگ، اُن کا طریقہ ایسا ہی تھا۔ لیکن میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ لیڈر دولت سے نہیں بنتا، بہت سے

---

[1] عبد الرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۵۷۰

[2] ایضاً: ص ۵۸۰

پڑھ لکھ جانے سے نہیں بنتا، حکومت کا وزیر بن جانے سے نہیں بنتا، لیڈر تو پیدا ہوتا ہے اور مولانا (سید ہاروی صاحب) ایسے ہی لیڈر تھے۔ ابھی آپ نے سنا کہ مولانا شروع ہی سے لوگوں کی خدمت کے کاموں میں حصہ لیتے تھے، تو اُن میں وہ بات شروع ہی سے تھی جو ایک پیدائشی لیڈر میں ہوتی ہے۔ملخصاً[1]

گاندھوی امام الہند کے کارنامے

جناب ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) اس گاندھوی قبیلے کی ممتاز و منفرد ہستی تھے۔ موصوف کی گاندھویت کے بارے میں مولوی شریف الحسن ناظر لکھنوی نے یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"ہندوستان کی سیاست کے اس انقلابی دور میں حضرت مولانا کی پہلی ملاقات مہاتما گاندھی سے ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ جہاں مسئلہ ترکی و خلافت کے متعلق وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لیے تمام ممتاز ہندو مسلمان لیڈر جمع ہوئے تھے۔ اس موقع پر آنجہانی تلک بھی موجود تھے اور وہی دن تھا جب مولانا اور گاندھی جی کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو گاندھی جی کے آخری دم تک قایم رہا۔

یہ پہلی ملاقات ہندوستان کی تاریخ میں اس لیے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ لیڈروں کے اس اجتماع میں پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی کے اصولوں کو قبول کر لیا گیا۔ البتہ وائسرائے سے ملاقات کرنے کی تجویز سے مولانا نے اختلاف کیا۔ وہ گفت و شنید اور عرض و معروض کے قدیم طریقوں سے بہت بیزار تھے اور اس لیے اُس مجلس میں اُنھوں نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ کسی وفد کا وائسرائے کے پاس جانا فضول ہے۔ البتہ وہ پہلے مسلمان لیڈر تھے جنھوں نے اس

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۹۰ء، ص ۹۵۹

مارچ کی اجتماع میں گاندھی جی کے پروگرام کی پوری پوری تائید کی۔ اس وقت دوسرے مسلمان لیڈر جو مولانا کے ہم خیال تھے، حکیم اجمل خاں مرحوم تھے۔[1] گاندھویت کے علمبرداروں میں موصوف سب سے قدآور ہیں۔ موصوف نے اکبری دور کے ابوالفضل کا حقیقی جانشین بن کر مسلمانانِ ہند کو مشرکوں اور بت پرستوں کا حقیقی بھائی بنا دینے اور اسلام اور بت پرست و بت شکن کا فرق مٹا دینے کی غرض سے اور اس طرح دانستہ نادانستہ بھولے بھالے مسلمانوں کو ہندوؤں میں مدغم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کی مساعی جمیلہ کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے اور ابوالفضل و فیضی وغیرہ کے ناپاک مشن کو از سرِ نو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس نظریہ کی علمبرداری کرتے ہوئے یوں اسلامیانِ ہند کو تلقین کرتے ہیں:

"میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں کہوں گا۔ ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی بات نادانی کی بھی ہو جائے تو اُسے بخش دیں اور اپنی جانب سے کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے اس مبارک اتحاد کو صدمہ پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں جو اسلام کے خلاف ہو، اُس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ اُن کے مشوروں پر کاربند رہیں۔"[2]

یہ الگ بات ہے کہ ابوالکلام صاحب ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء سے رجسٹرڈ گاندھوی بنے تھے، ماضی قریب کے ابوالفضل اپنے زمانہ "الہلال" ہی سے ہندو نواز اور زنار دوست تھے۔ موصوف کا یہ رجحان اُن کے دل کی کوٹھڑی میں ہی بند نہیں تھا بلکہ "الہلال" کے ذریعے وہ ہندو دوستی اور متحدہ قومیت کی زور شور سے تبلیغ کر رہے تھے اور علی گڑھ کے برٹش نوا

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء، ص ۲۹۔

[2] ایضاً: ص ۲۲۔

پر بھی وار کرتے رہتے تھے مولوی شریف الحسن ناظر لکھنوی اس امر کی وضاحت یوں کرتے ہیں،

"الہلال مسلمانوں کے کسی مکتبِ خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے ہندوستان کی ایک متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ اس کی دعوت سے ہندوستان کا اسلامی ذہن اس وقت تک بیگانہ تھا۔ مولانا نے قدامت پسندی کے مخالف قومیت کے قلعہ پر حملہ کیا لیکن بظاہر مستقیم نہیں بلکہ ایسے افکار کی اشاعت کر کے جنھوں نے علی گڑھ کی بنیاد کو ہلا دیا۔" [1]

موصوف کے بارے میں زمانہ قریب کی نامور شخصیت یعنی خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم کے تاثرات بھی ملاحظہ فرمایئے :

"۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انھوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا "سب باہیں منظر ہیں باستثنائے شرکتِ مسلم لیگ"۔ گویا ۲۴ سال پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے آجکل ہیں . . . . . اگر مولانا ابو الکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبر اعظم کی طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے . . . . بہرحال مولانا آزاد موجودہ ہندوستان کے لیے سیاسی سورج ہیں اور سیاسی چاند ہیں۔" [2]

موصوف کے سیاسی عزائم و زنار دوستی کے پیشِ نظر، اُن سے ظفر علی خاں یوں گویا ہو سکتے تھے :

بو الکلام آزاد سے یہ پوچھتے ہیں دل جلے — آجکل تم پیشوائے اُمتِ مرحوم ہو
کیا خطا کوئی بھی سرزد تم سے ہو سکتی نہیں — تم بھی کیا پاپائے روما کی طرح معصوم ہو
نہرو گاندھی کے دل کا حال تم جانو اگر — پھر ذرا تم کو بھی قدرِ عافیت معلوم ہو
کٹ کے اپنوں سے ملے ہو جا کے تم اغیار سے — پھر یہ کہتے ہو کہ ہم ظالم ہیں تم مظلوم ہو

---

[1] عبد الرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۴۳۰۔

[2] ایضاً، ص ۵۱۱۔

ہم مسلماں میں جو ہیں اوجِ سعادت کے ہُما — آئیں اُس کے سایہ میں ہم کس طرح جو گم ہو
تم یہ کہتے ہو کہ مسلم لیگ ہے رجعت پسند — تم کہاں کے ہٹلر وقت اسے مرے مخدوم ہو
کیا تماشا ہے کہ ہندو ہو ہمارا ترجماں — اور غلامی کفر کی اسلام کا مقسوم ہو
کیا تماشا ہے کہ تم گاندھی کے آگے سر نگوں — کیا قیامت ہے کہ جو حاکم ہے وہ محکوم ہو

اے خدا راہِ ہدایت اس مسلماں کو دکھا
غیرتِ اسلام کی دولت سے جو محروم ہو[۱]

جناب ابو الکلام آزاد اس گاندھوی قبیلے میں اتنے قد آور، رکھ رکھاؤ کے اور قابلِ احترام تھے کہ کانگرس کے بڑے سے بڑے رکن سے اختلاف بھی کر سکتے تھے۔ راج گوپال اچاریہ، جندر پرشاد، پنڈت مدن موہن مالوی اور پٹیل جیسے حضرات کی کیا گنتی جب کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے۔ دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ بارہا اُن کی رائے گاندھی کی رائے سے مختلف رہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کئی دفعہ کانگرس کے بڑے بڑے ہندو لیڈروں کو گاندھی سمیت اُن کی رائے کے آگے جھک جانا پڑا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ وہ گاندھوی صنم خانہ جس میں گاندھی کی پوجا ہوتی تھی، وہاں ہندو ہوں یا مسلمان کہلانے والے سب اسی بُت کے آگے سجدہ ریز تھے اور "جی حضوری" کی منزل سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے لیکن اس بھرے جمگھٹے میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں، جن کی اپنی رائے ہوتی تھی اور جو ہر بڑی سے بڑی ہستی سے اختلاف کرنے کی پوزیشن میں تھے اور اُن کے اختلاف کو نظر انداز کر دینے کی اس قبیلے میں جرأت نہیں ہوا کرتی تھی۔ اُن دو ہستیوں سے میری مراد ایک کانگرس کے سابق صدر سبھاش چندر بوس اور دوسرے سابق صدرِ کانگرس جناب ابو الکلام آزاد ہیں۔ چنانچہ موصوف کی اسی انفرادیت کے بارے میں رئیس احمد جعفری ندوی یوں رقم طراز ہیں:

"خطیب اور انشا پرداز، مدبّر اور سیاست دان" انا کے مرض میں گرفتار

---

[۱] ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۹۲

ہوتا ہے۔ لیکن مولانا کی انانیت سب سے مختلف تھی۔ دوسروں کا "انا" زیادہ تر رکیک اور مبتذل ہوتا ہے، خواہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن مولانا کے "انا" میں ہمالہ کی رفعت تھی، اتنا موٹا اور چوڑا چکلا "انا" صرف مولانا کا حصہ تھا۔ غالب کے سوا اس باب میں ان کا کوئی حریف نہیں اور غالب بھی اس لیئے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ اُن کی زندگی کا حلقہ محدود تھا، اُسی حلقہ میں وہ اپنے "انا" کا ڈنکا بجاتے رہے۔ لیکن مولانا ادیب بھی تھے، انشاء پرداز بھی تھے، صحافی بھی تھے، خطیب بھی تھے، عالم دین بھی تھے، سیاست دان بھی تھے، نیشنلزم کے حلقہ میں بھی موجود تھے جہاں ایک سے ایک گھاگھ موجود تھا۔ لیکن وہ ادیبوں کی محفل ہو یا انشاء پردازوں کا مجمع، صحافیوں کا جمگھٹ ہو یا خطیبوں کی مجلس، سیاست کا پلیٹ فارم ہو یا نیشنلزم کا اسٹیج، علمائے کرام کی جمعیت ہو یا صوفیائے عظام کا زاویہ۔ اس شخص کا "انا" کہیں بھی امام، لسند، رئیس التحریر اور رب الارباب سے کم پر قناعت نہیں کرتا۔

جس طرح عشق چھپائے نہیں چھپتا اور ذرا سی بے احتیاطی میں معاملہ پابدستِ دگرے دست بدستِ دگرے تک آجاتا ہے، اسی طرح "انا" نے بھی نہ جانے کتنے یگانۂ روزگار لوگوں کے بیڑے ڈبو دیئے، جن کی قابلیت، ذہانت، فراست، علم، فضل، ہر چیز شک وشبہ سے بالاتر تھی، "انا" کے کثرتِ استعمال نے اُنھیں کہیں کا نہ رکھا یا نقلِ محفل بنا دیا ورنہ پھر سامانِ تفریح۔ لیکن مولانا کے "انا" کا یہ وصف تھا کہ استعارہ اور کنایہ سے بے پروا وہ مجسم "انا" بن گئے تھے لیکن اُن کے اس "انا" میں وہ دلکشی، وہ جاذبیت، وہ سحر ہے کہ طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ محسن الملک ہوں یا وقار الملک، حالی ہوں یا شبلی، موتی لال نہرو ہوں یا گاندھی جی، محمد علی ہوں یا شوکت علی، عمر میں سب سے چھوٹے لیکن "انا" کے پیمانے سے ناپیئے تو، ع

طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کانگریس جیسے ادارہ میں جہاں گاندھی جی کی پوجا ہوتی تھی، جہاں موتی لال،
جواہر لال اور سردار پٹیل کا طوطی بولتا تھا، جہاں نیشنلزم کے دعوے کے باوجود
مکمل طور پر کمیونلزم (فرقہ پرستی) کی کارفرمائی تھی جہاں محمد علی (جوہر) کا چراغ نہ
جل سکا، جس نے گاندھی کو گاندھی بنایا تھا۔ جہاں شوکت علی کا بھرم قایم نہ رہ سکا
جس کی قوت عمل نے کانگریس کو صحیح معنی میں ہندو مسلم اتحاد کا نشان (SYMBOL)
بنا دیا تھا۔ جہاں سے اجمل خاں جیسے مرد حکیم وحلیم کو دل برداشتہ ہو کر نکلنا پڑا،
وہاں ابوالکلام نامی ایک شخص کا اپنے قد آور اور بلند و بالا "انا" سمیت زندگی کی
آخری سانس تک موجود رہنا کانگریس کا نہیں ابوالکلام کا کمال تھا۔"[1]

جناب رئیس احمد جعفری نے یوں تو اپنے امام الہند یعنی ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے عجیب و غریب
پہلو بھی ظاہر کر دیے، موصوف کی انانیت کو تفصیلاً بیان کرنے کی زحمت اٹھائی لیکن پہلو پورے
طور پر بیان نہ کر پائے تھے۔ اسی لیے اس کی کتاب کے اختتامی صفحات پر "حرف آخر" کے
تحت یوں پورا کرتے ہیں:

"ان کا "انا" سمندر کی طرح گہرا، ہمالیہ کی طرح اونچا اور چاند کی طرح خوبصورت تھا۔
لوگ اپنے "انا" کو سات پردوں میں چھپاتے ہیں لیکن پکڑے جاتے ہیں۔ وہ
سر جھکاتے ہیں، منہ بناتے ہیں، اپنے لیے غلام، خادم، ہیچ میرز، خاکسار،
ذرۂ بے مقدار، ننگ اسلاف، بندۂ عاصی اور اسی طرح کے بہت سے لاحقوں
کے ساتھ "انا" کی پردہ پوشی کرتے ہیں، لیکن وہ ایک جرم کی طرح ظاہر
ہو ہی جاتا ہے۔ کوئی پوچھے یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے۔ لیکن مولانا کا "انا"
بے پردہ ہے، بے پروا ہے، خود سر ہے، خود بیں ہے، مغرور ہے، متکبر ہے
لیکن نہایت دلکش۔ اس میں جلال و جمال کی ایسی آمیزش ہے کہ اس کی
"انا" کی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی دل کا دامن اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

---

[1] رئیس احمد جعفری ندوی، آزادی ہند، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور، باب چہارم ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۹، ۲۳۰

جس کانگریس میں گاندھی جی "ٹرسٹی شپ" کا نعرہ لگاتے ہیں اور سب سربسجود ہو جاتے ہیں، جس میں جواہر لال کی زبان گاندھی جی کو "باپو" کہتے کہتے سوکھتی ہے، جس کے سامنے راجگوپال اچاری جیسا منجھا ہوا سیاستدان سر کے بل حاضر ہوتا ہے اور پٹیل اور راجندر پرشاد جیسے لوگوں کے سامنے اگر وہ دن کو رات کہتا ہے تو یہ "ایمک ماہ و پروین" کا نعرہ لگانے لگتے ہیں، جس کے سامنے کانگریس کے بڑے بڑے نیتا، مہاسبھا کے لیڈر، جن سنگھ کے رہنما، گورنر جنرل اور وائسرائے ہند، برطانیہ کابینہ کے وزراء، برطانیہ کا وزیر اعظم، جمعیتہ العلماء ہند کے علمائے کرام سر نیاز خم کرتے ہیں، وہاں ابوالکلام کہتا ہے: "میں" اور اس "میں" کا بانکپن سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس کا "میں" گاندھی جی کو مہاتما نہیں کہتا، جواہر لال کو پنڈت جی نہیں کہتا، راجندر پرشاد اور پٹیل کو ذرۂ بے مقدار سمجھتا ہے۔ اس کا "انا" بڑے سے بڑا اعزاز جو گاندھی سے لے کر جواہر لال تک کو دے سکا، وہ شریک کار (COLLEAGUE) کا لفظ تھا۔[1]

جعفری صاحب سمندر کی تہہ سے ہمالیہ کی چوٹی تک، جمعیتہ العلمائے ہند کے علماؤں سے کانگرسی نیتاؤں تک، نجی مجلسوں سے سیاسی اکھاڑوں تک اور ننگِ اسلاف سے گاندھیوں کے مادرن فرعون تک، وہ کونسی جگہ ہے جہاں نہیں گئے؟ وہ کونسا فرد ہے جس سے نہ ملے، وہ بھارت کی کونسی ہستی ہے جس کا ذہن نہ جانچا، وہ کونسی رائے ہے جس کا بانکپن نہ دیکھا، وہ کونسی خوبصورتی ہے جس کی دلکشی نظر نہ آئی اور وہ کونسی گاندھوی قبیلے کی کمزوری ہے جو اُن کے احاطۂ نظر میں نہ آسکی ہو۔ لیکن اِس سعیِ بلیغ کے باوجود جس چیز کی وسعت کا، رفعت کا، گہرائی کا، طاقت کا، جسامت کا، جعفری صاحب احاطہ نہ کر سکے۔ وہ ہے جناب ابوالکلام آزاد کی "انا"۔ اسی لیے اتنی مغز کھپائی کرنے کے باوجود آگے سراپا استفسار بن کر یوں رقمطراز ہیں:

"ساری کتاب (INDIA WINS FREEDOM)[2] پڑھ جائیے، معلوم ہوگا

---

[1] رئیس احمد جعفری ندوی، آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۳، ۲۸۴

[2] مصنفہ ابوالکلام آزاد۔ آزادیِ ہند اسی کا ترجمہ و تحشیہ ہے نیز جعفری صاحب نے ترتیب بھی اپنے انداز پر کی ہے۔ آخر

کانگرس کے تمام اہم فیصلے "انا" کی طبعِ رسا کا نتیجہ ہیں۔ تمام اہم تجویزوں کا مسودہ "انا" کا لکھا ہوا یا لکھوایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، اُس کا "انا" ایسا ڈکٹیٹر ہے جس کے سامنے کسی کو مجالِ دم زدن نہیں۔ اِس "انا" کی پشت پر اگر کوئی قوت ہوتی تو شاید اس کی دلکشی ختم ہو جاتی۔ لطف تو یہ ہے کہ صاحبِ "انا" ایک ایسا شخص ہے جو اقلیت کا ایک فرد ہے، جس کی قوم نہ صرف یہ کہ اُس کی پشت پناہ نہیں بلکہ اس سے بیزار ہے۔ جو بہت بڑا لیڈر ہے لیکن جس کے متبعین انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ جو کوئی بات اپنی قوم سے نہیں منوا سکتا۔ جو ایک عرصۂ دراز سے اپنی قوم کے اجتماعاتِ عام میں نہ شرکت کرتا ہے نہ تقریر۔ جو اگر کانگرس سے الگ ہو جائے تو پرِ کاہ کے برابر اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا، شامل رہے تو پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ بھی اپنی اس کمزوری سے واقف ہے اور اُس کے شرکائے کار (COLLEAGUE) بھی۔ لیکن پھر بھی دم خم کا یہ عالم ہے کہ اُس کا "انا" اُن لوگوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا جو اپنی عظیم اکثریت رکھنے والی قوم کے رہنما ہیں، شاہِ بے تاج ہیں، جن کے ایک اشارہ پر خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں، جن کے ایک لفظ پر انقلاب آ سکتا ہے، جن کا ایک بول بغاوت برپا کر سکتا ہے، جن کے پاس دولت بھی ہے، سرمایہ دار اور مالکانِ مل بھی ہیں، لیکن اس "انا" کی جیب خالی ہے۔ کسی سرمایہ دار سے اُس کا یارانہ نہیں، کسی مل مالک سے اُسے سروکار نہیں اور اگر ہو بھی تو اُس کی خودداری اُن سے استمداد کو اپنی توہین سمجھتی ہے۔ ان حالات میں اِس بے مثل و بے نظیر اور حسین و جمیل "انا" کی یہ جرأت، یہ ادا، یہ دھاندلی دیکھیے کہ سب سے اونچا بیٹھتا ہے، سب سے اونچا رہتا ہے۔۔۔۔ ہر طرح کے فکری اور سیاسی اختلافات کے باوجود یہ "انا" دلکش ہے یا نہیں؟[1]

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، بار چہارم، ۱۹۶۵ء، ص ۴۸۴ ، ۴۸۵

فری صاحب نے ابوالکلام آزاد کی بیکسی در گاندھی کی شہنشاہی کے تحت جو موصوف کی "انا" کے
ے میں رائے قایم کی ہے کم از کم راقم الحروف اسے درست تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ اگر
رت حال یہی ہوتی تو مولانا محمد علی جوہر کی طرح ابوالکلام آزاد کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا تھا جیسا
تر بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب نہ صرف گاندھی نے بلکہ کانگریس کے
ہندو لیڈروں نے مولانا جوہر کو پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہ دی اور اُن کی بات تک سننے
ے انکار کر دیا تھا حالانکہ اُن دنوں ہندو تو ہندو سہی مسلمانوں کا تو اُن کے ساتھ ایک سیلاب تھا۔
برادران کو نظر انداز کر دینے کے بعد لیڈروں کا معاملہ تو صاف ہُوا، باقی رہ گئے گاندھوی
ے۔ اِن مسکینوں کی کانگریس کے اہم معاملات تک رسائی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ خواہ یہ
لوشش شیخ الہند و شیخ الاسلام بنتے پھرتے یا مجاہد ملت و امیر شریعت۔ یہ صرف کانگریس
فیصلوں پر انگوٹھا دستخط کرنے والے تھے اور گاندھی و نہرو کے ارشادات کو قرآن و
یث کی تعلیمات کے عین مطابق ثابت کرنے والے اور بس۔ اہم مواقع پر ان بیچاروں
کانگریس نے کبھی بلانے اور اِن سے مشورہ تک لینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

اب دست معلوم کرنی ہے ابوالکلام آزاد کے "انا" کی۔ یہ اس وقت تک معلوم
نہ ہو سکتی جب تک یہ معلوم نہ کر لیا جائے کہ گاندھی کے عزائم کیا تھے اور ابوالکلام آزاد نے
ساری اور گوناگوں قابلیتیں کس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وقف کی ہوئی تھیں۔ اِن
حضرات کے مدعا و مقصود کا پتہ لگتے ہی گاندھوی امام الہند کا "انا" پورے طور پر
ہو جائے گا، جس سے رئیس احمد جعفری جیسے حضرات کی حیرانی خود ہی دُور ہو جائیگی۔

گاندھی کو جب مولانا محمد علی جوہر جیسوں نے گاندھی بنا کر ہندوستان کا سرکردہ لیڈر
لیا اور تحریک آزادی کے ہر ٹولے نے اُسے اپنا قاید، رہنما، پیشوا اور امام بنا لیا، تو
ھی کی منزلِ مقصود نزدیک سے نزدیک تر آتی جا رہی تھی۔ وہ منزلِ مقصود کیا تھی؟ یہی کہ
وستان کے مالک بلا شرکت غیر ہندو اور صرف ہندو رہیں۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے
غرض سے وہ ایسی پالیسی وضع کرتا تھا کہ جس سے اُس وقت کے حکمران یعنی انگریز ہندوستان
بوریا بستر گول کرکے بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔ اِس کے بعد رہ جائیں گے سابق حکمران

(یعنی مسلمان) اور اُن کے مذہب میں شامل ہو جانے والے تو اُنھیں بہلا پھسلا کر دوستی
ہمدردی کا جھانسا دیا جائے، نزدیک آنے پر اپنا مقصد حاصل۔ اس قرب و اتحاد سے
باتوں کی گاندھی کو توقع تھی اُن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ بُت شکن اور بُت پرست کا فرق ختم ہو جائے گا۔

۲۔ توحید کے پرستار جب بُت پرستوں سے دوستی کرنے لگے تو جذبۂ توحید خود ہی اُن کے
دلوں سے محو ہو جائے گا۔

۳۔ ہندو کے دوست بننے والے اگر ہندو نہیں بنے تو نہ سہی، لیکن مسلمان بھی
رہ سکیں گے۔

۴۔ انگریزوں سے ٹکراؤ کی صورت میں مسلمانی کا دعویٰ کرنے والوں کو مقابلہ پر چھوڑ
خود اہنسا کے پجاری اور امن کے دیوتا بن جایا کریں گے۔ اس سے حکومت کا
مسلمانوں پر گرے گا جو ہر طرح ہندو کا فائدہ کہ مسلمان انگریزی اقتدار کی دیوار پر
ماریں گے تو دیوار ٹوٹے یا مسلمان کا سر پھوٹے، دونوں صورتوں میں مشرکین ہند
اور اینٹ پتھر کے پجاریوں کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔

۵۔ انگریزوں کے بیک بینی و دوگوش نکل جانے کے بعد ہندو اقتدار کو چیلنج کرنے
کوئی نہیں رہے گا، کیونکہ جن مسلمانوں سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے وہ خود
زنّار دوست بلکہ ہندو کے غلام اور گاندھی کے بندۂ بے دام بنے ہوئے ہوں
پھر خطرہ کیسا؟

۶۔ گاندھی نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی سردھانند کی طرح اس لیے تو کوئی تحریک
شروع نہیں کی تھی کہ اُس انقلاب، وہ اس سے سبق سیکھ لیا تھا۔ انگریزوں نے
ہندوستان کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے منصوبے پر جب عمل کرنا
کر دیا تھا تو نتیجہ مکمل بغاوت پر منتج ہوا جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔ اس
بعد انگریزوں نے اس منصوبے کو ترک کر کے ایسی تعلیم و تہذیب کو رائج کرنا شر
کر دیا، جس نے پڑھے لکھے باشندگانِ ہند اور خصوصاً اسکولوں کالجوں

پڑھے ہوئے مسلمانوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اور اس طرح پرانی قوم کی جگہ ایک نئی قوم نے ہی جنم لے لیا۔ گاندھی بھی اسی طرح اتحاد اور دوستی کے چکر میں پھنسا کر مسلم قوم کی نسل کو اپنے انداز پر بدلنا چاہتا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی تو دیکھیے کہ ہمارے گاندھوی علماء بغیر کسی جبر و اکراہ کے، اس شمع طاغیت پر، خود ہی برضا و رغبت اور اس سامری وقت کے سحر سے مسحور ہو کر یہ کہتے ہوئے پروانہ وار نثار ہو رہے تھے۔ سہ

میں آپ ہی سر شوق سے مقتل میں جھکا دوں
لے جان اگر خنجرِ تسلیم تمہارا

اب دیکھنا یہ ہے کہ جناب ابوالکلام آزاد کیا چاہتے تھے؟ کیا وہ بھی گاندھی کی جادوگری کا شکار ہو گئے تھے؟ احقر کا جواب (قطع نظر اس کے کہ وہ کسی کی نظر میں صحیح ہے یا غلط) نفی میں ہے۔ ابوالکلام اور گاندھی کی پہلی ملاقات ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوتی ہے لیکن آزاد صاحب اس ملاقات سے پہلے متحدہ قومیت کے حامی اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست مبلغ تھے۔ موصوف اپنے اس سیاسی و دینی نظریہ کی "الہلال" کے ذریعے کھل کر تبلیغ و اشاعت کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو دورِ حاضر کا ابوالفضل بن کر برابر راغب کر رہے تھے کہ وہ ہندوؤں کو بھی اپنا بھائی سمجھیں اور یہ خیال قطعاً دل میں نہ لائیں کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ہندو الگ۔ نہیں، بلکہ ہندو ہوں یا مسلمان، ہندوستان کے سارے باشندے ایک ہی قوم کے افراد ہیں اور اس قوم کا نام، ہندو یا مسلمان نہیں بلکہ "ہندوستانی" ہے۔

ابوالکلام آزاد اپنے مخصوص نظریات و عزائم کی بنا پر اپنے دور کے ابوالفضل بن کر اکبرِ اعظم کی تلاش میں تھے اور ادھر گاندھی جو ہندوستان کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا، اس نے اس مقام پر پہنچ کر ماڈرن اکبرِ اعظم بننے کی غرض سے اس کے "دینِ الٰہی" کو گاندھویت کی شکل میں پورے ملک پر مسلط کرنے کی غرض سے اپنے دور کے ابوالفضل کی راہ میں دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو گاندھی اور ابوالکلام ملے نہیں، اپنے دور کے اکبرِ اعظم اور ابوالفضل ملے۔ دونوں بامراد ہو گئے۔ اکبرِ اعظم کو اپنا ابوالفضل مل گیا اور ابوالفضل کو اپنا اکبرِ اعظم ہاتھ آ گیا۔ نہ گاندھی ابوالکلام کا مرید تھا

نہ ابوالکلام گاندھی کا، بلکہ دونوں ایک دوسرے کی مراد تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے عزائم کی تکمیل کا سب سے بڑا سہارا تھے۔ اگر مغلِ اعظم اور ابوالفضل اکٹھے نہ ہوتے تو تاریخ کے اوراق میں "دینِ الٰہی" کا نام تک نہ آتا۔ اسی طرح اگر گاندھی اور ابوالکلام مل جل کر ایک ہی منزل پر گامزن نہ ہوتے تو "گاندھویت" کے نام سے بھی ابنائے زمانہ کے کان ناآشنا رہتے۔ ظفر علی خان نے اسی لیے تو کہا تھا :-

کھڑے یہاں سے بھول گئے کیوں حرم کو آپ
آئیں ابوالکلام جو ورد ھا سے گھوم کر[1]

شاید رئیس احمد جعفری صاحب نے یہ محسوس کر ہی لیا ہوگا کہ ابوالکلام آزاد کے "آنا" میں اتنی وسعت کیوں تھی اور موصوف کی جلکہ کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود کانگرس کا کوئی ہندو لیڈر تو کیا خود گاندھی بھی اسے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا، بلکہ وہی گاندھی جس کی اس کے صنم خانے میں مغلِ اعظم کی طرح پرستش ہورہی تھی بعض اوقات اُسے بھی ابوالکلام آزاد کی رائے کے آگے جھک جانا پڑا۔ ابوالکلام کو رد کرکے گاندھی کی لیڈری میں تو واقعی کوئی فرق نہ آتا لیکن جس گاندھویت کی خاطر وہ مہاتمائی کا ڈھونگ رچائے پھر رہا تھا اُس کا شاید کہیں نام و نشان بھی نہ ملتا۔ یہ گاندھی ابوالکلام اتحاد کی حدیں محض دوستی و تعاون پر ہی ختم نہیں ہوجاتیں بلکہ دونوں میں جسم و روح اور لازم و ملزوم کا رشتہ تھا جس کے تحت دونوں ایک جان اور دو قالب ہوگئے تھے اور زبانِ حال سے ایک دوسرے کو مخاطب کرکے یوں کہا کرتے تھے :-

من تو شدم، تو من شدی، من تن شدم، تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازاں، من دیگرم، تو دیگری

موصوف کی وفات پر مشہور ہندو لیڈروں کی کیفیت کیا تھی، یہ شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان کی زبانی سنیے :

---

[1] ظفر علی خان، چمنستان۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۳

"پنڈت جواہر لال نہرو سراپا گریہ تھے۔ انھیں سنبھالنے والے ہزاروں تھے،
لیکن وہ لوگوں کو سنبھالنے کے لیے دوڑے پھر رہے تھے۔ تمام کوٹھی کے
وسیع باغات انسانوں سے اٹ چکے تھے لیکن لوگ اندر آنے کے لیے دروازہ
پر ہجوم کرتے رہے۔ پنڈت نہرو پورٹیکو کے باہر لوگوں کو ایک عام رضاکار کی
طرح ہاتھ پھیلا کر روکتے رہے اور جب جنازہ اٹھانے کے لیے ان کو بلایا تو
ان کی نظریں ہمرکاب سیکورٹی آفیسر پر رک گئیں۔ استفسار کیا، آپ کون؟
جواب ملا، سیکورٹی آفیسر، آپ کی حفاظت کے لیے۔ پنڈت نہرو نے کہا،
کیسی حفاظت؛ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے، بچا سکتے تو مولانا کو
بچا لیتے۔ یہ کہہ کر پنڈت نہرو بلک بلک کر رونے لگے۔

پون بجے میت اٹھائی گئی۔ پہلا کندھا عرب ملکوں کے سفیروں نے دیا
جب کلمۂ شہادت کی صداؤں میں جنازہ اٹھا تو عربی سفرا کاندھا دیتے وقت
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، خان محمد یونس خاں،
مسٹر کرشنا مینن، مسٹر پربودھ چندر اور بخشی غلام محمد نے احاطہ سے باہر
میت کو توپ گاڑی پر رکھا۔ راجندر بابو دمہ کے مریض ہونے کے باوجود صبح
ہی سے تصویر یاس بنے کھڑے تھے، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، "آج
۵۴ سال کی دوستی اور رفاقت کا انت ہو گیا۔ مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا
نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔"

پنڈت نہرو کی ہچکی بندھ گئی۔ مولانا احمد سعید کی سفید داڑھی پر آنسوؤں
کے موتی جگمگا اٹھے۔ تمام فضا میں نالہ ہائے شیون تیرنے لگے . . . . .
جنازے کی گاڑی میں سرہانے کی سمت دائیں رخ پر پنڈت نہرو اور بائیں طرف
پر صدر کانگرس ڈھیبر بھائی کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے جنرل شاہ نواز،
ڈھیبر بھائی کے ساتھ بخشی غلام محمد اور پروفیسر ہمایوں کبیر موجود تھے۔"[1]

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ص ۷۷۶

موصوف کو کرن سے مسنون طریقے کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔ اِس آخری جلوس میں زیادہ تر کو نسے عقیدت مند حضرات شامل ہوئے۔ یہ بیان بھی شورش کاشمیری کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیں:

"میت پر کھدر کا کفن تھا۔ میت ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپٹی ہوئی تھی، جس پر کشمیری شال پڑا تھا۔ جنازہ کے پیچھے صدر جمہوریہ اور نائب صدر کار میں بیٹھے تھے۔ اُن کے پیچھے پارلیمنٹ کے ارکان، مختلف صوبوں کے وزرائے اعظم اکثر صوبائی گورنر اور غیر ملکی سفارتی نمائندے چلے آ رہے تھے۔ بھارتی افواج کے چیف آف اسٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے ..... پریڈ گراؤنڈ میں محتاط سے محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ افراد جمع تھے۔ قبر کے ایک طرف علماء و حفاظ قرآن مجید پڑھ رہے تھے، دوسری طرف اکابر و فضلاء سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہاں سب سے پہلے بری فوج کے ایک ہزار سپاہیوں، ہوائی فوج کے تین سو جانبازوں اور بحری فوج کے پانچ سو نوجوانوں نے اپنے عسکری بانکپن کے ساتھ میت کو سلام کیا۔ پھر مولانا احمد سعید نے دو بجکر پچاس منٹ پر نمازِ جنازہ پڑھائی۔

اِدھر نمازِ جنازہ پڑھائی جا رہی تھی اُدھر پنڈت نہرو قبر کے قریب فرشِ زمین پر بیٹھے ٹکٹکی دیکھ رہے تھے۔ امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا اور میت لحد کے قریب لائی گئی تو ہزارہا ہندو و سکھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوج نے تعزیتی بگل بجائے۔ ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے مسلمانوں کی آنکھیں پھر اشکبار ہو گئیں۔ مولانا احمد سعید نے لحد میں اُتارا۔ کوئی تابوت تیار نہ کیا گیا تھا۔ ایک یادگار جسم سعید کفن میں لپٹا ہوا خاک کے حوالہ کر دیا گیا۔ راجندر بابو نے آنسوؤں کی سبیل میں بھگو کر پھول نچھاور کیے۔ پنڈت نہرو نے گلاب چھڑکا تو بے اختیار ہو گئے، لوگوں نے سہارا دیا اور جب مٹی دینے لگے تو بلک بلک کر رو رہے تھے۔"[1]

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۲۰۰۱ء، ص ۵۵۵

گاندھی نے تو ان حضرت کے بقول شہادت پائی تھی لیکن ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ گاندھی اور ابوالکلام آزاد میں سے کس کا مرتبہ اونچا رہا کیونکہ ابوالکلام آزاد یقیناً شہادت سے محروم رہے تھے۔ بہرحال اس تاریخ ساز ہستی کے متعلق گاندھوی حضرات کا مندرجہ ذیل تبصرہ بھی نظر انداز کرنا ظلم ہوگا:

"گاندھی جی کی شہادت کے بعد سے ملک کبھی ایسا تنزلزل نہیں ہوا جیسا کہ مولانا صاحب کی حسرتناک موت سے ہوا۔ انھوں نے ۴۵ سال سے بھی زیادہ ملک کی خدمت کی ہے۔ ماضی قریب کے بہت سے برسوں کی ہندوستانی تاریخ مولانا مرحوم کے اس کردار کو ایک وسیع صورت میں پیش کرے گی جو مرحوم نے اس تاریخ کی تعمیر میں ادا کیا ہے۔" [1]

موصوف کی وفات پر بھارت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ:

"ہندوستان ایک عظیم عالم، ایک بلند پایہ مقرر، ایک تجربہ کار سیاستدان، ایک مسلّم قوم پرست، ایک مایہ ناز محبِ وطن، جنگِ آزادی کے ایک سپہ سالار، اور ایک عظیم رہنما کی خدمات سے محروم ہوگیا ہے۔ جس کا مشورہ مشکل اوقات میں قوم کے لیے ہمیشہ ہی مشعلِ راہ کا کام دیتا رہا ہے۔ وہ آخر وقت تک وطن کی، جس سے انھیں بے حد پیار تھا، آبیاری اور خدمت کرتے رہے۔" [2]

بھارت کے دوسرے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے موصوف کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں اُن کی خدمات کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"مولانا آزاد ایک بہت بڑے سیاست دان تھے، مفکر اور اسکالر تھے، سچے مسلمان تھے اور پُرجوش محبِ وطن۔ اُن کی سیرت کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے محض اپنے نظریات کی خاطر بڑی مصیبتیں اٹھائیں

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء، ص ۷۷۰

[2] ایضاً، ص ۷۷۰

لیکن پروا نہ کی۔ مولانا مرحوم کی خدمات کا اعتراف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قوم اُس نصب العین کو کلیجے سے لگائے رکھے جسے مولانا نے ہمیشہ سامنے رکھا۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات، رواداری اور اتحاد کی روح کو یاد رکھنا چاہیے۔" [۱]

بھارت کے وزیرِ داخلہ پنڈت گوبند ولبھ پنت نے اپنے تعزیتی پیغام میں یوں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں،

"ایک زندگی جو ایک مقصد کے لیے وقف تھی ختم ہو گئی۔ ایک عظیم انسان جو ہر لحاظ سے عظیم تھا ہم سے جُدا ہو گیا۔ مولانا آزاد جیسی ہستی ہمیں پھر کبھی دیکھنے کو نہ ملے گی۔ ہندوستان کی گزشتہ برسوں کی تاریخ بتائے گی کہ اِس میں مولانا نے کتنا حصہ لیا تھا۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کے وقت برسوں تک کانگرس کی رہنمائی کی۔ مولانا مرحوم صحیح معنوں میں ایک عظیم الشان انسان تھے۔" [۲]

پنڈت جواہر لال نہرو ایک بُت پرست تھے اور ابوالکلام آزاد مسلمان کہلاتے والے بلکہ اپنے حلقے میں "امام الہند" تک مشہور تھے اور اپنے موحّد ہونے پر بھی نازاں تھے۔ حالات نے یہ بتایا اور دکھایا کہ ایک توحید پرست کی موت پر ایک مشہور زمانہ بُت پرست اِس طرح بلک بلک کر روتا رہے تھا اور بہاتا ہے جیسے کوئی عاشقِ صادق اپنے معشوق کی لاش کو دیکھ کر۔ موحّد اور بت پرست کے عشق کی کہانی، مرنے والے کی زبانی سُنیے،

"جواہر لال نہرو میرے (ابوالکلام آزاد کے) محبوب ترین دوست ہیں۔ ہندوستان کی قومی زندگی میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ کسی دوسرے فرد سے کم نہیں ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کیا تھا، مصائب برداشت کیے تھے اور آزادیِ ہند کے بعد سے تو وہ ہماری قومی زندگی اور

---

[۱] عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۷۷۰

[۲] ایضاً، ص ۷۷۰

ارتقاد کا نشان بن گئے ہیں:[1]

جناب ابوالکلام آزاد نے دوسری جگہ اسی تعلقِ خاطر اور دلی لگاؤ کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے،

"شروع ہی سے جب کانگرس میری سرگرمیوں کا مرکز بنی، میں اور جواہر لال بہترین دوست تھے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے کی تائید پر بھروسہ کرتے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان رقابت یا حسد کا سوال کبھی نہیں پیدا ہوا اور میرا خیال تھا کہ ایسا کبھی ہو بھی نہیں سکتا۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ نہرو خاندان سے میرے تعلقات کی تاریخ پنڈت موتی لال نہرو کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے بھی میں جواہر لال کو ایک بھائی کے بیٹے کی حیثیت سے دیکھتا رہا اور وہ بھی اپنے والد کے دوست کی حیثیت سے میرا احترام کرتے رہے۔"[2]

ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو کے خیالات اور جذبات ایک ہی تھے۔ کانگرس کی صدارت کے لیے اسی لیے موصوف کو اپنے بعد جواہر لال سب سے موزوں نظر آئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

"دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ میرا جانشین کون ہو؟ میں (ابوالکلام) چاہتا تھا کہ ایسا آدمی منتخب ہو، جو میرے خیالات و جذبات کا حامل ہو اور میری قائم کی ہوئی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جواہر لال سے زیادہ موزوں آدمی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ۲۶ اپریل کو میں نے اس مفہوم کا ایک بیان شایع کیا اور کانگرسی اصحاب سے اپیل کی کہ وہ بالاتفاق جواہر لال کو منتخب کر لیں۔ گاندھی جی سردار پٹیل کی طرف مائل تھے لیکن جواہر لال کا نام جب میری طرف سے پیش ہو گیا تو انھوں نے پبلک طور پر

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۷

[2] ایضاً، ص ۲۹۲

پھر اپنے خیالات اس سلسلہ میں ظاہر نہیں کیے۔" [1]

لیکن دوسرے ہندو زعماء، کانگرسی لیڈر اور اراکین سلطنت بھی ان کی موت کو گاندھی کی موت کے بعد سب سے بڑا سانحہ شمار کر رہے تھے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہندو لیڈر اپنی اکثریت کے گھمنڈ میں دوسری اقوام خصوصاً مسلمانوں کا سب کچھ چھین لینا چاہتے تھے اُن کے اس منصوبے کو جتنی مدد ابوالکلام آزاد سے ملی تنی پورے ایک سو ہندو لیڈروں سے بھی نہیں مل سکتی تھی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات پر کاری ضرب لگانے سے موصوف کبھی نہیں ہچکچائے، اسی لیے ہندو قیادت اُن کی قدر دانی کی مالا جپنے لگ جاتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ تو موصوف کو جعفر بنگال یا صادق دکن ہی سمجھتے ہوں۔ لیکن ہندوؤں کو چونکہ ان کی ذات اور ان کے مشن سے بڑی تقویت پہنچ رہی تھی اور آج تک پہنچ رہی ہے اس لیے وہ لوگ ابوالکلام جیسے محسن کی تعریف میں بخل سے کیوں کام لیتے ؟

ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۹۴۵ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ نے ۷۵ کانگرس نے ۹ اسیٹیں پنجاب سے حاصل کیں۔ جمعیتہ العلماء ہند نے دو اور آزاد امیدوار نے ایک نشست حاصل کی، پانچ حلقے مشترک تھے۔ گویا کانگرس سے تو پنجاب میں پھر بھی مسلم لیگ ہی بازی لے گئی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی کوئی پیش نہ گئی۔ لیکن ابوالکلام آزاد کا تاریخی کارنامہ جو اس موقع پر انجام دیا گیا، ایک یادگار کے طور پر محفوظ رہے گا، وہ یہ ہے،

"میں (ابوالکلام) نے پنجاب میں جو کچھ کیا تھا، وہ یہی تو تھا کہ اس حقیقت کے باوجود کہ گورنر مسلم لیگ کی وزارت قائم کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ کانگرس کو بھی ایوان وزارت میں دھکیل کر پہنچا دیا۔ یہ میرے ہی مساعی کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ نظر انداز کر دی گئی اور کانگرس اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب کے معاملات میں فیصلہ کن عنصر بن گئی۔" [2]

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیٔ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۰

[2] ایضاً، ص ۳۴۹

موصوف اس مسلم دشمنی کے کارنامے پر نازاں اور اپنے ہندو بھائیوں کی واہ واہ کے شور میں مست ہو کر فرماتے ہیں :

"یہ پہلا موقع تھا کہ پنجاب میں کانگرس شریک حکومت بنی۔ یہ بات ایسی تھی جو اب تک ناممکن سمجھی جاتی رہی۔ سارے ملک کے سیاسی حلقوں نے اعتراف کیا کہ میں نے غیر معمولی صلاحیت اور تدبر کا ثبوت دیتے ہوئے پنجاب میں وزارت سازی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ملک کے مختلف اطراف و جوانب سے مبارکباد کے تاروں کی مجھ پر بھرمار ہو گئی۔ نیشنل ہیرالڈ نے جو یو۔پی۔ کانگرس کا ترجمان ہے، مجھے مبارک باد دی کہ میں نے ایسا طرز کار اختیار کیا جس سے پنجاب کا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ حل ہو گیا۔ اس اخبار نے تو میرے بارے میں یہاں تک لکھ دیا کہ پنجاب کے حالات کو اس طرح مٹھی میں لے لینا میری صلاحیت اور تدبر کی ایسی شاندار مثال ہے، جس کی نظیر اب تک کسی کانگریسی لیڈر کے ہاں نظر نہیں آتی۔"[1]

موصوف کے اس عدیم المثال کارنامے پر رئیس احمد جعفری کا تبصرہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"مولانا (ابوالکلام) کے اس کارنامے کی حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں تقریباً ساری مسلم نشستوں پر اگرچہ لیگ نے قبضہ کر لیا تھا اور از روئے اخلاق و آئین اسے تشکیل وزارت کا حق تھا، لیکن مولانا نے سر خضر حیات خاں اور ان کے تین چار ساتھیوں قزلباش اور بھرق وغیرہ کو مسلمانانِ پنجاب کا نمائندہ تسلیم کر لیا۔ کانگرس کو، سکھوں کو اور دوسرے غیر مسلم عناصر کو خضر حیات کا پشت پناہ بنا دیا۔ مسلمانوں کی اکثریت چونکہ عددی تھی لہٰذا ان چند غداروں کو اپنے ساتھ ملا لینے کے بعد مولانا نے درحقیقت کانگرسی بظاہر یونینسٹ حکومت

---

[1] رئیس احمد جعفری : آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۸، ۳۱۹

قائم کرادی۔

مولانا ہندوؤں کے شور مبارک باد سے اتنے مسرور ہوئے کہ انھوں نے یہ نہ سوچا، اس طرح وہ پاکستان کی بنیاد مستحکم کر رہے ہیں۔ مسلمانوں نے سوچا اور بجا طور پر سوچا کہ جب اس طرح ہماری اکثریت چال بازیوں کے باعث اب اقلیت بنائی جاسکتی ہے تو سارے ہندوستان کی عنانِ اقتدار ہاتھ میں لے لینے کے بعد مسلم اکثریت کے صوبے بالکل کانگرس کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ وہاں وہی حکومت بن سکے گی جو کانگرس کی منظورِ نظر ہو۔[1]

موصوف نے اسی وزارت سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے اس طرح تجزیہ کیا ہے:

"واقعی مسلم لیگ عوامی جماعت تھی اس سے اشتراک وتعاون کانگرس کے شایانِ شان تھا لیکن یونینسٹ جماعت، جس نے ہمیشہ کانگرس کے سر پر ڈنڈے برسائے، جس نے کانگرس کی ہر تحریک کو پوری ہیبت سے کچلا، جس نے کانگرسی لیڈروں کو ہتھکڑیاں پہنا کر جیل بھیجا، جس نے انگریزوں کی حمایت اور جاں نثاری میں اپنے ملک، قوم اور وطن سے غداری کی، جو صرف جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں پر مشتمل تھی۔ جس میں سردار، خان بہادر، رائے بہادر بھرے ہوئے تھے، جس کے ارکان میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جس نے کبھی بھولے سے بھی کسی عوامی تحریک میں حصہ لیا ہو۔ جس نے ہمیشہ انگریزوں کی وفاداری پر قوم اور ملت کی وفاداری کو ترجیح دی، محض مسلم لیگ کو زک دینے کے لیے ایسی جماعت سے ساز باز کرنا اور سازش سے کام لے کر اس کی وزارت بنوا دینا، یقیناً مولانا کا ایسا کارنامہ تھا جس پر ہندوؤں کی مسرت بجا تھی، جس پر مولانا بھی فخر کرنے میں، لکن سے حق بجانب ہوں لیکن ملت اسلامیہ کا جہاں تک تعلق ہے، اس نے نفرت اور حقارت کے ساتھ اس

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیٔ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۳۰۴، ۳۰۵

کارنامہ کر دکھایا تھا۔ یہ کارنامہ اُن کی نظر میں بالکل ایسا ہی تھا جیسے جعفر و صادق کا۔[1]

جب کانگرس نے مسلم لیگ اور مسلم اکثریت کے صوبوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تو خوش قسمتی سے مسلم لیگ کو وزارتِ مال کا عہدہ مل گیا۔ کانگرس نے یہ عہدہ اِس غرض سے مسلم لیگ کے سپرد کرنے کی پیش کش کی تھی کہ اُن کے خیال میں اِسے سنبھالنے والا آدمی مسلم لیگ کے پاس کوئی نہیں تھا لہٰذا انکار کر دے گی اور اِس طرح مسلم لیگ اور مسلمانوں کو مرکز میں قابلِ ذکر عہدوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ مسلم لیگ نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔ لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ خان لیاقت علی خان اِس پر فائز کیے گئے۔ لیاقت علی خان نے اپنے رفقائے کار کی مدد سے اِس ہوشمندی سے یہ کام چلایا کہ کانگرس کی ساری مشینری کو معطل کر کے رکھ دیا۔ بڑے سے بڑے ہندو عہدیدار بھی بے بس ہو کر رہ گئے۔ اور آخر میں بجٹ وہ پیش کیا کہ ہندو لیڈروں یعنی صنعتکاروں اور مہاجنوں کے سارے پیچ و خم نکال کر رکھ دیے اور بتا دیا کہ سارے مسلمان کہلانے والے ابوالکلام آزاد اینڈ کمپنی جیسے ملت فروش نہیں ہیں جنہیں ہندو آنکھ دکھا کر یا میٹھی گولیاں کھلا کر نگل سکتے ہیں بلکہ ان میں اکثریت اُن غیور مسلمانوں کی ہے جنہیں نگلنا انتہائی مشکل اور بڑی ہی ٹیڑھی کھیر ہے۔ لیاقت علی خان کی اِس کارگزاری کو ابوالکلام آزاد کی زبان سے سُن لینا چاہیے:

"محکمہ مالیات کی باگ مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھی، گویا نظم و انصرام کی کنجی اِس کے پاس تھی۔ محکمہ مالیات میں چند نہایت قابل اور سینئر مسلم حکام موجود تھے، انھوں نے لیاقت کو ہر ممکن امداد دی۔ اُن کے مشورے سے لیاقت علی ہر اُس تجویز کو مسترد یا مؤخر کر دیتے تھے جو اگزیکٹو کونسل کے کانگرسی ممبران کی طرف سے پیش کی جاتی تھی۔ سردار پٹیل نے خود ہی یہ انکشاف کیا کہ اگرچہ وہ وزیر داخلہ ہیں لیکن لیاقت علی کی مرضی کے بغیر وہ ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ کانگرسی ممبروں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کریں۔"[2]

---

[1] رئیس احمد جعفری: آزادیٔ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۴

[2] ایضاً، ص ۲۵۴

لیاقت علی خاں نے جو بجٹ پیش کیا وہ انھی اصولوں پر مبنی تھا جو کانگرسی لیڈروں کے اعلانات اور اُن کی پالیسی سے بالکل ہم آہنگ تھے۔ موصوف کے اصولوں کی کانگرسی زعماء نے بھی تائید کی لیکن وہ اعلانات منافقت پر مبنی تھے اور یہ بجٹ اُن کی عملی تصویر تھی۔ مثلاً ابوالکلام آزاد یُوں وضاحت کرتے ہیں :

"ہم خود یہ چاہتے تھے کہ تقسیم دولت زیادہ سے زیادہ مساوی بنیاد پر ہو اور ٹیکس سے بچنے والے لوگوں کو ہرگز معاف نہ کیا جائے ، لہٰذا بنیادی طور پر ہمیں لیاقت علی کی تجویز سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب انھوں نے کابینہ میں یہ مسئلہ پیش کیا تو کہا کہ اُن کی تجاویز اُن اعلانات پر مبنی ہیں جو وقتاً فوقتاً کانگرسی لیڈروں کی طرف سے ہوتے رہے تھے۔ اُنھوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ یہ اعلانات زیادہ تر جواہر لال کے تھے لیکن انھوں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی ، عام احساس پر ہم نے اُن سے اصولی طور پر اتفاق کر لیا۔" [1]

رئیس احمد جعفری نے اس بجٹ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یُوں کیا ہے :

"عوام کے ساتھ کانگرس کا یہ منافقانہ رویّہ اور سرمایہ داروں کے ساتھ اِس نیازمندانہ برتاؤ پر اتنی ہزار صفحے کی کتاب لکھ دی جاتی ، ملک کے طول و عرض میں شعلہ نوا خطیب اور آتش نوا مقرر تہلکہ مچا دیتے تو بھی وہ اس طرح بے نقاب نہیں ہو سکتے تھے جس طرح لیاقت علی خاں کے چند ورق کے اِس میزانیہ نے کر دیا ..... گویا لیاقت علی نے بجٹ اِس لیے بنایا تھا کہ برلا ، ڈالمیا ، سنگھانیہ کو لوٹ کر غریب مسلمانوں کی جھولیاں بھر دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت پٹیل اور راجگوپال اچاری کے منہ سے وہ الفاظ نہیں نکلوا سکتی تھی جو لیاقت علی کے بجٹ نے نکلوا دیے۔" [2]

---

[1] رئیس احمد جعفری : آزادیٔ ہند ، مطبوعہ لاہور ، ص ۴۴۹

[2] ایضاً ، صفحہ ۴۴۷ – ۴۴۸

یہ سطریں یہاں جملہ معترضہ کے طور پر آگئیں۔ ذکر تھا جناب ابوالکلام کی ہندو نوازی اور ہر موقع پہ مسلم مفادات پر کاری ضربیں لگانے کا۔ مسلمانوں نے ہندو لیڈروں کی عیاری اور مسلم دشمنی کے تحت تقسیمِ ملک کی تجویز اور مطالبۂ پاکستان کو اپنے حقوق کے تحفظ کا واحد حل پا کر اپنی تمام تر مساعی اِس مقصد کو حاصل کرنے پر مرکوز کر دی تھیں تاکہ علیحدہ خطّے میں مسلمان اپنی قسمت کے آپ مالک بن کر رہیں۔ اُنہیں صاف نظر آنے لگا تھا کہ انگریز کی غلامی سے نجات پانے کے بعد بھی مسلمانانِ ہند غلامی کے چکّر سے نہیں نکل سکیں گے۔ آزادیِ ملک کے بعد ہندو اکثریت کی غلامی کا جُوا کندھوں پر رکھا ہوا ہوگا۔ جو انگریزی اقتدار میں مسلمانوں کو پیس رہے ہیں وہ لعبد میں تو کچا ہی چبانے کی کوشش کیا کریں گے۔ اِن متوقع خطرات سے بچاؤ کی صورت مطالبۂ پاکستان کے سوا اور کیا تھی۔ مسلمانانِ ہند کے اِس مطالبہ نے جب انتہائی شدّت اختیار کر لی تو بڑے بڑے ہندو لیڈروں کو بھی تقسیمِ ہند کے علاوہ مسلمانوں کو مطمئن کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ معاملات کے آگے اُنھیں بھی جھکنا اور مطالبۂ پاکستان کو درست تسلیم کرنا پڑا۔ اِس سلسلہ میں پاکستان کو "پلیدستان" یا "کنجری" بتا کر قبول کرنے والے نام نہاد علماء کا ذکر نہیں کرتا بلکہ تذکرہ ہے اُس اونچی چوٹی کی سرکار کا، جس کو گاندھوی حضرات امام الہند کا لقب دیتے ہیں کہ موصوف کا اُس وقت کیا خیال تھا؟

"اب کہ سردار پٹیل ہی نہیں جواہر لال تک تقسیمِ ہند پر راضی ہو چکے تھے، میری (ابوالکلام کی) تنہا اُمیدگاہ، گاندھی جی کی ذات تھی۔ وہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے دہلی آئے ہیں، فوراً اُن سے ملنے روانہ ہو گیا۔ اُنھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ تقسیمِ ہند اب ایک خطرہ بن چکی ہے۔ ولبھ بھائی (یعنی سردار پٹیل) اور صرف وہی نہیں جواہر لال تک سپر انداز ہو چکے ہیں۔ بتائیے مولانا آپ کیا کریں گے؟ آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل چکے ہیں؟

میں نے جواب دیا: میں تقسیمِ ہند کا مخالف پہلے بھی تھا، اب بھی ہوں، بلکہ اب سے زیادہ اِس تخیّل کا مخالف کبھی نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے کہ جواہر لال اور سردار پٹیل نے شکست تسلیم کر لی ہے، بلکہ

آپ کے الفاظ میں سپر انداز ہو گئے ہیں۔ میری واحد اُمیدگاہ آپ کی ذات ہے
اگر آپ تقسیم کے خلاف آمادۂ عمل ہوں تو ہم حالات کو اب بھی قابو میں لا سکتے ہیں
لیکن اگر آپ بھی خاموشی اختیار کرلیں تو مجھے شبہ ہے کہ پھر ہندوستان ہاتھ سے گیا۔
گاندھی جی نے جواب دیا کہ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اگر کانگرس تقسیم ہند
قبول کرنا چاہتی ہے تو یہ کارروائی میری لاش ہی پر ہو سکے گی۔ جب تک میں
زندہ ہوں میں کبھی بھی تقسیم ہند پر رضامند نہیں ہو سکتا اور نہ میں کانگرس کو
ایسا کرنے دوں گا۔"[1]

عبارت کے تیور بتا رہے ہیں کہ تقسیم ہند کا جھگڑا گویا ہندوؤں اور مسلمانوں یا کانگرس اور مسلم لیگ
کا جھگڑا نہیں تھا بلکہ جھگڑا تھا ابوالکلام آزاد اور مسلمانوں کا۔ مسلمانان ہند کا مطالبہ تھا کہ ہندو
ہمارے ساتھ اب بھی زیادتی کر رہے اور آزادی کے بعد تو ذرا بھی کسر باقی نہیں چھوڑیں گے
لہٰذا ہندوستان کو تقسیم کر کے ہمارا حق ہمیں علیحدہ دے دیا جائے تاکہ ہم انگریز کی غلامی کے
ساتھ ہی ہندو کی غلامی سے بھی نجات حاصل کرلیں۔ اس کے برعکس ابوالکلام دی گریٹ کا نظریہ
یہ تھا کہ خواہ سارے ہندو لیڈر اور پوری ہندو قوم بھی اس بات پر رضامند ہو جائے کہ ہم
مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے پر بضد نہیں اور تقسیم ہند کا منصوبہ تسلیم کر کے مسلمانوں کو ان کا
حق دینے پر راضی ہیں لیکن میں پھر بھی اس فیصلے کو تسلیم نہیں کروں گا۔ موصوف کے اس وقت
بھی تسلیم نہ کرنے کی چند وجوہات ہیں:

۱۔ جس طرح ابوالفضل علامی دالمتوفی   ، نے اکبر بادشاہ کو سمجھایا تھا کہ
ہندوستان کے باشندوں کو یک قوم بنایا جائے۔ ہندو اور مسلمان وغیرہ کی
علیحدہ قومیت کا تصور ہی ختم کر دیا جائے اسی طرح ماضی قریب میں اس ایک قوم (متحدہ
قومیت) بنانے کے منصوبے کو پروان چڑھانے والے نہ ہندو لیڈر تھے، نہ گاندھی تھا،
نہ اور کوئی، وہ امام الہند کہلانے والا ابوالکلام آزاد تھا۔

۲۔ ہندو لیڈر اس متحدہ قومیت کے منصوبے میں ابوالکلام کے معاون و مددگار ضرور تھے
لیکن اس منصوبے کی علمبرداری اور سارے قافلے کی سپہ سالاری کے جملہ حقوق تو بحق

[1] رئیس احمد جعفری: آزادی ... ص ۳۰۴

این مولانا خیر الدین محفوظ تھے۔

۳۔ تقسیم ہند سے ہندو بھی گھبرائے ضرور۔ وُہ اپنے لیے اِسے نقصان دِہ فیصلہ سمجھتے تھے، لیکن براہِ راست ضرب تو ابو الکلام آزاد کے منصوبے پر پڑ رہی تھی۔ وہ تڑپ کیوں نہ اُٹھتے، آنکھوں دیکھتے اُن کی پچیس تیس سالہ محنت پر پانی پھرنے لگا تھا۔ ہندو لیڈر ٹکٹ ٹوٹ فورسز وز طاقتیں مان کر ملک کے دو حصّے بنا دینے پر رضامند ہو رہے تھے مگر یہ کیسے ہو سکتے؟

۴۔ ملک کے دو حصّے بننا متحدہ قومیت کی ضد ہے۔ اِسی لیے متحدہ قومیت کا علمبردار تقسیمِ ہند کو کس طرح قبول کرتا جبکہ یہ اُس کی شانِ ابو الفضلی کے خلاف تھی۔

۵۔ ڈوبنے والا تنکے کا بھی سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اِسی طرح ہندو اور مسلمان کو ایک قوم بنانے والے، توحید اور بُت پرستی کا فرق مٹانے والے اور کعبے میں بُت خانہ سجانے والے امام الہند نے اپنے منصوبے کو بگڑتے دیکھا تو سر ہندو لیڈر کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن اِنھیں ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔

۶۔ ذکر تھا کہ ابو الکلام آزاد، تقسیمِ ہند کے خلاف گاندھی سے استمداد کر رہے تھے۔ گاندھی نے یقین دہانی کرائی، پُرزور الفاظ میں اپنی شاہانہ طاقت کا اظہار کیا۔ چند روز بعد تقسیمِ ہند کی لعنت کرنے والا، ہندوستان کا بے تاج بادشاہ کہلانے والا گاندھی کون سی آندھی میں اُڑا؟ یہ ابو الکلام آزاد سے سنیے۔

”اُسی دن گاندھی جی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے۔ دُوسرے دن دونوں کی پھر ملاقات ہُوئی اور ۲ اپریل کو پھر۔ پہلی مرتبہ جب وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مل کر واپس آئے تو فوراً ہی سردار پٹیل اُن کے پاس پہنچے اور دو گھنٹے تک بیٹھے رہے۔ اِس ملاقات میں کیا باتیں ہُوئیں؛ میں نہیں جانتا۔ لیکن جب دوبارہ میں گاندھی جی سے ملا، تو میں نے ایسا جھٹکا محسوس کیا جو میری زندگی کا اہم ترین حادثہ ہے۔ میں نے دیکھا، گاندھی جی بھی بدل گئے۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ صدمہ پہنچایا اور حیران کیا وہ یہ تھی کہ اب گاندھی جی بالکل سردار پٹیل کی زبان میں بول رہے تھے۔ دو گھنٹے تک میں اُنھیں ہموار

کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ آخر کار میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ نے بھی یہ خیالات قبول کر لیے ہیں تو پھر مجھے کوئی آس نہیں ہے کہ ہندوستان تباہی سے بچ سکے گا۔ گاندھی جی نے مجھے بتایا کہ پوزیشن ایسی ہے کہ اب تقسیمِ ہند کو ٹالا نہیں جا سکتا۔[1]

تقسیمِ ہند کر کے مسلمانوں کو اُن کا حق دینے اور ہندوؤں کی غلامی سے آزادی حاصل کر لینا ابوالکلام آزاد کی نظر میں کیا تھا، یہ مذکور ہُوا۔ اِسی سلسلے میں موصوف کی ایک وضاحت اور ملاحظہ ہو

"۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ ہُوا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بہت سے جلسوں میں شریک ہو چکا ہُوں، لیکن اِس عجیب جلسے میں کاش! شریک نہ ہوا ہوتا۔ کانگرس جس نے ہمیشہ ہندوستان کی آزادی اور وحدت کے لیے لڑائی جاری رکھی تھی آج تقسیمِ ہند کے ریزولیشن پر غور کر رہی تھی۔ پنڈت گوبند بلبھ پنت نے ریزولیشن پیش کیا۔ پھر سردار پٹیل اور جواہر لال بولے، بعد میں گاندھی جی نے لب کشائی کی۔

کانگرس کی طرف سے اِتنے ذلیل طریقے پر ہتھیار ڈال دینے کا منظر برداشت کر لینا میرے بس سے باہر تھا [illegible] تقریر میں، میں نے صاف طور پر کہا کہ جس فیصلے پر ورکنگ کمیٹی پہنچی ہے وہ نہایت افسوسناک [illegible] کا نتیجہ ہے۔ تقسیمِ ہندوستان کے لیے سب سے بڑا المیہ ہے اور اِس کی تائید میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے [illegible] ہم نے اپنے مقدور بھر تقسیم سے بچنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ بہرحال ہمیں سمجھنا چاہیے کہ قوم ایک ہے (یعنی ہندو مسلم ایک ہی بات ہے)، اِس کی تہذیبی زندگی ایک ہے اور ایک رہے گی، سیاسی طور پر ہم ناکام ہو گئے اور اِسی لیے تقسیمِ ملک پر مجبور ہو گئے۔ ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے۔"

---

[1] رئیس احمد جعفری: آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۹

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ عہد بھی کر لینا چاہیے کہ ہماری تہذیب تقسیم نہیں ہوئی۔

اگر ہم پانی کو ایک چھڑی سے بانٹیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ پانی تقسیم ہوگیا، لیکن وہ تقسیم نہیں ہوتا، چھڑی جیسے ہی ہٹائی جائے گی، تقسیم کے اثرات فوراً زائل ہو جائیں گے۔"[1]

اِس تقریر پر کوئی تبصرہ کرنا ہمارے نزدیک لاحاصل ہے کیونکہ موصوف کے نظریات اُن کے الفاظ سے خود ہی پورے طور پر واضح ہو رہے ہیں، ہاں اِس کے متعلق سردار پٹیل کے تاثرات پیش کر کے فیصلہ قارئین کے سپرد کرتا ہوں:

"سردار پٹیل کو میری تقریر پسند آئی۔ اُن کی ساری تقریر میری تقریر کا جواب تھی اُنھوں نے کہا تقسیم ملک کا پرپوزیشن جبر یا کمزوری کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہندوستان کے موجودہ حالات کا بہترین حل یہی ہے۔"[2]

پٹیل، جواہر لال اور گاندھی تک آخر یہ تقسیم ہند پر رضامند ہو گئے لیکن آخری سانس تک رضامند نہ ہونے والے ابوالکلام کے نزدیک یہ ایک بدترین اندیشہ تھا جو کبھی کبھی ان کے دماغ کی کھڑکیوں کو کھڑکھڑا کر ان کی نیندیں حرام کر دیا کرتا تھا، وہی اندیشہ اب موصوف کے سامنے حقیقت بن کر آگیا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"لارڈ ماؤنٹ بیٹن برطانوی حکومت سے تقسیم ہند کی اسکیم منظور کرا کے ۳۰ مئی کو دہلی واپس آ گئے۔ ۲ جون کو نمائندگانِ لیگ و کانگریس سے اُنھوں نے گفتگو کی۔ ۳ جون کو تقسیم ہند کی تفصیلات کے ساتھ قرطاس ابیض شائع ہو گیا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے بدترین اندیشے واقعہ بن گئے آزادیِ ہند کی قیمت دو حکومتوں میں ہندوستان کی تقسیم تھی۔"[3]

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴

[2] ایضاً، ص ۲۴۴

[3] ایضاً، ص ۲۴۱، ۲۴۴

مطالبۂ پاکستان جو ہندوؤں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی آخری صورت تھی، اُس کے بارے میں موصوف نے اپنی پُوری کی پُوری توجہ اور ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر یوں فیصلہ صادر فرمایا تھا:

"ہر ممکن نقطۂ نظر سے میں نے مسلم لیگ کی تجویز پاکستان پر غور کیا۔ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ صرف مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بھی مضر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تجویز سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ بہت سے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔"[1]

اس سلسلے میں موصوف نے ذرا صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے پاکستان کے متعلق ارشاد فرمایا تھا:

"میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری طبیعت قبول نہیں کرتی۔"[2]

گویا مسلمانانِ ہند کے مفادات سے جتنے ابوالکلام آزاد ٹکرائے وہ کسی بڑے سے بڑے ہندو لیڈر سے بھی نہ بن سکا۔ تقسیم ملک کے بعد موصوف کو تعلیمات کا محکمہ دیا گیا کیونکہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو اردو زبان اور عثمانیہ یونیورسٹی سے محروم کرنے نیز نئی نسل کے ذہنوں کو نئے انداز میں ڈھالنے کے لیے ابوالکلام آزاد سے موزوں شخصیت اور کون تھی؟ کوئی ہندو یہ کام کرتا تو ہنگامے ہوتے، شور مچتا، مسلمانوں کا بدخواہ ٹھہرایا جاتا لیکن اس طرح سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی محفوظ رہی۔ یہ کام نہ ابوالکلام وزیر اعظم ہو کر انجام دے سکتے تھے اور نہ بھارت کے صدر ہو کر۔ اسی لیے ہندو لیڈروں نے اُنھیں صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کے ہر موقع پر نظر انداز کیا۔ مثلاً جعفری صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیِ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۲

[2] ایضاً، ص ۱۶۳

"اگر کانگریس صحیح معنی میں قومی تنظیم تھی، تو مولانا نے بتایا ہوتا کہ جس عالی ظرفی کا مظاہرہ مسلم لیگ کی ضد میں، لارڈ ویول کو اپنے نمائندوں کی فہرست پیش کرتے وقت کانگریس نے کیا، آزاد ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کیا؟ لارڈ ویول کو جو فہرست پیش کی گئی اُس میں پہلا نام مولانا آزاد کا تھا لیکن جب

(الف) ہندوستانی کابینہ میں نائب وزیر اعظم کا عہدہ پیش کیا گیا تو پہلا نام سردار پٹیل کا تھا حالانکہ مستحق مولانا آزاد تھے۔

(ب) پٹیل کے انتقال کے بعد بھی مولانا آزاد "سینئر موسٹ" ممبر تھے۔ لیکن یہ عہدہ ختم کر دیا گیا مگر مولانا کو مستحق نہ سمجھا گیا، حالانکہ ان کا جرم سوا اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے۔

(ج) ماؤنٹ بیٹن کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ اب کوئی ہندوستانی گورنر جنرل بنایا جائے تو پہلا نام راج گوپال اچاری کا پیش ہوا اور منظور ہوا، حالانکہ خدمات کے لحاظ سے سزاوار مولانا تھے۔

(د) پھر جب صدر جمہوریہ ہند کا منصب تخلیق ہوا تو بھی مولانا نظر انداز کر دیئے گئے اور راجندر بابو کا پہلا اور آخری نام منظور کر دیا گیا، حالانکہ خدمات کے لحاظ سے پٹیل، راجہ جی، راجن بابو سب مولانا کے سامنے طفلِ مکتب تھے۔"[1]

گاندھوی مدینہ

بجنور سے نکلنے والا اخبار "مدینہ" کانگریس اور متحدہ قومیت کا حامی تھا۔ اُس کا حال ملاحظہ ہو:

"انہیں جرائد میں بجنور کا اخبار "مدینہ" بھی ہے جو کبھی اسم با مسمیٰ تھا لیکن آجکل برعکس نہند نام زنگی کا فور اچھا خاصا سومنات بنا ہوا ہے۔ کانگریس اور گاندھی جی کو خوش کرنے کی دھن میں اس اخبار نے اپنی تمام گزشتہ روایات کو

---

[1] رئیس احمد جعفری، آزادیٔ ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۲، ۱۲۳

طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلام کے سوادِ اعظم کو انگریزوں کا ٹوڈی کہنا، اُن آزاد خیال مسلمانوں کو جن کا جرم صرف اِس قدر ہے کہ وہ کانگرس میں جذب ہونا پسند نہیں کرتے بلکہ ایک برابر کی جوڑ کی حیثیت سے اُس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر آمادہ ہیں، پالی پی کر کوسنا، ہندوؤں سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کے لیے مسلمان اکابر پر جھوٹے الزام لگانا "مدینہ" کا محبوب ترین شغل ہے۔" [1]

گاندھی کی پیشوائی کے بارے میں بھی ظفر علی خاں یوں "مدینہ" کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"جہاں تک کانگرس کے اصولوں کا تعلق ہے ہمیں ان کے ساتھ اتفاق ہے، مگر ہم اپنی داڑھی گاندھی جی کے ہاتھ میں دینا پسند نہیں کرتے۔ پرتاپ یا ملاپ ہو کر "مدینہ" اگر ان باتوں پر بگڑتا ہے تو بگڑا کرے، مسلمانوں کو اس کی کوئی پروا نہیں وہ شوق سے اپنی داڑھی گاندھی جی کے ہاتھ میں تھما دے بخش کر جہاں پاک"۔ [2]

موصوف نے "مدینہ" بجنور کی گاندھویت پر اُس کی خدمت میں ایک سوغات پیش کی تھی، وہ بھی ملاحظہ ہو:

"مدینہ اب وہ مدینہ نہ رہا۔ آجکل وہ سومنات ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اسی مناسبت سے ایک نئی سوغات اُس کی خدمت میں پیش کی جائے۔ سُنیے:

جب مدینے کے قلمکار یہودی ہو جائیں
کیوں نہ پھر اُس کو بھی تابوتِ سکینہ کہیے
کالی ماتا کی اسے کہیے چہیتی بیٹی
یا مہادیو کی اولادِ نرینہ کہیے
کانگرس جس سے مسلمان کو لیتی ہے خرید
اپنے سینہ کو اسی زر کا خزینہ کہیے

---

[1] ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۹۰

[2] ایضاً، ص ۷۷

اڑ رہا ہے پہ نہرو کا ہو ترنگا جھنڈا
اپنے اخبار کو اسی بام کا زینہ کیجیے

وہ دعا آپ کو دے، آپ اُسے گالی دیں
آپ میں پایا ہے "زمیندار" کینہ کیجیے[1]

جب اسلامی عقائد و معمولات کو غیر اسلامی اور غیر اسلامی باتوں کو اسلامی کہا جانے لگے تو ایسے نامساعد حالات اور فتنہ پرور دور میں اللہ تعالیٰ کا جو مقبول بندہ تائید ایزدی سے دلائل و براہین کے ذریعے فتنہ پردازوں کو ساکت و مبہوت کر کے حق و باطل کو واضح کر دکھائے، دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کر دے، اصطلاحِ شرع میں اُسے مجدِّد کہا جاتا ہے۔ آج تک کوئی مجدِّد ایسا نہیں ہوا، نہ ہو سکتا ہے کہ وہ دیوبندیوں کے مولوی اشرف علی تھانوی کی طرح نصاریٰ کے ہاتھوں چھ سو روپیہ ماہوار پر بک کر خود تو ساری عمر کفر کے سمندر میں پڑا غوطے لگاتا رہے لیکن دوسروں کو سمجھانا بجھانا بھی ضروری سمجھے۔ چنانچہ موصوف نے بھی اپنی گاندھوی برادری کو یوں سمجھایا تھا:

"مسلمانوں میں افسوس تو یہ ہے کہ دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن مصائب کا شکار بنے رہتے ہیں۔ خصوص اُن پر زیادہ افسوس ہے کہ جو مسلمانوں کے رہبر اور مقتدا کہلاتے اور جن کے ہاتھ میں اُن کی نکیل ہے۔ جو اُن کی کشتی کے ناخدا بنے ہوئے ہیں۔ جو اُن کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں وہ اُن کے لیڈر ہیں۔ لیکن ایسے لوگ کیا خاک رہبری کریں گے جو خود گم کردہ راہ ہیں تو دوسروں کو کیا راہ بتائیں گے؟"

انھوں نے کافروں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر مسلمانوں کو پسوا دیا اور مسلمانوں ہی کو کیا، خود بھی اُن چیزوں کا ارتکاب کیا جو ایمان اور دین کو خراب اور برباد کرنے والی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتے، پیشانیوں پر قشقے لگائے، ہندوؤں کی ارتھیوں کو کندھا دیا، رام لیلا وغیرہ کا انتظام مسلمان والنٹیروں نے

---

[1] ظفر علی خان، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۷۰

کیا، بیہودہ اور کفریہ کلمات بکے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو فلاں ہندو نبی ہوتا، کیا خرافات واہیات ہے۔

میں نے اُس ہی شباب تحریک کے زمانہ میں کہا تھا کہ جو شخص توحید اور رسالت کا منکر ہو اور وہ اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہو، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر اُس وقت پڑھی ہوئی تھی، کون سنتا تھا۔ اب دیکھ لی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اُس کی خیر خواہی اور ہمدردی۔ اِدھر تو حکومت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو آگے کر دیا۔ اُدھر بعض بدفہم اور بے سمجھ مسلمانوں کے جو راہبر تھے اُن کو بہلا پھسلا کر ہجرت کا سبق پڑھایا۔ اِدھر شدھی کا مسئلہ جاری کرا دیا۔ غرضیکہ ہر طرح پر مسلمانوں کے جان، ایمان، جائیداد، مال، زر، زمین، گھر، سب کا مالک اپنی قوم کو بنانا چاہتا تھا۔ یہ تھی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اُس کی خیر خواہی اور ہمدردی۔

لیکن یہ لیڈر نہ تھے اور نہ اُن کے ہم خیال مولوی۔ ہندوؤں کو تو قوت ہوئی مسلمانوں کی شرکت سے اور مسلمانوں کی شرکت ہوئی مولویوں کی شرکت سے ورنہ لیڈران قوم تو قریب قریب ڈیڑھ سال سے چیخ رہے تھے، عوام مسلمانوں نے شرکت نہ کی تھی۔ جس وقت مولویوں نے شرکت کی تب بیچارے عوام مسلمان بھی پھنس گئے۔ اگر وہ ہندو (گاندھی) ایسا ہی تھا جیسا کہ بعض بداندیش سمجھے ہوئے تھے یا اب تک بعض سمجھے ہوئے ہیں، تو محمد علی تو پاس رہتے ہیں، اُن کا فیصلہ دیکھ لو کر کس طرح الگ ہونے تھے۔“[1]

احرار پارٹی

پنجاب میں کانگریس کے مفادات کا تحفظ ”احرار پارٹی“ کر رہی تھی۔ احرار پارٹی کی حقیقت

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی۔ الافاضات الیومیہ۔ جلد پنجم، ص ۹۰،۸۹۔

میں جمعیۃ العلماء ہند کی ذیلی شاخ تھی جس طرح خود جمعیۃ العلماء ہند ہی کانگرس کی شاخ ہے۔ احراری حضرات پھر گاندھی پرستی اور زنار دوستی میں کسی دوسرے گاندھوی سے پیچھے کس طرح رہ سکتے تھے؟ کانگرس بھی ان کی دل وجان سے سرپرستی کا فریضہ ادا کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات نے مسلمانوں کا سرتاج بننے کے بجائے گاندھی، نہرو اور پٹیل کا نعلین بردار بننا برضا و رغبت قبول کیا ہوا تھا۔ ظفر علی خاں لکھتے ہیں:

میں نے کل پوچھا یہ صدرِ مجلسِ احرار سے
بندہ پرور آپ کیوں ہیں خاکساروں کے خلاف
گر عقائد کی بنا پر آپ کی ہے اُن سے جنگ
کیوں نہیں ہیں آپ پھر زنار داروں کے خلاف
چار شرک ہیں پٹیل و گاندھی و نہرو و بوس
کاش ہوتی آپ کی یلغار ان چاروں کے خلاف
ہنس کے فرمانے لگے ارشاد عالی ہے عجب
ہو تو جائیں ہم بھی ان مردارخواروں کے خلاف
پل رہے ہیں اُن کے چندوں پر اگر احرار ہند
پھر ہوں کیوں وہ اپنے اُن پروردگاروں کے خلاف
کانگرس نے پال رکھے ہیں مدینہ کے کچھ اونٹ
عالم اسلام ہے اُن بے مہاروں کے خلاف[1]

احرار پارٹی کے کارنامے گناتے ہوئے مزید اُس کا تعارف کرانے کی یوں کوشش کی گئی ہے:

باوا تھے مسلمان تو بیٹے تھے مجوسی
پوتے جو ہیں "احرار" وہ کہلائے فلوسی
مل جائے جہاں چندہ، وہی ہے وطن ان کا
ہندی ہیں نہ مصری ہیں نہ چینی ہیں نہ روسی

---

[1] ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۲

جو بوندر سے مجوں کی مہاجن سے بچی تھی
پنجاب کے احرار ستم پیشہ نے چوسی

نہرو جو ہے دولہا تو دلھن مجلسِ احرار
ہو پیر بخاری کو مبارک یہ عروسی[1]

مجلسِ احرار کے صدر مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ موصوف ایک شعلہ بیان مقرر اور دیوبندی مکتبِ فکر سے متعلق تھے۔ مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کرنے والی واحد جماعت مسلم لیگ سے ان حضرات کو اتنا ہی بخار تھا جتنا مشرکینِ ہند کو اور شاید کانگرس کے کسی بڑے سے بڑے لیڈر نے بھی مسلم لیگ اور اُس کی ہمنوائی کرنے والوں کے حق میں اتنے گندے الفاظ استعمال نہ کیے ہوں گے جیسے گاندھوی علماء نے استعمال کیے تھے۔ مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری[2] اور مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی کے بارے میں یُوں مرقوم ہے :

"ایک دُوسرے صاحب نے فرمایا کہ احرار کے متعلق ایک شعر ضرور ہونا چاہیئے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ احرار کی شریعت کے امیر، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے امروہہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو مسلم لیگ کو ووٹ دیں گے وہ سؤر ہیں اور سؤر کھانے والے۔ اوکما قال۔
پھر میرٹھ میں مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی صدر مجلسِ احرار اس قدر جوش میں آئے کہ دانت پیستے جاتے تھے، غصہ میں آ کر ہونٹ چباتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ دس ہزار جینا اور شوکت اور ظفر[3]، جواہر لال نہرو کی جوتی کی نوک پر قربان کیے جا سکتے ہیں۔"[4]

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۹۶
[2] مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔
[3] مراد مسٹر محمد علی جناح، مولانا شوکت علی اور ظفر علی خاں ایڈیٹر 'زمیندار' اخبار ہیں۔
[4] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۳

وری عطاء اللہ شاہ بخاری اور دیگر اراکینِ مجلسِ احرار امتیازی خوبیوں کے مالک تھے۔ دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مولوی ظفر علی خاں نے ان حضرات کا تعارف یوں کرایا ہے:

گالیاں دے، جھوٹ بول، احرار کی ٹولی میں رل
نکتہ یوں ہی ہو سکے گا حل سیاسیات کا
پہلے ہی دن سے ہیں جب دیدے بخاری کے پٹم
مانگتے پھرتے ہیں کیوں کاجل سیاسیات کا
خالصہ کا ساتھ دے جب یہ شریعت کا امیر
کیوں نہ کہیے اس کو "باباٹل" سیاسیات کا
کیا تماشا ہے کہ زلفِ شرع کی مشاطگی
کر رہا ہے آج دستِ شل سیاسیات کا
دیکھ لے مظہر علی اظہر کو افضل حق کے ساتھ
ایک پیڑی دوسرا چاپل سیاسیات کا
مجلسِ احرار کے نیفے کی رونق بن گیا
ایک لیٹو دوسرا کھٹمل سیاسیات کا
دخل معقولات میں دیتا ہے کیوں "بُدمولوی"
عقدہ کیا کھولے گا یہ ڈھیل سیاسیات کا
ڈاکٹر کچلو زبر ہیں اور حسام الدین ہیں زیر
یہ دمن اس عہد کی وہ نل سیاسیات کا
جل گئے منہ میں بھٹے مولوی داؤد کے
حد سے بڑھ کر گرم تھا جو بل سیاسیات کا[1]

سنا ہے کہ مجلسِ احرار نے شہید گنج مسجد کے بارے میں سودا بازی کی تھی۔ اندرونِ حشامہ

---

[1] ظفر علی خاں: چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵، ۵۶

سکھوں سے ساز باز تھی اور زبانی ہمدردی مسلمانوں کے ساتھ۔ واللہ اعلم کہ اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ بہرحال اخبار "زمیندار" کے ایڈیٹر کی رائے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے:

نرالی وضع کا مومن ہے طبقۂ احرار

کہ سر جھکا ہوا مشرک کے آستاں پر ہے

اس آرزو میں کہ نہرو کسی طرح خوش ہو

نگاہِ خشم سکندر حیات خاں پر ہے

خدا کے گھر کی تباہی میں حصہ دار ہوئے

یہ ظلم انھوں نے کیا آپ اپنی جاں پر ہے

اشارہ پا کے اُدھر سے شہید گنج کا شور

کئی دنوں سے اُن اشرار کی زباں پر ہے

سنا گیا جو کئی سال دیر کا ناقوس

لگا ہوا وہی کان آجکل اذاں پر ہے[1]

مولوی مظہر علی اظہر احراری نے کامریڈ محمد حسین مینن سار کو مخاطب کر کے یوں دھمکی دی تھی:

ہم ہیں احرار نہیں ہم سے اُلجھنا اچھا

تیری اوقات ہی کیا ہے ارے او دین فروش

کامریڈ محمد حسین نے مولوی مظہر علی اظہر احراری کی اس دھمکی کا جواب یوں دیا تھا:

میں نے مسجد نہیں بیچی کبھی تیری مانند

ابے او چندے کے بھوکے ابے او دین فروش[2]

مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری کے سکھوں سے بھی اُسی طرح کے نیازمندانہ تعلقات تھے

---

[1] ظفر علی خاں۔ چمنستان مطبوعہ لاہور۔ ص ۱۰۴

[2] ایضاً۔ ص ۶۲

جس طرح سے مشرکینِ ہند اور خصوصاً گاندھی و نہرو دست تھے سکھوں کی طرف سے بھی موصوف پر نوازشات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

احرار کے بت خانہ سے مظہر کو بُلا لا

منظور بنانا ہو جو مسجد کو شوالا

سرکارِ مدینہ سے ملا مجھ کو بھی کمبل

سکھوں نے بخاری کو جو بخشا ہے دوشالا[1]

اراکینِ مجلسِ احرار کی صفت و ثنا میں اسی سلسلے کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ کی ہر پانہ سے آئی صدا

رنگ افضل حق کا سنتے ہی جسے فق ہو گیا

گر پڑے غش کھا کے مولانا عطاء اللہ شاہ

اور کلیجہ مولوی داؤد کا شق ہو گیا

مولوی مظہر علی اظہر کی رُسوائی کا داغ

اُن کی مجلس کے سیہ خانے کی رونق ہو گیا

اُس طرف مندر کا شور اور اس طرف مسجد کا زور

بیچ میں مظہر علی اظہر معلق ہو گیا

جاٹ گیا سوچ کر احرار سے ملاّئے غوث[2]

سارسوں میں کس لیے شامل یہ لقلق ہو گیا

صدرِ احرار آ گئے لے کر لفنگوں کے پرے

لشکرِ اشرار سے جنگ آزما حق ہو گیا[3]

---

[1] ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۶

[2] مراد، مولوی غلام غوث ہزاروی جو آجکل پاکستان اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔

[3] ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵، ۵۶

حلقہ بجنور سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر عبدالسمیع کھڑے ہوئے تھے اور ان کے مقابلے پر کانگرس نے حافظ ابراہیم کو کھڑا کیا تھا۔ نام نہاد ابراہیم صاحب کی زنار دوستی پر دو شعر مزید ملاحظہ ہوں:

کیا قیامت ہے کہ جس کا نام ہی تھا بت شکن
بت کے آگے سر اسی ملت کا جھک جانے لگے
نعرۂ توحید اب کس کی زباں پر آئے گا
جب خود ابراہیم بندے ماترم گانے لگے [1]

ہزارہ میں جب مسلم لیگ نے نمایاں کامیابی حاصل کی تو گاندھویوں میں یوں صف ماتم بچھ گئی:

جب جیت لیگ کی ہوئی اور کانگرس کی ہار
روتی تھی سر پکڑ کے گورنمنٹ "خان" کی
گاندھی بھی رو رہے تھے یہ کہہ کر کہ ہائے ہائے
سرحد میں ناک کٹ گئی ہندوستان کی
میدان میں جم سکا نہ قدم سرخ پوش کا
جس وقت سر پہ آئی گھڑی امتحان کی [2]

علمائے حقانی اور دینِ متین کی مخالفت میں پوری جولانی دکھانے والے اور ابوالکلام آزاد و جمعیۃ العلماء ہند سے احرار پارٹی اور ان کے جملہ گاندھوی افراد سے عقیدت رکھنے والے جناب شورش کاشمیری نے احرار پارٹی کی دیانت داری کے بارے میں ایک انکشاف شایع کیا تھا، وہ موصوف ہی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"جب مولانا دستکار کرجانے لگے تو شاہ جی نے روک لیا۔ مولوی صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ تشریف رکھیں، آپ کے خلاف یا جماعت (مجلس احرار) کے خلاف شورش کچھ چارج لگا رہا ہے۔ مولوی صاحب رک گئے۔ میں

---

[1] ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵
[2] ایضاً، ص ۱۲۱

نے ترتیب وار چارج لگانے شروع کیے۔ کانگرس کا روپیہ ساٹھ ہزار، دس ہزار کی ایک قسط اور پچاس ہزار کی دُوسری قسط اور یونینسٹ پارٹی ...... ابھی فقرہ پُورا بھی نہ ہُوا تھا کہ مولانا غلام غوث نے ایک ایک شق پر زور دیا۔ کچھ دیر تو سناٹا چھایا رہا پھر سکوت ٹوٹا۔ مولانا نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے لیکن اس وقت اُن کے ذہن میں صحیح یاد نہیں کہ یہ رقم کتنی ہے۔ بات صبح پر ملتوی ہو گئی۔

مجھے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ، مولانا مظہر علی اظہر کے مکان پر لے گئے رات وہیں کاٹی۔ مولانا اس افشاء کو بُرا جانتے تھے اور مضطرب بھی تھے۔ لیکن وہ انخفا کے حق میں تھے میں نے عرض کیا جب تمام لوگ آپ سے روپیہ لے چکے ہیں تو پھر وہ معصوم عن الخطا کیوں بنتے ہیں؟ رات جو گزری سو گزری، صبح وہی حیثیت بحث۔ صاحبزادہ صاحب نے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں کہیں یہ کہہ دیا کہ شورش اپنے الزام واپس لیتا ہے۔ میں موجود نہ تھا، جب پہنچا تو مجھے حیرت ہُوئی۔ خیر دوبارہ وہی قصہ چھڑ گیا۔

مولانا مظہر علی نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے۔ لیکن اُس کے سزاوار وہ تنہا نہیں بلکہ باقاعدہ مشورے سے رقم لی گئی ہے۔ پہلا دس ہزار روپیہ مولانا داؤد غزنوی نے دیا تھا اور شیخ حسام الدین اُس وقت موجود تھے۔ دوسری قسط بھی انہی حضرات کے مشورے سے حاصل کی گئی۔ یعنی یہ کہ شیخ حسام الدین نے مولانا حبیب الرحمٰن کو لدھیانہ خط لکھا کہ وہ کلکتہ میں کانگرس ہائی کمانڈ تک پہنچیں۔ یہ خط لے کر فاقان بابر مولانا مظہر علی کے صاحبزادے لدھیانہ پہنچے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کلکتہ گئے، مولانا ابوالکلام ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ رقم دینے کو تیار ہو گئے مگر سردار پٹیل جو کانگرس کے خازن تھے، اس سے اختلاف کیا اور پچاس ہزار روپے کی رقم کا چیک لالہ بھیم سین سچر کی تحویل میں دیا گیا، جو اُن کی معرفت دفتر احرار میں پہنچا، پھر اس رقم کی بندر بانٹ کی گئی۔

وہ رقم جو یونینسٹ پارٹی سے وصول کی گئی اور جس کو بہ اختلاف مولانا نے تسلیم کیا کہ وہ رقم جو دو چار ہزار بطور چندہ فراہم کی گئی یہ تمام مل ملا کر پچانوے یا پچاسی ہزار بنتے تھے۔ جب مولانا مظہر علی نے بتایا کہ نواب زادہ نصر اللہ کے سوا ورکنگ کمیٹی کے ہر امیدوار نے اُن سے روپیہ لیا ہے، تو سب نے تسلیم کیا۔ شیخ حسام الدین بھی مان گئے، ماسٹر تاج الدین نے بھی سر ہلا دیا، مولانا حبیب الرحمٰن نے بھی صاد کیا۔ اس مجموعی رقم میں سے لے دے کر صرف بیس ہزار بچتے تھے۔ مولانا مظہر علی نے دس ہزار اپنے الیکشن کا صرفہ بتایا اور دس ہزار روپے کے متعلق کہا کہ وہ روزنامہ آزاد نکالنے کے لیے جمع رکھا گیا ہے۔" [1]

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زُہد کی
میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

تھانوی صاحب کے خلیفہ عبدالماجد دریابادی نے مدرسہ دیو بند سے گاندھوی فیض حاصل کرنے والے طلبہ اور متعلقین کی تبلیغی مساعی کے ساتھ اُن کی موحدانہ شان کا ایک المناک طریقوں پیش کیا ہے:

"آج چار دن سے اس قصبہ (دریاباد) پر کانگرسی خیال کے مسلمانوں کا وعدہ ہے دیو بند کے طلباء کا ایک وفد آیا ہوا ہے اور اپنے مسلک کی تبلیغ یا کوشش تبلیغ میں مصروف ہے۔ اس میں مضائقہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر فریق یہی کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے لیکن ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ کام مسلمانوں کے اندر کرتا ہے لیکن تعلقات یہ تمام مسلمانوں سے توڑے ہوئے ہے اور قصبہ کی غیر مسلم آبادی سے جوڑے ہوئے ہیں۔ قیام اُن کا دھرم سالہ میں ہے، حالانکہ قصبہ میں ایک نہیں دو سرائیں مسلمانوں کی موجود ہیں۔ ان کا رہنا سہنا چلنا پھرنا، کھانا پینا تمام تر ہندوؤں کے ساتھ۔ انھیں کے درمیان اور

---

[1] شورش کاشمیری، ہفت روزہ چٹان، بابت ۱۷ اپریل ۱۹۵۰ء

اُنھیں کا سا ہے، صدمہ یہ ہے کہ ان سطور کے راقم کو جب بھی اُنھوں نے سرفراز کیا تو ہمیشہ ہندوؤں ہی کے حلقہ میں۔ یہاں تک کہ ایک دن مسلمان صاحب تو ایک تھے اور اُن کے ہندو رفقا تین کی تعداد میں، گویا توحید تثلیث کے نرغہ میں، اس سے قبل سنٹرل اسمبلی کے الیکشن کے وقت تو یہ منظر دیکھنے میں آیا تھا کہ شکست مسلمان امیدوار کے کارکن اور باقاعدہ پولنگ ایجنٹ تک ہندو ہسلک یا سیاسی نظریہ کے غلط یا صحیح ہونے کا یہاں ذکر نہیں، ذکر یہاں صرف اس ناقابلِ حل معمہ کا ہے، اچھوت بنائے جاتے ہوئے سنا تھا، پڑھا تھا، اچھوت بنتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔" [۱]

یہ حضرات اچھوت کیوں نہ بنتے؟ جنھوں نے اپنے قلوب سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت نکال ڈالی تھی اور اُن کی شان میں نازیبا الفاظ جاری کرتے اور گستاخانہ نظریات کی نشر و اشاعت کرنا اپنا محبوب مشغلہ بنا لیا تھا، اُن کے دلوں میں گاندھی جیسے دشمنِ اسلام و مسلمین اور ہیٹ بت پرست کی الفت اس طرح جاگزیں ہوئی کہ گوسالہ سامری کی طرح اُس کی پرستش ہونے لگی اور شب و روز اُس کی بارگاہ میں بڑے بڑے صاحبانِ جبّہ و دستار اور امام الہند و شیخ الاسلام بھی ہدیۂ عقیدت کے نذرانے پیش کرنے لگے۔ مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی ٹھہرانے والے اگر ہنود کے برادرانِ دینی ملیچھ نہ بنتے تو اور کس کے بنتے؟ ملتِ اسلامیہ سے کٹ جانے والے اگر دشمنانِ اسلام کے غلام نہ بنیں تو اور کس کے بنیں؟ یہ اُن حضرات کا اپنا ہی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کا بھائی بننا ناپسند کیا اور بت پرستوں کا غلام بننا دل و جان سے پسند کیا۔ بزرگوں سے تعلق رکھنے کے منکر اور اُن کی فاتحہ کو بدعت و حرام ٹھہرانے والے اپنے باپو شہید کی پوجا پاٹ اُس کی موت کے بعد بھی یُوں کرتے رہے،

"حافظ حفیظ الرحمٰن جمعیۃ العلماء ہند اور حضرت بابا خضر محمد سابق سرپرست جمعیۃ العلماء ہند کانپور نے مہاتما گاندھی کی رُوح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے

---

[۱] اخبار صدق لکھنؤ، بابت ۱۰ فروری ۱۹۴۶ء

سے لیے قرآن کریم کی آیتیں ان (گاندھی) کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر
پڑھیں اور اُن کی روح کو بخش دیں۔" الخ [1]

؎ صورت تو مومنانہ ہے بے شک حضور کی
سیرت کا گوشہ گوشہ مگر ہندوانہ ہے

یہاں ایک تلخ حقیقت کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چودھری حبیب احمد صاحب نے ایک ضخیم کتاب تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء کے نام سے لکھی۔ اس میں گاندھوی علماء کی غیر اسلامی روش اور ہندو نوازی کا تذکرہ نیز تحریک پاکستان کے راستے میں اُن حضرات کی رکاوٹوں کا اخباری بیانات کی روشنی میں سیر حاصل ذکر کیا ہے لیکن مسٹر پرویز کے معتقد ہونے کے باعث نیشنلسٹ علماء کے مقابلے پر ہر جگہ مسٹر پرویز جیسے دشمن اسلام کو پیش کرتے رہے ہیں۔ موصوف کا ارشاد ہے کہ گاندھوی علماء کا جتنا مقابلہ ہمارے پرویز صاحب نے کیا اتنا کسی اور سے کب بن پڑا، ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ علمائے اہلسنت اُن کے نزدیک کسی گنتی شمار میں نہیں۔

چودھری صاحب چونکہ تاحال بقید حیات ہیں لہٰذا ہم یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے وقت ہندوستان میں مدعیانِ اسلام کی تعداد دس کروڑ تھی، جن میں سے نو کروڑ سے زاید اہلسنت وجماعت کا وُہ سوادِ اعظم تھا جسے بدمذہبین زمانہ نے بریلوی جماعت کے نام سے متعارف کیا ہے۔ باقی جملہ فرقوں کے افراد کی مجموعی تعداد ایک کروڑ سے بھی کم تھی۔ دیوبندی، اہلحدیث، جماعت اسلامی، پرویزی، گاندھوی اور مرزائی وغیرہ سارے مل کر مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کا عشرِ عشیر بھی نہ تھے۔ سُنّی کانفرنس بنارس میں پانچ ہزار علماء و مشائخ نے شمولیت کی۔ سُنّیوں کے بیس ہزار رہنما یعنی علماء و مشائخ سُنّی کانفرنس کے رکن تھے۔ گویا اتنے رہنما تھے اور اتنی قوم تھی۔ کیا چودھری صاحب ہمیں یہ بتا سکتے ہیں کہ مسٹر پرویز کی قوم کتنی تھی؟ اس قوم کے کتنے حضرات نے پاکستان کے حق میں

---

[1] اخبار سیاست کانپور، بابت یکم فروری ۱۹۴۷ء

ووٹ دیے؟ پرویزی حضرات کے ووٹوں سے آیا مسلم لیگ کا ایک بھی مرکزی یا صوبائی اسمبلی کا ممبر کامیاب ہوا؟ اگر کوئی ایک بھی ایسا ہے تو اُس کا نام بتا دیا جائے ورنہ واضح کیا جائے کہ پرویز صاحب کا قیامِ پاکستان میں حصہ ہی کیا ہے؟ اگر کوئی حصہ ہو بھی تو مسلمانوں کا ان کے بیانات سے کیا تعلق؟ اگر کوئی ہندو یا سکھ یا عیسائی بھی پاکستان کی حمایت کرتا تو کیا اتنی بات سے وہ مسلمانوں کا رہنما بن سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اِسی طرح مسٹر پرویز کے کاغذی بیانات کچھ بھی ہوں لیکن نہ مسلمان اُن کے ساتھ ہیں نہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں جب تک وہ دائرۂ اسلام میں نہیں آتے اُس وقت تک مسلمانوں اور پرویزیوں کا معاملہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ والا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چودھری صاحب اور دُوسرے پرویزی حضرات پر احقر کی یہ وضاحت گراں گزرے لیکن حقیقت کو چھپانا دین و ملت کی بدخواہی اور غداری ہے جسے یہ ناچیز ہرگز پسند نہیں کرتا۔

علمائے اہلسنت کی فہمائش

گاندھی علماء اور لیڈروں نے جب خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا ہی کو بُھلا دیا تھا، ہنود کی خوشنودی پر سب کچھ قربان کر چکے تھے تو کسی رہنما کی فہمائش پر کب کان دھرنے لگے تھے۔ بُت پرست نوازی کے منازل طے کرتے ہُوئے چودھویں صدی میں ایک پُراسرار اور نرالا جہاد بھی ایجاد فرمایا۔ بقائے خلافت اور تحفظِ مقاماتِ مقدسہ کے نام پر وہ جہاد جاری کیا کہ جب پردہ اُٹھا تو صاف نظر آ گیا کہ یہ مشرکینِ ہند کی حمایت میں سوراج کی خاطر تحریکِ ترکِ موالات یعنی نان کوآپریشن سکیم تھی۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم نے اِس کے بارے میں لکھا ہے:

> عوام سودیشی کا استعمال کریں یہ اُن کا جہاد ہے۔ اعزازی عہدے واپس کیے جائیں یہ آنریری کام کرنے والوں کا جہاد ہے۔ کونسل کی ممبری چھوڑ دینا آنریبل ہونے والوں کا جہاد ہے۔ سب سے بڑا جہاد طلبا، انگریزی خواں کے لیے ہے۔ وہ موجودہ نظامِ تعلیم کو جب تک نہ چھوڑیں گے مجاہدین میں اُن کا شمار قطعاً نہ ہوگا۔ ساری وعیدیں جو تارکینِ جہاد کے لیے ہیں ایک وعید

بھی ان میں سے باقی نہ رہے گی جو طلباء پر صادق نہ آجائے۔ موجودہ نظامِ تعلیم کے ترک میں تاخیر و تدبیر بھی گناہِ کبیرہ ہے۔ والدین و اساتذہ کے استشارہ و استرضا کی بھی حاجت و رخصت نہیں۔

وہ جہاد جسے فرضِ عین کہا گیا تھا۔ وہ جہاد جس میں اولاد کو والدین اور زوجہ کو زوج کی اجازت کی حاجت نہ تھی۔ وہ جہاد جس کے لیے نفیرِ عام ثابت کیا گیا تھا۔ وہ جہاد جس کے منعوں کا کسی وقت شمار کیا گیا تھا۔ وہ جہاد جس کی صورت خاص آج تک غیر متعین تھی۔ وہ یہی مسئلہ نان کوآپریشن ہے ...

ہاں یہ ساری فتوے نویسی اور مجالس کی گرماگرمی صرف اسی لیے تھی کہ نوجوانوں کو والدین و اساتذہ سے سرکشی و تمرد پر اچھی طرح آمادہ کر دیا جائے تاکہ ملک میں ہنگامہ آرائی کے لیے ایک کافی تعداد پڑھے لکھے ناتجربہ کاروں کی ہاتھ آجائے۔[1]

اس کے ساتھ ہی گاندھی جی کی سرکار سے ان حضرات کو ہجرت کا الہام ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہہ کر عمل پیرا ہو گئے۔ ملازمتیں اور کاروبار چھوڑ دیے۔ مسلمانوں کی جائیدادیں ہندوؤں کے ہاتھوں کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگیں۔ مسلمانوں کو برباد کرنے کی یوں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ مسلمانوں کی اس خانہ بربادی میں ہندوؤں کی خانہ آبادی تھی۔ یہ اُجڑ رہے تھے وہ بس رہے تھے۔ ہندو لیڈروں نے تو ایک تیر سے دو شکار کر لیے کہ اپنی قوم کو آباد اور مسلمانوں کو برباد کر دیا لیکن مسلمانوں کے لیڈروں کو خیر خواہِ ملت کہا جائے یا بدخواہ، رہنما کہا جائے یا غدارانِ قوم؟ جن علماء نے اس گاندھوی جہاد (نان کوآپریشن) اور ہجرت برائے افادہ ہنود کو شرعی حکم کا لباس پہنایا، اسے آیات و احادیث سے مزین کر کے خدا اور رسول کا حکم بنا کر دکھایا انھیں خدا کے بندے کہا جائے یا گاندھی کے؟ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُمتی کہلانے کے حقدار ہیں یا دشمنِ اسلام و

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۴۱

مصلحین، بُت پرست گاندھی کے ، اس صورتِ حال پر ایک خیر خواہ وقت کی نوحہ خوانی ملاحظہ ہو:

"جہاد اور ہجرت ان دونوں اہم و اعظم مسئلوں کو جس طرح اس دور کے علمائے سیاسی نے تباہ کیا ہے تاریخ اسلام اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ مسلمانانِ ہند کا جو نقصان اس مدلس وکاذب فتویٰ نویسی سے ہُوا دیکھیے اُس کی اصلاح کیونکر ہوتی ہے اور کتنا زمانہ چاہتی ہے ، علی الخصوص لفظ جہاد میں کچھ وہ برقی قوت تھی کہ اس کے سننے سے غیر مسلموں کو ٹھنڈا پسینہ آتا تھا اور مسلمانوں کے مردہ افسردہ قلوب میں حیات و تازگی۔

اس موقع سے قبل جب کبھی اور جہاں کہیں بھی یہ لفظ کہا گیا تو مثل دیگر کلمات کے اس نے اپنے تلفظ کردہ ہوائے کیف ثابت ہونے نہیں دیا جو ایک مرتبہ نکل کر ہوا کی موجوں میں گم ہو جائے اور اس کرۂ ارضی پر اُس کا نام بھی غیر قارہ اشیاء کی فہرست میں منسلک ہو جائے بلکہ جب کبھی یہ لفظ کہا گیا اور مسلمانوں کے کانوں تک پہنچایا گیا ہے تو کفر و شرک کی بنیادیں ہل گئی ہیں ، مخلوق پرستوں اور خدا کے دشمنوں میں زلزلہ پڑ گیا ہے۔ تاریخ اقوام اور جغرافیہ ملکی میں ہمیشہ ایک عظیم تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس لفظ جہاد کے کہنے اور سننے کے ایام صفحاتِ زمین پر ہمیشہ خون کی سُرخی اور نوک سنان و شمشیر سے لکھے گئے ہیں۔

لیکن آج تم نے مسلمانوں کی اس سیزدہ صد سالہ عظمت کو اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالا۔ آج تم نے سات کروڑ مسلمانوں کی دینی حمیت کو یوں ذلیل وخوار کیا۔ دیکھو غیر مسلم قومیں تم پر ہنستی ہیں۔ نہ انگریزوں میں تمہاری ہیبت رہی نہ ہندوؤں میں تمہارا خوف رہا۔

تم اور تمہارا دین ، تم اور تمہارا مذہب ، تم اور تمہاری مذہبی تعلیم ، تم اور تمہارے دینی احکام ، سب کے سب نگاہِ غیر مسلم میں ہیچ و فرومایہ ثابت ہوئے لیکن اس کی تمہیں کیا پروا ، جبکہ تقریباً ایک ملک کا خراج تمہارے گھروں میں پہنچ گیا ، جبکہ ہزاروں انسان تمہیں اپنے دوش عقیدت پر لیے لیے پھرے۔

جبکہ ہر روز شاہد و دسترخوان سے کام و زبان نئی نئی لذتیں لے رہی ہیں ، تو پھر
ان نعمائے خلد بریں کے مقابلہ میں اسلام کیا ہے اور ایمان کیا !

اے سرمستانِ بادۂ لیڈری ذرا ہوش میں آکر ہمیں بتاؤ کہ تم سوراج
کے لیے اٹھائے گئے تھے یا خلافت کے لیے تم نے ہندوؤں کو آمادہ کیا تھا؟ تم
اسلام کی نشر و تبلیغ کا علم لے کر بڑھے تھے یا کفر و شرک کی حکومت قایم کرنے کی
غرض سے یہ لشکر آرائی کی گئی تھی؟ اسلام کی حقانیت اور ارکانِ اسلام کا غیر مسلم کو
گرویدہ بنانا تمھارا نصب العین تھا یا خود کفر و شرک کے جال میں پھنس کر آزادیِ
ہند کا ترانہ سنانا مقصود و مطلوب تھا؟ [1]

موصوف نے اس موقع پر اُس ہندو نواز اور زنّار دوست ٹولے سے ایک سوال کیا جو ہر مسلمان
کے دل کی آواز ہے اور ان کی روش کے پیش نظر ہر خیر خواہِ دین و ملت کے دل و دماغ کی گہرائیوں
سے اُٹھتا اور اُسے مضطرب کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ سوال حضرت علامہ ہی کے لفظوں میں ملاحظہ
فرمائیے:

"یہ سارے اعمال جو وقوع پذیر ہوئے اور ہو رہے ہیں، ان سے ہندوؤں کے
مطالب و مقاصدِ مذہبی و ملکی کا تحفظ ہو رہا ہے یا اسلام اور اسلامی خلافت کی
خدمت انجام پا رہی ہے؟ چوبیس کروڑ ہندوؤں کا قدم خلافتِ اسلامی کی طرف
بڑھا یا سات کروڑ مسلمانوں نے بڑھ کر سوراج اور مراسمِ کفر و شرک کو لبیک کہا؟
مسلمان ہندوؤں کے ہو گئے یا ہندو مسلمانوں کے ہو رہے؟ مسلمانوں کے
قلوب آہنی تھے یا مقناطیسی؟ مسلمانوں نے مقناطیس بن کر ہندوؤں کو اپنی
طرف کھینچا یا ہندوؤں نے اپنی مقناطیسی سے انھیں اپنے میں جذب کر لیا؟
اس کا جواب واقعات سے ہونا چاہیے نہ خطیبانہ عبارت آرائی سے۔" [2]

موصوف نے ان حضرات کو کلمہ گوئی کا پاس لحاظ کرتے ہوئے، اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا

---

[1] سلیمان اشرف ، مولانا ، النور ، ص ۵۹ ، ۶۰

[2] ایضاً ، ص ۴۸

عبرت دیتے ہوئے بڑے درد بھرے انداز میں بالغ نظری سے اُن کی کرتوت کا مآل سمجھایا اور یُوں فہمایش کی ہے:

"علم برداران تاج پوشی و سوراج! قیامت ایک دن ضرور قایم ہو گی، جہاں اوّلین و آخرین کا مجمع ہو گا اور پھر لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ - لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ کی دل کپکپا دینے والی آواز کے ساتھ تختِ ربّ العالمین سامنے ہو گا ۔ ۔ ۔ ۔ اُس دن تمہارے سرائر و مخفیات کُھل جائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ اُس دن تمھیں اُس جلیل و جبار، قادر و قہار کے سامنے جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری کیا حالت ہو گی اور تمہارے اِن اعمال کا ترازوئے عمل پر کیا وزن ہو گا؟ خلافت اور دین کا نام لے کر سوراج اور تلقینات گاندھی میں فنا ہو جانا کیا نتیجہ لائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یقین کر لو کہ اس روز تمہاری تلبیس کی چادر پارہ پارہ ہو گی اور تدلیس کا جال ریزہ ریزہ۔ یہی لیڈری اُس دن تمھیں وبال ہو گی اور یہ ہر دلعزیزی تمھیں رُسوا و خوار بنائے گی۔ آج وہ جمگھٹا و انبوہ جس پر تمھیں ناز و تفخر ہے آج وہ ہنگامہ و ہجوم جس پہ تمھیں اعتماد و سہارا ہے، کل بروزِ قیامت تم سے بیزاری کا اظہار کرتا ہو گا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ گروہِ معتقدین، یہ مجمعِ ارادت مندان جو آج تمھیں اِس درجہ محبوب ہے کل بروزِ حشر تم اِس سے خفا ہو گے اور دست بردار۔ شامتِ اعمال کا وبال سامنے ہو گا اور یہ جیکڑی خاک سیاہ۔"[۱]

اِس گاندھی گردی کے دور میں مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں اور گاندھوی علماء سے کیسے کیسے افعال و اقوال شنیعہ و قبیحہ سرزد ہوئے اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف یُوں رقمطراز ہیں:

"لا الٰہ الّا اللہ۔ گاندھی نے کس حُسنِ تدبیر سے مسلمانوں کو اپنا اور اپنے مذہب کا غلام بنا لیا۔ ایک برس بھی گزرنے نہ پایا جو حمایتِ خلافت سے نہ صرف ہندو دست کش ہو گئے بلکہ اس عیارانہ چال سے خود مسلمانوں ہی کے

---

[۱] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۴۹ ۔ ۵۰

ہاتھوں نے مسئلہ خلافت کو دھکے دے کر پس پشت ڈال دیا۔ خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کی جگہ گاندھی کو دی گئی۔ اب یہ مدعیانِ اسلام اسی کی کوشش کر رہے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے گاندھی کی محبت و عظمت سے کوئی قلبِ مومن خالی نہ رہنے پائے۔

کوئی امام مہدی علیہ السلام کا مثیل کہتا ہے۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو گاندھی نبی ہوتا، یعنی نبوت کے ماتحت جو سب سے بڑا رتبہ و منصب ہو سکتا ہے وہ گاندھی کا ہے۔ کوئی اپنے کو پس رو گاندھی کا کہتا ہے اور اسلام کی نجات کا اُسی کے ہاتھوں سے یقین رکھتا ہے۔ مسلمان اپنے کانوں سے سنتے ہیں، آنکھوں سے اخبارات میں یہ مضامین دیکھتے ہیں، پڑھتے ہیں، پھر بھی عالم وجد و تواجد میں آکر واہ ہمارے لیڈرو! شاباش ہمارے لیڈرو! کی رٹ لگائے جاتے ہیں۔"[1]

فخرِ اہلسنت، خیر خواہِ دین و ملت، علامہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے ان حضرات کی گمراہ کن اور اقوالِ شنیعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بارگاہِ مجیب الدعوات میں یوں دستِ دعا دراز کیے تھے،

"انتہائی بدنصیبی یہ ہے کہ آج اس دینِ حنیف اور ملتِ بیضا کے نہ صرف پیرو بلکہ اس مذہب کے عالم و علامہ ہونے کے مدعی اور علم کے ساتھ کسی سلسلۂ طریقت کے شیخ ہونے کا جواز عار رکھتے ہیں، جن کے ہاتھوں پر سیکڑوں مسلمان بیعتِ طریقت کر کے وصول الی اللہ کی راہ پانا چاہتے ہیں، آج وہ ہیں کہ صاف لفظوں میں یہ کہہ رہے ہیں کہ ۔۔۔ گاندھی مذکر ہے ۔۔۔ پس رو گاندھی کا ہوں ۔۔۔ گاندھی کو اپنا رہنما بنا لیا ہے ۔۔۔ اسلام کی نجات گاندھی کے ہاتھوں سے ہوگی ۔۔۔ والہ لا الہ الا اللہ۔ ان مدعیانِ علم نے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کی جو تفسیر کر اس وقت اپنے اقوال و افعال سے

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۴۶، ۴۷

کی ہے، اس سے اسلام اور اسلام کی تعلیم بیزار ہے۔ حق سبحانہٗ انھیں ہدایت فرمائے اور ان کا کھویا ہوا ایمان پھر انھیں مرحمت فرمائے بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد۔[1]

حضرت علامہ مولانا سلیمان اشرف بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دیدہ ور کی طرح ان حضرات کی حرکات اور اقوالِ شنیعہ کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے مزید فہمائش کی اور خیر خواہی کا حق ادا کرتے ہوئے مآل سمجھایا ہے۔ آپ کے یہ ایمان افروز الفاظ گاندھوی حضرات کے لیے ہوا سرافیل اور منصف مزاج کے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔ موصوف رقمطراز ہیں:

"مدینہ اخبار بجنور ۱۲ فروری ۱۹۲۰ء میں مسٹر شوکت علی کی تقریر شائع ہوئی تھی اس کے دو فقرے نقل کرتا ہوں: زبانی جمع پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اگر تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے تو خدا کو راضی کرو گے —— بھائیو! خدا کی رسّی کو مضبوط پکڑو، اگر ہم اس رسّی کو مضبوط پکڑ لیں گے تو چاہے دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی۔"

یہ فقرات جہاں یہ بتا رہے ہیں کہ مطمحِ نظر ان حضرات کا کیا ہے، مذہب کی حقیقت اور وقعت ان کے نزدیک کس قدر ہے، دین و مذہب کا نام کیوں لیا جاتا ہے، وہاں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہنود کے ساتھ انھیں کیسی عقیدت و ارادت ہے۔

چنانچہ جلسۂ جمعیۃ العلماء میں جس کا انعقاد بماہ نومبر دہلی میں ہوا، مسٹر شوکت علی نے صاف الفاظ میں یہ کہا، —— "اے اللہ! ہم سے ایک نیک کام ہو گیا ہے کہ میں اور مہاتما گاندھی حقیقی بھائی ہو گئے ہیں۔" (فتح دہلی ۲۴ نومبر ۱۹۲۰ء) پھر ایک عالم نے یہ کہا، —— "خدا نے اُن (گاندھی) کو ہمارے واسطے مذکّر بنا کر بھیجا ہے، قدرت نے اُن کو مدبّر بنا کر بھیجا ہے۔" (فتح دہلی، ۲۴ نومبر ۱۹۲۰ء)۔

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۹۳

ایمان سے کہیے، یہ جمعیۃ العلما ہے یا اُمت گاندھی کا حلقہ؛ یہ اسلام اور شارع علیہ السلام کی طرف اللہ کے بندوں کو دعوت دے رہی ہے یا گاندھی کی نبوت تسلیم کرا رہی ہے؟ یہ حضرات اسلام کی ہمدردی میں انگریزوں سے لڑنا چاہتے ہیں یا دینِ گاندھی کی حمایت میں؟ پھر اگر کسی نے ان کی بات نہ سُنی تو کافر، منافق، یزیدی، ملعون اور جہنمی کیونکر ٹھہرا؟

لیڈران قوم! آج اخبار وجرائد تمہارے ہاتھوں میں ہیں، جسے چاہو گالیاں دو، کافر کہو، حق کو باطل اور باطل کو حق کہو اور چھاپ کر شائع کرو، اس وقت تو تمہاری بات بن آئی ہے، مخلوق اندھی ہوگئی ہے لیکن ایک وقت آئیگا اور ساری حقیقت عُریاں ہوجائے گی۔

میدانِ کربلا میں یزیدیوں نے بعد شہادتِ شہزادۂ کونین سیدنا امام حسین علیہ السلام فتح کے نقارے بجائے، دودمانِ نبوت کو جس طرح چاہا، اسیر کیا۔ لیکن آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ یزیدیوں پر خدا نے ایسی لعنت بھیجی کہ آج تک اُس کا سلسلہ منقطع ہوا، قیامت تک منقطع ہو۔ اس وقت اہلِ حق کے مقابلہ میں تمہیں اپنے انبوہ پر ناز ہے، جسے چاہتے ہو عوام سے فضیحت و رُسوا کراتے ہو، اہلِ حق "فصبرٌ جمیل" کہہ کر ضبط کر جاتے ہیں۔

اہلِ حق کے مقابلہ میں مثلِ یزید دعوائی اجماع پیش کرتے ہو؟ صریح نصِ قرآن اور نصِ حدیث کی مخالفت اور پھر اجماع کا دعوی! کیا احکامِ قرآن کا نسخ اجماع سے جائز ہے؟ اور پھر اجماع بھی ایسے علماء کا جن کے پاس خدا نے گاندھی کو مذکر بنا کر بھیجا ہے، جو علماء پس رو گاندھی ہیں۔ جس طرح قرآن مجید توریت وانجیل کا ناسخ ہے اُسی طرح گاندھی کا فرمان آیاتِ الٰہیہ کا ناسخ ان مدعیانِ علم و اجتہاد کے عقیدہ میں ہے۔ ایسے نجس و ناپاک عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے کچھ تو شرمایئے، الحیاء شعبۃ من الایمان۔

یزیدیوں نے جب یزید کی امامت وخلافت کا علم بلند کیا تو اہلِ حق کے

مقابل میں اُنھوں نے یہی دلیل پیش کی تھی کہ سارے ملک نے یزید کی امامت تسلیم کرلی، اجماع ہو گیا، صرف چار شخص ہیں جو اُس کی امامت تسلیم نہیں کرتے یعنی عبدالرحمٰن بن ابوبکر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہم۔ دیکھتے ہو وُہ اجماع یزید کی امامت پر ہُوا تھا کیسا خائب و خاسر ہوا؟

عبرت پکڑو اور اہلِ حق کو گالیاں دینے سے باز آؤ۔ اُن کی تکلیف اور اذیت رسانی سے اپنے ہاتھ اور زبان کو منع کرو۔ تمھارے دشنام دہی کی یہ ہمہ گیری ہے کہ جہاں تم نے ایک رُکنِ دین، حامیِ شرعِ متین، امامِ اہلسنّت، مجددِ مائۃ حاضرہ مؤیدِ ملّتِ طاہرہ پر سب و شتم کیا وہاں اِس فقیرِ بے نوا کو بھی بار بار متعدد جرائد میں تم نے گالیاں سُنائیں۔ میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا۔ بیشک یہ قصور ہُوا کہ جس وقت ساری زبانیں گنگ تھیں مجھ گنہگار کی زبان کلمۂ حق کہہ رہی تھی جس وقت سارے اقلام خشک تھے مجھ بے بضاعت کا قلم مصروفِ تحریر تھا، جس وقت سارے پاؤں مفلوج تھے مجھ ضعیف کا پاؤں منزل رساں راستہ پر تھا۔ انصاف کرو اس میں میری کیا خطا ہُوئی؟

یہ تو اللہ کا فضل تھا تم ہلالِ احمر کے نام سے چندہ وصول کرتے تھے اور دادِ عیش و نشاط دیتے تھے۔ زرکشی کے لیے جس طرح کے مضامین ضروری تھے تم انھیں کو لکھتے، اُنھیں کو کہتے تھے لیکن اِس فقیر کو خلافت کی لَو لگی تھی، اِس لیے ترکوں کی مختصر تاریخ پھر اُن کی خلافت، اُن کی اطاعت اور اُن کے حقوق دلیل و بُرہان کے ساتھ لکھ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیے۔ دیکھو فقیر کا رسالہ البلاغ۔ تمھیں مسئلۂ خلافت کی اب اگر جو دُھن بھی بندھی تو ایک کافر کے تذکیر و تلقین سے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ خلافت کی جگہ سوراج نے خلیفۃ المسلمین سے کہیں ارفع و اعلیٰ مقام گاندھی نے اور شیخ الاسلام کا لقب شیخ الہند نے لے لیا۔[۱]

---

[۱] سلیمان اشرف، مولانا، النور، ص ۲۲۶ تا ۲۲۹

اسی زمانے میں گاندھوی حضرات کے غیر اسلامی نعروں سے متعلق دہلی کے مردِ حق آگاہ سے اُن کا شرعی حکم دریافت کیا گیا۔ وہ سوال اور حضرت مفتی اعظم دہلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایمان افروز جواب ملاحظہ ہو:

سوال نمبر ۲۳۸

ایک شخص مسلمان جو پہلے انجمن اسلام کا ممبر تھا اب کانگرس میں شامل ہوکر نعرہ ہائے مندرجہ ذیل لگایا کرتا ہے:—— مہاتما گاندھی کی جے —— بھارت ماتا کی جے —— بندے ماترم وغیرہ۔ کیا ایسے شخص سے میل جول رکھنا اور اُس کے پیچھے نماز پڑھنا اور سوشل تعلقات رکھنا درست ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

مستفتی:—— احمد رضا خاں

ایس پی۔ ڈبلیو۔ آئی ریٹائرڈ

ہو الموفق

گاندھی کو مہاتما کہنا اور اُس کی فتح کے نعرے لگانا شرعاً ناجائز و حرام ہے کہ مہاتما کے معنی ہیں رُوحِ اعظم اور رُوح کا اطلاق قرآن پاک میں جان پر بھی آیا ہے اور وحی پر بھی اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو بھی یہ لقب عطا ہُوا ہے اور حضرت جبرئیل علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو بھی۔ پس ان معانی و القاب پر نظر کرتے ہُوئے اس کے یہ معانی ہوں گے کہ تمام جانوں میں بڑی جان یا حق تبارک و تعالیٰ کی وحیوں میں بڑی وحی یا حضرت عیسیٰ و حضرت جبرئیل علیٰ نبینا وعلیہم السلام سے بلند مرتبہ۔

اب مسلمان خود ہی غور کرلیں کہ جس لفظ کے یہ معانی ہوں اُس کو ایسے شخص کے لیے جس کو نصوص قطعیہ میں ذلیل سے ذلیل بتایا گیا ہو کیونکر استعمال کیا جا سکتا ہے؛ اسی طرح کفار کی شان میں ارشاد ہوا:

ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء ——— یعنی اگر کفار تم پر قابو پالیں گے تو تمہارے

ویبسطوا الیکم ایدیھم	دشمن ہو جائیں گے اور تم پر دست درازی
والسنتھم بالسوء ودوا	اور زبان درازی کریں گے اور وہ چاہتے
لو تکفرون ۝	ہیں کہ (ان کی مانند کسی طرح) تم بھی
	کافر ہو جاؤ۔

چنانچہ اس کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی بھی ان کو قوت میسر آئی مسلمانوں کا تباہ کرنا اُن کا پہلا فرض رہا۔ اسی تحریک میں ملاحظہ کیجئے کہ باوجودیکہ ابھی کامیابی کی جھلک بھی نہیں دکھلائی دی ہے لیکن ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ "گاندھی جی کی جئے کے مقابل اللہ اکبر کے نعرے نہ لگاؤ۔ وہ زمانہ گزر گیا جس میں ہم خاموشی کے ساتھ یہ نعرے سُنتے رہے، اب ایسا نہیں لگا سکتے۔" دو روز ہوئے کہ جمعیۃ اقامۃ جو موں (ریاست جے پور) کا ایک خط موصول ہوا جس میں انھوں نے کمیٹیاں بنانے کی استدعا کی ہے اور تحریر کیا ہے کہ:

"یہاں کے مشرکین عام طور پر نعارہ کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان اب تو کلمہ ہمارے روبرو نہیں پڑھ سکتے۔ وہ دن دُور ہوئے جب وہ ایسے نادان اور بودے تھے کہ اس کلمے کے سُننے کی تاب لا سکتے تھے۔ اب ان کو سمجھ آ گئی۔ یہ کلمہ تو ہندو دیوتاؤں کی شان میں گستاخی ہے۔ اس کو پکارنا ہے تو مکہ، مدینہ چلے جاؤ، ہمارے دیس میں اس کا کیا کام؛ (انتھی بلفظہٖ)

اب شاید یہ کہا جائے کہ یہ تمام ہنود کے اقوال نہیں، ان کا کیا اعتبار؛ تو پھر ذمہ دار کا قول لیجیے، رسالہ شدھی سماچار مورخہ ۱۵ جون ۱۹۲۰ء میں بھارت شدھی سبھا (دہلی) کے جنرل سیکرٹری نے شدھی اور سوراج کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اُس کا ترجمہ بعض اخبارات نے چھاپا ہے، جس کے چند الفاظ یہ ہیں:

"ہمیں تو جہاں حصولِ سوراجیہ کے میدان میں لڑائی کرنا منظور ہے وہاں ہم اُن کو دھوکا دے کر قتل کرنے والوں اور پڑوسی لٹیروں سے بھی اپنے گھر کی حفاظت کریں گے جو سر ڈال کر چھپ کر ہمارے گھر میں نقب لگانے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔"

غرض اس حالت کو دیکھتے ہوئے اس تحریک کی فتح یابی (کہ وہی گاندھی کی فتح ہے) کے لیے نعرے لگانا اپنی بربادی پر نعرے لگانے کے معنی میں ہوگا اور یہ یقیناً حرام ہے۔ بھارت ماتا کی جے اور بندے ماترم کے معنی اگر صرف مادرِ ہند کی فتح ہی کے ہیں، تب بھی چونکہ یہ مشرکین کے خاص قومی نعرے ہیں اور ان کے شعائر سے ہیں اس لیے مسلمانوں کو ان نعروں میں بھی شرکت کرنا شرعاً جائز نہیں سد ہیۃ المتشبیہ الکفار وھو ممنوع۔ فقط

محمد مظہر اللہ غفر اللہ لہٗ

امام مسجد فتحپوری دہلی (۱۹۳۰ء) [1]

اس فتوے کا ہر لفظ کتنا ایمان افروز اور رہنمائی کے جذبات سے بھرپور ہے لیکن افسوس! گاندھوی حضرات مشرکین ہند کی محبت میں کچھ ایسے سرشار ہو گئے تھے کہ کسی کی آواز پر کان دھرنا اپنی توہین سمجھنے لگے۔ اس کے برعکس ان کی تمام تر لیاقتیں اور صلاحیتیں ہندو مسلم اتحاد کی خاطر وقف ہو کر رہ گئی تھیں، چنانچہ مسلم لیگ کے صدرِ محترم عالی جناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب نے ترکِ موالات پر زور دیتے ہوئے اپنی دیانت داری کا یوں مظاہرہ کیا:

"حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب نہایت غیظ و غضب اور پُرجوش لہجہ میں ناتمام عبارت ابن جریر کی نقل فرما کر یہ نتیجہ استخراج فرماتے ہیں کہ: "اگر اس کے بعد بھی یہ کہا جائے کہ نہیں مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ بھی ترکِ موالات کرنی چاہیے تو اب کہنے والوں کو خدا ہی بہتر سمجھا سکتا ہے۔ (خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ جمعیۃ العلماء ص ۱۵) طرفگی یہ کہ برّ و اقساط کا صحیح ترجمہ خود بالائی سطروں میں حکیم صاحب نے احسان و انصاف تحریر فرمایا ہے لیکن استخراج نتیجہ میں موالات کو برّ و اقساط کا مرادف قرار دے کر عوام کو نہایت شرمناک دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔" [2]

موصوف کی اس کتر بیونت کا یعنی کلام الٰہی میں معنوی تحریف کا علامہ سلیمان اشرف بہاری

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: فتاویٰ مظہری مطبوعہ کراچی، ص ۳۲۸، ۳۲۹

[2] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۹۴، ۹۵

رحمۃ اللہ علیہ نے تعاقب کرتے ہوئے تفسیر ابن جریر کی عبارت کو مد نظر رکھ کر ریوں گاندھویت کا کھوٹ سمجھایا تھا:

"جن چیزوں کو ابن جریر نے آیۂ کریمہ لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء کی تفسیر میں موالات کہا ان میں سے کسی ایک کی بھی اجازت و رخصت آیت لا ینھاکم اللہ الخ سے نہ بھی نکلی، بلکہ ان کی ممانعت کی۔ اس مقام پر کثرت تصریح فرماکر ہر کافر کے ساتھ ہر حال میں ترک موالات پر مہر فرمادی۔ کیا اب بھی حکیم صاحب یہی ارشاد فرمائیں گے کہ بر و اقساط مرادف موالات ہیں؟ ان تصریحات کے بعد بھی اگر حکیم صاحب یا ان کے حواریین علمائے سیاسی اپنے اس قول پر کہ ہندؤوں سے موالات یا وداد یا محبت منطوق کلام الٰہی اور موافق تعلیم نبوی ہے، متعصبانہ اصرار فرمائیں تو بجز گاندھی صاحب کے اور کوئی انھیں سمجھا نہیں سکتا۔"[1]

حضرت بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے حضرات کی بت پرست نوازی اور زنار دوستی پر افسوس کرتے ہوئے انھیں شاہراہِ اسلام و ایمان سمجھانے کی، ایک حقیقی خیر خواہ بن کر بڑے درد بھرے دل سے کوشش کی اور اپنے قلبی جذبات کو صفحۂ قرطاس پر سجا کر یوں گاندھوی حضرات کے سامنے پیش کیا:

"اے پرستارانِ ہنود! کبھی ایمان کی قوت اور اسلامی اخلاق کی کشش بھی تم نے دیکھی ہے؟ کبھی تم نے کلمۂ توحید جس دل پر نقش ہو اس کے نعرۂ تکبیر کے زور و طاقت کا خیال بھی کیا ہے؟ تمھاری مادی آنکھیں کفار کی جمعیت دیکھ کر پتھرا گئیں۔ تمھارے مادی دماغ کفار کی قوت حربیہ سے لرزاں و ترساں ہو گئے۔ لیکن کیا تمھارے پاس بچی کھچی کچھ ایمان کی بھی پونجی ہے؟ میری دلی دعا ہے کہ اس کا جواب تم اثبات میں دے سکو، پھر میں تم سے یہ کہوں کہ ایمان

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا، النور، ص ۹۴

کے نور سے توحید و خدا پرستی کے زور و قوت کا نظارہ کرو تو تمھیں اصل شاہراہ عمل معلوم ہو جائے۔ میری دردمندانہ گزارش تعصب اور ہٹ دھرمی سے یکسو ہو کر سنو۔ اِس وقت سیاسی مفتیوں نے الہامات گاندھی سے متاثر و مستفیض ہو کر موالات کی جو تعریف بیان کی ہے اور جن چیزوں کو مصداق موالات قرار دیا ہے وہ محض القائے گاندھی کی تعمیل ہے، اِس کا نتیجہ حقیقی اسلامی خدمت سے تغافل و بے پروائی ہے۔"[1]

ایک مقام پر آپ نے مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں اور گاندھوی علماء کو زوردار لفظوں میں غیرت دلاتے ہوئے اُن کی لیڈری اور علامگی کی حقیقت کو یُوں بیان کیا ہے:

"اے گروہِ ناخدا ترس! اے جماعتِ علمائے سوء! یُوں کہو کہ یہ احادیث اور یہ حکمِ الٰہی تو آج تک تمھیں نسیًا منسیًا تھے۔ اِس لیے کہ تمہارا رہبر اور تمہارا مذکِّر تو گاندھی ہے۔ آج تک اُس نے تمھیں یاد نہ دلایا تو پھر تمھیں یاد کیونکر آتے؟ اگر قرآن شریف یا کتبِ احادیث و سِیَر تمہارے رہبر و مذکِّر ہوتے تو تمھیں سب کچھ یاد آ جاتا۔ فی الحقیقت تم معذور ہو، تمہارا مرتبہ عوام کا ہے، تمہارے دماغ علوم سے خالی، تمہارے سینے جذبات سے کورے، تمہارے قلوب دولتِ ایمانی سے مفلس، تمہاری زبانیں گنگ اور تمہارے اقلام خشک۔ تم تو ایک قالبِ بے جان ہو۔ جو تمہارے لیڈر کہتے ہیں تم اُسی کی محاکات کر دیتے ہو اور ان لیڈروں کا منبعِ فیض سرکار گاندھی اور اُن کی ہندو پارٹی ہے۔ سلسلہ یُوں ہے کہ ایک تحریک مسٹر گاندھی پیش کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمان اُسے لبیک کہتے ہیں، علماء سیاسی کا جبّہ و عمامہ اُسے شرعی جامہ پہناتا ہے۔ اِن علماء کی یہ مجال نہیں کہ وُہ بطورِ خود کوئی تحریک پیش کر سکیں یا کسی تحریک کے سامنے آمنّا و صدّقنا کے سوا کوئی آواز بلند کرنے کی جرأت

---

[1] سلیمان اشرف، مولانا: النور، ص ۱۰۶، ۱۰۷

بھی کریں۔ لہ

١٣٤٩ھ/١٩٣٠ء میں بنارس کے مسلمانوں پر رمضان المبارک میں جمعیۃ العلمائے ہند کے خدا وندانِ نعمت یعنی مشرکینِ ہند نے ایک قیامت برپا کر دی۔ سفاکی کے تمام مرحلے طے کر دیے گئے لیکن ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپنے والے گاندھوی علماء سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ان کی ہمدردی میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالتے۔ اپنے پروردگاروں کی بارگاہ میں تو اپیل کرتے کہ سرکار! ہم تو آپ کے بندۂ بے دام ہیں، ذرا ظلم و ستم ڈھاتے وقت ہماری خلمادری کا کچھ تو لحاظ فرما لیا کیجیے۔ ہندو لیڈروں حتیٰ کہ گاندھی تک نے مسلمانوں کی ہمدردی یا ہنود سے بہبود کو سمجھانے پر ایک منٹ بھی صرف کرنا تضیعِ اوقات شمار کیا، بلکہ اس گاندھوی ٹولے کے پاسِ خاطر سے جھوٹ موٹ بھی ایک لفظ تک ہمدردی کا منہ سے نہ نکالا۔ ان حالات میں تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ درد بھرے دل سے جمعیۃ العلمائے ہند کے سنگدل اور قوم فروش صاحبانِ جبہ و دستار سے سوال کرتے ہیں:

”ہندوؤں کا کلمہ پڑھنے والی جمعیۃ العلماء کو کچھ خبر ہے کہ رمضان المبارک ١٣٤٩ھ میں بنارس کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بنا ڈالی۔ ماہ مبارک اُن کے لیے محرم بن گیا۔ درندہ صفت ہندوؤں نے بے گناہ مسلمانوں کو اس بے دردی سے شہید کیا جس کے تصور سے دل کانپتا ہے۔ گھر کے گھر صاف کر دیے۔ بچے تک قتل کر ڈالے۔ مسجدیں مسمار کر دیں۔ دکانیں لوٹ لیں۔ ظلم و ستم کا سیلاب امنڈا چلا آتا ہے۔ جور و جفا کے سمندر میں طغیانی تھی۔ مسلح ہندو گنڈاسوں اور بھالوں سے بے خبر نہتے مسلمانوں پر بلائے ناگہانی بن کر ٹوٹ پڑتے تھے۔ دھوکے دے دے کر مسلمانوں کو ہندوؤں کے محلے میں لے جا کر شہید کرتے تھے۔ جمعۃ الوداع کی نماز تک مسلمان اس مصیبت کی وجہ سے ادا نہ کر سکے۔

لہ سلیمان اشرف، مولانا، النور، ص ١٥٠، ١٥١

مسلمانوں کی اِس مصیبت کا جمعیۃ العلماء کو کچھ درد ہوا ؟ جمعیت کچھ حرکت میں آئی ؟ ہندو پرستانہ جذبات کچھ بھی سرد ہوئے ؟ ہندوؤں کے فدائی اپنی بے جا فداکاری پر کچھ بھی نادم وشرمندہ ہوئے ؟ آئندہ کے لیے انھوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے ہوشیار رہنے اور اپنا تحفظ کرنے کا کوئی مشورہ دیا ؟ یا اپنے ہندو خداوندانِ نعمت سے کوئی اپیل کی ؟ جن کے قدموں پر سر جھکاتے ہیں اُن سے ہندوؤں کے اِن مظالم کی کچھ شکایت کی ؟ اپنے قبلہ وکعبہ گاندھی کو لیجا کر بنارس کے مقتل کی سیر کرائی ؟ ہندو لیڈروں سے جن کی غلامی کیا کرتے ہیں اِن ہولناک مظالم کو روکنے اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے نقصانات کی تلافی کرنے کی کوئی تحریک کی ؟ یا ہندو لیڈر اِس جمعیۃ العلماء کی فداکاری کی قدر کر کے مسلمانوں کی دلجوئی کرنے بنارس گئے ؟ یا انھوں نے ہندوؤں کی اِن امن سوز خونخواریوں پر اظہارِ نفرت وملامت کیا ؟ عدمِ تشدد کا وظیفہ پڑھنے والے گاندھی نے ہندوؤں کے اِس ہولناک تشدد پر کوئی موثر کارروائی کی ؟ تمھاری ہمدردی میں ہندوؤں نے کچھ کیا ہو تو بتاؤ ؟ یا انھوں نے تمھاری غلامانہ اطاعت شعاری کو بے التفاتی سے ٹھکرا دیا ؟ مسلمانوں کے خون کی قیمت اُن کی نظر میں کچھ بھی نہ ٹھہری ؟ پھر بھی تمھاری غیرت تمھیں ہندو پرستی کی اجازت دے گی ؟ اب بھی تم ہندوؤں کے غلام بنے رہوگے ؟ اب بھی تمھاری آنکھ نہ کھلے گی ؟ اب بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کی اطاعت وفرمانبرداری کی دعوت دیا کروگے ؟ کیا اب بھی تمھارا منشا یہی ہے کہ ہندوستان میں ہر جگہ ایسی ہی بربادی دیکھنا چاہتے ہو ؟"[۱]

بنارس کے بعد ہندوؤں نے مرزا پور، آگرہ اور دیگر کتنے ہی مقامات پر مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ لیکن کسی ہندو لیڈر نے افسوس کا ایک لفظ نہ کہا، نہ اپنی قوم کو سمجھانے کا کوئی

---

[۱] محمد عمر نعیمی، مولانا، السواد الاعظم، بابت شوال ۱۳۴۹ھ، ص ۲

نہ کیا۔ اس کے باوجود مسلمانوں کے لیڈر بننے والوں اور گاندھوی علماء کی زنار دوستی اور بت پرستی نوازی میں سرِ مُو فرق نہ آیا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مولانا قاضی احسان الحق نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کے قلبی جذبات لفظوں کی صورت میں یوں صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے:

"بنارس کے دلدوز واقعات اور مسلمانوں پر ہندوؤں کے خونخوار حملوں سے جو طوفان برپا کیا تھا ابھی وہ پورے طور پر ساکن نہ ہونے پایا تھا کہ نواحِ بنارس و مرزاپور و آگرہ سے خونی ہنگاموں کی اطلاع ملی۔ ہندوؤں کے نیزے تیر و سنان مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہندوستان کی جیو ہتیا نہ کرنے والی قوم مسلمانوں کے خون بہانے پر تلی ہوئی ہے اور اس کی آتشِ غیظ کے تند و تیز شعلے بڑے زور سے بھڑک رہے ہیں۔ ہندو لیڈر اور چند ہندو پرست مسلم نما مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد کا سبز باغ دکھا کر مغالطہ میں ڈال رہے ہیں مسلمانوں کی جان پر بنی ہوئی ہے، ان کے زن و فرزند قتل کیے جاتے ہیں، مال لوٹے جاتے ہیں، گھر بار برباد کیے جاتے ہیں، مسجدیں مسمار ہوتی ہیں، مگر کوئی لیڈر صاحب پلیٹ فارم چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتے ہوئے مسلمانوں کے مقتل میں نہیں پہنچے اور ہندوؤں کو اس درندہ وش سفاکی، جفا جوئی سے نہیں روکتے۔ اگر درحقیقت یہ قوم مسلمانوں کے ساتھ کچھ بھی ارادۂ اتفاق رکھتی تو اپنے ہم قوموں کی ان ہنگامہ آرائیوں و جفا شعاریوں کو روکنے کے لیے میدانِ عمل میں آتی۔ گاندھی صاحب مزے مزے کی تقریروں میں مصروف ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جیسی باتیں بنیوں نے ہمیشہ بنا بنا کر مسلمانوں کا دیوالیہ کر دیا۔۔۔۔۔ ہمیں اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار گاندھی ہندوؤں کے ان مظالم کو دیکھ کر کیوں نہیں گھبرا اٹھا اور اس نے اپنی قوم کو جا کر عدمِ تشدد اور شانتی کا درس کیوں نہیں دیا؟ آج وہ اپنے اس رٹے ہوئے سبق کو کیوں بھول رہا ہے اور ہندو قوم کو خونخواری سے روکنے کے لیے میدانِ عمل میں پہنچنے کے واسطے اس کا

قدم کیوں نہیں جنبش کرتا؟ کیا ایسے ہی شخص کو مسلمانوں کا ہمدرد، ملک کا خیرخواہ، امن کا حامی کہا جا سکتا ہے؟[1]

ہندو کی بے وفائی، محسن کشی، خودغرضی اور عیاری ایک ایسی مسلّمہ حقیقت ہے جس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود یہ حضرات ہندوؤں کے بندۂ بے دام اور ہاتھ جوڑ کر غلام بنے اُن کی ملت فروشی میں کون سے انصاف پسند اور صاحبِ عقل و دانش کو شبہ ہو سکتا ہے؟ حضرت صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) نے ہندو، بے وفا اور گاندھوی علماء کی ذہنیت کا یوں تجزیہ کیا ہے:

"ہندوؤں کی بے وفائی کا ایک دو مرتبہ نہیں، دس مرتبہ نہیں، ہزار مرتبہ نہیں، روزمرہ ہر کہیں تجربہ ہو رہا ہے۔ اُن کا بچہ بچہ مسلمانوں کی عداوت و ایذارسانی کے خمار میں مست و سرشار ہے۔ سلطنتِ اسلام کے عہد میں شاہانِ اسلام کے مراحم خسروانہ اس قوم کے حال پر مبذول رہے۔ انہیں تعلیم دی، علم سکھایا، شائستہ بنایا، وزارتیں دیں، عہدے اور منصب دیے، جاگیریں دیں، انعام و اکرام کیے، جن کے اثر آج تک باقی ہیں۔ لیکن اِس قوم کی محسن کشی و غداری اُس زمانے میں بھی نہ شرمائی اور عنایات و اکرام کے سامنے ممنونِ احسان ہو کر خمیدہ سر نہ ہوئی۔ پروپیگنڈے، ریشہ دوانیاں، بداندیشی و بدخواہی اِن کی طرف سے ہمیشہ جاری رہی۔ اچھے سلوکوں کا انھوں نے ہمیشہ بُرا بدلہ کیا اور اُس محسن سلطنت کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں ہمیشہ لگے ہی رہے مگر غلامانہ ذہنیت کے ساتھ دشمنی پر دوستی کا اور بدخواہی پر خیرخواہی کا، غداری پر وفاداری کا پردہ ڈالے رکھا۔ سلطنتِ اسلام کے بعد سے آج تک بھی ان کا یہی طریقِ عمل ہے۔

وہ مسلمانوں کو نجس و ناپاک سمجھتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی چیز

---

[1] قاضی احسان الحق نعیمی، مولانا، السواد الاعظم، بابت شوال ۱۳۴۹ھ، ص ۴۹، ۵۰

پلید جانتے ہیں۔ جب نفرت کا یہ عالم ہے تو ایذا رسانی سے وہ کس طرح صبر کر سکتے ہیں؟ آدمی جس چیز کو ناپاک سمجھتا ہے اُس کو دفع کرنے پر اُس کی طبیعت مجبور ہوتی ہے۔ اس لیے ہر قرن اور ہر زمانہ میں ہندو طرح طرح کے حیلوں اور تدبیروں سے مسلمانوں کو مٹانے میں کوشاں رہے۔ اب سے دس سال قبل جب ہندو مسلم اتحاد کے علم بلند کیے گئے اور مسلمان جاہل خود رائے لیڈروں کے اغواء سے ہندوؤں پر فدا ہو رہے تھے۔ جوشِ محبت میں بہت سی ناکردنی حرکات کے مرتکب ہوئے، ہندوؤں کو مسجدوں میں بلایا، منبروں پر بٹھایا، پیشانیوں پر قشقے لگوائے، چہروں پر گلاب گرائے، ہولیوں میں خاک اڑائی، ہندو مُردوں کی ٹکٹیاں اٹھائیں، بُت کے نعرے لگائے، قربانی کی گائیں گئوشالوں میں پہنچائیں، کشتگانِ امرتسر کی مرثیہ خوانیاں کیں، انھیں شہید بنایا، سب کچھ کیا، مگر ہندوؤں نے ستم رانی کی خصلت نہ چھوڑی، اُن کی جفا کاریوں میں فرق نہ آیا۔ آرہ، شاہ پور اور کرتار پور کے مظالم سے بھی سیر تر ہوئے۔ ملک بھر میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں؛ مسجدوں کی بے حرمتی کی، نمازوں کے وقت مسجدوں کے سامنے باجا بجا کر مسلمانوں کو تنگ اور آزردہ کیا، اس حد سے مار دھاڑ شروع کی۔ ہزارہا بیگناہ مسلمانوں کو قتل کروا ڈالا، لوٹ لیا، گھروں کو آگ لگا دی، جلتی آگ میں مسلمانوں کو ڈال کر پھونک دیا۔

تلخ تجربے ہونے کے بعد کون مسلمان تھا جو ہندوؤں سے امیدِ وفا کرتا؟ امیدِ خیر خواہی رکھتا؟ تمام ملک کے مسلمان اِن کے دستِ ستم سے نالاں تھے، ان کی حکومت پر کیسے راضی ہوتے؟ اس لیے موجودہ زمانے کی تحریکات کانگرس میں مسلمان بالکل علیحدہ رہے۔ اِن کا کوئی طبقہ شریک نہ ہوا۔ یہ روش مسلمانوں کے لیے بہت بہتر تھی۔ اس فرصت کو بہت غنیمت سمجھتے اور اپنی بگڑی حالت درست کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ مگر ہندوؤں نے محسوس کیا کہ یہ علیحدگی مسلمانوں کو نفع پہنچائے گی اور اس فرصت میں وہ کچھ نہ کچھ کمزوری رفع کرنے

میں کامیاب ہو جائیں گے اور گورنمنٹ کا مقابلہ تنہا ہندوؤں سے رہ جائے گا۔
اس کا جو خمیازہ بھگتنا ہو گا وہ تنہا ہندو قومیت کے سر پڑے گا۔ اگر مسلمان
شریک ہوئے ہوتے تو مرنے، پٹنے، قید ہونے کے موقعوں پر اُنھیں پیش کیا جاتا
اور یار لوگ کنی کاٹ جاتے۔ اس خیال سے اُنھیں بہت فکر تھی کہ مسلمانوں کو
اس تحریک میں کس طرح شامل کیا جائے؟ مگر مسلمانوں کا کوئی طبقہ اُن کے ہاتھ
نہ آیا، البتہ چند خود غرض لوگ اُن کے ہتھے چڑھ گئے جنھوں نے اپنے ذاتی مفاد کو
مقدم رکھ کر قوم کے ساتھ غداری کی اور مسلمانوں کو شرکت کانگرس کی دعوت دی
اور ہندوؤں کے روپیہ سے مدرسے کرا غوائے اہلِ اسلام کا کام جاری رکھا
اس قلیل الطماع، خود غرض جماعت نے اپنا نام جمعیۃ العلماء رکھا اور
مسلمانوں کو مغالطہ دیا کہ یہ ہندوستان کے تمام علماء کی جمعیت ہے باوجودیکہ
تمام علمائے ہند اس کے سخت مخالف ہیں اور اس نام نہاد جمعیت کو جمعیۃ
الہنود جانتے ہیں۔ جو چند ذی وقار علماء اس میں پہلے کسی وجہ سے شریک
ہو گئے تھے اس وقت وہ بھی علیحدہ ہو گئے، گنتی کے آٹھ دس نام کے مولوی
رہ گئے جنھوں نے اپنا ضمیر ہندوؤں کے ہاتھ کھوٹے داموں کو فروخت کر دیا
اور کانگرسی پروپیگنڈا کے ایجنٹ ہو گئے اور کسی ذکسی قدر مسلمانوں کو مغالطہ
دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ خطرناک جماعت ہندوؤں کی کٹھ پتلی ہے، اُن
کے اشاروں پر رقص کیا کرتی ہے۔ مسلمان اس سے متفق نہیں، نہ ملک کا کوئی
معتمد شخص ان کے ساتھ شریکِ عمل ہے۔ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ
رہنا چاہیے کہ نام نہاد جمعیۃ العلماء ہندوستان کے علماء یا عام اہلِ اسلام
کی نائب و ترجمان نہیں ہے بلکہ وہ تمام مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں سے ساز باز
کرنے کی مجرم ہے۔ اس نے اپنے نفع کی خاطر بہت سے مسلمانوں کو غلطی
میں ڈالا اور نقصان میں مبتلا کیا، غلط فتوے دیتے رہتے، بے فائدہ ہندو
تحریک پر مرنے والوں کو شہید بتا کر مسلمانوں کو جانیں کھونے پر آمادہ کیا۔ مسلمان

اس غدار، مسلم کش، ہندو پرست جماعت کے دام تزویر سے بچیں۔ ؎

۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء میں حضرت مفتی اعظم دہلی، سیدی و مرشدی شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ہنود کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت اور مسٹر گاندھی کے احکامات کی پیروی کے بارے میں سوال کیا گیا۔ آپ کا جواب خلوص و للہیت اور تقویٰ و طہارت کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت کی وسیع النظری اور اعلائے کلمۃ الحق میں کوشاں رہنے کا زندہ ثبوت ہے۔ دہلی جیسے شہر میں جو وہابیہ سے بھرپور اور گاندھوی حضرات کا ہیڈ کوارٹر ہو وہاں آپ کا لومۃ لائم سے بے خوف ہو کر علی الاعلان حق بات کہنا اور کسی بڑی سے بڑی طاقت کو خاطر میں نہ لانا حق پرستی کی عظیم الشان مثال ہے۔ اب وہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیے اور حق و صداقت کی داد دیجیے۔

سوال نمبر ۲۳۹

۱۔ آجکل قوم ہنود آزادی حاصل کرنے میں بڑی سرگرم نظر آتی ہے اور اُس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ حکومت کی قانون شکنی کر کے اس کو مجبور کیا جائے تاکہ وہ ہم کو آزاد تسلیم کرے۔ اگر اس مقابلہ میں حکومت کی جانب سے نقصان برداشت کرنے پڑیں تو اُن کو بھی بلا مخالفت برداشت کیا جائے، یہاں تک کہ اُن کی گولیاں اپنے سینے پر لی جائیں لیکن قدم پیچھے نہ ہٹے۔ پس اس صورت میں ہنود کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت جائز ہے یا نہیں اور اس امر میں جمعیۃ العلماء کا یہ فیصلہ کہ مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے حق بجانب ہے یا اس سے غلطی ہوئی؟

۲۔ اگر اس مقابلہ میں کوئی مسلمان گولی لگنے کی وجہ سے مر جائے تو شہید ہوگا یا نہیں؟

۳۔ محض اس لیے کھدر پہننا کہ ہنود اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں اور شرک کا بول بالا رہے اور اُس کو اپنے لیے بمنزلہ فرض کے سمجھنا اور جو لوگ کھدر نہ پہنتے ہوں اُن

؎ نعیم الدین، مراد آبادی، مولانا، السواد الاعظم، بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ، ص ۳ تا ۵

بہ نظرِ حقارت دیکھنا یہاں تک کہ اِس کی وجہ سے اُن کی نمازوں میں قصور بتلانا ، یہ سب امور جائز ہیں یا نہیں؟

۴۔ مشترک قانونِ ملک کے توڑنے کا حکم دیتا ہے۔ اِس پر کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی ہے، لہٰذا اُس کے حکم کی تعمیل فرض ہے۔ پس یہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلائل۔

الجواب

۱۔ مسلمانوں کا آزاد ہونا اِس امر کا مقتضی ہے کہ احکامِ کفر یک قلم نابود ہو جائیں اور اہلِ اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے، جو مطلوبِ شارع ہے اور ہندوؤں کی آزادی یہ ہے کہ مسلمانوں کو نیست کر دیں اور کسی مسلم کو یہ قوت نہ رہے کہ وہ شرک اور کفر کی برائی بھی کر سکے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ دونوں آزادیوں میں تضاد ہے۔ ایک ملک میں دونوں آزادیوں کا اجتماع محالاتِ عقلیہ سے ہے۔

پس صورتِ مذکورہ میں اگر آزادی ہو سکتی ہے تو ان دونوں قوموں میں سے صرف ایک قوم آزاد ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں غیر آزاد قوم یقیناً آزاد قوم سے مغلوب رہے گی۔ اِس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہنود مسلمانوں کی آزادی چاہتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اخبار بین حضرات پر اچھی طرح روشن ہے کہ ہنود کا اصلی منشا ابھی بھی کامل آزادی نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ گورنمنٹ کے سایہ میں ہم کو وہ قوت میسر آ جائے جس سے مسلمانوں کی مالی قوت تو برباد کر ہی چکے ہیں، دینی قوت بھی مٹا دیں کہ آج اِس کی کوشش کی جاتی ہے تو گورنمنٹ آڑے آتی ہے، جب ہم خود مختار ہو جائیں گے تو اپنے تینتیس ممبروں میں مسلمانوں کے دس ممبروں کو جذب کر لینا کون سی بڑی بات ہوگی کہ اول تو وہ ممبر خود بھی ایسے ہوں گے جو ہماری آواز پر لبیک کہنے والے ہوں گے، لہٰذا اگر کبھی انھوں نے کسمسانا چاہا بھی تو پھر کثرتِ رائے کے بھاری پہاڑ سے نیچ کر اُن کے سیدھے بھاگنے کی راہ بھی کہاں ہوگی؟ غرض پھر جس طرح نچائیں گے اُن کو

ناچار پڑے گا۔ کیا ساردا ایکٹ کے منشا سے تجربہ نہ ہو چکا جو ہندو مسلم ممبروں کی کثرت نے پاس کر دیا، وہ اسپیشل اٹل ہے۔ اس کے منسوخ کرانے میں کیا دقیقہ اٹھا رکھا گیا! لیکن باینہمہ آج تک اس کو جنبش نہیں ہوئی اور گورنمنٹ کی جانب سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم کیا کریں! یہ سب تمہارے نمائندوں کی روشنی دماغ کا نتیجہ ہے۔

پھر ہم نے تو احتیاطاً تمہارے بعض معتمد علیہ علما سے بھی دریافت کر لیا تھا۔ لیکن جب ہم کو ان سے بھی اجازت مل جائے تو پھر ہمارا کیا قصور! دوسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب کسی ملک میں مختلف مذاہب موجود ہوں اور کوئی اصلاحی اسکیم جاری کی جائے تو اس وقت اصلاح معاشرت عام ہوتی ہے، کسی خاص قوم کا اس میں استثنا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی قسم کے اور بھی جواب دیے جاتے ہیں جن کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب چیختے چلاتے رہو، جو ہونا تھا ہو چکا۔ غرض یہی قصہ آئے دن اس وقت ہوگا جب یہ دنیا کے دلدادہ منصب حکومت پر فائز ہوں گے اور زہر کفر و عسل اسلام کی معجون تیار کر کے اسی کے ساتھ قوم کا علاج شروع کریں گے۔

مسلمانو! ہوش میں آؤ۔ اپنے ہاتھوں اپنے کو برباد نہ کرو۔ اس مسئلے میں جمعیۃ العلماء ہو یا کوئی دوسری جماعت، جو بھی تم کو شرکت مشرکین کی رائے دے وہ سخت غلطی میں ہیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، بیسیوں آیات میں اس کی حرمت ظاہر و باہر ہے۔ تبرکاً صرف دو آیتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے، یاایہا الذین امنوا لا تتخذوا بطانۃ (الآیہ) مسلمانو! غیروں کو اپنا بھیدی نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی میں کمی نہ کریں گے۔ انھیں تمہارا تکلیف میں پڑنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی زبانوں سے دشمنی ظاہر ہو رہی ہے اور جو امور ان کے سینوں میں پوشیدہ ہیں وہ اور بھی زیادہ سخت ہیں۔ اگر تم کو عقل ہے تو ہم نے کھلی نشانیاں بیان کر دیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے، یاایہا الذین امنوا ان تطیعوا الذین کفروا (الآیہ) مسلمانو! اگر تم نے کافروں کا کہنا مان لیا تو یاد رکھنا وہ تم کو الٹا پھیر دیں گے (اور تمہاری پچھلی پستی کا تم کو نظارہ پھر تم کو دکھلا دیں گے) پھر تم نقصان

میں جا پڑو گے (یہ تمہاری کیا مدد کریں گے تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو) اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اس کی مدد سب سے بہتر ہے۔ ہم عنقریب تمہارا رُعب کافروں کے دلوں میں ڈالے دیتے ہیں۔

بعض مسلمانوں کو جو بات ہندو کی ہمراہی پر ابھار رہی ہے یہ ہے کہ اب یہ اُن کے ذہن نشین ہو چکا ہے کہ جس روش پر اس قوم کی اس وقت جدوجہد ہے اگر کچھ زمانہ یونہی رہی تو ضرور بازی لے جائیں گے۔ پھر ہمیں سوائے افسوس کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا اور جب انھوں نے حقوق حاصل کر لیے تو یہ گورنمنٹ اور نیز دوسری سلطنتوں کی نگاہ میں معزز ہو جائیں گے اور ہم ذلت کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو جن حقوق کا مطالبہ ہے وہ خالص ہندو کے حقوق نہیں ہیں، بلکہ مشترک تمام ہندوستانیوں کے لیے ہیں۔ تو اگر حاصل ہو بھی گئے تو مسلمان محروم نہ رہیں گے۔ پھر خواہ مخواہ اُن کا اس بُری صورت کے ساتھ دخل انداز ہونا کیا معنی بالخصوص جبکہ ہندو بھی کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمانوں کی شرکت کی حاجت نہیں اور اگر کہتے ہیں کہ ہمارے حقوق برائے نام ہیں اصل میں وہ حقوق زیادہ تر انھیں کے حق میں مفید ہوں گے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر اُن کے حاصل کرنے کے لیے آپ کیوں کوشاں ہیں؟ آپ کو چاہیے کہ گورنمنٹ کی خدمت میں ایسے حقوق پیش کریں جو آپ کے لیے مفید ہوں مگر قانونی حدود میں رہتے ہوئے اور تہذیب کے ساتھ تاکہ بلا کسی نقصان کے آپ کو حقیقی کامیابی میسر آجائے، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ درخواست کنندگان میں سے گورنمنٹ ایسے اشخاص کو محروم رکھے جو اس کے قواعد کے ساتھ درخواست کرتے ہیں اور اُن کو کامیاب بنادے جو اُس کے ساتھ برسرپیکار ہیں۔ رہا عزت کا سوال - ان کے ساتھ تو شرکت ممنوع ہے لقولہٖ تعالیٰ:

أيبتغون عندهم العزة فان العزة لله جميعا.	کیا تم اُن کی شرکت میں عزت ڈھونڈ رہے ہو عزت تو تمام کی تمام محض اللہ ہی کے لیے ہے۔

پس عزت اگر ہے تو صرف اس میں کہ حاکم حقیقی کے حکم کے آگے کسی کے حکم کی پروا نہ کی جائے اور تمام مسلمان آفاق کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ عامل ہو جائیں، پھر ہو نہیں سکتا کہ کامیابی ہمارے قدم نہ چوم لے۔ اگر یہی تفرقہ اور بددینی رہی تو ذلت کی شکایت بے جا ہے کہ اس کا ارشاد ہو چکا:

واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول	اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری
ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب	کرو اور آپس میں تنازعہ نہ ڈالو ورنہ
ریحکم۔	تم کم ہمت اور سست پڑ جاؤ گے
	اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

سچ فرمایا باری تعالیٰ جل مجدہ نے۔ آنکھوں نے دیکھا، آج سے دس سال پہلے (۱۳۳۹ھ) میں، اگرچہ حالت بہت تباہ ہو چکی تھی مگر پھر بھی کیسی ہوا بندھی ہوئی تھی! لیکن جب تم نے اس (اللہ تعالیٰ) کے حکم کی مخالفت کی اور ہندوؤں سے دوستی گانٹھی اور جو کچھ اسلام کے خلاف نہ کرنا تھا، وہ کیا، جس کے بیان کے لیے دفاتر بھی گنجائش نہیں رکھتے، یہاں تک کہ مخالفین کو سارے گر سکھا دیئے اور ان کی دلی مراد پوری کر دی کہ آپس میں اچھی طرح مخالفت پیدا کر لی اور آج وہ حالت ہو گئی کہ وہ تم کو کسی شمار میں نہیں لاتے۔ لیکن تمہاری شراب محبت کا خمار اب بھی نہیں اترا؟ اسی کوشش میں لگ رہے ہو کہ کسی طرح رہی سہی اسلامی شان بھی ہندوستان سے مٹ جائے۔ ہندوؤں کے روزمرہ کے سلوک دیکھ رہے ہو لیکن آنکھیں ایسی بند ہو گئی ہیں کہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

مسلمانو! خدارا خواب غفلت سے بیدار ہو اور بہت جلد ان وسائل سے کام لو جن سے آپس کا اتفاق نصیب ہوتا ہے کہ اجتماعی قوت سے آنے والی مشکلات کی مدافعت کر سکو کہ آج ایک قوت کے کرشموں کا رونا رو رہے ہو، کل دوسری قوت کے مظالم کا سامنا پڑتا ہے۔ لیکن تمہاری ہر کوشش اور ہر فعل و حرکت محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اور پابندیٔ دین کے ساتھ ہو، ورنہ کامیابی کی امید نہ رکھنا۔

اس مسئلے میں نصوص صریحہ قطعیہ کی مخالفت کی جا رہی ہے، لہٰذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ

دیں، جلسہ میں اس کے سامنے اس نام نہاد جنگِ آزادی میں شرکت کا مسئلہ پیش ہو وہ صاف بلند آواز سے کہہ دے کہ ہم شرکت سے ہرگز راضی نہیں۔ اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں اور یہ یاد رکھیں کہ قیامت میں اس سے سخت بازپرس ہوگی۔

بعض لوگ شرکتِ مشرکین پر یہ بیان کر کے اُبھار رہے ہیں کہ غیر مسلم قوم جب مسلمانوں کے ملک پر قبضہ کرے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے ملک کو اس سے آزاد کرائے۔ سو یاد رہے کہ مسئلہ تو یونہی ہے مگر اوّل تو یہ ہر مسلمان پر فرض نہیں بلکہ اُن مسلمانوں پر فرض ہے کہ جو آزاد کرانے کی طاقت رکھتے ہوں۔ ہندوستان کے مسلمان اس پر ہرگز قدرت نہیں رکھتے۔ دوسرے جو آزادی شارع کو مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ خالص مسلمانوں کی قوت و شوکت کے حصول کی امید ہو اور یہاں ایسی آزادی کی ہرگز اُمید نہیں بلکہ اور نقصان کا اندیشہ ہے۔ عالمگیری میں دشمن کے مقابلے کی اباحت کے شرائط کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

والشرط ان یرجو الشوکۃ والقوۃ لاھل الاسلام باجتھادہ او باجتھاد من یعتقد فی اجتھادہ ورایہ وان کان لا یرجو القوۃ والشوکۃ للمسلمین فی القتال فانہ لا یحل لہ القتال لما فیہ من القاء نفسہ فی التھلکۃ۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہم اس حکومت کی وجہ سے طرح طرح کے نقصانات کے شکار ہو رہے ہیں۔ سو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا ہے کہ:

اسمعوا واطیعوا فانما علیھم ما حملوا وعلیکم ما حملتم۔	تم سنتے جاؤ، اطاعت کرتے رہو کہ جو حقوق حکام پر ڈالے گئے ہیں وہ اُن پر لازم ہیں اور جو تم پر ڈالے گئے ہیں وہ تم پر لازم ہیں۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا نفسِ شرکت کے متعلق تھا کہ اس وقت کی شرکت کا کیا حکم ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس راہ کے دوسرے اور بھی صدہا منہیات کا ارتکاب کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے یہ شرکت اشد حرام کا حکم پیدا کر لیتی ہے چونکہ اُن تمام کا ذکر موجب طوالت تھا، دوسرے اُن کے متعلق سوال میں استفسار بھی نہیں تھا اس لیے ان کو ترک کیا گیا۔

۲۔ اس مقابلے میں اگر قوم کی جانب سے ایسا تشدد وقوع میں نہ آئے جس میں پولیس یا فوج کے افراد میں سے بعض کے تلف ہو جانے کا خوف ہو اور ایسی صورت میں حکومت کی جانب سے گولی چلا دی جائے اور کوئی مسلمان گولی کے صدمہ سے مر جائے تو شہید کہلائے گا اور اس کے تلف ہونے کا سبب ایسے وقت ظلم ٹھہرے گا اور ظلماً مارا جانا شہادت ہے۔ لیکن ایسے وقت میں بھی اگر کسی مسلمان کا اس پر گمان غالب ہو جائے کہ اگرچہ میرا کوئی ایسا سنگین گناہ نہیں ہے لیکن حکومت اس پر بھی گولی چلا دے گی، تو ایسی صورت میں اس پر فرض ہوگا کہ وہ اس مقام سے ہٹ جائے۔ اگر نہ ہٹے گا اور مارا جائے تو شہید نہ کہلائے گا۔

اگر قوم کی جانب سے ہی ایسے تشدد کی ابتداء کی گئی جس میں گورنمنٹی ملازمین سے بعض افراد مارے گئے یا اُن کے مارے جانے کا قوی اندیشہ تھا کہ وہ آلاتِ جارحہ کے استعمال کا ارتکاب کر رہے تھے اور ایسی صورت میں مجمع کے منتشر کرنے کے لیے گولی چلائی گئی اور اس میں کوئی مسلمان بھی مارا گیا تو اس کو بھی شہید نہ کہا جائے گا کہ اس موقع پر وہ یقیناً جانتا ہے کہ گولی چلنا لابدی ہے، پس ایسے وقت میں اس کا ٹھہر جانا اپنے اُوپر موت کا پیش کرنا ہے، جو حرام ہے۔ پھر جن صورتوں میں شہادت کا حکم نہیں کیا گیا، اگر وہ جانتا تھا کہ شرعاً مجھے یہاں ٹھہرنا ممنوع ہے تب تو خودکشی کا مرتکب ٹھہرے گا ورنہ امید ہے کہ ماخوذ نہ ہو۔ حکومت کے خلاف جن امور پر اصرار کیا جاتا ہے وہ تو مکروہات سے بھی نہیں، علماء نے حفاظتِ جان کے لیے بعض محرمات کے ارتکاب کو بھی فرض فرمایا ہے۔ عالمگیری میں ہے:

السلطان اذا اخذ رجلاً وقال لاقتلنك او لتشربن هذا الخمر كان في غالب رأيه انه لو لم يتناول يقتل فان لم يتناول حتى قتل كان اثماً في ظاهر الرواية عن اصحابه وذكر شيخ الاسلام انه اثم ماخوذ بدمه لان يكون جاهلاً بالاباحة حالة الضرورة اذا كان عالماً بالاباحة كان ماخوذاً هكذا قال محمد رحمه الله تعالى۔

۳۔ کھدر کا استعمال فی نفسہٖ مباح ہے لیکن اس نیت سے پہننا جو سوال میں مذکور ہے ممنوع ہے کہ مباح اشیاء کا استعمال اچھی نیت سے مستحسن ہے اور بُری نیت سے مکروہ۔

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی نیت سے نہ قانون نمک کے توڑنے کا حکم د
دیا ارشاد مبارک کا مقصود ہے کہ اگر کوئی حکومت نمک پر محصول لے تو اس کی مخالفت کر کے ایسے
قانون کو توڑ دیا جائے۔ غرض بہر حال مذکور محض کذب ہے۔ فقط [1]

محمد مظہر اللہ غفر اللہ لہٗ
مسجد جامع فتحپوری

اب ہم قارئین کرام کے سامنے ایک فتویٰ اور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مستفتی نے باختلاف
الفاظ یہی چار سوال جمعیۃ العلمائے ہند کے قائمقام صدر یعنی مفتی کفایت اللہ دہلوی سے اُن
جواب مانگا۔ ہم مفتی صاحب موصوف کے جواب کو حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین
مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ مصنف خزائن العرفان لا لکتۃ العلیا کی تنقید سمیت پیش کرنا چاہتے ہیں
تاکہ قارئین کے سامنے تصویر کے دونوں رُخ آجائیں اور فریقین کا موقف سمجھنے میں کسی قسم
وقت محسوس نہ ہو کیونکہ دونوں حضرات ہی اپنی اپنی جماعت کے معتمد علیہ اور چوٹی کے علماء میں
شمار ہوتے تھے۔ لیجیے وہ استفتاء مع جواب و تنقید پیش خدمت ہے:

استفتاء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم و آلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد۔
فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین امورات ذیل میں۔ جواب مع ادلۂ شرعیہ بیان
اولاً: ایک شخص غیر مسلم و غیر معاہد حکم کرتا ہے کہ قوانین مروجہ حکومت حاضرہ
خلاف ورزی اُس کی قوم اور اُس کے ہم وطن کریں جس سے رام راج حاصل ہوگا۔ بعد
قانون شکنی بغیر استطاعت اندفاع و بغیر کوشش اندفاع برداشت کرنے کی حتیٰ کہ گولی چلنے
وقت گولی کو اپنے سینے پر لینے کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اُس کے حکم کی تعمیل کر

---

[1] مسعود احمد، پروفیسر فتاویٰ مظہری، ص ۳۲۹ تا ۳۳۲

تو شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

ثانیاً: اگر اُس غیر مسلم کے حکم کی تعمیل میں کوئی مسلمان اِس خطرہ میں یہ جانتے ہوئے کہ گولی لگنے سے موت واقع ہوسکتی ہے، اپنے آپ کو مبتلا کرے اور گولی لگنے سے مرجائے تو اُس کی موت کیسی موت ہوگی؟ آیا اس کو شہادت کہیں گے یا خودکشی کہہ سکتے ہیں؟

ثالثاً: ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ کھدر پہنو۔ اس کی تعمیل میں کوئی مسلمان کھدر پہنتا ہے اور فخر کرتا ہے کہ میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی اور اُس حکم کو فرض قرار دے کر دوسرے مسلمانوں کو اُس غیر مسلم کے حکم پر آمادہ کرتا ہے اور جو شخص کھدر نہ پہنے اُس سے نفرت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا کھدر پہننا، حکمِ غیر مسلم کی تعمیل کو فرض سمجھنا، کھدر نہ پہننے والے مسلمان سے نفرت کرنا کیسا ہے؟

رابعاً: حکومتِ حاضرہ کی طرف سے نمک بنانے پر محصول لیا جاتا ہے۔ ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ یہ محصول دیئے بغیر نمک بناؤ اور گرفتار ہو جاؤ۔ اس پر ایک مسلمان کہتا ہے کہ اس نے باوجود غیر مسلم ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس لیے غیر مسلم کے حکم کی تعمیل ہر مسلم پر فرض ہے۔ مسلم کا یہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ اور ناجائز ہے تو کیا حکم رکھتا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب

غالباً یہ سوالات تحریکِ حاضرہ سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا ہے تو تحریرِ سوالات میں کس قدر تلبیس سے کام لیا گیا ہے جو مناسب نہ تھا، بلکہ چاہیے یہ تھا کہ واقعہ صاف صاف ذکر کرکے اُس کا حکم ذکر کیا جاتا۔ مثلاً سوال اوّل یُوں کہنا چاہیے تھا کہ ہندوستان میں ایک غیر ملکی حکومت کا جبر و تسلط ہے، جس کو ہندوستان کے رہنے والے کسی طرح پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانیوں کی خواہش ہے کہ پردیسی قوم جو ہزاروں میل دُور سے آکر ہمارے وطن و ملک پر جبراً قابض اور مسلط ہے اور ہمارے تمام خزائن اور منافع کو ہمارے ہاتھوں سے چھین کرلے جارہی ہے اور جس کی بدولت اہلِ ملک بھوکے اور محتاج ہوگئے ہیں، جلد سے جلد ہمارا ملک خالی کردے

تاکہ اہلِ ملک خود اپنی مرضی کے موافق حکومت قایم کریں اور اپنے ملکی ذخائر سے خود متمتع ہوں، لیکن
یہ پردیسی حکومت کسی طرح ہندوستانیوں کی خواہش کا احترام کرنے کو تیار نہیں ہوتی اور اپنی مادی
طاقت کے بل پر جبراً حکومت کر رہی ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس مادی قوت اور طاقت نہیں
کیونکہ تمام مادی طاقتیں اور قوتیں اس پردیسی قوم نے اپنے قبضہ میں کر رکھی ہیں - حتیٰ کہ
ہندوستانیوں کو اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے بھی ہتھیار
رکھ سکیں۔ اس لیے ہندوستان کی ایک ملکی مجلس نے جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے
شریک ہیں، یہ طے کیا کہ اس غیر ملکی حکومت متسلطِ جابرہ سے آزادی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ
اور وہ یہ کہ اس کے جبریہ قوانین کی خلاف ورزی کی جائے اور اس سلسلے میں جو تکالیف اور مصائب
برداشت کرنے پڑیں ان کو برداشت کیا جائے گا اور اپنی طرف سے تشدد پر ہرگز اقدام نہ کیا جائے
تاکہ تحریکِ آزادی کی کامیابی کی امید ہو، ورنہ بصورتِ تشدد حکومت کو تشدد کا بہانہ مل جائے گا
اور وہ اپنی مادی قوت سے قوم کو تباہ کر دے گی۔ خلاف ورزیِ قوانین کو عملی جامہ پہنانے کیلئے
ملک میں سے ایک شخص تیار ہوا جو غیر مسلم تھا۔ اس مجلسِ مشترک نے اس کو اس مظلومانہ جنگ
کی انجام دہی کے لایق سمجھ کر اس جنگ کی تکمیل کے اختیارات دے دیئے۔ اب وہ غیر مسلم
تمام ہندوستانیوں کو جنگ کے آداب بتا رہا ہے اور قوم کو لڑا رہا ہے، تو آیا اس کے حکم
کی تعمیل جائز ہے یا نہیں اور اس مظلومی کی جنگ میں اگر مطالبۂ حقِ آزادی کی وجہ سے کسی
جان تلف ہو جائے تو وہ شہید ہو گا یا نہیں اور آیا بحالاتِ مذکورہ آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے
آپ کو ایسے خطرات میں مبتلا کرنا، جس میں جان تلف ہو جانے کا خطرہ ہے، جائز ہے
یا نہیں؟ سوال کی صحیح شکل یہ ہے۔

اب اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قومیں آباد ہیں۔ مسلمانوں
کے مذہبی اصول سے مسلمانوں پر ایک غیر مسلم حکومت جابرہ متسلط سے اپنے ملک کو آزاد کرانا
اولین فرض ہے۔ مسلمان جو إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ اور لَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى
الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام
کی اطاعت نہیں کر سکتے اگر وہ اطاعت کرتے ہیں تو مجبوری اور اضطراری طور پر کرتے ہیں اور

اس مجبوری اور اضطرار کو دفع کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو تو ان پر لازم ہو جاتا ہے کہ اُس جبری حکومت کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار پھینکیں۔ یہ وجہ تو ایسی ہے کہ اس میں غیر مسلم شریک نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے (جس میں تمام ہندوستانی اقوام برابر کی شریک ہیں) کہ ایک اجنبی قوم کو جو ہزاروں میل پرے کی رہنے والی ہے کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ہمارے ملک پر ہماری مرضی کے خلاف جبراً حکومت کرے۔ ہم اس کی حکومت کو ایک لمحہ کے لیے بھی طوعاً برداشت کرنے کو تیار نہیں اور یہ ہمارا فطری، عقلی، عرفی، بین الاقوامی حق ہے اور جس تدبیر اور جس طریقہ سے ہم اپنا یہ حق حاصل کر سکیں اختیار کرنے اور عمل میں لانے میں حق بجانب ہوں گے۔ چونکہ ہمارے پاس مادی قوت نہیں ہے اس لیے ہم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے سے معذور و مجبور ہیں۔ مگر عدم تشدد کے ساتھ سول نافرمانی کی مظلومانہ جنگ یقیناً لڑ سکتے ہیں اور اگر ہمارے افراد اس کے لیے تیار ہیں کہ وہ لاٹھیاں کھائیں، سنگینیں اور برچھیاں، چھرے اور گولیاں اپنے سینوں پر لیں تو یقیناً اُن کو اپنے حق آزادی کے مطالبہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کیونکہ اُن کا فعل فی حد ذاتہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر حکومت لاٹھیاں برسائے یا سنگینیں بھونکے یا چھرے اور گولیاں مارے تو یہ بربریت اور ظلم حکومت کا فعل ہے۔ اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے، نہ اُن مظلوموں پر جو اپنا حق مانگتے ہیں اور کسی ایسے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں جس کو وہ پہلے سے ناپسند کرتے تھے مگر مجبوراً اس کی تعمیل کیا کرتے تھے۔

رہی یہ بات کہ یہ جانتے ہوئے کہ حکومت بسا اوقات اپنی بربریت کے مظاہرہ کے لیے لاٹھیاں چلاتی ہے، گولیاں برساتی ہے، کسی کو ایسے خطرہ میں پڑنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مطالبۂ حقوق ہمیشہ خطرات سے پُر ہوتا ہے۔ مذہب و وطن کی آزادی کا مقصد چونکہ اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ اس لیے اس کے راستہ کے خطرات بھی بہت بڑے اور ہیبت ناک ہیں مگر بغیر خطرہ کے تو کوئی مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس کا نتیجہ حکومت کی جانب سے تشدد ہو اور اگر بغیر اس کے کہ ہماری طرف سے کوئی تشدد آمیز حرکت ہو، حکومت بلا وجہ تشدد پر اُتر آئے اور ہمیں مار مار کر زخمی یا شہید کر دے تو اس کی

ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔ مثلاً یہ قصد ہو کہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کریں اور پانچسو اشخاص ایسے مہیا
کیے جائیں جو جمع ہو کر جلسہ کریں اور حکام کے اس حکم سے کہ منتشر ہو جاؤ، منتشر نہ ہوں۔ اس قصد
سے جلسہ شروع کیا گیا اور فرض کرو کہ صرف یہی پانچسو اشخاص تھے اور یہ سب عدم تشدد کے پابند تھے
اب حکام آئے اور انھوں نے حکم دیا کہ منتشر ہو جاؤ۔ انھوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا مگر
کوئی حرکت نہیں کی۔ تو اس صورت میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ ان سب کو آدمیت کے ساتھ
گرفتار کرے اور قانونی کارروائی کرے مگر بسا اوقات حکومت آئین اور انسانیت کے ساتھ
ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے بجائے کبھی تو لاٹھیوں سے پٹوا کر منتشر کراتی ہے اور کبھی گولیاں چلا کر
بہیمیت اور بربریت کا انتہائی مظاہرہ کرتی ہے۔ اس ظالمانہ کارروائی سے مظلوموں کا وہ فعل
ناجائز نہ ہو جائے گا جو عقل و انصاف اور مذہب کے خلاف نہ تھا اور جو لوگ اس بہیمیت و بربریت
کا شکار ہو کر شہید ہوں گے وہ یقیناً مظلومیت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پائیں گے۔ ان کو
خودکشی کا مرتکب بتانا سخت جہالت اور ناواقفیت احکام شرعیہ کی دلیل ہے۔

سول نافرمانی کی اس مظلومانہ جنگ میں جو اپنے وطن اور مذہب کو ایک غیر ملکی حکومت
کے جابرانہ قوانین سے آزاد کرانے کے لیے اپنی وطنی مشترک مجلس کی جانب سے جاری کی گئی ہو
شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت کرنا ناجائز نہیں ہے
کیونکہ یہ کوئی مذہبی رہنمائی اور دینی ہدایت نہیں ہے محض جنگی رہنمائی ہے۔ جو لوگ اسے ناجائز
کہنے کی جرأت کرتے ہیں اور جنگ میں زخمی ہونے والے کو ملامت کرتے ہیں اور مر جانے والو
کو شہادت سے محروم کرتے ہیں وہ پہلے ان مسلمانوں کا حکم بتائیں جو کسی غیر مسلم جابر و دشمن اسلا
حکومت کی حمایت اور اس کی حرص ملک گیری کی خاطر اس کے مقرر کیے ہوئے غیر مسلم افسروں
کی کمان میں رہ کر ان غیر مسلموں کے فوجی احکام کی اطاعت کرتے ہیں اور بسا اوقات غیر مسلم
حکومت کی طرف سے اپنے مسلمان بھائیوں کو نشانۂ بندوق بناتے ہیں یا خود گولی کھا کر مر
جاتے ہیں، ان مسلمانوں کا کیا حکم ہے؟ یعنی کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ حکومت کے غیر مسلم
افسروں کی ماتحتی میں کام کریں اور مسلمانوں پر گولیاں چلائیں اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ غیر مسلم
ججوں کے سامنے اپنے مقدمات لے جائیں اور ان سے خلاف شرع فیصلے صادر کرائیں، لیکن

عمل کریں اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ شرعی معاملات نکاح، طلاق، آمین بالجہر، رفع یدین وغیرہ وغیرہ نزاعات کے مقدمات غیر مسلم حکام کی عدالتوں میں فیصلے کے لیے لے جائیں؟

اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو ان حضرات کا پہلا فرض یہ تھا، وہ قوتِ ایمانی کا ثبوت دینے کے لیے پہلے ان امور کے متعلق فتوے شایع کرتے اور مسلمانوں کو ان مہلکات سے بچانے کی کوشش کرتے، جنھوں نے اُن کے اسلام اور قومیت دونوں کو فنا کر دیا ہے۔

کھدر پہننے کا جو حکم اُس غیر مسلم نے دیا ہے، وہ اُس نے اپنے مذہب کی بنا پر نہیں دیا ہے بلکہ ملک و وطن کی بھلائی اور دشمن کو کمزور کرنے کی ایک تدبیر سمجھ کر دیا ہے اور مسلمان کے لیے کھدر پہننا مذہبی احکام کے بموجب ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے کھدر پہننا ناجائز نہیں ہے۔ یہ حکم اُن احکام سے بدرجہا زیادہ قابلِ تعمیل ہے جو انگریزی عدالتوں کے غیر مسلم حکام سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے کھدر ہی بہترین لباس ہے اور جبکہ پہننے والوں کی نیت اپنے بھائیوں کی فائدہ رسانی بھی ہو تو ایک پنتھ دو کاج، دوہرا ثواب ملے گا۔ اس کو گاندھی پرست فرقہ کا شعار بتانا میری سمجھ سے باہر ہے۔ اوّل تو کھدر پہننے والے مسلمانوں کو گاندھی پرست کہنا ہی ظلمِ عظیم ہے کیونکہ وہ مسلمان ہیں اور خدا پرستی کے سوا کسی کی پرستش اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی۔ وہ تو رسول پرست بننے سے بھی توبہ کرتے ہیں، پھر اُن کو گاندھی پرست کہنا کتنی بڑی جرأت و جسارت ہے؟ دوسرے یہ کہ وکیلوں کے گون اور اسی طرح بعض اداروں کے مخصوص لباسوں کے متعلق ان حضرات نے کبھی کوئی فتویٰ شایع کیا ہے یا نہیں؟ اور اس کو حکومت پرستی یا ادارہ پرستی کی بنا پر ناجائز فرمایا ہے یا نہیں؟ نہیں تو کیوں نہیں؟

قانونِ نمک کی خلاف ورزی اُس کی سہولت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے اختیار کی گئی ہوگی اصل مقصود تو قانون شکنی تھی۔ ابتداءً ایسا قانون اختیار کیا گیا جس کی خلاف ورزی ہر مقام، ہر ہر صوبہ میں ہو سکے اور ہر شخص انفرادی طور پر کر سکے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس قانون کو منتخب کرنے میں یہ فائدہ بھی ظاہر ہوا کہ شریعتِ اسلامیہ میں نمک کو اپنے فطری معادن میں آزاد رکھا گیا ہے۔ اگر کسی مسلمان نے یہ کہہ دیا کہ اس قانون کی خلاف ورزی فی نفسہٖ بھی شریعت

اسلامیہ کے موافق ہے تو اُس نے کیا گناہ کیا ؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے اور میرے خیال میں یہ تو کسی نے
بھی نہیں کہا کہ گاندھی جی نے اِس قانون کی خلاف ورزی کا حکم شرعی احکام کی تعمیل کی نیت سے
دیا ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ گاندھی جی غیر مسلم ہیں۔ وہ اسلامی حکم کی تعمیل کی نیت سے کوئی حکم
دیں یہ بظاہر مستبعد ہے۔ مگر یہ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم اسلامی حکم کے خلاف نہیں ہے۔ جیسے
گاندھی جی شراب چھوڑنے کا حکم دے رہے ہیں تو یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ گاندھی جی نے یہ حکم شریعت
اسلامیہ کی تعمیل کی نیت سے دیا ہے۔ مگر ہر مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم اسلام کے حکم کے موافق
ہے۔ اسلام بھی شراب کو حرام قرار دیتا ہے اس لیے مسلمانوں کو اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے اور
اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

نوٹ از مصنف جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم مقام صدر یعنی جناب مفتی کفایت اللہ شاہجہانپوری
ثم دہلوی کی خدمت میں مذکورہ استفتاء جناب سید ممتاز احمد صاحب (سجادہ
نشین خانقاہ اخوند صاحب فراشخانہ دہلی) نے پیش کیا تھا۔ مفتی صاحب موصوف کا جواب قارئین کی
خدمت میں بلفظہٖ پیش کر دیا گیا ہے۔ جناب محمد ظہور سوداگر چرم عقب لال مسجد مراد آباد نے مذکور
فتویٰ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کر کے اس
اقدام کی غرض و غایت یوں بیان کی :

"یہ فتویٰ حاضر کر کے دریافت کیا جاتا ہے کہ جواب مجیب کا صحیح ہے یا نہیں ؟
اس کی پوری حقیقت سے آگاہ فرمایا جائے۔ بینوا توجروا۔"

حضرت صدر الافاضل نے اس فتوے پر جو تبصرہ فرمایا اُس کا ایک ایک لفظ اہلسنت وجماعت
کے موقف کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ہم موصوف کے تبصرے یا تنقید کو بلفظہٖ پیش کرنا ضروری
سمجھتے ہیں تاکہ قارئین کے سامنے وضاحت کے ساتھ تصویر کے دونوں رُخ آ جائیں :

الجواب بعون الملک الوہاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ۔

سید ممتاز احمد صاحب مستفتی کے سوالات واقعات کے نہایت مطابق تھے

مفتی کفایت اللہ صاحب کا انہیں تلبیس بتانا غلط اور تلبیس ہے۔ مستفتی کا کوئی جملہ ایسا نہیں ہے
جس کا انکار کیا جا سکے اور خود مفتی صاحب سے ممکن نہ ہوا کہ وہ دو چار الفاظ پیش کر کے بتا سکتے
کہ مستفتی نے اُن میں یہ تلبیس کی ہے اور واقعات سے سوال کے فلاں لفظ میں یہ مطابقت
نہیں ہے۔ اس طرح تو ہر ایک کلام کو تلبیس کہا جا سکتا ہے اگرچہ چیز بے ثبوت ہو، جو بات
بے سند ہو، اصحابِ عقل و خرد کے نزدیک لایقِ التفات نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سوالات نے مفتی صاحب کے چھکے چھڑا دیے اور انھیں اپنے طرزِ عمل کو
دیکھتے ہوئے جواب کی کوئی راہ نہ ملی اس لیے آپ نے اُن سوالوں کے جواب کی بجائے اپنی
طرف سے اپنے حسبِ منشا طول طویل سوال بنانے کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنے ہی سوال کا
جواب تحریر فرما دیا۔ یہ طریقہ رائج ہو جائے تو ہر شخص مفتی بن سکتا ہے۔ جب مستفتی کے سوال کا لحاظ
ہی نہ ہو تو اپنا من مانا سوال گھڑنا اور اُس کا جواب دے لینا کیا مشکل ہے۔ مفتی صاحب نے جو
سوال بنایا ہے اُس میں تلبیس ہیں اور اُس کی چند قابلِ لحاظ باتیں یہ ہیں:

۱۔ ہندوستان پر ایک غیر ملکی حکومت کا جبریہ قبضہ۔
۲۔ ہندوستانیوں کی خواہش ہے کہ پردیسی قوم ہمارے خزائن و منافع چھین کر لے جا رہی ہے
اور اس کی بدولت ہم محتاج ہو گئے ہیں۔ وہ ہمارا ملک خالی کر دے۔
۳۔ اہلِ ملک اپنی مرضی کے موافق حکومت قایم کریں اور ملکی ذخائر سے خود متمتع ہوں۔
۴۔ ایک ملکی مجلس نے جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں، اسے کیا
کہ آزادی حاصل کی جائے۔
۵۔ آزادی کا طریقہ جبریہ قوانین کی خلاف ورزی ہے۔
۶۔ اس سلسلہ میں جو مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں، کی جائیں۔
۷۔ مشترک مجلس نے ایک غیر مسلم کو جنگ کے اختیارات دے دیے۔ وہ تمام ہندو مسلمانوں
کو جنگ کے طریقے بتا کر لڑا رہا ہے۔ ان نمبروں میں مفتی صاحب نے جو عیاریاں
اور تلبیسات کی ہیں وہ ملاحظہ کیجیے:

مفتی جمعیۃ کے تلبیسات (۱) کی نسبت یہ دریافت طلب ہے کہ جبری قبضہ سے کیا مراد

یہی کہ اگر اُس ملک کے بعض لوگ اس قبضہ کو پسند نہ کرتے ہوں تو بزورِ قوت اُن پر حکومت قایم رکھی جائے یا کچھ اور معنی ہوں تو مفتی صاحب بیان کریں اور اگر یہی معنی ہیں تو دنیا کی ایسی کون سی حکومت ہے اور جہاں میں ایسی کون سی سلطنت قایم ہوئی جس کا کوئی مخالف ہی نہ ہوا ہو اور جس نے اپنے قیامِ حکومت کے لیے قوت جمع نہ کی ہو؟

۲۔ ہندوستانیوں سے کون مراد ہے؟ تنہا ہندو یا ہندو اور مسلمان سب؟

دوسری صورت میں کیا مفتی صاحب کے علم میں نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں کو پردیسی بتلاتے ہیں اور صرف اپنے آپ کو ہندوستان کے منافع کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس لیے اُن کی خواہش فقط انگریزوں کو نکال دینے سے پوری نہیں ہوسکتی جب تک وہ مسلمانوں کو بھی ہندوستان سے باہر نہ کر دیں اور ایسا وہ بار بار کہہ چکے ہیں اور بہت سے ہندوؤں کے قلم سے ایسے مضامین نکل چکے ہیں اور ملک میں اس کا غلغلہ مچایا گیا ہے۔ اس کو چھپانا اور یہ ظاہر کرنا کہ ہندوؤں کی صرف یہ خواہش ہے کہ حکومتِ موجودہ کو نکال دیں، اس کے بعد ہندوستان کی دولتوں میں مسلمانوں کو برابر شریک بنا لیں گے، یہ سخت تلبیس ہے، محض دھوکا ہے۔ ایسے ہی دھوکے دینے کے لیے سوال دوبارہ گھڑا گیا ہے۔

۳۔ اہلِ ملک سے کیا مراد ہے؟ صرف ہندو یا مسلمان بھی؟ دلیل کے ساتھ بیان کیجیے۔ ہندوؤں نے کب مسلمانوں کو اہلِ ملک قرار دیا ہے؟ یہ بھی تلبیس ہے۔

۴۔ یہ بہت بڑی تلبیس ہے کہ ملکی مجلس جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں۔ ایسی مجلس کونسی ہے؟ آپ کانگریس کو ایسی مجلس بتانا چاہتے ہیں مگر یہ انتہا درجے کی تلبیس اور غایت درجے کا فریب ہے۔ کانگریس میں تمام اقوام کے نمائندے کب شامل ہیں؟ کیا ہندوؤں کے زرخرید اشخاص کسی قوم کے نمائندے قرار دیے جاسکتے ہیں؟ یا آپ کی مٹھی بھر جمعیت جو جمہور اہلِ اسلام کے مخالف ہو کر کانگریس کا کلمہ پڑھنے لگی ہے اور تمام عالمِ اسلام اُس پر ملامت کر رہا ہے، وہ اُن کی نمائندہ ہوسکتی ہے؟ جو قوم کسی جماعت سے ناراض ہو، اُس کو غدار سمجھے، وہی جماعت اُس کی نمائندہ قرار دی جاسکتی ہے؟ مسلمانوں نے کب کانگریسی مدعیانِ اسلام کو اپنا نمائندہ بنایا؟ کھلا ہوا

قائم مقام مقرر کیا؟ کس مجلس میں شرکت کانگریس کی اجازت دی؟ خود نمائندہ بن بیٹھنے سے کوئی شخص کسی کا وکیل ہو سکتا ہے؟ ایسی وکالت آپ نے کس کتاب میں پڑھی ہے؟ اور یہ طریق نمائندگی کون سے دار الافتاء کے حکم سے جائز کیا ہے؟ اسے کہیے جبری نمائندگی اور یہ ہے تلبیس۔ آپ کے مستفتی نے تو تلبیس نہیں کی مگر جناب کا جواب مجموعۂ تلبیسات ہے۔

۵۔ جبریہ قوانین کے معنی بھی بتائیے۔ کیا اگر بارز تعالیٰ ہندوستان میں کہیں اسلامی حکومت قائم ہو تو آپ کے اہل ملک اور آپ کی ملکی مجلس ان قوانین کو برضا و رغبت قبول کرنے کے لیے تیار ہوگی اور جبریہ قوانین نہ بتائے گی؟ بتائے گی اور ضرور بتائے گی اور بتا چکے ہیں اور جبریہ سے زیادہ سخت الفاظ کہہ چکے ہیں اور شرعی قوانین کی نہایت توہین کر چکے ہیں اور اب بھی کہہ رہے ہیں۔

اگر آپ کے علم میں نہ ہو تو مجھ سے دریافت کیجیے گا۔ آپ کو بتاؤں گا اور ذخیرے کے ذخیرے آپ کو دکھاؤں گا، جو اسلامی شریعت اور اسلامی قوانین کی مخالفت و اہانت میں پُر ہیں۔ تو آپ کی ملکی مجلس اور آپ کے اہل ملک سوائے رام راج کے یعنی سوائے اپنے مذہبی قوانین کے دنیا کے ہر ایک قانون کو جبری قانون اور ظالمانہ قانون کہتے ہیں۔ جب اہل ملک کے نزدیک اسلامی قانون بھی جبری اور ظالمانہ ٹھہرا اور جبری قانون سے آزادی مطلوب، تو آپ کے اہل ملک کے نزدیک آزادی رام راج میں منحصر ہوئی۔ آپ نے اس پر پردہ ڈالا، یہ ہے آپ کی تلبیس۔

۶۔ اہل ملک کی کافر عوام کی آزادی یعنی رام راج کے سلسلہ میں تمام مصائب برداشت کی جائیں۔ اس میں لُٹنا پِٹنا، مارا جانا، تباہ ہونا، سب ہی کچھ آ گیا۔ آپ ہی انصاف سے کہیے کہ جو ہندوؤں کی محبت میں اس قدر فنا ہو گیا ہو کہ وہ مسلمانوں کو رام راج قائم کرنے کے لیے مر جانے اور ہلاک ہو جانے کی رائے دیتا ہو، اس کو اگر ہندو پرست کہا جائے تو کیا بیجا ہے؟ رام راج قائم کرنے کے لیے مرنا کو آپ نے لفظ آزادی کے پردہ میں چھپایا۔ اس کو کہتے ہیں تلبیس۔

۷۔ کیا آپ اپنے اعتقاد میں یہ سچ جانتے ہیں کہ بحالتِ موجودہ مسلمانانِ ہند سب کے

یا اُن کا سوادِ اعظم گاندھی کو جنگ کے مکمل اختیارات دینے اور اپنا سپہ سالارِ اعظم بنانے پر راضی ہیں اور یہ جائز سمجھتے ہیں ورقرآن وحدیث میں اس کی اجازت دی گئی ہے؟ شاید ایسا آپ بھی نہ کہہ سکیں اور اتنا موٹا جھوٹ بولنے کی آپ کو جرأت نہ ہو، تو آپ ہی بتائیے کہ جس جماعتِ ذلیلہ نے عامۃ المسلمین کی مرضی اور اُن کے عقیدے کے خلاف ایک مشرک کو سپہ سالارِ اعظم بنایا ہو اور جنگ کے تمام اختیارات تفویض کر دیے ہوں اور اپنے آپ اس کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی ہو، وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہو سکتی ہے؟ اور اس کو مسلمانوں کا نمائندہ بتانا کیسی بڑی تلبیس ہے؟ اور مجلس مشترک کا لفظ اسی تلبیس کے لیے لایا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اس مغالطہ میں ڈالا جائے کہ کانگرس میں ہندو مسلمان ایک حیثیت سے شامل ہیں اور جس طرح کانگرس ہندوؤں کی نمائندہ ہے اُسی طرح تمام مسلمانوں کی بھی نمائندہ ہے۔ یہ ہیں آپ کے تلبیسات۔

سوالات کی شکل اس تنقید کے بعد مولوی کفایت اللہ صاحب کی تقریر سے سوالات کی مسطورۂ ذیل شکل قائم ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۱: ہندو فقط ہندوؤں کو ہندوستانی سمجھتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہی ہندوستان میں عیش و آرام کرنے، یہاں کی سرزمین سے فائدہ اٹھانے، یہاں حکومت کرنے کے مستحق ہیں اور مسلمانوں کو غیر ملکی جانتے ہیں۔ وہ آزادیِ ملک کے لیے جو جد و جہد کریں آیا وہ مسلمانوں کے لیے نافع و جائز ہے یا نہیں؟

سوال نمبر ۲: جمعیۃ العلماء نے عامۃ المسلمین کی رائے کے خلاف کانگرس کی اطاعت منظور کی۔ ایسی حالت میں جمعیۃ العلماء کو مسلمانوں کا نمائندہ کہنا اور محض اس جماعتِ قلیلہ کی شرکت سے کانگرس کو مشترک مجلس ظاہر کرنا فریب ہے یا نہیں، اور جو شخص ایسا کہتا ہے وہ دین و ملت کا غدار ہے یا نہیں؟

سوال نمبر ۳: جس حالت میں عام ہندو اور بالخصوص کانگرسی اسلامی قانون کو انگریزی قانون سے سخت اور قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں، تو یہ باور کرنے کی کیا وجہ ہے کہ وہ قانونِ شریعت کی بے حرمتی نہ کریں گے؟ اور اس کو اپنے ملک کے لیے خوشی دل سے منظور

کرلیں گے۔ اگر ہندو قانونِ شریعت کو منظور نہ کریں تو کیا آپ کے نزدیک ہندو دھرم شاستر انگریزی قانون سے بہتر ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کی وجہ مع دلائل بیان کیجیے!

سوال نمبر ۴: رام راج یعنی وہ حکومت جو ہندو دھرم شاستر کو اپنا قانون بنائے یا اور کسی غیر اسلامی قانون کو رائج کرے اور قانونِ اسلامی کو ناقابلِ نفاذ اور جرم جانے، ایسی حکومت قائم کرنے کے لیے ملک کے امن کو برباد کرنا، اپنے جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا، بلکہ پٹنا، قید ہونا، مرجانا، آیا یہ شرعاً جائز ہے؟ اور یہ موت دین کے لیے ہوگی؟ اور اس موت کو شہادت کہا جائے گا؟ دلائل کے ساتھ بیان کیجیے۔

سوال نمبر ۵: جو کافر رام راج قائم کرنے کے لیے اٹھا ہو اور اس کی سعی کا انجام جو اس کے پیشِ نظر ہے یہی ہوگا کہ ہندوستان کو انگریزوں اور مسلمانوں سے آزاد کرلیا جائے اور ہندو قانون رائج کیا جائے، اس کو جو جماعت اختیاراتِ جنگ تفویض کرے اور اس کے اشارہ و ارشاد کا اتباع اپنے اوپر لازم کرے اور مسلمانوں کو اُن کی فرمانبرداری کی اجازت دے اور مسلمانوں کو یہ مغالطہ دے کہ جس طرح یہ کافر ہندوؤں کا نمایندہ ہے ایسے ہی مسلمانوں کا بھی نمایندہ ہے۔ ایسی جماعت اسلام کی دشمن اور غدار ہے یا نہیں؟ اور اس جماعت میں شامل ہونا اور اس کے حکموں کا ماننا درست ہے یا نہیں؟ شریعت میں ایسی جماعت کا کیا حکم ہے؟ دلائل سے بیان کیجیے۔

یہ تو مولوی کفایت اللہ صاحب کی تحریرِ سوالات پر تنقید کرنے سے جو مشکل سوالات پیدا ہوتی وہ تھی اور اصل مستفتی کے سوالات بدستور لاجواب ہیں۔ مفتی صاحب پر لازم ہے کہ وہ ان دونوں کے جواب تحریر کریں اور دیانت و انصاف کے ساتھ تحریر کریں۔ اب مولوی کفایت اللہ صاحب کے جواب پر ایک نظر کی جائے اور دیکھا جائے کہ اُن کے جواب میں کہاں تک شرع محفوظ ہے۔

مولوی کفایت اللہ کے کلام سے انگریزی حکومت جائز اور سوراجی حکومت اور اس کے لیے کوشش ناجائز ثابت ہوتی ہے

(۱) مولوی کفایت اللہ صاحب نے غیر مسلم حکومت سے ملک کو آزاد کرانا اوّلین فریضہ بتایا

اور اس کی دلیل میں دو آیتیں اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ـــــ اور ـــــ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا پیش کیں اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ ان آیات پر ایمان رکھنے والے علماء کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ اگر کرتے ہیں تو مجبوری و اضطراری طور پر کرتے ہیں اور اس مجبوری کو دفع کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو تو اس سے آزادی حاصل کرنا اُن پر لازم ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون ہے مفتی کفایت اللہ صاحب کے جواب کا جو اُنھوں نے وجہ اول میں بیان کیا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انگریزی حکومت کا اتباع تو جائز ہے کیونکہ وہ مجبوری و اضطرار کیا جاتا ہے اور کانگرس کی مجوزہ حکومت ناجائز ہے کیونکہ اُس میں ہندو اکثریت حکمران ہو گی اور خداوندی احکام کی اطاعت کا کچھ لحاظ نہ کیا جائے گا اور ایسی حکومت بقصد و اختیار طلب کی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اُن کے تسلط سے مجبوراً اُن کے احکام ماننے پڑے ہوں۔ لہٰذا مفتی صاحب کی پیش کی ہوئی آیات کے حکم اور مولوی صاحب کی تصریح سے ثابت ہوا کہ کانگرس کی مطلوبہ حکومت ناجائز، اس کی اطاعت مسلمانوں کو حرام۔ تو اُس ناجائز حکومت کیلئے سعی و امداد ناجائز و حرام اور حکم قرآنی کے خلاف ہے۔

(۲) جواب میں دوسری وجہ مفتی کفایت اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ اجنبی قوم کو حق نہیں کہ ہمارے ملک پر ہماری مرضی کے خلاف جبراً حکومت کرے، ہم اُس کی حکومت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، یہ ہمارا فطری عقلی عرفی بین الاقوامی حق ہے۔ ان لفظوں کے معنی مفتی صاحب بیان کر دیں تو بہت بہتر ہو کیونکہ اس سے متبادر ہو رہا ہے کہ ہمارا ملک کہنے کا حقدار کون ہے اور اس استحقاق کی بنا کس چیز پر ہے؟ اگر کہیے قبضہ پر، تو قبضہ انگریزوں کا موجود ہے۔ اور اگر کہیے پیدائش پر، تو کیا وہ ہندو یا مسلمان اجنبی سمجھے جائیں گے جو ولایت یا عرب یا اور کسی ملک میں پیدا ہوئے اور اُن کے آبا و اجداد ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے، وہ خود بھی ہندوستان میں سکونت رکھتے ہیں۔ اور کیا وہ انگریز جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اجنبی ہوں گے اور ہندوستان کی حکومت بقول آپ کے اُن کا فطری عقلی عرفی بین الاقوامی حق ہو گی اور آپ کے نزدیک اُنھیں جائز ہو گا کہ وہ ہندوستان کو اپنا ملک بنائیں۔ اسی طرح بہت سے افغانیوں، چینیوں، جاپانیوں کے ہندوستان میں اولاد ہوتی ہے، کیا اُن سب کو حق ہے کہ ہندوستان کی

اپنا ملک کہیں، یا ہمارا ملک کہنے کا حق صرف ان لوگوں کو ہے جو ہندوستان میں قدیم سے بود و باش
رکھتے ہیں۔ اس تقدیر پر مسلمان تو مسلمان، ہندو بھی ہندوستان کو اپنا ملک نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ
یہاں کے قدیم باشندے نہیں ہیں۔

ذرا اپنے خداوندان نعمت (ہندو) سے پوچھ دیکھیے کہ وہ ملک کا حقدار کس کو سمجھتے ہیں اور
ملک والا کس کو بتاتے ہیں؟ اجنبی کس کو ٹھہراتے ہیں؟ مسلمانوں سے کتنی مرتبہ کہا گیا ہے کہ تم
ہندوستان سے چلے جاؤ، تمہارا اس ملک میں کوئی حق نہیں ہے۔ جن کے آپ ہمنوا ہیں اور
جن کی محبت میں آپ نے دین ملک کو خیرباد کہہ دیا ہے، وہ ہندوستان کو خالص اپنا بتاتے ہیں
اور مسلمانوں کو غیر ملکی پردیسی کہتے ہیں، جب کانگرس یہ مطالبہ کرے کہ ہندوستان ہمارا ہے، اجنبی
چلے جائیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ انگریز اور مسلمان دونوں بوریا بدھنا اٹھا کر چلتے ہوں۔ اگر جمعیۃ یا
مفتی جمعیت کانگرس کو اس معاملہ میں حق پر سمجھتی ہے تو وہ ہندوستان سے مسلمانوں کے اخراج
کی مساعی ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب نے فطری حق کے کیا معنی لیے ہیں؟ یہی کہ جہاں جو پیدا ہو جائے وہ
جگہ اسی کے لیے ہے، دوسرے کو اس سے کچھ سروکار نہیں یا کچھ اور؟ اگر یہی معنی ہیں تو کرسی کو
دیمک سے، کتاب کو کیڑے سے، چارپائی کو کھٹمل سے اگر آپ صاف کرنا چاہیں تو یہ ظلم ہوگا
کیونکہ بقول آپ کے سر جوؤں کا فطری حق ہے، چارپائی کھٹمل کا فطری حق ہے، کتاب کیڑے کا
فطری حق ہے اور اس کے علاوہ یہود کو جزیرۃ العرب سے نکال دینے کا حکم پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم نے دیا، تو کیا آپ کے نزدیک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فطری حق سلب کیا تھا؟
اور اس ہندوستان میں جو مسلمان دوسرے ممالک سے سلطنت کرنے کے لیے آئے، وہ تو
اجنبی تھے، پردیسی تھے، ہزاروں میل دور کے رہنے والے تھے، ہندوستانی ان کی سلطنت
سے راضی نہ تھے تو کیا آپ کا یہی فتویٰ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر جبری حکومت کی اور
ہندوؤں کا فطری حق چھینا اور وہ سلطنت قطعاً، عقلاً، عرفاً اور بین الاقوامی طریقہ سے ناجائز
تھی؟ اور جس قدر تصرفات انہوں نے ملک میں کیے وہ سب ظلم تھے؟
کھل کر کہیے اور اگر آپ یہ کہنے کے لیے تیار ہوں تو آپ کو اعلان کر دینا چاہیے کہ سلطنت

اسلام کی بنا کی ہوئی املاک و معافیات و اوقاف پر جو مسلمان قابض ہیں، یہ قبضہ ناجائز ہے، سب ہندوؤں کو واپس کر دینا چاہیے۔ اور جس سلطنت کا ہندوستان میں قبضہ ہی ناجائز تھا اُس کو فطری، عقلی، عرفی، بین الاقوامی طور پر کوئی حق ہی حاصل نہ تھا، اُس نے جتنی مسجدیں بنائیں، وُہ بھی سب غصب کی زمین تھیں، اُن کے لیے کیا حکم ہے؟ اگر ہندوؤں کو واپس دینے کا فتویٰ دے دیجیے تو آپ کا کام بن جائے اور جو مطمحِ نظر ہے وُہ پُورا ہو جائے اور آپ کے ہندو آقا یا اولی نعمت خوب خوش ہوں۔ آپ ہندوؤں کی محبت میں اِس قدر محو ہیں کہ اسلام و حکومتِ اسلام پر درپردہ حملے کر رہے ہیں۔ اِس کو ہندو پرستی نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ جس کے مقابل نہ شریعت کی پروا ہے نہ دین کی، نہ مسلمانوں کے طریق و آئین کی۔ انگریزوں کی مخالفت تو ایک بہانہ ہے، اصل مقصود تو ہندوؤں کو راضی رکھنا اور مسلمانوں کو کٹوانا اور مروانا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہلاک کروا دو، پھر ہندوستان صرف تمھارے دوستوں ہی کے لیے رہ جائے گا۔ سوراج ہی سوراج ہے۔ عالی سوراج ہو تو ایسا ہو، قوم مٹ جائے مذہب برباد ہو جائے مگر ہندو راضی رہیں۔ خوب حقِ نمک ادا کیا۔ واہ مفتی! (اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب کرے)

(۳) مفتی کفایت اللہ صاحب نے لکھا ہے:

> "چونکہ ہمارے پاس مادی قوت نہیں ہے اس لیے ہم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے سے مجبور ہیں۔"

یہاں تو انگریزوں سے جنگ آزما ہونے سے انکار اور مجبوریوں کا اظہار ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما رہے ہیں کہ:

> "اگر ہمارے افراد اس کے لیے تیار ہیں کہ وُہ لاٹھیاں کھائیں، سنگینیں اور برچھیاں، چھرے اور گولیاں اپنے سینوں پر لیں تو یقیناً انھیں اپنے حقِ آزادی کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے۔"

مفتی صاحب کی یہ دونوں قلمیں باہم مخالف و متضاد ہیں۔ ایک میں مادی طاقت نہ ہونے سے جنگی مجبوری کا اظہار ہے۔ دوسرے میں لاٹھیاں، سنگینیں، برچھیاں، چھرے، گولیاں کھانے کے لیے مسلمانوں کو اُبھارا گیا ہے۔

جب تمہارے پاس مادّی طاقت نہیں ہے، نہ تم دشمن کو مار سکتے ہو، نہ اُن کی مار کو روک سکتے ہو، تو پھر بے انگریاں اور سنگینیں کھانے سے کیا نتیجہ؟ مسلمان گولیاں کھا کھا کر مر گئے تو آزادی کون لے گا؟ کہو ہمارے یار ہندو، جن کے اوپر ہم مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں۔ کیا ستم ہے، ہندوؤں کے لیے ملک خالی کرانے کے واسطے مسلمانوں کو مرنے اور جان کھونے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

جب آپ کا یہ فتوٰی ہے اور مسلمانوں کو نشانۂ بندوق بننے کا آپ مشورہ دیتے ہیں تو خود کیوں ایسے موقع پر آگے نہیں بڑھتے؟ جناب کی ساری بہادری اُسی وقت تک ہے جب تک بندوق کا رُخ دوسرے مسلمانوں کی طرف ہو اور جو جناب مفتی صاحب کی طرف بندوق کا رُخ ہو تو ابھی معافی مانگ لیں اور فتوٰی یاد نہ آئے۔ یہ فتوٰی اپنے گھر چھوڑ کر سارے جہان کے لیے ہے۔ اپنے گھر پر آفت آتی دیکھیں تو ہندوؤں کی دوستی سے بھی دست بردار ہو جائیں۔ مفتی صاحب کی طرف سے بہت سے بلند آہنگیاں کرنے والے بہادر جو مسلمانوں کو پڑھا دے کر گنوؤں میں دھکیلا کرتے تھے، معافی مانگ بیٹھے اور تحریک کے مخالف ہو گئے۔

اب رہی یہ بات کہ جب کفار سے مقابلہ کی قوت نہ ہو اُس وقت اُن کے مطابق ہو جانا اور اُن کی تیغ و سنان سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالنا جو مفتی صاحب نے جائز کہا ہے، اس جواز سے کونسا جواز مراد ہے؟ جواز سوراجی یا فطری یا عقلی یا بین الاقوامی کون سا جواز؟ جواز فطری اگر ہوتا تو اس پر آپ کوئی شرعی دلیل تحریر فرماتے تو کہاں سے فرماتے؟ شریعت کے تو خلاف کہہ رہے ہیں۔ شریعت نے تو مسلمانوں کو اپنی جان کی حفاظت کا حکم دیا ہے، کسی مباح کام کے کرنے یا ترک کرنے پر اگر اُس کو جان کا اندیشہ ہو اور دشمن قتل کرنے یا کم سے کم کسی عضو کے تلف کرنے پر آمادہ ہو، تو مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ اپنی بات پر اَڑا رہے اور یہ کہے کہ میں تو مباح کام کرتا ہوں، جائز کام کرتا ہوں، ہرگز اِس سے باز نہ آؤں گا۔ اگر اُس نے ایسا کیا اور دشمن نے اُس کو مار ڈالا، تو وہ گنہگار ہوگا اور اُس پر الزام ہوگا کہ اُس نے اپنی جان ہلاک کرنے میں دشمن کو مدد پہنچائی، بلکہ اگر کسی حرام کام پر بھی مجبور کیا جائے، تو شریعت مسلمان کی جان کی حفاظت مقدم رکھتی ہے اور یہ حکم دیتی ہے کہ جان بچانے کے لیے

حرام کا ارتکاب کرے۔ اِس ارتکاب پر اللہ تعالیٰ اُس کو نہ پکڑے گا۔

زیادہ بسط ترک کیا جائے، آپ کو ہدایہ کی صرف ایک عبارت دکھا دی جاتی ہے۔ متداول کتاب ہے، ملاحظہ کیجیے:

ان اکرہ علی ان یاکل المیتۃ او یشرب الخمر فاکرہ علی ذلک بحبس او بضرب او قید لم یحل لہ الا ان یکرہ بما یخاف منہ علی نفسہ او علی عضو من اعضائہ فاذا خاف علی ذلک ان یقدم علی ما اکرہ علیہ وکذا علی ہذا الدم ولحم الخنزیر لان تناول ہذہ المحرمات انما یباح عند الضرورۃ کما فی حالۃ المخمصۃ لقیام المحرم فیما وراءہا ولا ضرورۃ الا اذا خاف علی النفس او علی العضو حتی لو خیف علی ذلک بالضرب الشدید وغلب علی ظنہ ذلک یباح لہ ذلک ولا یسعہ ان یصبر علی ما توعد فان صبر حتی اوقعوا بہ ولم یاکل فہو اثم لانہ لما ابیح کان بالامتناع معاونا لغیرہ علی ہلاک نفسہ فیاثم کما فی حالۃ المخمصۃ۔

مردار کھانا اور شراب پینا شرعاً حرام ہے اور اس سے باز رہنا مسلمان کا دینی و شرعی فرض ہے۔ جو مسلمان مردار کھانے یا شراب پینے سے انکار کرتا ہے، وہ نہ فقط امر جائز کا مرتکب ہے بلکہ اپنے فرض کو ادا کر رہا ہے۔ لیکن جس حالت میں کوئی شخص اُس کو ان چیزوں کے کھانے پینے پر مجبور کرے اور قتل یا قطعِ عضو پر آمادہ ہو جائے تو مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان چیزوں کو نہ کھائے پیئے اور قتل ہو جائے۔ اگر مسلمان نے ایسا نہ کیا اور مارا گیا تو گنہگار ہوگا اور اپنی جان ہلاک کرنے میں دشمن کی اعانت کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ ہدایہ کی مذکورہ بالا عبارت میں یہ مضمون صاف و صریح موجود ہے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کی یہ طبع زاد دلیل کہ حق آزادی کا طلب کرنے والا ایک امر جائز کا مرتکب تھا، حکومت نے اگر گولیاں برسائیں تو یہ اُس کا فعل ہے اور اس کی ذمہ داری مرتکب پر کچھ نہیں۔ یہ اُن کی اپنی ذاتی رائے ہے اور رائے بھی ایسی جو شریعت کے خلاف۔ شریعت کی رُو سے

شخص کو گنہگار بتاتی ہے، اپنے وشمن کی اعانت کا مجرم قرار دیتی ہے، مگر مولوی کفایت اللہ صاحب خلافِ شرع اس کو بری اور بے گناہ کر رہے ہیں۔ آپ کی دلیل نہ قرآن سے مقتبس، نہ حدیث سے، نہ فقہ سے، معلوم نہیں ہندوؤں کے دھرم شاستر سے آپ فتویٰ دیتے ہیں یا کانگریسی قانون سے؟ غرض جو کچھ بھی ہے یہ فتویٰ شریعت حقہ کے خلاف ہے۔

آپ نے اس کی مثال میں لکھا ہے کہ،

"دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کریں اور پانچسو اشخاص ایسے مہیا کیے جائیں جو جمع ہو کر جلسہ کریں اور حکام کے اس حکم سے کہ منتشر ہو جاؤ، منتشر نہ ہوں۔ اس قصد سے جلسہ شروع کیا گیا اور فرض کرو کہ صرف یہی پانچسو اشخاص تھے کہ سب عدم تشدد کے پابند تھے، حکام آئے اور انہوں نے حکم دیا، منتشر ہو جاؤ۔ انھوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ اس صورت میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ ان سب کو آدمیت کے ساتھ گرفتار کرے اور قانونی کارروائی کرے۔ مگر بسا اوقات حکومت آئین اور انسانیت کے ساتھ ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے بجائے کبھی تو لاٹھیوں سے پٹوا کر منتشر کرتی ہے اور کبھی گولیاں چلوا کر بہیمیت و بربریت کا انتہائی مظاہرہ کرتی ہے اور ظالمانہ کارروائی سے مظلوموں کا وہ فعل ناجائز نہ ہو جائے گا، جو عقل و انصاف اور مذہب کے خلاف نہ تھا اور جو لوگ اس بربریت اور بہیمیت کا شکار ہو کر شہید ہوں گے وہ یقیناً مظلومیت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پائیں گے۔ ان کو خودکشی کا مرتکب بتانا سخت جہالت اور ناواقفیتِ احکامِ شرعیہ کی دلیل ہے۔"

مذکورہ بالا خط کشیدہ عبارت مفتی کفایت اللہ صاحب کی ہے۔ اس میں آپ نے خودکشی کا مرتکب بتانے والوں کو سخت جاہل اور ناواقفِ احکامِ شرعیہ تو فرمایا مگر احکامِ شرع نقل نہ فرمائے جو دفعہ ۱۴۴ کو توڑنے پر پٹی جائیں ہلاکت میں ڈالنے والوں کو مظلوم اور شہید قرار دیتے اور آپ وہ احکام بیان کہاں سے کرتے، شریعت میں تھے کہاں، شریعت کے خلاف تو آپ نے خود فتویٰ دیا ہے، احکامِ شرعیہ کے نام پر عوام کو مغالطہ دیا ہے۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی شرعاً فرض نہیں، نہ اس کی موافقت مردار اور شراب کی طرح حرام۔ غایت یہ ہوگی کہ ایک امر جائز ہو،

اس کے لیے جان کا ہلاک کرنا کس طرح مظلومیت اور شہادت ہوگا جبکہ شریعت نے مردار اور حرام شراب جیسی چیزوں سے محترز رہنے پر جان کا ہلاکت میں ڈالنا جائز نہیں رکھا اور ایسے شخص کو اپنے قتل کا معین اور گناہگار قرار دیا جیسا کہ ہدایہ کی مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے۔ شریعت اس شخص کو ظالم معین قرار دیتی ہے اور آپ مظلوم۔ شریعت اس کو گناہگار بتاتی ہے شریعت کے حکم کی آپ صراحتہً مخالفت کر رہے ہیں اور جہالت و ناواقفیت کا الزام دوسروں پر۔

جہالت تو یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے فتوے میں لکھا کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ "ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس کا نتیجہ حکومت کی جانب سے تشدد ہو" اور خود ہی اس کے خلاف یہ فتویٰ دیا کہ دفعہ ۱۴۴ کی مخالفت میں ڈٹے رہنا اور جان دے دینا شہادت ہے ——— ایک ہی صفحے میں اتنا بڑا تعارض! اسی صفحے میں آپ نے قانون شکنی کو جائز قرار دیا اور اسی صفحے میں حکومت سے قانونی کارروائی کرنے اور دفعہ ۱۴۴ کا خلاف کرنے والوں کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا۔ جس قانون کی آپ مخالفت کرتے ہیں اسی قانون کے نفاذ کرنے کی گورنمنٹ سے استدعا کرتے ہیں، مفتی صاحب یہ فتویٰ کس خمار میں بیٹھے لکھ رہے تھے، جو اپنی ہی بات خود بار بار کاٹتے تھے اور عاقلہ نباشد کا مضمون پیش آ رہا تھا۔ آپ کے اس فتوے نے بہت سے مسلمانوں کی جانیں کھوئیں، جنھوں نے شہادت سمجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا اور خدا جانے اور کتنے آپ کی تیغِ ستم سے قتیل ہوں گے اور آپ کے اس خنجر خونخوار کی دھار سے موت کے گھاٹ اتریں گے، مسلمانوں کو تو یہ غلط فتویٰ دے کر مروا ڈالو اور ہندوؤں کے لیے ملک خالی کر دو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے۔

مولوی کفایت اللہ نے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت جائز کر دی

اس فتوے میں بہادر مفتی نے لکھ دیا کہ شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت ناجائز نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں، اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے تو آپ رسول نافرمانی اور قانون شکنی کا حکم کس طرح دے سکتے ہیں؟ آپ کی جو بات ہے متضاد، اس سے بھی درگزر کیجیے تو یہ بتائیے کہ غیر مسلم کے احکام کی اطاعت کا جواز جناب نے کس دلیل شرعی سے نکالا ہے؟

آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ اپنے فتوے کے اول میں لکھ چکے تھے، "مسلمان جو [illegible]

الا للہ — اور — وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا پر ایمان رکھتے ہیں
لہٰذا طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے" یہ آپ ہی کا مقولہ تھا اور
آپ ہی غیر مسلم کے احکام کی اطاعت جائز بتا رہے ہیں ۔ اس میں تو یہ تعمیم تھی کہ کسی وقت کسی
طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت جائز نہیں ۔ اب کون سی طرح جواز کی نکل آئی؟ یا گاندھی جی
کے احکام کو خداوندی احکام سمجھ لیا؟ معاذ اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

وہ آیتیں جو آپ نے خود نقل کی تھیں اُن پر اب عمل کیوں نہیں ہے؟ اب ان کے خلاف
کیوں گاندھی کی اطاعت جائز کی جا رہی ہے؟ غرض مفتی صاحب کے فتوے کا بطلان خود ان کے
کلام سے بھی ثابت ہوا۔ گاندھی کی اطاعت اور اسے رہنما بنانا، اس کا ماتحت اور لشکری بننا
کسی طرح بھی جائز نہیں ۔ انگریزوں کی اطاعت کے جواز کی وجہ تو مفتی صاحب نے مجبوری بتائی
تھی یہاں تو کوئی مجبوری بھی نہیں ہے ۔ پھر یجعل اللہ للکٰفرین علی المؤمنین کی مخالفت
کر کے گاندھی کی اطاعت کس طرح جائز کی جاتی ہے؟ یہ چند باتیں نمونہ کے طور پر کہہ دی گئیں، فتویٰ
بہت اغالیط پر مشتمل ہے ۔ اگر مفتی صاحب نے قلم اٹھایا اور چاہا تو ان کے باقی ماندہ اغالیط بھی
پیش کیے جا سکیں گے ۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو راہِ ہدایت نصیب فرمائے، کجروی و گمراہی سے
بچائے ۔ آمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سید المرسلین محمد وآلہ واصحابہ اجمعین ۔

کتبہ العبد المعتصم بحبلہ المتین
محمد نعیم الدین عفا عنہ المعین[1]

مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مفتی اعظم دہلی شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی، مولانا سلیمان اشرف
بہاری، مولانا قاضی احسان الحق نعیمی اور مولانا مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات جنہوں نے
گاندھوی فرقے کے خلاف چند نگارشات پیش کی ہیں، یہ اور دیگر تمام علمائے اہلسنت جو ہر قدم پر
مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے، یہ بریلی کے اس مردِ حق آگاہ کی فوج کے
جرنیل اور سپاہی وغیرہ تھے جس کو اللہ رب العزت نے چودھویں صدی کی تجدید کا منصب مرحمت

---

[1] نعیم الدین مراد آبادی، مولانا: السواد الاعظم (مراد آباد) بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ، ص ۲ تا ۱۸

فرمایا تھا، جو مسلمانوں کی ہر بڑے اور چھوٹے معاملے میں رہنمائی کر رہا تھا، جو ہر گمراہ اور گمراہ گر کا ناطقہ
بند کرنے میں پیش پیش تھا، مصری کچھار کے جس شیرِ قرآن کے روبرو ہونے کی نہ کسی شیخ الہند
کہلانے والے کو جرأت ہوئی نہ کسی شیخ الاسلام کو، جس کے سامنے نہ کوئی امام الہند زبان کھول
اور نہ شیخ الکل، جس کے بالمقابل نہ کسی برطانوی قطب الاقطاب کا چراغ جل سکا نہ تخریب دین کے
سلسلے میں برٹش گورنمنٹ سے چھ سو روپیہ ماہوار معاوضہ لینے والے حکیم الامت کا۔ وہ امام محمد غز
امام فخر الدین رازی اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم جیسے سابقہ مجددین کی طر
دین و ملت کی تجدید کا فریضہ ادا کر رہا تھا، گمراہ گروں کے جملہ شبہات کو مٹا کر دلائل و براہین سے ق
مطلع صاف کر رہا تھا۔ چنانچہ دنیائے اسلام کے اُسی فقیہ اعظم، مرکز دائرۂ تحقیق اور مرجع
خاص و عام کے سامنے اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر حاکم علی نقشبندی مجددی اور اسلا
ائی اسکول لائلپور کے سابق ہیڈ ماسٹر چودھری عزیز الرحمٰن نے یکے بعد دیگرے دو استفتاء ۱۹۲۰
میں اس وقت پیش کیے جب گاندھی کی آندھی چڑھی ہوئی تھی۔ نام نہاد تحریک خلافت اور ترک م
کے ڈنکے کی صدائے بازگشت سے ملک کا ہر گوشہ گونج رہا تھا۔ آپ نے دلائل و براہین سے
ایسا جواب دیا، جس کی نظیر اس موضوع پر لکھے ہوئے سارے اسلامی لٹریچر میں پائی نہیں جا
وہ جواب المحجۃ المؤتمنہ کتاب کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اس
زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے، اسکولوں اور کالجوں میں اسے رائج کیا جائے کیونکہ ا
لحاظ سے یہ کتاب وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ یہی وہ قومی نظریہ کا وہ انمٹ سبق ہے
جو آخر کار ہندو کے چرکے کھانے کے بعد علامہ اقبال مرحوم اور محمد علی جناح جیسے بیدار مغز لیڈ
کو بھی اپنانا پڑا اور جو قیامِ پاکستان کا باعث ہوا۔ آپ نے دلائل و براہین سے جواب د
ہوئے ترکِ موالات کی تبلیغ کرنے والے علماء اور لیڈروں کی حالت پر اظہار تأسف کیا
فرمایا:

"افسوس اور سخت افسوس یہ کہ آج آپ کو جتنے لیڈر دکھائی دیں گے، وہ اور ان کے
بازو اور ان کے ہم زبان عام طور پر اُنھیں اسکولوں کالجوں کے کاسہ لیس ملیں گے
اُنھیں سے بڑی بڑی ڈگریاں ایم۔ اے، بی۔ اے کی پاس ہوئے ملیں گے

کیا اُس وقت اُن میں یہ خباثتیں نہ تھیں؟ ضرور تھیں مگر ان صاحبوں کو مقبول اور
منظور تھیں۔ اور اب جو اُگلا کھلا، تو صرف ایک گوشہ انگریزوں کی طرف کی اور وہ
بھی شریعت پر زیادت کے ساتھ کہ اُن سے مجرد معاملت بھی حرام قطعی بلکہ کفر اور
مشرکوں کی طرف کی پہلے سے بھی زیادہ پٹ ہو گئی کہ اُن سے وداد و اتحاد واجب،
بلکہ اُن کی غلامی و انقیاد فرض، اُنھیں راضی کر لیا تو خدا کو راضی کر لیا۔ تو ثابت ہوا
کہ اسلام ان حضرات کو جب مدِنظر تھا، ورنہ ایسی مخرّبِ دین تعلیموں سے بھاگتے
نہ اب مدِنظر ہے، ورنہ مشرکوں کے اتحاد و انقیاد کے فتنے نہ جاگتے۔[1]

قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر کفار سے ترکِ موالات کا حکم دیا ہے کہ گاندھوی علماء کی جراُت کا
اندازہ بھلا کون کرسکتا ہے جنھوں نے قرآن و سنّت کے صریح احکام کو پس پشت ڈال کر افراط و تفریط کا
اس ایک ہی مسئلے میں وہ المناک منظر دکھا دیا جو تاریخ کا ایک شرمناک باب ہو کر رہ گیا ہے۔ ترکِ
موالات کے فتوے جاری کرکے انگریزوں سے محض معاملت بھی حرام ٹھہرانے لگے اور دوسری
جانب مشرکین جن سے نہ صرف موالات جائز رکھے بلکہ اُن کی غلامی کو اپنے اُوپر فرض قرار دے لیا اور
اُن کی تبلیغ کا مرکزی نقطہ یہی ہو کر رہ گیا۔ اعلیٰحضرت، مجدد مائۃ حاضرہ، امام احمد رضا خاں بریلوی
قدس سرہٗ نے گاندھوی علماء کے اس طرزِ عمل پر یوں تنبیہ فرمائی تھی:

"ترکِ معاملت کو ترکِ موالات بنا کر قرآنِ عظیم کی آیتیں کہ ترکِ موالات میں ہیں
سُوجھیں، مگر فتویٰ مسٹر گاندھی سے، اُن سب میں استثنائے مشرکین کی پچر
لگالی کہ آیتیں اگرچہ عام ہیں مگر ہندوؤں کے بارے میں نہیں۔ ہندو تو
ہادیانِ اسلام ہیں۔ آیتیں صرف نصاریٰ کے بارے میں ہیں اور نہ کل نصاریٰ فقط
انگریز اور انگریز بھی کل تک ان کے مورد نہ تھے، حالاتِ حاضرہ سے ہوئے۔
ایسی ترمیمِ شریعت و تغیرِ احکام و تبدیلِ اسلام کا نام خیرخواہیٔ اسلام رکھا ہے۔
ترکِ موالاتِ کفار میں قرآنِ عظیم ایک دو دس بیس جگہ تاکید شدید پر اکتفا نہ

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، مطبوعہ بریلی، ص ۱۶

فرمائی بلکہ بکثرت، جا بجا کان کھول کر تعلیمِ حق سنائی اور اس پر بھی تنبیہ سنا دی کہ،
قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ہم نے تمھارے لیے آیتیں صاف کھول دی ہیں اگر تمھیں عقل ہو۔

مگر توبہ! کہاں عقل اور کہاں کان! یہ سب تو وداد ہنود پر قربان۔ لاجرم ان سب ہندوؤں کا استثناء کرنے کے لیے بڑے بڑے آزاد لیڈروں نے قرآن عظیم میں تحریفیں کیں۔ آیات میں پیوند جوڑے، پیش خویش واحد قہار کو اصلاحیں دیں۔ ان کی تفصیل گزارش ہو تو دفتر طویل نگارش ہو۔[1]

گاندھوی علماء جو رام راج (سوراج) کی خاطر ہندوؤں پر نثار تھے، ان کے جذبہ سے بے دام ہو کر اللہ جل شانہ سے منہ پھیر بیٹھے، خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا سے عاری ہو کر ترکِ موالاتِ کفار کی آیت میں ہنود کا استثناء کرتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی خاطر سوراج کا نام آزادی اور ہنود کی غلامی کو ہندو مسلم اتحاد بتا کر ہلکا ٹھہراتے تا کہ عام مسلمان ان کی اسلام دشمنی اور ملت فروشی پر مطلع نہ ہو جائیں۔ اس پر فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

"مقصود سیلف گورنمنٹ ہے، جس کی صاف تصریح بڑے بڑے لیڈران نے کر دی، بلکہ عجز دیکھ کر مشرکوں کا دامن پکڑا، انھیں اپنا یار و انصار بنایا، اوروں کو چھوڑ دیجیے، مولویوں میں گنے جانے والے لیڈر فرماتے ہیں: ہم ہندوستان کی آزادی کو ایک فرض اسلامی سمجھتے ہیں، اس کے لیے ضرورت ہے کہ عام اتحاد ہو اور پوری کوشش سے مقصد حاصل کیا جائے۔ حالانکہ مشرکوں سے ایسی استعانت نصِ قرآنی کے خلاف اور قطعاً حرام بلکہ صراحۃً قرآن کریم کی تکذیب ہے۔"[2]

قرآن کریم نے جملہ کفار سے ترکِ موالات کا حکم دیا ہے۔ گاندھوی علماء نے ہنود کی محبت سے سرشار ہو کر مشرکینِ ہند کا سورۂ ممتحنہ کی آیت کریمہ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ ...... سے استثناء نکال کر روح

---

[1] امام احمد رضا خاں بریلوی، امام، المحجۃ المؤتمنہ، مطبوعہ بریلی، ص ۱۶، ۱۷
[2] ایضاً، ص ۵۶

کر دیا۔ بہر حال آپ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد کتب معتبر یعنی تفاسیر و احادیث، فقہ و فتاویٰ کے حوالوں سے اس کی پانچ تفاسیر پیش کیں کہ:

۱۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک بنو خزاعہ کے متعلق ہے۔

۲۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے اس آیت کے نزول تک مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت نہیں کی تھی۔

۳۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے کفار کی عورتیں اور بچے مراد ہیں۔

۴۔ اکثر مفسرین و محدثین کے نزدیک یہ حکم والدۂ اسماء بنت ابوبکر کے متعلق ہے۔

۵۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ مطلق ان کافروں کے بارے میں ہے جو مسلمانوں سے نہ لڑے اور اس معنی کے لحاظ سے یہ آیت منسوخ ہے۔ حضرت امام اہلسنت نے وضاحت فرمائی کہ ہمارے اکابر احناف کے نزدیک یہ آیت دربارۂ اہل الجہاد اس لحاظ سے احناف کے نزدیک یہ آیۂ کریمہ محکم ہے۔ اس وضاحت کے بعد آپ نے ہنود کے بے شمار مظالم شمار کر کے ہندو نواز لیڈروں کو یوں مخاطب کیا:

> آپ کوئی ستم رسیدہ مسلمان ان لیڈروں سے یہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ اے استیوں پر مسلمان بننے والو! ہندوی اسلام کا ظاہری تانا تننے والو! کچھ حیا کا نام باقی ہے تو ہندوؤں کی گنگا میں ڈوب مرو۔ اسلام و مسلمین و مساجد و قرآن پر یہ ظلم توڑنے والے، کیا یہی تمہارے بھائی، تمہارے چہیتے، تمہارے پیارے، تمہارے سردار، تمہارے پیشوا، تمہارے مددگار، تمہارے غمگسار، مشرکین ہند نہیں؟ جن کے ہاتھ آج تم بکے جاتے ہو، جن کی جے مناتے، جن کی غلامی کے گیت گاتے ہو؟ [1]

گاندھوی علماء کہتے تھے کہ تمام ہندو تو مسلمانوں سے نہیں لڑتے بلکہ وہ بعض ہیں جنہوں نے مسلمانوں پر بعض جگہ مظالم ڈھائے، لہٰذا سب کو محارب نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ حالانکہ ان کی یہ بچی اسلام دشمنی

---

[1] احمد رضا خاں، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۲۷

اور بت پرست نوازی کی آئینہ دار ہے کیونکہ قرآن کریم نے محارب یا غیر محارب کی تقسیم و تفریق نہیں فرمائی بلکہ جملہ کفار و مشرکین سے موالات رکھنا حرام قرار دیا ہے۔ گاندھوی حضرات کی راہ فرار بند کرتے ہوئے فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اب جس شہر، جس قصبہ، جس گاؤں میں چاہو آزما دیکھو۔ اپنی مذہبی قربانی کے لیے گائے پچھاڑو، اس وقت یہی تمہاری باتیں پسلی کے نکلے، یہی تمہارے سگے بھائی بنی تمہارے منہ بولے بزرگ، یہی تمہارے آقا، یہی تمہارے پیشوا، تمہاری ہڈی پسلی توڑنے کو تیار ہوتے ہیں یا نہیں؟ ان متفرقات کا جمع کرنا بھی جہنم میں ڈالیے۔ وہ جو آج تمام ہندوؤں بلکہ تم سب ہندو پرستوں کا امام ظاہر و بادشاہ باطن ہے یعنی گاندھی، صاف کہہ چکا کہ مسلمان اگر قربانیِ گاؤ نہ چھوڑیں گے تو ہم تلوار کے زور سے چھڑا دیں گے۔ اب بھی کوئی شک رہا کہ تمام مشرکین ہندوین ہم سے محارب ہیں۔ پھر انھیں لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ میں داخل کرنا نری بے حیائی ہے یا صریح بے ایمانی بھی!" [۱]

مجدد مائۃ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے موالات کے بارے میں انتہائی تنزل اختیار کرکے گاندھوی حضرات کی حرکاتِ شنیعہ و افعال و اقوالِ قبیحہ گنائے اور انھیں یوں شرمسار کیا ہے:

"ان صاحبوں سے یہ پوچھ دیکھیے کہ سب جانے دو، کریمہ لَا يَنْهٰكُمُ ہر مشرک غیر محارب کو عام ہو کر محکم ہی سہی اور مشرکینِ ہند میں کوئی بھی محارب نہ سہی۔ اب دیکھو تمہارے ہاتھ میں قرآن سے کیا ہے؟ خالی ہوا۔ افسد تمم عدوا؟ کریمہ لَا يَنْهٰكُمُ نے کچھ نیک برتاؤ، مالی مواسات ہی کی رخصت دی یا یہ فرمایا کہ انھیں اپنا انصار بناؤ؟ ان کے گھرے یار ہو جاؤ؟ ان کے طاغوت کو اپنے دین کا امام ٹھہراؤ؟ ان کی جے پکارو۔ ان کی حمد کے نعرے مارو، انھیں مساجد

---

[۱] احمد رضا خاں، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۲۸

مسلیین میں بادب تعظیم پہناکر، تمہیں مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پہلے جاکر، مسلمانوں سے اونچا اٹھاکر، واعتدہ و بادیٰ مسلیین بناؤ، اُن کا سردار جیند اٹھاؤ، کندھے پر ٹکنگی زبان پر بجے یُوں مرگھٹ پہنچاؤ، مساجد کو اُن کا ماتم گاہ بناؤ، اُن کے لیے دعائے مغفرت و نماز جنازہ کے اعلان کراؤ، اُن کی موت پر بازار بند کرو، سوگ مناؤ، اُن سے اپنے ماتھے پر قشقے لگواؤ، اُن کی خوشی کو شعائر اسلام بند کراؤ، گائے کا گوشت کھانا گناہ ٹھہراؤ، کھانے والے کو کمینہ بتاؤ، اُسے مثل سور کے گناؤ، خدا کی قسم کی جگہ رام دہائی گاؤ، واحد قہار کے اسماء میں الحاد رچاؤ، لکھے معاذ اللہ رام یعنی ہر چیز میں رما ہُوا، ہر چیز میں حلول کیے ہُوا ٹھہراؤ، قرآن مجید کے ساتھ رامائن کو ایک ڈولے میں رکھ کر مندر میں لے جاؤ، دونوں کی پوجا کراؤ، اُن کے سرغنہ کو کہو، خدا نے اِن کو تمہارے پاس مذکر بنا کر بھیجا ہے، یُوں ختم نبوت بجاؤ، اللہ عزوجل نے سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہی تو فرمایا اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ تم تو نہیں مگر مذکر اور خدا نے مذکر بنا کر بھیجا ہے اس نے معنی رسالت کا پورا نقشہ کھینچ دیا، ہاں فقط بچایا، اُسے یُوں دکھایا:—
نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے اور امام وپیشوا و بجائے مہدی موعود تو صاف کہہ دیا، بلکہ اس کی حمد میں یہاں تک اونچے اُڑے کہ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست، صاف کہہ دیا کہ آج اگر تم نے ہندو بھائیوں کو راضی کر لیا تو اپنے خدا کو راضی کر لیا، صاف کہہ دیا کہ ہم ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہیں جو ہندو مسلم کا امتیاز اٹھا دے گا۔ صاف کہہ دیا کہ ایسا مذہب چاہتے ہیں جو سنگم و پریاگ کو مقدس علامت ٹھہرائے گا، صاف کہہ دیا کہ ہم نے قرآن وحدیث کی تمام عمر بت پرستی پر نثار کر دی۔ کیا کریمہ لَا يَنْهٰكُمْ میں ان ملعونات وکفریات کی اجازت دی تھی؟[1]

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۹۴، ۹۵

حضرت امام اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ نے دادِ تحقیق دیتے ہوئے فرمایا کہ کفار سے مدد لینے کی تین قسمیں ہیں:

(۱) التجا (۲) اعتماد (۳) استخدام

تینوں صورتوں کی وضاحت کرنے کے بعد حکم یوں واضح فرمایا:

"یہ دونوں صورتیں (التجا و اعتماد) کفار کے ساتھ یقیناً قطعاً نصوص قطعیہ قرآنیہ حرام قطعی ہیں جن کی تحریم کو پہلی اور دوسری دو ہی آیتیں کافی و وافی ہیں ہرگز کوئی مسلمان انہیں حلال نہیں کہہ سکتا۔ استخدام: وہ کہ کافر ہم سے دبا ہوا ہے۔ اس کی چوٹیا ہمارے ہاتھ میں ہو کسی طرح ہمارے خلاف پر قادر نہ ہو۔ وہ اگرچہ اپنے کفر کے باعث یقیناً ہمارا بدخواہ ہوگا مگر بے دست و پا ہے ہم سے خوف و طمع رکھتا ہے۔ خوف شدید کے باعث اظہار بدخواہی نہ کر سکے یا طمع کے سبب مسلمان کے بارے میں نیک رائے ہو گیا۔"[1]

حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۵۰ھ) نے اس استعانت کی صورت کے لیے فرمایا ہے کہ "کالاستعانۃ بالکلاب" مجدد مائۃ حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا:

"دو باتیں افادہ فرمائیں۔ ایک یہ کہ انہیں کتا بنا کر ان سے مدد لے سکتے ہیں، جیسے شکار میں کتوں سے مدد لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ہمارے ہاتھوں میں کتوں کی طرح مسخر ہوں کہ ان کا فعل ہمارے ہی لیے ہو، ہمارے ہی دین کے اعزاز کے واسطے ہو۔ کتے سے شکار میں استعانت کب جائز ہوتی ہے جبکہ وہ وقت شکار سارا کام ہمارے ہی لیے کرے، اس میں سے اپنے واسطے کچھ نہ کرے، اگر شکار مار ڈالا اور اس میں سے اس کا گوشت کھا لیا، شکار حرام ہے۔ تو استخدام بتایا اور وہ بھی سب سے ذلیل تر یعنی جیسے کتے سے خدمت لیتے ہیں اور شرط

---

[1] احمد رضا خان بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۷۱

فرمادی کہ وہ خود سری سے یکسر نکل کر محض ہمارے ہی آلۂ کار بن گئے ہوں ؟ لہ

مجدد ماثرہ حاضرہ قدس سرہٗ نے بتایا کہ استخدام کی صورت میں بھی شرعِ مطہر نے کفار سے استعانت کی عام اجازت نہیں دی ہے بلکہ اس کی چار صورتیں ہیں :

۱۔ اگر استخدام کی صورت میں اُسے رازدار اور دخیل بنانا پڑے تو یہ استعانت بھی حرام۔

۲۔ اگر کوئی منصب یا عہدہ دینا پڑے تو یہ مسلمان پر اس کا استعلا ہونے کے باعث حرام ہے۔

۳۔ بغیر ضرورت بھی کفار سے استعانت جائز نہیں۔

۴۔ ضرورت ہو اور اس میں کافر کو رازدار یا دخیل نہ بنایا جائے اور کوئی منصب نہ دینا پڑے تو استعانت جائز ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا :

" ان شروط و قیود سے مشروط استعانت نہ ان کو رازدار و دخیل کار بنانا ہے کہ آیتِ اُولیٰ کا خلاف ہو، نہ ان سے عزت چاہنا کہ آیتِ دوم کے مخالف ہو، ذلیل وقلیل سے کون عزت چاہے گا، نہ اُسے کوئی ولی و نصیر بنانا کہ کافر باقی آیات کے خلاف ہو، یہ استعانت اگر ایسی نہیں جیسے کُتُبُ بِالْعَسْکَرِ میں تو ایسی ضرور ہے جیسے لوگ چماروں کو پکڑ کر بیگار لیتے ہیں بلکہ جب انھیں کچھ مال دیا جاتا ہے تو ایسے جیسے چمار کو پیسہ دے کر جوتا گنٹھوا لینا ۔ کیا اسے کوئی کہے گا کہ چمار کو دلی و ناصر بنایا ؟ لاجرم کلماتِ علماء مخالفِ آیات نہ ہوئے ...... یہ تھا حکم شرعی جس کی تحقیق و تنقیح بحمد اللہ تعالیٰ اُس درجہ جلیل پر ہوئی کہ ان سطور کے غیر میں نہ ملے گی۔" لہ

آپ نے خلافت کمیٹی کے سبق یعنی ترکِ موالات کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے اس کے مبلغ لیڈروں اور گاندھوی علماء کے ضمیروں کو یوں جھنجھوڑا تھا :

" عقل باور نہیں کرتی کہ ان کی چیخ پکار سے تمام ہندوستان و بنگال و برہما و

لہ احمد رضا خاں بریلوی، امام، المحجۃ المؤتمنہ، ص ۷۱،

لہ ایضاً، ص ۸۸،

افریقہ وجاوا حتیٰ کہ عدن تک کے مسلمان سب نوکریاں، ملازمتیں، زمینداریاں، تجارتیں یک لخت چھوڑ دیں۔ یہ شورشیں تو دو دن سے ہیں۔ صد ہا حرام نوکریاں پہلے ہی سے کر رہے ہیں، وہ تو چھوڑیں نہیں، مباح نوکریاں اور حلال تجارتیں، زمینداریاں کس طرح چھوڑیں گے!

ان جلسوں، ہنگاموں، تبلیغوں، کراموں سے اگر سو دو سو نوکریاں یا دس بیس نے تجارتیں یا دو ایک نے زمینداریاں چھوڑ بھی دیں تو اس سے ترکوں کا کیا فائدہ یا انگریزوں کا کیا نقصان؟ غریب نادار مسلمانوں کی کمائی کا ہزار ہا روپیہ ان تبلیغوں میں برباد جا رہا ہے اور جائے گا اور محض بیکار و نامراد جا رہا ہے اور جائے گا، ہاں لیڈروں، مبلغوں کی سیر و سیاحت کے سفر خرچ اور جلسہ و اجابت کے پلاؤ قورمے سیدھے ہو گئے اور ہوں گے۔ اگر یہ فائدہ ہے تو ضرور نقدِ وقت ہے اور سیر یورپ کا حساب تو روزِ حساب ہی کھلے گا۔"[1]

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات بجوشِ تعصب میں یا اُن لیڈروں کی محبت میں محض بدگمانی قرار دیں لہٰذا ہم تحریکِ خلافت کے سرگرم حامی و کارکن اور گاندھوی بیڑے کے امیر البحر یعنی عالیجناب ابوالکلام آزاد کے اس بارے میں تاثرات پیش کر دیتے ہیں، کیونکہ موصوف کا بیان ایک عینی شاہد کے بیان کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ موصوف کے تجربات و مشاہدات کو عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے یوں نقل کیا ہے:

"خلافت تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کے غریب مسلمانوں نے قابلِ فخر جذبۂ ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بے شمار روپیہ خلافت فنڈ میں دیا۔ پردہ نشین خواتین نے زیور تک اتار کے دے دیے۔ خود لیڈروں کا اعتراف تھا کہ تیس لاکھ روپیہ جمع ہوا ہے لیکن اس مالامال فنڈ کا حشر کیا ہوا؟ ایک قلیل رقم تو ترکوں کو پہنچی باقی روپیہ کو مردے کا مال سمجھ لیا گیا۔ اس زمانے میں خود میں اپنی آنکھوں

---

[1] احمد رضا خان بریلوی، امام، المحجۃ المؤتمنہ، ص ۸۰

دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے لیڈر کس بیدردی سے قومی روپیہ اپنی ذات پر اڑا رہے ہیں[1]
اعلیٰحضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترکِ تعاون کی تبلیغ کرنے والے علماء اور لیڈروں سے براہِ راست بھی استفسار کیا کہ اُن میں سے کتنے حضرات نے اپنے فتووں اور ارشادات کے مطابق برٹش گورنمنٹ سے تعلق ترک کیا ہے؟ نان کوآپریشن کر اُن کی زندگیوں میں کہاں تک عمل دخل ہے؛ چنانچہ آپ نے پوچھا:

"کیا لیڈر صاحبان فہرست دکھائیں گے کہ ان برسوں کی مدت اور لاکھوں روپے کی اشاعت میں اِتنا فائدہ مرتب ہوا ، اِتنوں نے نوکریاں چھوڑیں ، اِتنوں نے تجارتیں ، اِتنوں نے زمینداریاں ؟ طرفہ یہ کہ اُن کے خون گرم حامی ہمدم محرم اخبارات اس ترکِ تعاون پر بڑے بڑے زور لگا رہے ہیں ، خود اپنے اخبارات مطابع کیوں نہیں بند کرتے ؟ ان صیغوں کو تو انگریزوں سے جو گہرے تعلقات ہیں دوسرے صیغوں کو کم ہوں گے ۔ کیا اوروں کے لیے شور و فغاں اور اپنے لیے نوشِ جاں ، اور ایک اخبار و مطابع کیا کہیں ، بڑے بڑے لیڈر بننے والے اسی مرض میں گرفتار ہیں ۔ دیگراں رانصیحت وخود رافضیحت ...... ہجرت کا غُل مچایا اور اپنے آپ ایک تر سکا ۔ جو اُبھار نے میں آگئے اُن مصیبت زدوں پر جو گزری گزری ۔ یہ سب اپنے جورو بچوں میں چین سے رہے ، ہڑا لنگا نہ پھکری ، اور ترکِ تعاون میں بھی کیا کسی لیڈر کے پاس زمینداری یا کسی قسم کی تجارت نہیں ؟ نہ اُن کا کوئی انگریزی یا ریاست میں ملازم ہے ؟ پھر انھیں کیوں نہیں چھوڑتے ؟ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝[2]

مجددِ مائۃ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترکِ تعاون کی تبلیغ کرنے والے گاندھوی علماء اور مسلمانوں کو بے دست و پا بنانے کی گاندھوی اسکیم کو کامیاب بنانے والے لیڈروں سے یہ سوال بھی کیا کہ گاندھی کے بہکانے اور ہنود کی دوستی کے نشہ سے سرشار ہو کر

---

[1] عبدالرزاق ملیح آبادی ، ذکرِ آزاد ، ص ۳۰۰

[2] احمد رضا خاں بریلوی ، امام ، المحجۃ المؤتمنہ ، ص ۸۹ ، ۹۰

اب ترکِ تعاون کا اصول تو پیٹتے پھر رہے ہیں لیکن کبھی ہندوؤں کی طرف بھی دیکھا ہے کہ خود انہوں نے اس ترکِ تعاون کی تحریک پر کہاں تک عمل کیا ہے؟ اگر آپ حضرات کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو صاف نظر آجاتا کہ یہ اسکیم صرف مسلمانوں کو بے دست و پا اور انگریزوں کا موردِ عتاب بنانے کے لیے چلائی گئی ہے چنانچہ آپ نے ان حضرات کو یوں مخاطب کیا:

"بفرضِ غلط و بفرضِ باطل اگر سب مسلمان زمینداریاں، تجارتیں، نوکریاں، تمام تعلقات یکسر چھوڑ دیں تو کیا تمہارے جگری خیر خواہ، جملہ ہندو بھی ایسا ہی کریں گے؟ اور تمہاری طرح بھوکے ننگے رہ جائیں گے؟ حاشا ہرگز نہیں، زنہار نہیں اور جو دعویٰ کرے اس سے بڑھ کر کاذب نہیں، مکار نہیں۔ اتحاد و وداد کے جھوٹے جھگڑوں پر بھولے ہو، منافقانہ میل پر پھولے ہو، سچے ہو تو موازنہ دکھاؤ کہ اگر ایک مسلمان نے ترک کی ہو تو ادھر پچاس ہندوؤں نے نوکری، تجارت، زمینداری چھوڑی ہو کہ یہاں یہی نسبت ہے یا اس سے بھی کم ہے ---- لاجرم نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ تمام اموال، کل دولتیں، دنیاوی جمیع اعزاز، جملہ حاجتیں صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ جائیں اور مسلمان دانے دانے کو بھیک مانگیں اور نہ پائیں۔ ہندو کہ اب انہیں نگلے ڈالتے ہیں جب بے خوف و خطر کچا ہی چبا جائیں۔ یہ ہے لیڈر صاحبوں کی خیر خواہی، یہ ہے حمایتِ اسلام میں جانکاہی۔"[1]

قرآن کریم نے مسلمانوں کو بتایا ہے لَا یَأْلُوْنَکُمْ خَبَالًا کافر تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ گاندھوی علماء اور لیڈروں نے اللہ رب العزت کو سچا نہ جانا، اس کے فرمان پر یقین نہ آیا۔ ایک مشرک خبیث بت پرست گاندھی نے اپنی حمایت کا یقین دلایا تو اُسے ناصر و مرشد اپنا خیر خواہ و مشیر مان لیا۔ مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء ہند، احرار پارٹی وغیرہ تمام جماعتوں نے گاندھی جیسے دشمن اسلام و مسلمین کو اپنا ملجا و ماویٰ اور ہادیٔ مطلق و امام علی الاطلاق بنا لیا۔ اس کی ہر سکیم پر عمل کرنا اپنی سعادت سمجھے اور قرآن و حدیث کی نصوص کو اس پر اس طرح

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، امام: المحجۃ المؤتمنہ، ص ۹۱

منطبق کرنے میں کوشاں رہتے جیسے اصل ارشاداتِ گاندھی ہیں اور قرآن و حدیث تو محض اُس کا حاشیہ اور شرح ہیں۔ یہ حق پرستی نہیں بلکہ زنّار دوستی کی بدمستی تھی، حضرت امام اہلسنّت نے گاندھی کی جملہ اسکیموں کا راز فاش کرتے ہوئے گاندھوی علماء اور لیڈروں کی بے بصری کو واضح کیا اور انتہائی وسیع النظری سے اُس ہجرت، جہاد اور ترکِ معاملت کے مضرات کو یوں الم نشرح کیا تھا،

" آؤ تمہیں قرآن عظیم کی تصدیق دکھائیں اور اُن (ہنود) کی طرف سے میل اور مَیل کا راز بتائیں۔ دشمن اپنے دشمن کے لیے تین باتیں چاہتا ہے،

اوّل یہ اُس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔

دوم یہ نہ ہو تو اُس کی جلاوطنی کہ اپنے پاس نہ رہے۔

سوم یہ بھی نہ ہو سکے تو اخیر درجہ اس کی بے پَری کہ عاجز بن کر رہے۔

مخالف نے یہ تینوں درجے ان پر طے کر دیے اور ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں، خیر خواہی سمجھے جاتے ہیں۔

اوّلاً جہاد کے اشارے ہوئے۔ اس کا کھلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا ہونا تھا۔

ثانیاً جب یہ نہ بنی، ہجرت کا مجرا دیا کہ کسی طرح یہ دفع ہوں۔ ملک ہماری کبڈیل کھیلنے کو رہ جائے۔ یہ اپنی جائدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں یا یُونہی چھوڑ جائیں۔ بہر حال ہمارے ہاتھ آئیں۔ اِن کی مساجد و مزاراتِ اولیاء ہماری پامالی کو رہ جائیں۔

ثالثاً جب یہ بھی نہ بنے تو ترکِ موالات کا جھوٹا حیلہ کر کے ترکِ معاملت پر ابھارا ہے کہ نوکریاں چھوڑ دو، کسی کونسل کمیٹی میں داخل نہ ہو، مالگزاری ٹیکس کچھ نہ دو، خطابات واپس کر دو۔ امر اخیر تو صرف اس لیے ہے کہ ظاہری نام کا دنیاوی اعزاز بھی کسی مسلمان کے لیے نہ رہے اور پہلے تین اس لیے کہ ہر صیغہ و ہر محکمہ میں صرف ہنود رہ جائیں تو اُس وقت کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے؟ مالگزاری وغیرہ نہ دینے پر کیا انگریز چُپ بیٹھے رہیں گے؟ ہرگز نہیں۔ قرقیاں ہوں گی، کھیت نیلام ہوں گے، جائدادیں نیلام

ہوں گی اور ہندو غیرہ بن سکے۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان صرف قُلی بن کر رہ جائیں۔ یہ تیسرا فدیہ ہے"
دیکھا تم نے قرآنِ عظیم کا ارشاد کہ وہ تمھاری بدخواہی میں گئی نہ کریں گے۔ اُن کی دلی تمنا ہے
کہ تم مشقت میں پڑو، والعیاذ باللہ تعالیٰ" [1]

یہ تو تھیں ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء کی باتیں ہیں حالانکہ اُس وقت ہمارے عظیم لیڈر اور پاکستان کے بانی جناب
یعنی ڈاکٹر سر محمد اقبال اور محمد علی جناح جیسے بھی ہندو مسلم اتحاد کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ اقبال
مرحوم بھی کہہ رہے تھے، ع

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

لیکن جب اُن کی آنکھیں کھلیں ہندوؤں کی اسلام دشمنی اور اسلامی تعلیمات پر گہری نظر پڑی تو مجدد الفِ ثانی
اور احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہما والے دو قومی نظریے کو اپنانا پڑا، جس کی ان دونوں بزرگوں نے
اپنے اپنے وقت میں علمبرداری کا فریضہ ادا کیا تھا اور اس کے پیشِ نظر علامہ موصوف کو یہ نظریہ قائم
کرنا پڑا، ع

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

جناب محمد علی جناح کی آنکھیں نہرو رپورٹ کے وقت جا کر کھلیں اور اُنھیں صاف نظر آگیا کہ حقیقت
میں فردوسِ گوش بنانے کے قابل وہی بریلی کے مردِ قلندر کی آواز تھی، جس پر کوئی لیڈر اس لیے
کان دھرنا پسند نہیں کرتا تھا کہ سارے ہی گاندھی کی آندھی میں مست ہو کر تنکوں کی طرح اُڑتے
پھر رہے تھے، بلکہ اندھوی علما اُن کی حرکاتِ قبیحہ و اقوالِ شنیعہ پر شریعت کی مُہریں ثبت کر کے
جہاں لیڈروں کو شترِ بے مہار بنا رہے تھے، وہاں اپنے علم برسوں اور ملت فروش ہونے کا زندہ
ثبوت بھی پیش کر دیا تھا۔ اگر اور بھی پیچھے کی طرف دیکھیں تو اس سے آٹھ سال پہلے ۱۳۳۱ھ/
۱۹۱۲ء میں پہلی جنگِ عظیم کے وقت آپ مسلمانانِ ہند کو یوں فہمائش کر رہے تھے:

"ہندی مسلمانوں میں یہ طاقت کہاں کہ وطن و مال و اہل و عیال چھوڑ کر ہزاروں کوس
(ترکوں کے پاس) جائیں اور میدانِ جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ مگر مال تو
دے سکتے ہیں۔ اس کی حالت بھی سب آنکھوں دیکھ رہے ہیں، وہاں مسلمانوں
پر یہ کچھ گزر رہی ہے یہاں وہی جلسے ہیں، وہی رنگ، وہی تھیٹر، وہی امنگ،

---

[1] احمد رضا خاں بریلوی، المحجۃ المؤتمنہ، ص ۹۲

وہی تماشے، وہی بازیاں، وہی ضیافتیں، وہی فضول خرچیاں، ایک بات کی بھی
کمی نہیں۔ ابھی ایک شخص نے ایک دنیاوی خوشی کے نام سے پچاس ہزار دئیے۔ ایک عورت
نے ایک چھیں وچھاں ہوگا کو پچاس ہزار دیے۔ ایک رئیس نے ایک کالج کو ڈیڑھ لاکھ دیے
اور یونیورسٹی کے لیے تو تیس لاکھ سے زاید جمع ہوگیا۔ ایک رات میں ہمارے اس
مفلس شہر سے اس کے لیے چھبیس ہزار کا چندہ ہوا۔ بمبئی میں ایک کم درجے کے
شخص نے صرف ایک کوٹھری چھبیس ہزار روپے کو خریدی۔ فقط اس لیے کہ اس کے
وسیع مکانِ سکونت سے ملحق تھی، جیسے میں نے بھی دیکھ آیا ہوں۔ اور مظلوم اسلام کی
مدد کے لیے جو کچھ جوش دکھائے جا رہے ہیں، آسمان سے بھی اونچے ہیں اور جو عمل
کارروائی ہو رہی ہے زمین کی تہہ میں ہے۔ پھر کس بات کی اُمید کی جائے؟

بڑی ہمدردی یہ نکالی ہے کہ یورپ کے مال کا بائیکاٹ ہو۔ میں اسے پسند
نہیں کرتا، نہ ہرگز مسلمانوں کے حق میں کچھ نافع پاتا ہوں۔ اوّل تو یہ بھی کہنے ہی کے
الفاظ ہیں، نہ اس پر اتفاق کریں گے، نہ ہرگز اس کو نباہیں گے۔ اس عہد کے
پہلے توڑنے والے جنٹلمین حضرات ہی ہوں گے، جن کی گزر بغیر یورپین اشیاء کے
نہیں۔ یہ تو سارا یورپ ہے پہلے صرف اٹلی کا بائیکاٹ ہوا تھا۔ اس پر کتنوں نے
عمل کیا اور کتنے دن نباہا؟ پھر اس سے یورپ کا ضرر بھی کتنا؟ اور ہو بھی تو کیا فائدہ کہ
وہ سو ترکیبوں سے اس سے دُگنا ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ لہٰذا ضرر رسانی کا ارادہ صرف
وہی مثل ہے کہ کمزور اور چھنکی نشانی۔

بہتر ہے کہ مسلمان اپنی سلامت روی پر قایم رہیں۔ کسی شریر قوم کی چال نہ سیکھیں۔
اپنے اوپر مفت کی بدگمانی کا موقع نہ دیں۔ ہاں اپنی حالت سنبھالنا چاہتے ہیں تو
ان لڑائیوں ہی پر کیا موقوف تھا، ویسے ہی چاہیے تھا کہ
اوّلاً باستثناء اُن معدود باتوں کے جن میں حکومت کی دست اندازی ہو، اپنے
تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اپنے سب مقدمات اپنے آپ فیصل کرتے۔
یہ کروڑوں روپے جو اسٹامپ و وکالت میں گھسے جاتے ہیں، گھر کے گھر تباہ

ہو گئے اور ہوئے جاتے ہیں محفوظ رہتے۔

ثانیاً اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدتے کہ گھر کا نفع گھر ہی میں رہتا۔ اپنی حرفت و تجارت کو ترقی دیتے کہ کسی چیز میں کسی دوسری قوم کے محتاج نہ رہتے یہ نہ ہوتا کہ یورپ و امریکہ والے چھٹانک بھر تانبا کچھ صناعی کی گھڑنت کرکے، گھڑی وغیرہ نام رکھ کر آپ کو دے جائیں اور اُس کے بدلے پاؤ بھر چاندی آپ سے لے جائیں۔

ثالثاً بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدر آباد وغیرہ کے تونگر مسلمان اپنے بھائی مسلمانوں کے لیے بنک کھولتے، سود شرع نے حرام قطعی فرمایا ہے مگر اور سو طریقے نفع لینے کے حلال فرمائے ہیں، جن کا بیان کتب فقہ میں مفصل ہے اور اس کا ایک نہایت آسان طریقہ کفل الفقیہ الفاہم میں چھپ چکا ہے۔ ان جائز طریقوں پر نفع بھی لیتے کہ اُنھیں بھی فائدہ پہنچتا اور اُن کے بھائیوں کی بھی حاجت بر آتی اور آئے دن جو مسلمانوں کی جائدادیں بنیوں کی نذر ہُوئی چلی جاتی ہیں اُن سے بھی محفوظ رہتے۔ اگر غیروں کی طرح جائداد ہی لی جاتی، مسلمان ہی کے پاس رہتی، یہ تو نہ ہوتا کہ مسلمان ننگے اور بنیے چنگے۔

رابعاً سب سے زیادہ اہم، سب کی جان، سب کی اصلِ اعظم وہ دینِ متین تھا جس کی رسّی مضبوط تھامنے نے اگلوں کو اُن مدارجِ عالیہ پر پہنچایا، چار دانگ عالم میں اُن کی ہیبت کا سکّہ بٹھایا، نانِ شبینہ کے محتاجوں کو بلند تاجوں کا مالک بنایا اور اُسی کے چھوڑنے نے پچھلوں کو یُوں چاہِ ذلّت میں گرایا فانّا للہ وانّا الیہ راجعون ○ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

دینِ متین علمِ دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ علمِ دین سیکھنا، پھر اُس پر عمل کرنا اپنی دونوں جہان کی زندگی چاہتے، وہ اُنھیں بتا دیتا اندھا جسے ترقی سمجھ رہے ہو، سخت تنزّل ہے۔ جسے عزت جانتے ہو، اشد ذلّت ہے۔ مسلمان اگر یہ چار باتیں کرلیں تو انشاء اللہ العزیز آج اُن کی حالت سنبھل جاتی ہے۔[1]

---

[1] احمد رضا خان بریلوی، امام: تدبیر فلاح، مطبوعہ لاہور، ص ۳۔۲

جہاد، ہجرت اور ترکِ موالات (نان کوآپریشن) وغیرہ امور پر گاندھی نے مسلمانوں کو کیوں ابھارا؟
اِن کی وجوہات حضرات آپ مجدد ماٰۃ حاضرہ قدس سرہٗ کے لفظوں میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب یہ ملاحظہ ہو کہ
اُس دشمنِ اسلام و مسلمین گاندھی نے کھدر کی تحریک کیوں شروع کی تھی؟ ایک جانب وہ برٹش گورنمنٹ
کو خوش کرنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی صنعت پارچہ بافی کا مقابلہ کرنے سے برطانوی عاجز رہے اور
حکمران ہونے کے باوجود اس صنعت کو مسلمانوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے نہ تباہ کر سکے، گاندھی
نے اپنی حکمتِ عملی سے پارچہ بافوں کو بیکار بٹھا دیا جو اہلِ ملک سے خاطر خواہ دولت کماتے تھے۔
چونکہ اکثر روپیہ ہندو گاہکوں کے ذریعے مسلمان پارچہ بافوں کی جیب میں پہنچتا تھا، لہٰذا ہندو سرمایہ محفوظ
اور مسلمان مفلوج ہو کر رہ گئے۔ اِس حقیقت کی قدرے تفصیل اور قربانی گاؤکو روکنے کا اصل راز
حافظ امیر حسین مرادآبادی مرحوم کی زبانی ملاحظہ ہو:

> ہندوؤں نے دیکھا کہ اگرچہ مسلمانوں کا زمیندار طبقہ تباہ ہو گیا لیکن تجارت کے ذریعے
> یہ دو قومیں عروج کو پہنچ گئیں۔ اب انھیں تباہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ قریشی (قصاب)
> کے لیے تو ذبیحہ گاؤ کے روکنے کی رات دن کوششیں کی جا رہی ہیں، جس سے
> اِس قوم کی مالی حالت کمزور ہو اور مومن قوم (پارچہ بافوں) کے لیے کھدر کی
> تحریک جاری کی گئی، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ مسلمان پارچہ بافوں کی نفیس صنعتوں نے
> ولایت کو شکست دے دی ہے۔ ڈھاکہ کی چکن، چالس کی جامدانی، مئو مبارکپور
> کے ڈوپٹے، سنگی مشروع، غلطہ بھاگلپور کی سلک، خرجا کے تھانے، بنارس
> کے دوپٹے، ساڑھیاں، کمخواب، زربفت، زری وغیرہ وہ کپڑے ہیں جن سے
> ولایت کے جولاہے کبھی مقابلہ نہیں کر سکے اور ولایتی پارچہ جات ان کی قدر و قیمت
> کم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کوئی شخص ان کے مقابلہ میں ولایتی کپڑے پر
> نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ شادیوں میں عام طور پر بنارسی اور مبارکپوری کپڑے کا
> ہزار ہا روپے کا خرچ ہوتا ہے۔ ایک اور تکلیف دہ بات ہندوؤں کے لیے یہ تھی کہ
> بنارس کی نفیس اور قیمتی ساڑھیاں جو سات سات سو روپے قیمت تک کی ہوتی ہیں،
> وہ بکثرت ہندو خریدتے ہیں، یہ تجارتیں ہندوؤں سے نہ دیکھی گئیں اور اس کام کو

> برباد کرنے کے لیے اُنھوں نے کھدّر کی تحریک جاری کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی کروڑہا روپے کی تجارتیں خراب ہوگئیں اور بڑے بڑے کارخانوں کو زبردست نقصان پہنچے۔[1]

مسلمانانِ اہلسنت وجماعت اسلامی تعلیمات کے مطابق برٹش گورنمنٹ اور ہنود سے معاملت کرتے رہے۔ گاندھی کی اُن تحریکوں میں شامل ہوئے جو مسلمانوں کی بربادی کے لیے جاری کی جارہی تھیں اور حکومت یا ہنود کسی کے یار و انصار اور آلۂ کار نہ بنے۔ بفضلہ تعالیٰ سوادِ اعظم کا یہ کارواں سلامتی کے ساتھ قرآنی تعلیمات کے مطابق رواں دواں رہا لیکن سیاسی تنظیم کا فقدان ہونے کے باعث دوسری منظّم جماعتوں کے مقابلے میں خاطر خواہ کام نہ دکھا سکے جبکہ بدخواہان دین وملت اپنی تنظیم کے باعث روز بروز آگے ہی بڑھتے رہے جو ہمارے کوتاہ اندیش لیڈروں کی بے تدبیری اور یارانِ تیزگام کی عیاشی کا زندہ ثبوت ہے۔

علمائے اہلسنّت کی رفتار بے شک سست رہی اور اُنھیں کوئی راسخ العقیدہ لیڈرمیسّر نہ آسکا لیکن بفضلہ تعالیٰ اُن کے قرآنی موقف میں کوئی فرق نہیں آیا نہ ذرا بھر لچک پیدا ہوئی بلکہ آج تک اُسی موقف پر قائم ہیں۔ پاکستان کی تحریک اسی نتیجے کے طور پر اُبھری جس کی آواز حقیقت میں سب سے پہلے سُنّی کانفرنس کے بانی حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا تھا۔ آپ ہی کی آواز کو ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے الٰہ آباد میں پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے لیڈر ہونے کے باعث یہ نظریہ موصوف ہی کی جانب منسوب ہوکر مشہور ہوگیا۔ اِدھر پاکستان کا نام مسلمانوں کی زبانوں پر آنا شروع ہوا اور اُدھر علمائے اہلسنت نے پشاور سے لنکا تک طوفانی دورے کرنے شروع کردیے تاکہ مسلمانوں کو اس کے لیے آمادہ کریں۔ بحمدا للہ تعالیٰ اہلسنت وجماعت نے اپنے علمائے کرام کے بیانات کو بغور سُنا اور حصولِ پاکستان کے لیے سربکف ہوگئے۔ ان دنوں علمائے کرام و مشائخ عظام نے بنارس میں سُنّی کانفرنس کے اجلاس کیے۔ یہ کانفرنس ۲۴ تا ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء

---

[1] امیر حسین مرادآبادی، مولانا، السوادالاعظم، بابت ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ

ہوتی رہی۔ اس میں پانچ ہزار علمائے کرام و مشائخ عظام نے شرکت کی اور حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبۂ صدارت کو تقریباً دو لاکھ کے عظیم الشان تاریخی اجتماع نے سُنا۔ اُسی عظیم الشان تاریخی خطبے میں آپ نے فرمایا تھا:

"حجازِ مقدس جو ہم سُنّیوں کے ایمانیات کا گہوارہ ہے اور جس کے ذرہ ذرہ سے سُنّیوں کی دینی روایات وابستہ ہیں اس پر نجدی فتن و زلازل کو مسلط کر دیا گیا ہے۔ وہ ارضِ مقدس اب تک اُن فتنوں کی آماجگاہ ہے۔ فلسطین کے سُنّی بھائیوں پر بے رحم یہودیت ستم آرائیوں کی مشق کرنے کے لیے مسلط کی جا رہی ہے۔ ہمارے جاوا اور انڈونیشیا کے سُنّی بھائیوں پر توپ اور بم کی بارش ہو رہی ہے اور اُن بے گناہوں کی خطا صرف اتنی ہے کہ وہ سُنّی ہیں اور اپنے مقدس دین کی آزادی کو کسی قدر پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں صرف اہلسنت وجماعت کو پامال کرنے کے لیے (ہندو) اکثریت کا سانڈ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اہلِ باطل کی ٹولیوں کو سُنّیوں پر بھونکنے کے لیے پالا جا رہا ہے اور قیامت یہ ہے کہ سُنّیوں کو ختم کرنے کے لیے جن درندوں کو راشن دیا جاتا ہے اُن کا نام بھی سُنّی رکھا گیا ہے۔"[1]

اہلسنّت وجماعت کو مٹانے اور مغلوب کرنے کی خاطر برٹش گورنمنٹ نے فرقے قائم کیے اُن کی غرض و غایت اور کارگزاری پر روشنی ڈالتے ہوئے اسی خطبے میں آپ نے یوں ارشاد فرمایا تھا:

آج کا وہابی کل سُنّی تھا، آج کا قادیانی کل سُنّی تھا، آج کا خارجی کل سُنّی تھا۔
اس طرح سُنّیوں کے گھر میں آگ لگا دی گئی ہے اور ایک ایک کا شکار کھیل کر سُنّیوں کے خلاف شکاریوں نے مستقل سازش کر رکھی ہے اور انہی پالتو اور شکار کیے ہوئے افراد کے بل بوتے پر آگ مار کر لیڈر سُنّیوں کو آنکھیں دکھاتے ہیں، سِول جنگ کی دھمکی دیتے ہیں۔ کس قدر ہوش ربا واقعہ ہے کہ ہندوستان سُنّی مسلمانوں کا ملک تھا۔ سُنّیوں نے سیکڑوں برس اس پر حکمرانی کی اور تہذیب کی بنیاد

---

[1] سید محمد کچھوچھوی، مولانا، خطبۂ صدارت، ص ۱۰

رکھی لیکن اب ان کا وجود نہ ہماری نظر میں ہے نہ دنیا کی نگاہ میں۔ ہم جہانگیر و عالمگیر کے وارث کچھ نہ رہے اور برطانوی پالیسی کی پیداوار تین تین نفر کی ٹولیاں سب کچھ ہو رہی ہیں۔ امام الہند بننے کی ترکیبیں نکالی جاتی ہیں۔ امیر شریعت اپنے کو کہلایا جاتا ہے۔ ہمارا وہ مقدس و برگزیدہ نام جو ہمارے آقا حضور پُر نور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور ہمارا ایسی مکمل پتہ بتایا تھا مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ یعنی اہلسنت و جماعت ، اُس کا مجرمانہ استعمال اپنے سپیلے وہ کر رہا ہے جو سُنّیوں کو ہلاک کر دینے پر حلف اُٹھا چکا ہے۔ سُنّیوں کے پیسے سے مدرسہ چلایا جاتا ہے اور اُس میں ایسے دل و دماغ تیار کیے جا رہے ہیں جو سُنّیوں کو ستائیں ، جمہوریت اسلامیہ سے ٹکرلیں ، اسلامی اتحاد میں انتشار پیدا کریں ، اسلامی ہم آہنگی کو صدمہ پہنچائیں۔ ہمارے سلاطین و امراء و خواص و عوام کی بنائی ہوئی مسجدوں پر قبضہ ہمارے دشمنوں کا ، ہماری تعلیم گاہوں پر جھنڈا ہمارے مخالفوں کا ، ہماری خانقاہوں میں رسائی خانقاہ شکنوں کی . . . غضب یہ ہے کہ یہ سارے ستم تھے اور تمام مہلک خطرے آپ (علماء و مشائخ) کے سامنے ہیں۔ آپ کے دیکھتے ہوئے سُنّیوں کا جینا دشوار ہو رہا ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے سُنّیوں پر گھیرا ڈال دیا گیا ہے اور آپ کی موجودگی میں آپ کے رسول کی اُمّت دن دہاڑے لوٹی جاتی ہے ۔[1]

اسی خطبے میں حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ پاکستان کا مطلب واضح کیا جو مختلف جماعتوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے علی رؤس الاشہاد فرمایا:

میرے دینی رہنماؤ! میں نے عرضداشت میں ابھی ابھی پاکستان کا لفظ استعمال کیا ہے اور پہلے بھی کئی جگہ پاکستان کا لفظ آ چکا ہے۔ ملک میں اس لفظ کا استعمال روزمرہ بن گیا ہے ۔ در و دیوار پہ پاکستان زندہ باد ، تجاویز کی زبان میں پاکستان ہمارا حق ہے ، نعروں کی گونج میں پاکستان لے کے رہیں گے ، مسجدوں میں مناجات ہوں

---

[1] سید محمد کچھوچھوی، مولانا ، خطبہ صدارت ، ص ۱۰ تا ۱۲

میں، بازاروں میں، ویرانوں میں لفظ پاکستان لہرا رہا ہے۔ اِس لفظ کو پاکستان کا یونینسٹ لیڈر بھی استعمال کرتا ہے اور ملک بھر میں ہر سنگی بھی بولتا ہے اور ہم سُنیّوں کا بھی یہی محاورہ ہو گیا اور جو لفظ مختلف ذہنوں کے استعمال میں ہو اُس کے معنی مشکوک ہو جاتے ہیں جب تک بولنے والا اُس کو واضح طور پر نہ بتا دے۔

یونینسٹ کا پاکستان وہ ہوگا جس کی شمشیر، سردار جوگندر سنگھ کے ہاتھ میں ہوگی۔ لیگ سے نہ پاکستان کے متعلق دوسری قومیں متحیّر ہیں کہ اب تک اس نے پاکستان کے معنی نہ بتائے اور جو بتائے وہ اُٹھتے بیٹھتے ایک دوسرے سے لڑتے بتائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو لیگ کا ہائی کمانڈر اس کا ذمہ دار ہے لیکن جن سُنّیوں نے لیگ کے اس پیغام کو قبول کیا ہے اور جس یقین پر اس مسئلے میں لیگ کی تائید کرتے پھرتے ہیں، وہ صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے ایک حصّہ میں اسلام کی، قرآن کی آزاد حکومت ہو، جس میں غیر مسلم ذمّیوں کے جان و مال، عزّت و آبرو کو حسب حکم شرع امن دی جائے۔ اُن کو، اُن کے معاملات کو، اُن کے دین پہ چھوڑ دیا جائے، وہ جانیں اُن کا دھرم جانے۔ اُن کو اَتِمُّوْا اِلَیْہِمْ عَہْدَہُمْ سُنا دیا جائے اور بجائے جنگ و جدل کے صلح و امن کا اعلان کر دیا جائے۔ ہر انسان اپنے پُرامن ہونے پر مطمئن ہو جائے۔ اگر سُنّیوں کی اس بھی کوئی تعریف کے سوا لیگ نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو کوئی سُنّی قبول نہیں کرے گا۔[1]

مسلم لیگ اور آل انڈیا سُنّی کانفرنس کا معاہدہ ہو چکا تھا کہ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں سُنّی مسلمان مسلم لیگ کی بھرپور تائید و حمایت کریں گے لیکن دینی معاملات میں مسلم لیگ ہر موقع پر سُنّی کانفرنس کی رہنمائی اور ہدایات کو ملحوظ رکھے گی۔ چنانچہ اس خطبے میں اُس کا ذکر یوں کیا گیا:

"ہم سے مسلم لیگ کو اسی کی اُمید رکھنی چاہیے کہ اُس کا ہر قدم سُنّیوں کے کہے ہوئے پاکستان کے حق میں ہوگا اور اس کے ہر پیغام میں اسلام و مسلمین کا نفع ہوگا آل انڈیا

---

[1] سید محمد کچھوچھوی، مولانا، خطبۂ صدارت، ص ۲۳، ۲۴

سنی کانفرنس کی تائید اس کو بے دریغ حاصل ہوگی اور دینی امور میں ہاتھ لگانے سے
پہلے آل انڈیا سنی کانفرنس کی رہنمائی اس کو قبول کرنی پڑے گی اور ضرور کرنی پڑے گی
اگر ہماری حق گوئی کسی کے نزدیک جرم ہے اور کسی لیگی کے نزدیک یہ لیگ کی دشمنی ہے
تو ہمیں ڈیفنس میں ایک لفظ نہیں کہنا ہے اور اگر لیگ کے دشمنوں کے نزدیک یہ
ہمارا لیگی ہو جانا ہے تو ہم اس خوش فہمی کو بھی قابلِ مضحکہ سمجھتے ہیں!" ۱؎

اسی طرح ۵، ۶ رجب المرجب ۱۳۶۵ھ/ جون ۱۹۴۶ء کو بنارس کانفرنس کے تقریباً سوا مہینہ بعد مسجد شاہجہانی واقع درگاہِ معلی اجمیر شریف میں آل انڈیا سنی کانفرنس کے اسپیشل اجلاس ہوئے ایک نشست کی صدارت حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"حضرات! میں نے بار بار پاکستان کا نام لیا ہے اور آخر میں صاف کہہ دیا ہے کہ
پاکستان بنانا صرف سنیوں کا کام ہے اور پاکستان کی تعمیر آل انڈیا سنی کانفرنس
ہی کرے گی۔ اس میں کوئی بات بھی نہ مبالغہ ہے، نہ شاعری ہے اور نہ سنی
کانفرنس سے غلو کی بنا پر ہے۔ پاکستان کا نام بار بار لینے سے جس قدر ناپاکوں کو
چڑ ہے اسی قدر پاکوں کا وظیفہ ہے اور اپنا وظیفہ کون سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے
کھاتے پیتے پورا نہیں کرتا؟ اب رہا پاکستان کارِ سنیاں است۔ یہ ملک کی کسی
سیاسی جماعت سے تصادم کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے، جس کا
اظہار بلا خوفِ لومۃ لائم کر دیا ہے۔ اول تو مسلم لیگ کے سوا کوئی ٹولی ایسی نہیں
جو پاکستان کے ساتھ لفظی موافقت بھی رکھتی ہو الکفر ملۃ واحدۃ۔ سارے
ناپاکوں نے اپنے اندر بے شمار اختلافات رکھتے ہوئے پاکستان کے خلاف
صف آرائی کر لی ہے اور مسلم لیگ میں پاکستان کا پیغام کس سے پہنچا اور لوگوں
نے مسلم لیگ کا عقیدہ اس کو بنایا؟ اگر تاریخی طور پر دیکھا جائے تو وہ صرف سنی
ہیں۔ پاکستان کے معنی اسلامی قرآنی آزاد حکومت ہے۔ مسلم لیگ سے ہمارے

۱؎ سید محمد کچھوچھوی، مولانا: خطبۂ صدارت بنارس، ص ۲۹، ۲۷

سُنّی کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کے رکن حضرت سید شاہ زین الحسنات صاحب سجادہ نشین مانکی شریف (سرحد) نے کہہ دیا ہے کہ "اگر ایک دم سارے سُنّی مسلم لیگ سے نکل جائیں تو کوئی مجھے بتادے کہ مسلم لیگ کس کو کہا جائے گا؟ اُس کا دفتر کہاں رہے گا؟ اور اُس کا جھنڈا سارے ملک میں کون اٹھائے گا؟" ؎

اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہوا کہ مسلم لیگ کی وکالت اور اہلسنت وجماعت کے دوٹوں سے ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوگیا۔ ہندوستان کا ایک حصہ علیحدہ ہوکر اسلامی نظریاتی مملکت کے طور دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہوا۔ یہ موقع اور یہ شاندار کامیابی ہندوستانی مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی اور پاکستان کا قیام عالمِ اسلام کے لیے انتہائی مسرت وشادمانی کا پیغام تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے اسے دائم قائم رکھے، آمین۔

پاکستان قائم ہوجانے پر سُنّی کانفرنس کا نام جمعیۃ علماء پاکستان رکھ دیا گیا لیکن مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کی بدقسمتی کہ آل انڈیا سنی کانفرنس کے بانی اور سُنّیوں کی فعال شخصیت حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸ر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو بروز جمعۃ المبارک اپنے پروردگار کو پیارے ہوگئے (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ حضرت محدث کچھوچھوی اور مولانا سلیمان اشرف جیسی ہستیاں ہندوستان ہی میں رہ گئیں۔ ادھر قائدِ اعظم محمد علی جناح بھی ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی جانب سدھار گئے۔

نہ مسلم لیگ ہی قیامِ پاکستان کے بعد اپنے اسلامی و قرآنی وعدوں کو پورا کرسکی اور نہ جمعیۃ العلماء پاکستان یعنی سابق سُنّی کانفرنس ہی سے کوئی ایسا مردِ میدان نکل سکا جو مسلم لیگ کو مجبور کردیتا کہ اپنے وعدوں کو پورا کرے۔

حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ جس طرح برٹش گورنمنٹ نے مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کی جمعیت کو منتشر کرنے کی غرض سے مختلف فرقے کھڑے کردیے تھے، پاکستان بن جانے کے بعد اُسی سوادِ اعظم کے جن کے دوٹوں سے یہ نظریاتی مملکت معرضِ وجود میں آئی تھی اُسی جماعت کو دبانا گرانا اور بدمذہبوں کو ابھارنا شروع کیا گیا، حتیٰ کہ پاکستان کے مخالفوں ہی کی نازبرداری کرنا ضروری سمجھا گیا، جس کا خمیازہ پوری قوم بھگت رہی ہے کہ قیامِ پاکستان کا مقصد حاصل کرنا، اس میں قرآن وسنت کا آئین نافذ ہونا تو دُور کی بات، دینی اور اسلامی فضا ناگفتہ بہ

؎ خطبۂ صدارت، ص ۲۹

رقی جا رہی ہے۔ خدائے ذوالمنن ہماری حالت پر کرم فرمائے اور ہمیں اپنی انفرادی و اجتماعی حالتوں کو درست کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

نجدی وہابیہ کی بُت پرست نوازی

خوارج کے متعلق جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ وہ مختلف ناموں کے ساتھ قیامت تک ہیں گے اور ان کا آخری گروہ دجّال علیہ اللعنۃ کے ساتھ ہوگا۔ اسی کے مطابق علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے درمختار کے حاشیہ ردالمحتار میں تصریح فرمائی ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اس کے جبین زمانہ حال کے خوارج ہیں۔ موصوف کے اس بیان کی مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) نے اپنی تصنیف "الشہاب الثاقب" میں اور مولوی خلیل احمد انبیٹھوی (المتوفی ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء) نے المہند میں تصدیق و تائید کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں تمام علمائے دیوبند کی مسلمہ اور آخر الذکر اکثر اکابر دیوبند کی مصدقہ ہے۔

ہندوستان میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے مذہب کی ترویج و اشاعت کی تھی۔ موصوف کے جملہ متبعین بھی خوارج ہی کی ماڈرن آفس کاپیاں ہیں۔ احادیث میں خارجیوں کی ایک پہچان یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ اہلِ اسلام کو قتل کریں گے اور کافروں مشرکوں سے بنا کر رکھیں گے۔ چنانچہ نجدی مذکور نے اور اُس کے اتباع و خلفاء نے جزیرۂ عرب کے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہانے اور اُن کے اموال کو غنیمت کا مال سمجھ کر چھیننے میں کون سا دقیقہ فروگذاشت کیا تھا؟ ظالموں نے حرمین کا ادب بھی قطعاً ملحوظ نہ رکھا۔ مکۂ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مسلمانوں پر وہ قیامت ڈھائی جس کے سُننے سے مسلمانوں کا خون کھول اُٹھتا ہے، یہاں تک کہ اصحابِ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو اُن کی آخری آرام گاہوں میں تنگ کیا، مزارات شہید کروا دیے اور جنت البقیع میں ہل چلوا دیے نیز کتنی ہی مقدس یادگاروں کا اس طرح سے نام و نشان مٹا دیا کہ صرف کتابوں میں مذکرے ہی رہ گئے۔

اگر نجدی خارجیوں نے یہ کچھ کیا تو ہندی خارجی کون سے پیچھے رہ گئے۔ ظالموں نے

انگریزوں کی مدد سے سکھوں سے مقابلہ کرنے کی آڑ میں دل کھول کر پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کے
خون سے ہولی کھیلی۔ عنادی خاں سردار ہنڈ، یار محمد خاں حاکم یاغستان اور اُس کے بھائی
سلطان محمد خاں سے یکے بعد دیگرے لڑائیاں کیں۔ اوّل الذکر دونوں کو شہید کیا۔ ان لڑائیوں
میں جو مال چھینا اُسے مالِ غنیمت شمار کیا۔ اسی طرح کھلابٹ، مرغز، کڈا، ٹھنڈکوئی، پنج پیر،
ہنڈ، شیوہ، چارگلئی، مدرم، گڑیالی، ڈاگئی، شیخ جانا، اسماعیلہ، امان زئی، کاٹ لنگ،
لونڈ خوڑ، مردان، ہوتی، مایار، تورو وغیرہ دیہات کو بزورِ شمشیر مسلمانوں سے چھینا گیا۔ مایار کی
لڑائی میں سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا اور پشاور پر پیش قدمی کی لیکن سلطان محمد خاں کی دانشمندی
سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ ہزاروں مسلمانوں کا خون رنگ لایا اور ظالموں کو مظلوموں کا خون نگل گیا
و ذلک جزاء الظٰلمین۔

جب ہندی اور نجدی خارجی مسلمانوں کو قتل کرنے میں قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے
اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں پوری طرح کوشاں تھے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہندی
خارجی تو گاندھی اور نہرو کی پوجا کریں اور نجدی خارجی صرف دُور بیٹھے تماشا ہی دیکھتے رہیں۔ ان
حضرات کی مذہبی غیرت نے بھی اُنھیں مشرکینِ ہند اور خصوصاً گاندھی و نہرو کی تعظیم بلکہ پوجا پاٹ
کرنے پر اُبھارا۔ چنانچہ مئی ۱۹۵۵ء میں شاہ ابن سعود کے ہمراہ اُن کے بھائی شاہ امیر فیصل بھی
ہندوستان آئے۔ موخر الذکر نے اپنا مذہبی فریضہ یوں ادا کیا،

"امیر فیصل نے بھارت میں قیام کے دوران میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر
رادھا کرشن اور پنڈت نہرو سے ملاقاتیں کیں اور راج گھاٹ پر مہاتما گاندھی کی
سمادھ پر پھول چڑھانے گئے نیز ایک گاؤں رتن گڑھ میں تشریف لے گئے جہاں
دیہات سدھار کا کام دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہیں دس ہزار روپے کا عطیہ
عنایت فرمایا۔" [1]

بہرحال یہ اُس وقت پھر بھی چھوٹے میاں تھے۔ بڑے میاں کی سُنیے جنھیں حافظ حرم کا خطاب

---

[1] نوائے وقت لاہور، ۱۱ مئی ۱۹۵۵ء

اُن کے معتقد حضرات بڑی عقیدت سے دیتے ہیں جو بُت شکن کے بجائے قبر شکن تھے۔ مسلمانوں کو مشرک کہہ کر اُن سے دشمنی رکھنے پر مجبور تھے لیکن مشرکوں بُت پرستوں سے اتحاد اور دوستی کی یوں بھیک مانگتے پھرتے تھے :

"شملہ سے آٹھ میل دور آپ (شاہ ابن سعود نجدی) نے ہماچل پردیش کے لوگوں کا پیش کیا ہُوا لوک ناچ کا ایک پروگرام دیکھا اور جناب صدر، معزز وزراء خواتین اور راجندر پرشاد کے جواب میں شاہ سعود نے تقریر فرمائی مدرسہ دیوبند کو پچیس ہزار روپیہ دیا اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان اور سعودی عرب کے اتحاد اور دوستی کے رشتے ہمیشہ مضبوط رہیں گے۔"[1]

اپنے اس دورے کے موقع پر شاہ ابن سعود نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ارضِ مقدس کا دورہ کرنے کی دعوت دی جسے اس بُت پرست نے قبول کر کے ستمبر ۱۹۵۶ء میں سعودی عرب کا دورہ کیا۔ اُس وقت ان مسلمانوں کو مشرک بتانے والے لیکن حقیقت میں مشرک پرستوں نے کیسے کیسے قیامت خیز طریقوں سے پنڈت نہرو کا استقبال کیا، ان ایمان سوز حرکتوں پر پورا عالمِ اسلام بلبلا اٹھا اور ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہُوئی کہ موحّد ہونے کے دعویدار ارضِ مقدس میں مشرک پرستی کا عالمی ریکارڈ کیوں قائم کر رہے ہیں؟ نہرو کے دورے کا حال پاکستان کے سارے اخباروں میں شائع ہُوا۔ ایک اخبار کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

"سعودی عرب میں نہرو کا "مرحبا رسُولُ السّلام" اور جے ہند کے نعروں سے استقبال۔ شاہ سعود نہرو کی پنچ شیلا پر ایمان لے آئے۔ سعودی عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نہرو کے استقبال کے لیے عرب عورتیں بھی موجود تھیں ..... ریاض پہنچنے پر شاہ سعود نے نہرو کو گلے سے لگا لیا۔

سرزمین حجاز پر پہلی مرتبہ بھارتی ترانہ "جنا نا ما نا گا نا" بجایا گیا۔ پنڈت نہرو جب سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض پہنچے تو ہزاروں افراد نے جن میں

---

[1] اخبار سیاست، کانپور، ۲۳ دسمبر ۱۹۵۵ء

شاہ سعود، سعودی شہزادے، وزراء اور سعودی فوج کے اعلیٰ افسر شامل تھے نہرو کا
استقبال کیا اور ایک فوجی دستے نے نہرو کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اس کے بعد
نہرو ایک کھلی کار میں شاہ سعود کے محل روانہ ہو گئے۔ راستے میں سڑک پر دونوں طرف
ہزاروں افراد نے نہرو کو دیکھ کر زندہ باد کے نعرے لگائے۔ چوبیس ستمبر کی رات کو
شاہی محل "الحمراء" میں شاہ سعود نے نہرو کے اعزاز میں شاہی ضیافت دی۔
اس کمرے کو رنگا رنگ روشنیوں سے سجایا گیا تھا جب نہرو کمرہ میں داخل ہوا تو
شاہ سعود نے آگے بڑھ کر ان کی شیروانی کے کاج میں سرخ رنگ کا ایک گلاب
ٹانک دیا۔" [۱]

مشرک نہرو کا استقبال "یا رسول السلام" کے نعرے سے کرنے پر پورے عالم اسلام
سے احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں۔ توحید کے پردے میں یہ شرک پرستی کا نظارہ مسلمانانِ عالم
کے لیے ناقابلِ برداشت ہو کر رہ گیا اور سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ واقعی ان نام نہاد
موحدوں کی خارجیت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور یہ حضرات سیاسی مصالح کی خاطر
اپنی ظاہری مسلمانی کو بھی داؤ پر لگانے میں نہ کوئی باک محسوس کرتے آئے ہیں اور نہ آج کل
کر رہے ہیں۔ اب پاکستانی اخبارات کا احتجاج ملاحظہ ہو:

"نیز جیا نہرو رسول السلام" کا نعرہ ضرور کھٹکتا ہے۔ کاش معزز عرب میزبان
اپنے مہمان کو امن کا رسول پکارتے وقت اپنے ان کلمہ گو بھائیوں کا بھی تصور
کر لیتے جن پر بھارت میں ان دنوں امن و عافیت کے سب دروازے بند
کر دیئے گئے ہیں اور جن کا خون محض اس جرم کی پاداش میں پانی سے زیادہ
ارزاں کر دیا گیا ہے کہ انہوں نے رسولِ عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دلخراش
توہین پر احتجاج کیوں کیا تھا؟ افسوس بھارتی مسلمانوں ...... کی قلب کی گہرائیوں
سے نکلی ہوئی آہیں بھی عربوں کو اس وزیر اعظم کو "امن کا رسول" قرار دے کر

---

[۱] روزنامہ جنگ کراچی، ۲۷ ستمبر ۱۹۵۶ء

مرتباً کفے سے باز نہ رکھ سکیں، جس کی سرکاری انگلیوں سے بھارتی مسلمانوں کا گرم خون ابھی ٹپک ہی رہا تھا۔" [1]

دوسرے اخبار نے "جے ہند" کے نعرے لگانا اور ارضِ مقدس میں مشرک کو بلا کر اس کا اعزاز کرنے پر شاہ سعود کو متنبہ کیا اور اس خاندان کی قبہ شکنی کا ذکر کرتے ہوئے یوں سعودی حکمرانوں کی سیاسی مصلحت پر تبصرہ کیا ہے:

"آلِ سعود نے پہلے خالص سیاسی مصلحتوں کے تحت ایک بُت پرست قوم کے نمائندے کو ریاض بلایا اور اس کے استقبال کے لیے خواتین اور بچوں کو ساتھ لے گئے اور ان سے "جے ہند" کے نعرے لگوائے۔ سعودی عرب کا یہ فعل سراسر بدعت ہے جس کی کوئی مسلمان بھی حمایت نہیں کر سکتا۔ عجیب بات ہے کہ جن حکمرانوں نے صحابہ کی پختہ قبریں اور گنبد تک اس لیے ڈھا دیے ہوں کہ وہ اُن کی نظروں میں اسلام کی تعلیمات کے منافی تھے وہی حکمران آج اپنی سیاسی مصلحتوں کے لیے ایک ایسے شخص کو حجاز میں مدعو کر کے استقبال کرتے ہیں جو بُت پرستوں کا نمائندہ ہے۔ اور اسلام کے ہر مکتبِ خیال کے علماء کا متفقہ فتویٰ ہے کہ کوئی بُت پرست اسلام کے اس گہوارے میں قدم نہیں رکھ سکتا۔" [2]

ع لیکن یہ کیا کہ نغمۂ توحید کی بجائے
اُن کی زباں پہ برہمنوں کا ترانہ ہے

سعودی حکومت کے دعویِ اسلام کے بارے میں نعرۂ "رسولِ السلام" کے پیشِ نظر یہ اقتباس بھی قابلِ غور ہے:

"شاہ سعود وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس روایت کو توڑا اور صنم خانہ کے ایک پاسبان کو ارضِ کعبہ پر بلایا اور صرف بلایا ہی نہیں بلکہ خلافِ روایات انداز سے

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء
[2] روزنامہ کوہستان لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

اُس برہمن بچّے کا استقبال کیا۔ استقبال کے وقت جو نعرے بلند کیے گئے اُن میں سے ایک نعرہ دنیا کے اسلامی حلقوں میں خاص طور پر قابلِ اعتراض سمجھا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پنڈت جی کو "رسول السلام" کہا گیا جس کے معنی پیغمبرِ اسلام کے ہیں۔ پنڈت نہرو کے حالیہ دورے سے یہ تاثر بھی شدت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ سعودی مملکت جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی، محض نام کی اسلامی حکومت ہے اور اس کا طرزِ عمل ازمنۂ وسطیٰ کی عیسائی غیر کرسچین حکومتوں سے قطعاً مختلف نہیں جو مذہب کے نام پر لوگوں کا ناجائز استعمال کرتی ہیں۔[1]

اس دورے کے وقت سعودی حکومت نے "گیتا انجلی" پڑھوائی۔ کعبہ، بت خانہ، کافر، مومن، موحد، مشرک اور بت شکن و بت پرست کا فرق مٹانے کی جو کوشش کی اُس پر یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

"کعبے اور بت خانے کو ہمدوش کرنے کے لیے شاہ سعود اور پنڈت نہرو جو کوششیں کر رہے ہیں اُس میں برہمن کا تو کچھ بھی نہیں جائے گا البتہ موحد اگر جو بت شکنی (قبہ شکنی) میں سبک دست ہوتا ہے اُس میں مصلحت شناسی اور رواداری آ جائیگی۔ اللہ اکبر، ایک دور وہ تھا علامہ (ابن) عبد الوہاب نجدی کے نام لیوا ...... یہ نعرہ لگاتے تھے کہ ہمارے لیے قرآن اور حدیث کافی ہیں (فقہ کی ضرورت نہیں) اب وہ گیتا انجلی پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر پنڈت نہرو کو کتنی مسرت ہوئی ہوگی، وہ کیوں نہ خوش ہوں، وہ کہتے ہوں گے، بھارت کے مسلمانوں کو ہندو ہزار سال سے اپنا مذہب پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ پڑھنے نہیں دیتے اور میرے سعودی عرب کے ایک دورے نے عربوں کی نئی نسل میں گیتا انجلی پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا کر دیا۔ سعودی عرب کے اس تجربہ کے بعد عجب نہیں کہ بھارت کے مسلمانوں کو حکم ہو جائے کہ تم اپنی مسجدوں میں اشلوک بھی سنایا کرو۔"[2]

---

[1] روزنامہ کوہستان لاہور یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

[2] ایضاً ، ۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء

دیوبندی علماء جو اپنے اکابر کے کفریہ کلمات، کفریہ عبارتیں حتی کہ کفریہ عقیدے تک ایمان کا جوہر سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ مسلمانوں کے ٹوکنے پر ان کی دور از کار تاویلیں کر کے خود بھی ان کفریات میں برابر کے حصے دار بن جاتے اور انھیں اسلامی عقیدے اور عبارتیں ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ اگرچہ بات بنی ایک دفعہ بھی نہیں لیکن اس طرح اپنے متبعین اور جہلاء کو مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہم نے دندان شکن جواب دے دیا اور ثابت کر دکھایا ہے کہ ہمارے یہ عقیدے اور عبارتیں ہرگز کفریہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ ان حضرات کا اسلام کے ساتھ مذاق اور اپنی جانوں پر ظلم ہے۔ آخر عاقبت تو اپنی ہی خراب کرتے ہیں اور اپنے ساتھ متبعین کو بھی گھسیٹے ہیں لے کر ڈوبتے ہیں اس اس کے باوجود نجدیوں کا نعرہ "مرحبا رسول السلام" مولوی احتشام الحق تھانوی (کراچی) جیسے ناقابل برداشت ہو گیا۔ اس شناعت و قباحت کو موصوف بھی برداشت نہ کر سکے۔ ان کا ایک بیان یوں اخبارات و رسائل میں شائع ہوا۔

"مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج رات ایک بیان میں کہا ہے کہ سرزمین حجاز کے دارالخلافہ ریاض میں بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو کے استقبال پر "مرحبا نہرو رسول السلام" سے جو ننگ اسلام اور اسلام سوز قسم کے نعرے لگائے گئے ان سے نہ صرف یہ کہ مسلمانانِ عالم کے دینی و ملی جذبات غیرت کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا ہے بلکہ متولی حرمین شریفین کی اس موحدانہ دینداری کا پول بھی کھل گیا ہے جس کا سارے عالم میں ڈنکا پیٹا جا رہا ہے۔

(اس سے قطع نظر کہ سرزمین توحید اور گہوارہ اسلام میں ایک صنم پرست بلکہ منکر خدا اور اللہ کے باغی کو دعوت تکریم دینا اور جوار رسول میں بسنے والے موحدین مردوں اور عورتوں سے خیر مقدم و استقبال کرانا پاسبان حرم کے لیے کہاں تک زیب دیتا ہے یا اس احساس ذمہ داری کو کہاں تک پورا کرتا ہے جو حرمین شریفین کی تولیت پر مسلمانان عالم کی طرف سے عاید ہوتی ہے، خود یہ بات بھی اپنی جگہ انتہائی شرمناک اور غیر اسلامی ہے کہ پنڈت نہرو کے لیے "رسول السلام" جیسے اصطلاحی الفاظ استعمال کیے جائیں۔

سعودی عرب کے سفارت خانے سے جو وضاحتی بیان دیا گیا ہے، نامہ نگار عربی کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے کہ رسول سے قاصد کے معنی مراد ہیں نبی کے معنی مراد نہیں میرے نزدیک عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے اور ممکن ہے کہ نامہ نگار عربی کی ابجد سے حقیقت میں واقف نہ ہو، لیکن سعودی عرب کے سفارتی ترجمان سے زیادہ واقفِ اسلام ضرور ہوتا ہے اور الزام کی تردید کرنے والے ترجمان ممکن ہے کہ عربی کی مہارتِ تامہ رکھتے ہوں مگر اسلام اور تعلیماتِ اسلام کی ابجد سے بھی نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔

مرحبا رسول السلام کے نعرہ سے ادنیٰ سے ادنیٰ عقل رکھنے والے کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی ہے کہ پنڈت نہرو کو نبی یا پیغمبر بنا دیا یا اس لفظ سے نبی کے معنی مراد لیے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ رسول سے قاصد ہی کے معنی مراد لیے گئے ہیں، یہ اعتراض ہے کہ لفظ "رسول" اسلام اور قرآن کریم کی مخصوص اصطلاح ہے، جس کی حیثیت شعائر اللہ اور شعائرِ اسلام کی ہے۔ جیسے قرآن، مسجد حرام، مسجدِ اقصیٰ وغیرہ قسم کے بے شمار الفاظ اسلامی شعائر ہیں، جو اپنے لغوی معنی سے نکل کر اصطلاحی معنی کے لیے خاص ہو گئے۔ اب ان الفاظ کو لغوی معنی میں استعمال کرنا، بالخصوص اُن لوگوں کی طرف سے جن کو عربی زبان کے استعمال کرنے میں حدودِ دین کا پاس رکھنا ہے، قطعاً ناجائز و حرام ہے، بلکہ شعائر اللہ کی کھلی ہوئی بے حرمتی اور توہین ہے۔ ع

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

کیا کسی مسلمان کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنی تصنیف کا نام کتاب اللہ، اپنے گھر کا نام بیت اللہ اور اپنی مسجد کو مسجدِ حرام، اپنے باغ کو جنت، اپنے تالاب کا نام کوثر اور تنور کا نام جحیم اور اپنے پوسٹ مین کا نام رسول رکھ لے؟ حالانکہ لغوی اعتبار سے یہ سب صحیح ہیں۔ کیا قرآن کریم میں یا ایہا الذین امنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا میں الفاظ کا ادب مسلمانوں کو نہیں سکھایا

گیا ہے؟ کیا حدیث کے اندر مسلمانوں کو خبثتِ نفسی کی ممانعت سے بھی ادبِ الفاظ نہیں بتلایا گیا ہے؟

سعودی عرب کے سفارتی ترجمان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کی عربی زبان بھی وہ زبان ہے جس میں اصطلاحاتِ قرآن کی حرمت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر اللہ کے باغی کے احترام میں آج ناموسِ رسول کو یہ کہہ کر بھینٹ چڑھایا گیا کہ رسول کے معنی قاصد کے ہیں تو آئندہ تمام شعائرِ اسلام کی حرمت کبھی باقی نہ رہ سکے گی۔ پھر سلامتی و امن کا استعمال بھی کس قدر حیا سوز اور غیرت کش ہے کہ جس کے ملک میں آئے دن خونِ مسلم سے ہولی کھیلی جاتی رہی ہو وہ قاصدِ امن تو کیا ہوتا اُس میں امن و سلامتی کا ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ خدا کی شان ہے کہ مردم خور درندوں کو قاصدِ امن کے لقب سے یاد کیا جائے۔

جنوں کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں!
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ہم آخر میں پاسبانِ حرم سے صاف طور پر یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حرمین شریفین مسلمانانِ عالم کی امانت ہے اور ان پاسبانوں کی طرف سے ...... ناموسِ رسول کی بے حرمتی کبھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔"[1]

قارئینِ کرام حیران ہوں گے کہ جب دوسرے وہابی حضرات خاموشی یا تاویلات کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے تو اس غیر اسلامی نعرے پر دیوبندی ہونے کے باوجود مولوی احتشام الحق تھانوی نے تنقید کیوں کی تھی؟ ہم قارئین سطور کی واقفیت کے لیے عرض کرتے ہیں کہ موصوف کا تعلق اُس جماعت سے ہے، جس کے سرگروہ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) بقول علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۸ھ) چھ سو روپیہ ماہوار انگریزی حکومت سے وظیفہ پاتے تھے، اسی وجہ سے تھانوی صاحب اور اُن کے متبعین

---

[1] روزنامہ جنگ کراچی، ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء، صفحہ پہلا

زنار دوست ہونے کی بجائے برٹش نواز تھے اور ہندو نواز علماء پر تنقید ہی کرتے رہتے تھے جیسا کہ اِسی باب میں مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کا ایک طویل بیان پیش کیا جا چکا ہے ۔ مولوی احتشام الحق صاحب کا تعلق بھی چونکہ اُسی تھانوی گروپ سے ہے لہذا موصوف کا اِس زنار دوستی پر تنقید کرنا چنداں محلِ تعجب نہیں ۔ اب اِس بحث فروشانہ حرکت پر ماہنامہ "نقاد" کراچی کے ایڈیٹر کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے :

" قاطع بدعت و مناہی ، مقلدِ (ابن) عبد الوہاب نجدی ، محافظ حرمین الشریفین

جلالۃ الملک شاہ سعود کے نام

فدائیانِ رسول و عالیانِ اسلام کا پیغام

جلالۃ الملک ! اللہ آپ کو محبتِ رسول دے ۔ خدا معلوم آپ کو معلوم ہے یا نہیں کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء میں "پاکستان" کے نام سے ایک الگ ملک بنا لیا تھا ۔ اِس نوزائیدہ ملک کے بنتے ہی دشمنانِ اسلام و مسلمین نے مسلمانانِ ہند کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا اور پھر اُن کا قتلِ عام شروع کر دیا تھا ۔ چنانچہ ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں نے اپنے آبائی وطن اور گھروں سے بھاگ بھاگ کر ، مرتے گرتے نہ جانے کیا کیا مصائب برداشت کرنے کے بعد پاکستان میں سکونت اختیار کر لی ۔ لیکن اِس کے باوجود اب بھی ہندوستان میں ساڑھے چار یا پانچ کروڑ مسلمان موجود ہیں ، جہاں نہ اُن کی جانیں محفوظ ہیں نہ اُن کی عورتوں کی عصمتیں ۔

لیکن اے کلید بردارِ حرم ! جب آپ پچھلے دنوں ہندوستان کے سرکاری دورے پر آئے تو ان حالات کے باوجود آپ نے ہندوستانی حکومت کو یہ سندِ شاہی عطا فرما دی کہ " میں بحیثیت محافظ حرمین الشریفین اِس بات سے مطمئن ہوں کہ ہندوستان میں مسلمان امن و سکون سے ہیں اور اُن کی جانیں محفوظ ہیں وغیرہ وغیرہ "

یقین کیجیے شاہ ! آپ کی اس سندِ شاہی کی تشہیر کے بعد ہمیں محمد شاہ

تھگیلے کے فرامین بے ساختہ یاد آگئے تھے اور ہم یہ بھی سوچ گئے تھے کہ ترک کی مسلمان قوم آپ اور آپ کی حکومت سے کیوں غیر مطمئن رہی ہے۔

اس واقعہ کے بعد آپ نے ایک غیر مسلم سربراہ کو سرزمین حجاز مقدس کے سرکاری دورے کی دعوت دی اور ۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جب آپ کے دار الخلافہ ریاض پہنچے تو آپ کی حکومت کے اکٹھے کیے ہوئے عوام نے "یا رسول السلام نہرو" کے شرمناک نعروں سے اُن کا استقبال کیا تھا۔ اس استقبال کرنے والوں میں عرب کے وہ قبائلی بدو اور عورتیں بھی شریک کیے گئے تھے جو کسی دشمن اسلام فرد یا قوم کے لیے اپنے دلوں میں جذبات احترام نہیں رکھتے۔ پھر سب سے بڑا اجتہاد جو آپ جیسے قاطع بدعات نے کیا تھا وہ یہ تھا کہ عرب کی خواتین کو غیر مردوں کے انبوہ کثیر میں لا کر اُن سے ایک مجرم اور غیر مسلم شخص کا استقبال سرزمین حجاز پر "رسول" جیسے متبرک مقدس خطاب سے کرایا۔

شاہ بدعت شکن! پنڈت جواہر لال نہرو کو "رسول" کے نام سے آپ نے یا آپ کی قوم نے یاد کر کے پاکستان کے ۸ کروڑ مسلمانوں کی جو دلآزاری کی وہ ناگفتہ بہ ہے۔ آپ کو کسی نے یہ بات غلط بتا دی ہے کہ پاکستان میں ایسی قوم آباد ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہے اور عربی زبان کے معانی و مطالب سے آگاہ نہیں ہے۔ آپ کے سفارت خانے لفظ "رسول" کے لیے جو تاویلات وضع کر رہے ہیں اُس سے اُن کی بیچارگی اور ندامتِ جرم مترشح ہو رہی ہے۔

جلالۃ الملک! ہم مسلمانانِ عالم حیران ہیں کہ آپ اور آپ جیسے عقائد مذہبی رکھنے والے لوگ ایک ایسے شخص کو تو "یا رسول" جیسے عظیم لقب سے خوش آمدید کہہ سکتے ہیں جو بعثتاً و نسلاً بت پرست اور مسلکاً لامذہب ہے، لیکن کوئی مسلمان "حیات النبی، خاتم الرسل، حضور رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو وفورِ جذبات و عقیدت، لوازمِ احترام اور واجباتِ استغاثہ میں یا رسول

یا محمد، یا مصطفیٰ کہہ کر یاد کرے تو اُسے کافر و مشرک قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ کونسی منطق ہے؟ یہ کون سا عقیدہ ہے؟ یہ کون سا مذہب ہے۔ استغفر اللہ ربی۔

آپ لوگوں نے جنت البقیع کے تمام آثارِ مقدسہ کو شہید کرا دیا۔ صد ہا اصحاب کبار کے قبّوں کو مسمار کرا دیا۔ گنبدِ خضریٰ، آرام گاہِ رسول، سرچشمۂ نورِ الٰہی کے معاودے زمین بوسی کو حرام اور جُرم قرار دیا گیا اور آپ اور آپ کے ہم مسلک عقیدہ مولویوں نے یہ حکم بھی لگا دیا کہ ختم المرسلین، نبی آخرالزماں، حیات النبی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جو شخص کھڑے ہو کر یَا رَسُوْل سَلَامٌ عَلَیْکَ پڑھے مشرک و کافر ہے اور اس عقیدے پر اصرار کرے تو مرتد اور واجب القتل! لیکن آج یہ کیا ہُوا کہ احترامِ رسول کو بدعت و شرک و کفر کہنے والے مقلدینِ ابن عبدالوہاب نجدی ایک ایسی قوم کے سربراہ کا استقبال "یَا رَسُوْل نَسْتَدْم" کے نعروں سے کرتے ہیں جو دشمنِ رسول و اسلام ہے اور لاکھوں دیوی دیوتاؤں کا پجاری ہے اللہ اکبر۔

اے شاہ! ہم آج کے بڑے بڑے جغادریوں کے عقاید و مسلک کے آہنی قلعوں کو سیاسی تقاضے ایک ہی جھٹکے میں مسمار کر ڈالتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آج سعودی عرب میں کسی ڈاکیے یا پوسٹ مین یا کسی بھی پیغام رساں کو اہلِ زبان یا دیہاتی لوگ "یَا رَسُوْل" کہہ کر پکارتے ہیں؟ ہم پوچھتے ہیں کہ عرب کے کسی بھی گوشے میں کیا کوئی ایسا بدنصیب مسلمان ہے جو رسُول کا لفظ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے علاوہ عام آدمیوں علی الخصوص کسی مشرک و بُت پرست یا لامذہب شخص کے لیے بولتا یا لکھتا ہو؟

ہمارے سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہے اور ہم نہایت وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضور پُرنور (روحی فداہ) کی شان میں گستاخانہ خیالات رکھنے اور بارگاہِ رسالت میں اپنے معاملات صاف نہ رکھنے کی پاداش میں عرب حاکموں سے یہ حماقت اور دیوانگی سرزد ہوئی ہے۔ تواضع و میزبانی عربوں کا طرۂ امتیاز ہے

لیکن اے کلید بردارِ حرم! آپ نے یہ بھی غور کیا کہ سیاسی استحکام اور ذاتی حُبِّ جاہ کے لیے آج آپ کی میزبانی اپنی حدود سے بڑھ کر دشمنیِ دین اور شماتتِ رسالت کے تعریضِ ملت اور ظہورِ ضلالت کی سرحدوں پر آ پہنچی ہے۔ آپ تمام حضرات غیر مشروط طور پر اقرارِ گناہ کریں۔ اس نازک مرحلے پر تاویلات اور استدلال کے سہارے بڑے خطرناک ہیں۔ اس راستہ میں "باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کا عقیدہ واجب و لازم ہے اور تاویلات، "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مترادف ہیں۔ خداوند کریم آپ کو محبتِ رسول دے اور یہ توفیق بھی ارزاں فرمائے کہ آپ یا آپ کی حکومت مسلمانانِ عالم کی اس دلآزاری کے سلسلہ میں نادم ہو۔ اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی۔[1]

؎ خدا ہی جانتا ہے حشر اس ٹولی کا کیا ہوگا؟
حرم سے جس کی بدبختی نے رُخِ ملت کا پھیرا ہے

مولوی احتشام الحق تھانوی صاحب کچھ تو بولے، یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ ہندو نوازی سے اتفاق نہیں رکھتے ورنہ کونسی نئی بات تھی یا نرالا غیر اسلامی لفظ وہابیوں کے منہ سے نکل گیا تھا۔ اپنے دوسرے ہم مسلک علماء کی طرح موصوف بھی چپ سادھ لیتے یا تاویلات کی بھول بھلیاں میں پھر لگ جاتے مگر ہندو نوازی پر اپنے گروپ کی لاج رکھنے کے لیے بولنا پڑا لیکن اس طرح کہ دوسرے غیر اسلامی عقاید و نظریات اور نجدیوں کے کارناموں کو ٹھیس تک نہ لگنے دی۔
قارئینِ کرام نے ایڈیٹر ماہنامہ "نقاد" کراچی، جناب ظفر نیازی صاحب کا تبصرہ ابھی ملاحظہ فرمایا۔ موصوف نے وہی کچھ کہا جو ایک مسلمان کو کہنا چاہیے اور جو کچھ کہا جرأتِ رندانہ سے کہا

؎ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

قارئینِ کرام! نجدیوں کی اس غیر اسلامی روش نے غیر مسلموں کے ہاتھوں میں کیسا

---

[1] ماہنامہ "نقاد" کراچی، نومبر ۱۹۵۶ء، ص ۱۲، ۱۳

ہتھیار تھمادیا۔ "رسول" کے اصطلاحی اور لغوی معنوں کے بارے میں کسی کسی موشگافیوں کا موقع فراہم کر دیا چنانچہ بھارت کا دہلی سے نکلنے والا اخبار "تیج" اپنے ۲۰ ستمبر ۱۹۵۶ء کے اداریے میں نہروں کے اسی نعرے پر اظہارِ خیال کرتا ہے۔ اس اداریے کا ایک اقتباس نوائے وقت لاہور نے یوں نقل کیا تھا:

۱۔ پردھان منتری شری جواہر لال نہرو پیغمبرِ اسلام کی دنیا میں پہنچے تو ان کا استقبال "پیغمبرِ امن" کے نعروں سے کیا گیا۔

۲۔ اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو اسلام کے معنی امن کے ہیں، سلامتی کے ہیں پیغمبر اسلام کے معنی ہیں امن وسلامتی کے پیغامبر کے ہیں۔ (گویا پیغمبرِ امن اور پیغمبرِ اسلام ایک ہی بات ہے)

۳۔ پیغمبرِ اسلام کے ملک باسیوں نے پنڈت جی کی عزت افزائی کے لیے وہی لفظ منتخب کیا جس پر اسے ناز ہے جس کی وجہ سے دنیائے اسلام میں عرب دلیش کی عزت ہے۔

۴۔ پنڈت جی کے اس دورہ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ تو وقت بتائے گا، مگر اس سے کفر اور کافر کے فلسفے میں تبدیلی ہوگئی تو یہ دورہ کی بہت بڑی فتح ہوگی۔"[1]

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

اس اسلام سوز نعرے کی بنا پر مرزائی حضرات ان نام نہاد موحدوں کے منہ پر یوں لگام لگاتے ہیں:

"ایک مذہبی سوال لفظ "رسول" کے استعمال سے متعلق ہے۔ آج تو اہلحدیثوں کو یہ تاویل سوجھ رہی ہے کہ رسول کے معنی قاصد کے ہوتے ہیں مگر جب حضرت بانی سلسلہ احمدیہ (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) نے رسول کے معنی

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

ما مور اور تابع شریعت اُمتی نبی کے پیش کیے ستھے تو یہی مولوی (نذیر حسین دہلوی، ثناء اللہ امرتسری اور محمد حسین بٹالوی وغیرہ) شور مچاتے تھے کہ "رسول" شرعی اصطلاح ہے، اس لفظ کے اطلاق کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نئی شریعت لانے کا مدعی ہے۔ اگر اس موقع پر اہلحدیثوں کو بھی لفظ "رسول" کے استعمال کی وسعت کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی غلطی کو مان جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اہل نجد کی غلطی مفید ہی ثابت ہوئی۔"[1]

قارئین کرام نے نجدی وہابیوں کی زنار دوستی اور مشرک نوازی کا کرشمہ دیکھ لیا۔ یہ ہے ان حضرات کی توحید پرستی کا عالم۔ مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے والے کس طرح کے مشرک دوست اور بُت پرست نواز نکلتے ہیں۔ نجدی اور ہندی سارے ہی وہابی قبروں اور خصوصاً مزاروں سے بہت جلتے ہیں، اسی لیے مسلمانوں کو قبر پرست اور پیر پرست کہے بغیر تو ان حضرات کا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا۔ غضب تو یہ ہے کہ روضۂ رسول پر بھی غلاموں کو نہیں جانے دیتے کہ کہیں اس بارگاہ بے کس پناہ میں حاضر ہو کر یہ مشرک نہ بن جائیں، کافر ہو جائیں۔ مسلمانوں کو اپنے اصطلاحی کفر و شرک سے بچانے والے خود کن لوگوں کی قبروں سے اپنی ساختہ توحید کی بھیک مانگ کر لاتے ہیں، ملاحظہ ہو:

"واشنگٹن یکم فروری۔ آج صبح شاہ سعود پوٹامک دریا کو عبور کر کے ارلنگٹن قبرستان گئے اور گمنام سپاہی کی قبر پر پھول چڑھائے۔ یہ قبر گزشتہ جنگ میں ہلاک ہونے والے تمام امریکی سپاہیوں کی یادگار سمجھی جاتی ہے۔ دوپہر کا کھانا شاہ سعود نے نائب صدر نکسن کے ہمراہ کھایا۔"[2]

سعودی عرب کی نجدی حکومت کے اُس وقت کے وزیر دفاع نے اپنے شہنشاہ معظم کے ہمراہ امریکہ میں محافظ حرمین اور خیر خواہ اسلام ہونے کا الیلاسٹا ہوکرتے ہوئے یوں

---

[1] ماہنامہ "الفرقان" ربوہ، فروری ۱۹۵۷ء، ص ۱۵
[2] روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۲ فروری ۱۹۵۷ء

اپنے فرضی موحّد ہونے کا بین الاقوامی ثبوت پیش کیا:

"سعودی عرب کے وزیرِ دفاع امیر فہد بن سعود نے جو شاہ سعود کے ہمراہ امریکہ گئے ہیں کل امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی قیام گاہ کی سیر کی۔ بارش کے باوجود انہوں نے مکان کے پائیں باغ کی بھی سیر کی اور جارج واشنگٹن کی قبر پر پھول چڑھائے"۔ [1]

مسلمان اگر اللہ جل شانہٗ کے دوستوں یعنی حضرات اولیاء اللہ کے مزارات پر پھول چڑھائیں تو وہابی حضرات کو یہ فعل خالص مشرکانہ نظر آتا ہے لیکن یہی حضرات خدا کے دشمنوں یعنی کافروں اور مشرکوں کی قبور پر پھول چڑھائیں تو کیا مجال کہ ان کی توحید میں ذرا بھی فرق آجائے بلکہ اِس قطعاً غیر اسلامی اور سراسر ابلیسی توحید میں اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو ایسی نام نہاد توحید سے محفوظ و مامون رکھے اور ان حضرات کو خوش فہمی کی بھول بھلیاں سے نکال کر راہِ ہدایت پر گامزن فرمائے۔ آمین

کاش! وہ خارجی حکمران کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا فرمالیا کریں کہ جس دین و مذہب کے نام پر انہیں مسلمانوں سے نفرت ہے وہ مذہب انہیں کھٹ کافروں، ٹھیٹ مشرکوں سے محبت کی پینگیں بڑھانے سے کیوں نہیں روکتا؟ عالمِ اسلام کی جو قربانیاں بوراہ خدا میں حج کے موقع پر پیش کی جاتی ہیں، اُن کے متعلق سُنا ہے کہ نجدی وہابی ہرگز ان کا گوشت نہیں کھاتے، مشرکین کا ذبیحہ قرار دے کر اجتناب کرتے ہیں لیکن غیر ممالک کے دورے پر جائیں تو سب کچھ ضیافتوں کے بہانے ہضم کر جائیں۔ کچھ نہ سہی تو ملکی خزانے کو جس طرح اپنی ملکیت قرار دیا ہوا ہے اور بے دریغ شاہی خاندان پر لُٹایا جاتا ہے، کیا یہ حلال ہے؟ کیا مسلمانوں کی وہ قربانیاں حرام ہیں؟ کیا یہ ضروری نہیں کہ وہاں کا حکمران طبقہ مسلمانوں اور کافروں سے جس طرح کا سلوک روا رکھے ہوئے ہے اُس پر نظرِ ثانی کرے، کیونکہ اُن حکمرانوں کی اور پورے عالمِ اسلام کی بھلائی

---

[1] روزنامہ کوہستان لاہور، بابت ۲ فروری ۱۹۵۷ء

اور بہتری اسی میں ہے کہ کافروں کو کافر سمجھ کر اُن سے اسی طرح سلوک کریں جیسا کہ مسلمانوں کو اُن سے کرنا چاہیے اور مدعیانِ اسلام کے مابین جو اختلافات ہیں انھیں افہام و تفہیم کے ذریعے دُور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ حق کو قبول کرنا اور باطل سے پیچھا چھڑانا جہادِ اکبر ہے۔

بُت پرستوں کی پُختہ زنّاری

قارئین کرام! آپ نے اس باب میں ہندو نوازوں، زنّار دوستوں اور گاندھی پرستوں کے کارنامے تو ملاحظہ فرمالیے کہ علم و فضل کے تمام تر دعاوی کے باوجود اُن کی کوششوں کی منزلِ مقصود یہی تھی کہ ہندوستان کے سارے مسلمان گاندھی کے قدموں میں جھکتے، اسلامی غیرت و حمیّت کو کھوتے اور ہندو مت میں مدغم ہوتے چلے جائیں۔ گویا ان حضرات کی کوششوں کا ماحصل یہی تھا کہ امتِ محمدیہ کا رُخ حرم سے سومنات کی جانب پھیر دیا جائے، خدا پرستی کے بجائے مسلمانوں کو ایسے راستے پر گامزن کیا جائے جس سے یہ ان لوگوں کے پرستار بن جائیں جو خود بُت پرست ہیں۔

ان کی ملتِ اسلامیہ سے بہی خواہی کی ابتداء انگریز کی غلامی کے نعرے سے شروع ہوتی تھی اور گاندھی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جانے پر سارے پروگرام کی انتہا ہو جاتی ہے، یہ تھی ان حضرات کی ستم ظریفی، جس کا انتہائی فخریہ انداز میں آج تک ڈھول بجایا جا رہا ہے کہ باعثِ رونقِ چمن اگر کوئی تھا تو ہم ہیں اور مسلمانانِ پاک و ہند کے چہروں پر اگر رونق کے کوئی دُھندلے سے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں تو وہ ہماری ہی مساعیٔ جمیلہ کے مرہونِ منت ہیں۔ اسی غرض سے ہم نے پورے انصاف کے ساتھ ان حضرات کے حقیقی خدوخال تاریخ اور حقائق کی روشنی میں سب کے سامنے اُجاگر کر دیے ہیں۔ اب دُوسری جانب ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے کہ جن ہندو بہبود پر یہ کرم فرماتے جا رہے تھے اور جن کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں کو اُن کے قدموں میں جھکانے کا فریضہ پوری ہمت اور جانفشانی سے ادا کرتے آ رہے تھے، خود اُن ہندو لیڈروں یعنی ہندو نوازوں کے مہاتما اور اَن داتا حضرات کس وجہ مسلمانوں کی جانب جھکے؟ کیا اُن کی پُختہ زنّاری میں کوئی فرق آیا؟ کیا اپنے پُجاریوں کے پاسِ خاطر یا تسکینِ قلوب کے پیشِ نظر انھوں نے اپنے دھرم میں کوئی لچک پیدا کی؟ کاش! انھوں نے

گوش ہوش سے سُنا ہوتا کہ ان کے گاندھی مہاراج علی الاعلان یُوں فرما رہے تھے،

"میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں اور اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بُت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔"[1]

کاش! مسلمانوں کی خیر خواہی کا دعویٰ کرنے والے اِن زُنّار دوستوں کو یہ توفیق مل جاتی کہ ہم مسلمان ہیں، کتاب و سنّت ہمارے دین کے ماخذ ہیں اور اُن کے اندر واضح لفظوں میں غیر مسلموں سے دوستی رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے، بلکہ قرآنِ کریم میں تو یہاں تک فرمادیا گیا ہے کہ جو غیر مسلموں سے دوستی کرے گا وہ اُن میں ہی شمار کیا جائے گا۔ لہٰذا یہ اسلامی غیرت کے سراسر خلاف ہے کہ ہم بُت پرستوں کے آلۂ کار اور مشرکینِ ہند کے نعلین بردار بن جائیں لیکن ایسا تو کوئی اُسی وقت کر سکتا ہے جب اسلام کی نورانیت سے اُس کے دل و دماغ منور ہوں۔ گاندھی کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے،

"مختلف طبقات و مذہب کے بچّوں میں رَوا داری اور دوستی کی جو رُوح پیدا ہو رہی ہے، اُس کے پیشِ نظر میں اِس بات کو سخت مہلک سمجھتا ہوں کہ اُن کو یہ سکھایا جائے کہ اُن کا مذہب دیگر مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں، اُن کے نزدیک بس وہی سچّا مذہب ہے۔"[2]

کیا گاندھوی حضرات سنے مُن کر دریں چہ شک نہ کہا ہوگا۔ اگر کچھ بھی نہیں کہا، تب بھی خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔ خیر جس گاندھی کو یہ کرم فرما مسلمانوں کا اِس دَور میں سب سے بڑا خیر خواہ منوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے اور اعلان کرتے تھے کہ اگر نبوّت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے، وہی اِن حضرات کا مذہبی پیشوا، نبوّت کی اہلیت

---

[1] روزنامہ ینگ انڈیا، ۱۲؍اکتوبر ۱۹۲۱ء
[2] روزنامہ اسٹیٹسمین، ۱۲؍جولائی ۱۹۲۸ء

رکھنے والا ان کا دینی رہنما کسی گو لپٹی کے بغیر اپنوں اور بیگانوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ڈنکے کی چوٹ یوں علی الاعلان سُنا رہا تھا:

"میری رُوح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریہ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے، کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔" [۱]

کیا اس اعلان کو سُن کر گاندھوی علماء کی پیشانیوں پر بل آئے تھے؟ اگر بل آئے ہوتے تو اس کے بعد تو کم از کم گاندھی کی گاندھی میں تنکے بن کر فضا میں اڑنے سے توبہ کر لیتے۔ لیکن فضا میں اُڑنے کے لیے جو بلند مقام مل رہا تھا وہ توبہ کب کرنے دیتا تھا۔ مزید سُنیے کہ گاندھی نے متحدہ قومیت کی تلبیس کا زہر کس مزے سے شربتِ اتحاد و اتفاق کے نام سے ان علمبردارانِ توحید اور دشمنانِ شرک و مشرکین کو پلایا اور انھوں نے بڑے مزے سے لے کر نوشِ جان فرمایا تھا۔ چنانچہ گاندھی صاحب نے کہا تھا:

"اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے یعنی ایک نجی کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے، جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترکہ ہو۔ مذاہب انسانوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے کے لیے نہیں ہیں، وہ انھیں ایک رشتہ میں پرونے کے لیے ہیں۔" [۲]

۱۹۴۴ء میں گاندھی صاحب کا ایک بیان اخبارات میں محمد علی جناح کے نام کھلا خط کے نام سے شائع ہوا تھا۔ موصوف نے اس میں قومیت کا جو تصور پیش کیا اور جملہ گاندھوی حضرات

۱۔ ہندوستان ٹائمز، ۱۴ اپریل ۱۹۴۰ء

۲۔ ہندوستان ٹائمز، ۹ جون ۱۹۴۰ء

دعوت جس کے قائل بلکہ مبلغ تھے، وہ اسلامی غیرت کیلئے کھلا چیلنج ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

"میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنھوں نے اپنے آباؤ اجداد
کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور اُن کی اولاد یہ دعوے
کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان انگریزوں
کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد اُسے ایک ہی قوم رہنا چاہیے،
خواہ اس کے سپوتوں میں سے کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔"[1]

وہابی حضرات کے متبوع الاسلام یعنی پنڈت جواہر لال نہرو جو مسلمانانِ پاک و ہند
کے ازلی دشمن اور پکے کافر، مشیّت بُت پرست تھے، اُن کی صدارت میں آل انڈیا نیشنل
کنونشن مارچ ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوا۔ پنڈت جی نے صدارتی خطبے میں قومیت کا تصور یوں
بکھیرا تھا:

"ایسے لوگ بھی ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوستان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں
گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس
دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔"[2]

پنڈت جواہر لال نہرو نے گاندھوی حضرات کو اسلام کا ظاہری طور پر نام لینے اور
خود کو مسلمان کہلانے سے ہٹانے کی خاطر مذہب کی مخالفت جن لفظوں میں کی وہ دیدنی ہے۔
موصوف نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ:

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں اور دوسری
جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے
اور اسے مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔"[3]

---

[1] عام اخبارات، ۱۵ ستمبر ۱۹۴۳ء

[2] روداد آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء

[3] میری کہانی، ص ۹۱

مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے لفظوں سے بھی واضح تر الفاظ میں، ہندو مہاسبھا کے صدر یعنی مسٹر ساورکر سے ہندو کی تعریف سُن لیجیے۔ موصوف نے کہا تھا:

"لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو مثلاً کلچر، نسل اور روایات اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو۔" [۱]

اِسی ہندو مہاسبھا کے نائب صدر یعنی ڈاکٹر رادھا مکرجی نے آل انڈیا ہندو ویدک یُوتھ کانفرنس منعقدہ لاہور کے صدارتی خطبے میں علی الاعلان کہا تھا کہ:

"ہندوستان کو فطری اور عملی طور پر ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیے۔ جس کا کلچر ہندو اور جس کا مذہب ہندو ازم ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔" [۲]

دیوبندی حضرات کے شیخ الہند یعنی مولوی محمود الحسن صاحب جس شخص کی سرکردگی میں ریشمی رومال کی تحریک میں حصّہ لیا تھا اور جو اُس تحریک میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا، اُسی لالہ ہردیال کا بیان ہے کہ:

"پس اگر ہندوستان کو کبھی آزادی ملی تو یہاں ہندو راج قایم ہوگا۔ نہ صرف ہندو راج قایم ہوگا بلکہ مسلمانوں کی شُدھی، افغانستان کی فتح وغیرہ باقی آدرش بھی پُورے ہو جائیں گے۔" [۳]

اب کون پُوچھے گاندھوی حضرات اور اُن کے علماء و مشائخ کہلانے والوں سے کہ حضرات! آپ کے قومی رہنماؤں، مذہبی پیشواؤں، اخلاقی یاروں، پیاروں، مددگاروں اور اقتصادی پروردگاروں کے بیانات تو ایسے تھے، لہٰذا مسلمانوں نے تو اُن بُت پرستانِ ملّتِ اسلامیہ کے ازلی دشمنوں کو اُسی نظر سے دیکھا، جس کے وُہ قابل تھے لیکن گاندھوی حضرات کا رشتۂ تسبیح اُن پختہ زنّاروں کے حضور میں کیوں ٹوٹ گیا؟ دینی غیرت کیوں

---

[۱] ہندوستان ٹائمز، ۱۰ فروری ۱۹۳۹ء [۲] روئیداد آل انڈیا ویدک یُوتھ کانفرنس، منعقدہ لاہور

[۳] روزنامہ ملاپ، ۱۲ جنوری ۱۹۲۵ء

ہوگئی؛ دلوں اور دماغوں پر جو متحدہ قومیت اور متحدہ مسلم اتحاد کا بھوت سوار ہوا تھا، اُس سے اسلامی
حمیت کی رمق بھی باقی رہنے دی۔ یا ستم ظریفی تو یہ کہ اپنے موقف کی انتہائی کمزوری کا احساس
ہوجانے کے باوجود پاکستان میں بھی وہ حضرات اہلِ حق کے خلاف ہر میدان میں صف آرا ہیں۔

حالات کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اور محبانِ اسلام کی ہمدردی سے مجبور ہو کر
راقم الحروف کو یہ روشن دستاویز ایک صفا آئینے کی صورت میں پیش کرنی پڑی، تاکہ انصاف پسند
حضرات اور متلاشیانِ حق اس کی روشنی میں حق و باطل کو پرکھ سکیں اور اس راستے پر گامزن ہو سکیں
جس میں دارین کی کامیابی ہے، جو ملتِ اسلامیہ اور سوادِ اعظم کا راستہ ہے۔ صراطِ مستقیم اسی کو
کہتے ہیں۔ اس راستے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اللہ کے سارے مقبول بندے اسی
راستے پر چلتے آئے ہیں یعنی اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ والا راستہ یہی ہے۔ اس سے پھرنے والے کو
اللہ جل شانہ نے نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا کی وعید سنائی ہے۔

اگر ان پراگندہ سطور میں کوئی خوبی نظر آئے تو اُسے اِس سیاہ کار و عصیاں شعار کے
ولیِ نعمت، مرشدِ برحق، مفتیِ اعظم دہلی حضرت شاہ محمد مظہر اللہ فاروقی نقشبندی مجددی
دہلوی اور مجددِ مائۃ حاضرہ اعلیٰحضرت امام احمد رضا خاں قادری برکاتی بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی
نظرِ کرم اور فیضان کا کرشمہ شمار کیا جائے۔ جتنی غلطیاں، فروگزاشتیں اور کوتاہیاں نظر آئیں
وہ میری نااہلی کا نتیجہ ہیں۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ غلطیوں اور مفید مشوروں سے
مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان کا خیال رکھا جاسکے۔ خدائے ذوالمنن اپنے حقیر بندے
کی اس ناچیز کاوش کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اسے میرے لیے کفارۂ سیئات، باعثِ
حسنِ خاتمہ، توشۂ آخرت اور سرمایۂ نجات بنائے۔ آمین یا الٰہ العٰلمین ۝ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ وَ
صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۝

خاکپائے علماء، محمد عبد الحکیم خاں مجددی مظہری
المعروف بہ اختر شاہجہانپوری
دار المصنفین۔ لاہور

۱۵ر رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ
۲۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء

ماخذ و مراجع

۱۔ ابوالحسن علی ندوی، مولوی — سیرت سید احمد شہید، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۹ء

۲۔ سید ابوالقاسم، شیعہ مجتہد — برہان المتعہ، مطبوعہ نیو امپیریل پریس لاہور

۳۔ ابوالکلام آزاد، مولوی — آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی، مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی

۴۔ احمد رضا خاں بریلوی، امام — الکوکبۃ الشہابیہ فی کفریات ابی الوہابیہ، مطبوعہ الفاران پرنٹنگ پریس لاہور

۵۔ 〃 〃 — الحجۃ المؤتمنہ، مطبوعہ بریلی شریف ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء

۶۔ 〃 〃 — تدبیر فلاح ونجات واصلاح، مطبوعہ آفتاب عالم پریس لاہور

۷۔ 〃 〃 — تمہید ایمان بآیات القرآن، مطبوعہ تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور

۸۔ 〃 〃 — حدائق بخشش، دونوں حصے، مطبوعہ مشہور پریس کراچی

۹۔ 〃 〃 — کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، مطبوعہ لاہور مع نور العرفان، ۱۳۴۵ھ

۱۰۔ احمد بن عبدالرحیم المعروف شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا — القول الجمیل مترجم، مطبوعہ عربی پریس کراچی ۱۹۵۴ء

۱۱۔ احمد شہاب الدین ابن حجر مکی، محدث — فتاویٰ حدیثیہ

۱۲۔ احمد یار خاں، مفتی — مرآۃ شرح مشکوٰۃ، جلد ہشتم، مطبوعہ لاہور

۱۳۔ ارشد القادری، مولانا — تبلیغی جماعت "حقائق ومعلومات کے اجالے میں"، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء

۱۴۔ 〃 〃 — جماعتِ اسلامی اپنے آئینے میں

۱۵-	ارشد القادری، مولانا	زلزلہ، مطبوعہ لاہور، ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء
۱۶-	اشرف علی تھانوی دیوبندی، مولوی	الافاضات الیومیہ، جلد اوّل
۱۷-	〃 〃 〃	〃 جلد سوم
۱۸-	〃 〃 〃	〃 جلد چہارم
۱۹-	〃 〃 〃	〃 جلد پنجم
۲۰-	〃 〃 〃	〃 جلد ہفتم
۲۱-	〃 〃 〃	امداد المشتاق
۲۲-	〃 〃 〃	بوادر النوادر
۲۳-	〃 〃	حفظ الایمان، مطبوعہ نامی پریس لاہور
۲۴-	〃 〃	حکایاتِ اولیاء، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی
۲۵-	اشرف علی علیہ الفضل گلشن آبادی، مولانا	جامع الفتاوٰی، جلد دوم
۲۶-	افتخار عالم بلگرامی	حیاتِ نذیر، مطبوعہ شمسی پریس دہلی
۲۷-	الطاف حسین حالی، شاعر	حیاتِ جاوید، مطبوعہ لاہور
۲۸-	〃 〃	مسدس حالی، مطبوعہ دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور
۲۹-	انتظام اللہ شہابی، مفتی	مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگِ آزادی، مطبوعہ کراچی
۳۰-	انور شاہ کشمیری دیوبندی، مولوی	فیض الباری، جلد اول
۳۱-	〃 〃	مقدمہ مشکلات القرآن
۳۲-	ملا باقر مجلسی، شیعہ مجتہد	حیات القلوب، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
۳۳-	بدر الدین احمد، مولانا	سوانح اعلیٰحضرت امام احمد رضا، مطبوعہ کانپور
۳۴-	بدر عالم میرٹھی دیوبندی، مولوی	ترجمان السنہ جلد اوّل، مطبوعہ دہلی، بار اول ۱۹۴۸ء
۳۵-	ثناء اللہ امرتسری غیر مقلد، مولوی	تاریخ مرزا، مطبوعہ لاہور
۳۶-	〃 〃	فتاوٰی ثنائیہ، مطبوعہ لاہور
۳۷-	پنڈت جواہر لال نہرو، ہندو لیڈر	میری کہانی

نمبر	مصنف	کتاب
۳۸ -	مرزا حیرت دہلوی، ادیب	حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۰۷ء
۳۹ -	احمد حسین ٹانڈوی دیوبندی، مولوی	الشہاب الثاقب، مطبوعہ رحیم پرنٹنگ پریس دیوبند
۴۰ -	" " "	مکتوباتِ شیخ، جلد دوم
۴۱ -	" " "	نقشِ حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی
۴۲ -	حسین علی بھچرانوی دیوبندی، مولوی	بشارات بلغۃ الحیران
۴۳ -	حسین رضا خاں بریلوی، مولانا	وصایا شریف، مطبوعہ مقبول عام پریس لاہور
۴۴ -	خلیل احمد انبٹھوی دیوبندی، مولوی	المہند علی المفند اردو، مطبوعہ لاہور
۴۵ -	" "	براہین قاطعہ، مطبوعہ نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند
۴۶ -	ملا خلیل قزوینی، شیعہ مجتہد	صافی شرح اصول کافی، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
۴۷ -	ذکاء اللہ دہلوی، مولوی	عروجِ عہد انگلشیہ
۴۸ -	رحمٰن علی، مولانا	تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء
۴۹ -	رشید احمد گنگوہی دیوبندی، مولوی	فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوّب، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی
۵۰ -	رئیس احمد جعفری، ادیب	آزادیٔ ہند، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور ۱۹۷۵ء
۵۱ -	سعادت مرزا، ادیب	ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء
۵۲ -	سلطان خاں، مولوی	تذکیر الاخوان، اردو، مطبوعہ اتحاد پریس لاہور ۱۹۵۶ء
۵۳ -	سلیمان اشرف بہاری، مولانا	النور، مطبوعہ علی گڑھ ۱۳۳۹ھ/۱۹۱۹ء
۵۴ -	سید سلیمان ندوی، مولوی	حیاتِ شبلی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء
۵۵ -	" "	تعارف، مصنف معین الحق، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۶ء
۵۶ -	سرسید احمد خاں	آثار الصنادید، مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۶ء
۵۷ -	"	ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ کیپیٹل کوآپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور، بار اول ۱۹۴۴ء
۵۸ -	نواب صدیق حسن خاں بھوپال، غیر مقلد، مولوی	ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرتسر

نمبر	مصنف	کتاب
۵۹	نواب صدیق حسن خاں بھوپالی غیر مقلد، مولوی	رحلۃ الصدیق الی البیت العتیق
۶۰	" "	فتح المغیث بفقہ الحدیث
۶۱	" "	الروضۃ الندیہ فی شرح درالبہیہ
۶۲	طاہر احمد قاسمی دیوبندی، مولوی	مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ تعلیمی پریس لاہور
۶۳	ظفر علی خاں دیوبندی، ادیب	چمنستان، مطبوعہ اردو پریس لاہور ۱۹۶۲ء
۶۴	ظفر الدین بہاری، مولانا	حیات اعلیٰحضرت، جلد اول، مطبوعہ کراچی، ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء
۶۵	عاشق الٰہی میرٹھی دیوبندی، مولوی	تذکرۃ الخلیل، اخوان، اقبال پرنٹنگ پریس سیالکوٹ ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء
۶۶	" "	تذکرۃ الرشید، دونوں جلدیں مطبوعہ میرٹھ ۱۹۰۵ء
۶۷	عبدالرشید ارشد دیوبندی، مولوی	بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء
۶۸	عبدالستار دہلوی، مولوی	فتاویٰ ستاریہ، ہر چہار جلد
۶۹	حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی، غوث اعظم	غنیۃ الطالبین، شائع کردہ مکتبہ سعودیہ کراچی
۷۰	عبدالغنی نابلسی، امام	حدیقہ ندیہ
۷۱	شاہ عبدالعزیز دہلوی، محدث	تحفہ اثنا عشریہ اردو ترجمہ، مطبوعہ ایجوکیشنل وجاہد پریس کراچی ۱۹۶۳ء
۷۲	" "	تفسیر عزیزی سورہ البقرہ
۷۳	عبیداللہ سندھی دیوبندی، مولوی	شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور ۱۹۴۲ء
۷۴	عبدالشاہد خاں شروانی، مولوی	باغی ہندوستان، مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۱۹۴۷ء
۷۵	حافظ عبداللہ غیر مقلد، مولوی	مسئلہ معراج موتی
۷۶	عبدالجبار غزنوی غیر مقلد، مولوی	سوانح عمری عبداللہ غزنوی
۷۷	عبدالحق حقانی، مولوی	تفسیر حقانی، جلد اول، مطبوعہ محبوب پرنٹنگ پریس دہلی

۷۸- عبدالرزاق ملیح آبادی، مولوی — ذکر آزاد

۷۹- عبدالعزیز رحیم آبادی غیر مقلد مولوی — حسن البیان، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۳۸۵ھ

۸۰- عزیز الرحمٰن شیخوپوری دیوبندی " — تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۴ء

۸۱- عنایت اللہ اثری غیر مقلد مولوی — مکاتیب العجابہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۹۹ء

۸۲- ابوالفضل قاضی عیاض مالکی محدث — کتاب الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ

۸۳- حضرت علی المرتضیٰ، خلیفہ چہارم — نہج البلاغت، مطبوعہ طہران

۸۴- مسٹر غلام احمد پرویز، بانی پرویزیت — اسباب زوال امت

۸۵- " " — بہار نو، مطبوعہ اشرف پریس لاہور ۱۹۶۵ء

۸۶- " " — سلیم کے نام خطوط

۸۷- " " — فردوس گم گشتہ

۸۸- " " — قرآنی فیصلے

۸۹- " " — معراج انسانیت، مطبع ریاض ہند قادیان، بار اول ۱۸۹۳ء

۹۰- " " — مقام حدیث، مطبوعہ ضیاء الاسلام قادیان، بار اول ۱۸۹۱ء

۹۱- " " — نظام ربوبیت، " " " " " ۱۹۰۲ء

۹۲- مرزا غلام احمد قادیانی کذاب دجال — اربعین نمبر۲

۹۳- " " — اربعین نمبر۴

۹۴- " " — آئینہ کمالات اسلام

۹۵- " " — ازالہ اوہام

۹۶- " " — اعجاز احمدی

۹۷- " " — براہین احمدیہ

۹۸ – مرزا غلام احمد قادیانی، کذاب دجال — تبلیغ رسالت جلد ہفتم

۹۹ – 〃 〃 〃 — تبلیغ رسالت جلد ہشتم

۱۰۰ – 〃 〃 〃 — تتمہ حقیقۃ الوحی

۱۰۱ – 〃 〃 〃 — تحفہ قیصریہ

۱۰۲ – 〃 〃 〃 — تریاق القلوب

۱۰۳ – 〃 〃 〃 — تحفۃ العوام جلد اوّل

۱۰۴ – 〃 〃 〃 — تحفہ گولڑویہ

۱۰۵ – 〃 〃 〃 — حاشیہ چشمہ معرفت، مطبوعہ انوار احمدیہ قادیان، بار اوّل

۱۹۰۸ء

۱۰۶ – 〃 〃 〃 — حقیقۃ الوحی، مطبوعہ میگزین قادیان، بار اوّل ۱۹۰۷ء

۱۰۷ – 〃 〃 〃 — حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم

۱۰۸ – 〃 〃 〃 — خطبہ الہامیہ، مطبع ضیاء الاسلام قادیان، بار اوّل

۱۳۱۹ھ

۱۰۹ – 〃 〃 〃 — دافع البلاء و معیار اہل الاصطفاء 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۱۹۰۲ء

۱۱۰ – 〃 〃 〃 — درثمین

۱۱۱ – 〃 〃 〃 — رسالہ تشحیذ الاذہان

۱۱۲ – 〃 〃 〃 — ستارۂ قیصرہ

۱۱۳ – 〃 〃 〃 — شہادت القرآن، مطبوعہ پنجاب پریس سیالکوٹ

۱۹۲۸ء

۱۱۴ – 〃 〃 〃 — کشتی نوح، مطبوعہ خورشید عالم پریس لاہور ۱۹۲۲ء

۱۱۵ – 〃 〃 〃 — نور الحق

۱۱۶ – 〃 〃 〃 — نزول المسیح، مطبع ضیاء الاسلام قادیان، بار اوّل ۱۹۰۹ء

۱۱۷- غلام احمد حریری، پروفیسر — اسلامی مذاہب، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۹۰ء

۱۱۸- غلام رسول مہر غیر مقلد، مسشر — ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور

۱۱۹- " " — سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء

۱۲۰- " " — مقدمہ تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور

۱۲۱- غلام مہر علی، مولانا — دیوبندی مذہب، شائع کردہ کتب خانہ مہریہ چشتیاں ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء

۱۲۲- قاضی فضل احمد لدھیانوی، مولانا — انوار آفتاب صداقت، مطبوعہ لاہور ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء

۱۲۳- فضل حسین بہاری غیر مقلد، مولوی — الحیات بعد الممات، مطبوعہ ضیاء پریس کراچی ۱۹۵۹ء

۱۲۴- فضل رسول بدایونی، مولانا — سیف الجبار، مطبوعہ کان پور

۱۲۵- ملا فتح اللہ کاشانی، شیعہ مجتہد — تفسیر منہج الصادقین

۱۲۶- کمال الدین حیدر، مورخ — قیصر التواریخ، جلد دوم، مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۰۷ء

۱۲۷- لطف اللہ، مولوی — علمائے حق

۱۲۸- محمد ابو الحسن غیر مقلد، مولوی — فقہ محمدیہ کلاں

۱۲۹- محمد ابراہیم غیر مقلد، مولوی — فتاویٰ ابراہیمیہ، مطبوعہ الٰہ آباد

۱۳۰- محمد بن عبد الوہاب نجدی، امام الوہابیہ — کتاب التوحید

۱۳۱- ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی، شیعہ مجتہد — اصول کافی

۱۳۲- محمد اسمٰعیل دہلوی، امام الوہابیہ ثانی — ایضاح الحق، مطبوعہ محمدی پریس دیوبند، ۱۲۹۶ھ

۱۳۳- " " — تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور

۱۳۴- " " — تنویر العینین، مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور

۱۳۵- " " — صراط المستقیم، مطبوعہ ضیائی ۱۲۸۵ھ

۱۳۶- " " — اردو، مطبوعہ نامی پریس لاہور

۱۳۷- محمد بن اسمٰعیل یمنی غیر مقلد، مولوی — تطہیر الاعتقاد

۱۳۸۔ محمد اسمٰعیل غزنوی غیر مقلد، مولوی — تحفۂ وہابیہ

۱۳۹۔ محمد اسمٰعیل سابق امیر اہلحدیث، " — مقدمہ حسن البیان، مطبوعہ لاہور، بار سوم

۱۴۰۔ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مولوی — مقالات سرسید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور

۱۴۱۔ علامہ سر محمد اقبال، شاعر مشرق — ارمغانِ حجاز، مطبوعہ لاہور، طبع پنجم ۱۹۵۱ء

۱۴۲۔ " " " — کلیاتِ اقبال، مطبوعہ دہلی

۱۴۳۔ محمد امین ابن عابدین شامی، فقیہ — ردالمحتار، جلد سوم

۱۴۴۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر — دیباچہ تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء

۱۴۵۔ " " " — مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۶ء

۱۴۶۔ شیخ محمد اکرام، مسٹر — شبلی نامہ

۱۴۷۔ " " " — موجِ کوثر، مطبوعہ لاہور، بار ہشتم ۱۹۵۹ء

۱۴۸۔ محمد الیاس برنی، پروفیسر — قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ، مطبوعہ اشرف پریس لاہور

۱۴۹۔ محمد جعفر تھانیسری، مولوی — حیات سید احمد شہید (سوانح احمدی) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء

۱۵۰۔ محمد سعید، مولوی — ہدایتِ قلوب قاسیہ

۱۵۱۔ محمد سرور، مولوی — افادات و ملفوظاتِ سندھی، مطبوعہ لاہور، بار اول ۱۹۷۲ء

۱۵۲۔ میاں محمد شفیع، ڈپٹی کمشنر — ۱۸۵۷ء، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، بار اول ۱۹۵۸ء

۱۵۳۔ محمد صابر قادری نسیم بستوی، مولانا — مجددِ اسلام، مطبوعہ کانپور بھارت ۱۹۵۹ء

۱۵۴۔ محمد عمر اچھروی، مولانا — مقیاسِ حنفیت، مطبوعہ فیاض پریس لاہور، بار ششم ۱۹۶۲ء

۱۵۵۔ " " " — مقیاسِ وہابیت

۱۵۶۔ محمد فیروز الدین روحی، پروفیسر — آئینہ صداقت، مطبوعہ مطبع سیدی کراچی، طبع دوم ۱۹۶۶ء

۱۵۷۔ محمد قاسم نانوتوی دیوبندی، مولوی — تحذیر الناس، مطبوعہ لاہور

۱۵۸۔ سید محمد کچھوچھوی، مولانا — خطبۂ صدارت اجمیر، مطبوعہ تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور

۱۵۹۔ " " — خطبۂ صدارت بنارس، مطبوعہ " " " "

۱۶۰۔ محمد کرم الدین دبیر، مولوی — آفتاب ہدایت، مطبوعہ استقلال پریس لاہور، طبع نہم ۱۹۶۳ء

۱۶۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر — فاضل بریلوی اور ترک موالات، مطبوعہ لاہور

۱۶۲۔ " " — فتاویٰ مظہری، مطبوعہ کراچی، ۱۹۷۰ء

۱۶۳۔ " " — مواعظ مظہری، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۷۰ء

۱۶۴۔ محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر — ہندوستان میں وہابی تحریک (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء

۱۶۵۔ حکیم محمود احمد برکاتی، مولوی — مقدمہ معین المنطق، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۷ء

۱۶۶۔ مرزا محمود احمد، خلیفہ قادیانی کذاب — آئینہ صداقت

۱۶۷۔ " " — انوار خلافت

۱۶۸۔ مسعود عالم ندوی، مولوی — محمد بن عبدالوہاب، مطبوعہ کراچی ۱۹۴۹ء

۱۶۹۔ " " — ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی ۱۳۶۸ھ

۱۷۰۔ محمود الحسن دیوبندی، مولوی — مرثیہ گنگوہی، مطبوعہ لاہور

۱۷۱۔ مصطفیٰ رضا خاں بریلوی، مولانا — الملفوظ، چاروں حصے، مطبوعہ کراچی

۱۷۲۔ محسن کاشی، شیعہ مجتہد — تفسیر صافی

۱۷۳۔ مشتاق احمد نظامی، مولانا — خون کے آنسو، دونوں حصے، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور

۱۷۴۔ مناظر احسن گیلانی دیوبندی، مولوی — سوانح قاسمی، جلد اول و دوم

۱۷۵۔ مرزا حسین سعید الاسلام دہلوی، مولوی — تصدیق الایمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء

۱۷۶۔ منظور احمد، پرنسپل — انگریزی نبی، مطبوعہ پنجاب نیشنل پرنٹنگ پریس لاہور

۱۷۷۔ مودودی صاحب، بانی جماعت اسلامی — تجدید و احیائے دین، مطبوعہ لاہور، بار ہشتم

۱۷۸۔ 〃 〃 — تفہیم القرآن، جلد اول، مطبوعہ لاہور، بار ہشتم ۱۹۶۷ء

۱۷۹۔ 〃 〃 — 〃 جلد دوم 〃 ۱۹۷۰ء

۱۸۰۔ 〃 〃 — 〃 جلد سوم 〃 بار سوم ۱۹۶۹ء

۱۸۱۔ 〃 〃 — 〃 جلد چہارم 〃 〃 ۱۹۷۰ء

۱۸۲۔ 〃 〃 — تفہیمات جلد اول

۱۸۳۔ 〃 〃 — تفہیمات جلد دوم، مطبوعہ پاکستان پرنٹنگ ورکس، بار دوم ۱۹۵۵ء

۱۸۴۔ 〃 〃 — تنقیحات

۱۸۵۔ 〃 〃 — خلافت و ملوکیت، مطبوعہ لاہور، بار پنجم ۱۹۷۰ء

۱۸۶۔ 〃 〃 — دستور جماعت اسلامی

۱۸۷۔ 〃 〃 — مسئلہ قومیت، مطبوعہ لاہور، بار ہفتم ۱۹۷۰ء

۱۸۸۔ میاں نذیر حسین دہلوی، بانی غیر مقلد فرقہ — فتاوٰی نذیریہ جلد اول و دوم

۱۸۹۔ 〃 〃 — معیار الحق، مطبوعہ چٹان پریس لاہور ۱۹۶۵ء

۱۹۰۔ ابوحنیفہ نعمان بن ثابت، امام اعظم — الفقہ الاکبر، مطبوعہ اشرف پریس لاہور

۱۹۱۔ نورالحسن خان بھوپالی غیر مقلد مولوی — عرف الجادی، جلد اول و دوم

۱۹۲۔ نور بخش توکلی، مولانا — تحفہ شیعہ، جلد اول، مطبوعہ گلزار عالم پریس لاہور ۱۹۵۸ء

۱۹۳۔ وحید الزمان خان غیر مقلد، مولوی — تبویب القرآن

۱۹۴۔ 〃 〃 — نزل الابرار، جلد دوم

۱۹۵۔ وکیل احمد سکندر پوری، مولانا — وسیلہ جلیلہ، مطبع مصطفائی ۱۳۰۱ھ
۱۹۶۔ ونایک ساورکر، ہندو — ساورکر، طبع اول
۱۹۷۔ ولیم ہنٹر، انگریز — ہمارے ہندوستانی مسلمان
۱۹۸۔ ولی الدین احمد، محدث — مشکوٰۃ المصابیح

رسائل وجرائد

۱۔ ہفت روزہ، الاعتصام، لاہور — بابت ۹؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۲۔ 〃 〃 〃 〃 — بابت ۱۶؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۳۔ 〃 〃 〃 〃 — بابت ۲۳؍اکتوبر ۱۹۷۰ء
۴۔ ماہنامہ، الجمعیۃ، دہلی — شیخ الاسلام نمبر
۵۔ سہ ماہی، العلم، کراچی — بابت مارچ تا مئی ۱۹۵۸ء
۶۔ ماہ نامہ الفرقان، لکھنؤ — شہید نمبر
۷۔ 〃 〃 〃 〃 — بابت رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ
۸۔ 〃 〃 〃 ربوہ — بابت فروری ۱۹۵۷ء
۹۔ ماہنامہ، السواد الاعظم، مراد آباد — بابت ربیع الاول ۱۳۴۰ھ
۱۰۔ 〃 〃 — بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ
۱۱۔ 〃 〃 — بابت جمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ
۱۲۔ 〃 〃 — بابت شعبان ۱۳۴۹ھ
۱۳۔ 〃 〃 — بابت شوال ۱۳۴۹ھ
۱۴۔ 〃 〃 — بابت ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ
۱۵۔ ماہ نامہ، تجلی — بابت فروری، مارچ ۱۹۵۷ء
۱۶۔ ہفت روزہ، چٹان، لاہور — بابت ۱۶؍اپریل ۱۹۵۱ء
۱۷۔ ہفت روزہ، خدام الدین، لاہور — بابت ۱۳؍اپریل ۱۹۶۲ء

۱۸ - ہفت روزہ، خدام الدین، لاہور	بابت ۲۲ر فروری ۱۹۶۳ء
۱۹ - 〃 〃	بابت ۱۳ر اپریل ۱۹۶۳ء
۲۰ - ماہنامہ، دارالعلوم، دیوبند	بابت ستمبر ۱۹۵۵ء
۲۱ - ماہنامہ، نقاد، کراچی	بابت نومبر ۱۹۵۶ء
۲۲ - اخبار، الفضل، قادیان	بابت ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء
۲۳ - روزنامہ، جنگ، کراچی	بابت ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۶ء
۲۴ - 〃 〃	بابت
۲۵ - روزنامہ، سیاست، کانپور	بابت ۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء
۲۶ - 〃 〃	بابت یکم فروری ۱۹۵۷ء
۲۷ - روزنامہ، صدق، لکھنؤ	بابت ۲ر فروری ۱۹۵۷ء
۲۸ - روزنامہ، کوہستان، لاہور	بابت یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء
۲۹ - 〃 〃	بابت ۷ر اکتوبر ۱۹۵۶ء
۳۰ - 〃 〃	بابت ۷ر فروری ۱۹۵۷ء
۳۱ - روزنامہ، ملاپ، لاہور	بابت ۱۳ر جنوری ۱۹۲۵ء
۳۲ - روزنامہ، نوائے وقت، لاہور	بابت ۱۱ر مئی ۱۹۵۵ء
۳۳ - 〃 〃	بابت ۸ر ستمبر ۱۹۵۶ء
۳۴ - 〃 〃	بابت ۲ر فروری ۱۹۵۷ء
۳۵ - ہندوستان ٹائمز	بابت ۲۰ر فروری ۱۹۳۹ء
۳۶ - 〃	بابت ۹ر جون ۱۹۴۰ء
۳۷ - روزنامہ، ینگ انڈیا	بابت ۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۱ء
۳۸ - روزنامہ جنگ، کراچی	بابت ۱۹ر ستمبر ۱۹۵۶ء
۳۹ - روزنامہ اسٹیٹسمین	بابت ۷ر جنوری ۱۹۳۸ء

قطعۂ تاریخ کتابت

(از حضرت مولانا اختر الحامدی الرضوی مدظلہٗ - حیدرآباد)

زندہ و پائندہ باد اے اختر
آئینہ ہے، کتاب یہ کیا ہے

جس میں عریاں ہیں دیو کے پنجے
بر سر عام ہر سراپا ہے

اُن کے مکروہ چہروں سے تُو نے
ہر نقاب آج نوچ پھینکا ہے

اُن کی اِک اِک فریب کاری کا
تار تار ہر دبیز پردہ ہے

وہ کیا ہے محاسبہ تُو نے
سرِ بازار مکر ننگا ہے

اللہ اللہ تیری نوکِ قلم
شاہ احمد رضا کا نیزہ ہے

مار جس کی ارے معاذ اللہ
قہرِ حق جس کا وار، توبہ ہے

مظہرِ فیض ہے یہ سب لاریب
تجھ پہ بے شک کرم رضا کا ہے

پاسباں مسلکِ رضا کا تُو
رہبرِ راہ شاہِ بطحا ہے

تیری تحریر سے یہ ہے ظاہر
عہد تُو نے رضا سے باندھا ہے

سُنّت و دین کے تحفظ کا
کام تجھ کو رضا نے سونپا ہے

عہد نامہ ہے تیری ہر تحریر
چشمۂ فیض ہر رسالہ ہے

جس کا ہر حرف ساغرِ عرفاں
ہر سطر جس کی بادہ خانہ ہے

اللہ اللہ بہ فیضِ شاہِ رضا
جس نے دیکھا پکار اُٹھا ہے

واہ وا عہد نامۂ اختر
آج تحفۂ مطلع ہے

۱۳ ھ ۹۵   ۱۳ ھ ۹۵

قطعۂ تاریخ ترتیب

(از حضرت مولانا اخترؔ الحامدی الرضوی مدظلہ العالی حیدرآباد)

اللہ اللہ حضرتِ اخترؔ کی کیا تصنیف ہے — دیکھ کر جس کو نظر پُرنور ہے روشن نگاہ

مل گیا ہے خاک میں نجدی کا تاریخی غرور — سب کی ٹھوکر میں ہے مصنوعی فضیلت کی کلاہ

مکر کی اُن کے فضا میں اُڑ رہی ہیں دھجیاں — ہر دلیل اُن کی ہوا کے ہے پروں پر مثلِ کاہ

اس طرح فرمایا ہے بوجہلیوں کا احتساب — ہے ہر اک عریاں سرِ بازار با حالِ تباہ

نوچ پھینکی مُنھ سے ہر تخریب کاری کی نقاب — آج ہے پیشِ نظر اک ایک کا رُوئے سیاہ

یعنی سب انگریز کی شطرنج کے مُہرے ہیں یہ — حاشیہ بردارِ گاندھی، کانگرس کے خیر خواہ

بیش قیمت ہے یہ علمی کارنامہ آپ کا — ہے یقیناً آپ پر لطفِ رضا شام و پگاہ

روز و شب علم و عمل میں ہو ترقی آپ کے — ہو زمانے میں فزوں سے بھی فزوں تر عزّ و جاہ

مرحبا تحقیق، یہ روزِ قلم صد آفریں — اس کا اک اک حرف ہے علمی فضیلت پر گواہ

ایک سرمایہ ہے یہ اہلِ قلم کے واسطے — اک مورّخ کے لیے مشعلِ بکف، مینارِ راہ

جس نے دیکھا اس کو اخترؔ کہہ اُٹھا بیساختہ

واہ رضوی شان ہے، کیا یہ، رضا کی شان واہ

۱۳۹۴ھ — ۱۳۹۲ھ

قطعۂ تاریخِ طباعت

(از حضرت اختر الحامدی الرضوی مدظلہ العالی۔ حیدرآباد)

اختر ترے نثار ہے کیا سیرتِ رضا — عمرت دراز باد، دعا یہ خدا سے ہے

احمد رضا کا والا و شیدا نہ تو ہو کیوں — جب اُن کو عشق سرورِ ہر دوسرا سے ہے

تجھ پر نگاہِ طلعتِ رضا کی ہے رات دن — یہ اوجِ علم و فضل اُنھیں کی عطا سے ہے

سر پہ امامِ اہلِ قلم کا سجا ہے تاج — کیا شان فضلِ حضرتِ غوث الوریٰ سے ہے

طرزِ بیاں میں کلکِ رضا کا ہے بانکپن — ظاہر یہ حُسن، تیرے قلم کی ادا سے ہے

جنگ آزما و برسرِ پیکار رات دن — تو دشمنانِ ذاتِ شہِ انبیاؑ سے ہے

تاریخِ طبع میں ہے یہ اختر کا فیصلہ

تو فیضیاب چشمۂ فیضِ رضا سے ہے

۱۹ ۲ ۷۶